گھر کے ہر فرد کے لیے

کراچی

ماہنامہ

پاکیزہ

دسمبر 2014

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول

نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے ناولوں کی پُر لطف اقساط

فرحانہ ناز ملک کی یاد میں تعزیتی مضمون



اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

مکمل ناول

منی ناول

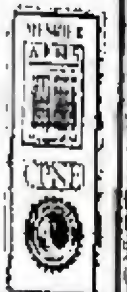
افسانے

پبلشر و پرنٹر ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن ، مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خصوصی مضامین

مستقل عنوانات



شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

نمائندہ لاہور سید فراز علی نازش 0332-4214400 رانا لئے حمید 0323-2895528

ماڈل: ایشا .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا

جلد 42 • شمارہ 09 • دسمبر 2014 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



یورپ کے ایک ٹیلی وژن چینل کو عجب سوجھی کہ اس نے ایک سروے کیا، جس کا موضوع تھا، لوگوں کی زندگی کا مقصد کیا ہے.....؟ اس سروے کے مطابق برطانیہ کے عوام امیر سے امیر تر بننا چاہتے ہیں۔ جاپانیوں کی زندگی کا مقصد عیش و آرام حاصل کرنا ہے جب کہ امریکی ٹیکسوں سے آزادی اور دولت کمانے کے خواہاں ہیں..... گویا اخلاقی اقدار کی بلندی، مخلوق خدا کی خدمت اور دوسروں کے لیے ایثار اور قربانی کا نصب العین کسی فرد کی زبان سے ظاہر نہ ہوا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا کی ہر شے کا ایک مقصد وجود ہے۔ کائنات کو ہی لیجیے اس کی ہر چیز انسان کی خدمت پر کمربستہ ہے۔ سورج، چاند ستارے، ہوا، بادل، نباتات و جمادات یہ زمین و آسمان غرض کوئی شے بھی بغیر مقصد کے پیدا نہیں کی گئی۔

ایک معمولی درخت کو ہی لے لیجیے اس سے انسان پھل حاصل کرتا ہے۔ سایہ حاصل کرتا ہے، اس کی لکڑی استعمال میں لاتا ہے۔ جب ایک معمولی درخت کی پیدائش کا بھی مقصد ہے تو خالق کائنات سے یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اشرف المخلوقات یعنی انسان کی زندگی کا کوئی مقصد نہ رکھا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''زمانے کی قسم، انسان (دراصل) خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے، جو ایمان لائے، نیک عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

اور آج مجھے آپ سے یہی کہنا ہے کہ آپ بھی دیگر نادان لوگوں کی طرح خوب سے خوب تر کی تلاش میں..... کہیں خسارے کی زندگی تو نہیں گزار رہے۔

مدیرہ
انجم انصار

دین کی باتیں

بے شک جن لوگوں نے کہا کہ مسیح مریم کے بیٹے ہی اللہ ہیں، وہ کافر ہو گئے اور مسیح نے (ان سے یہی) کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل میرے اور اپنے پروردگار (یعنی) اللہ کی پرستش کرو (اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو کیونکہ) بے شک جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے گا تو (یہ سمجھ لو کہ) بے شک اس پر اللہ نے جنت حرام کردی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ (۷۲) بے شک جن لوگوں نے کہا ہے کہ اللہ تین (معبودوں میں) کا تیسرا ہے وہ (بھی) کافر ہو گئے اور بے شک ایک معبود کے سوا کوئی معبود نہیں اور اگر یہ لوگ جو کہتے ہیں اس سے باز نہ آئیں گے (تو) بے شک جو لوگ ان میں کافر ہیں انہیں دردو دینے والا عذاب پہنچے گا (۷۳) یہ لوگ اللہ کی طرف کیوں نہیں رجوع کرتے اور اس سے (اپنے گناہوں کی) بخشش (کیوں) نہیں چاہتے اور اللہ (تو) بخشنے والا مہربان ہے (۷۴) مریم کے بیٹے مسیح (کچھ) نہ تھے مگر (اللہ کے) رسول، بے شک ان سے پہلے (بھی) پیغمبر ہو چکے ہیں اور ان کی ماں ایک ولیہ تھیں دونوں (ماں بیٹے) کھانا کھاتے تھے (پھر اللہ کیسے ہو سکتے ہیں اے نبی ﷺ) دیکھو ہم ان کے لیے کس طرح (امر حق کے) دلائل بیان کرتے ہیں پھر (انہیں) دیکھو کہ یہ کس طرح (راہ راست سے) بھٹکے جاتے ہیں (۷۵) (ان سے) کہو کہ کیا تم اللہ کے سوا اس کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہاری نقصان رسانی کا اختیار رکھتا ہے اور نہ نفع (رسانی) کا اور اللہ ہی سننے والا (اور) دانا ہے (۷۶) (نفع و نقصان کا مالک ہے ان سے) کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کی (نفسانی) خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو پہلے (ہی) سے گمراہ ہو چکے ہیں اور بہت لوگوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور راہ راست سے ہٹ گئے ہیں (۷۷)



(سورۂ مائدہ آیت نمبر ۷۲ تا ۷۷)

سیدنا محمود ﷺ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ نِ الْمَحْمُوْدِ فِیْ کُلِّ مَکَانٍ

مفہوم: سراہے گئے' تعریف کیے گئے' پسندیدہ۔

1: تفصیل مفہوم

1: حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ "جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ مخلوقات کو پیدا کرے اور موجودات کو وجود میں لائے تو اپنی عزت وجلال کے نور سے ایک نور پھیلایا اس کی ضیا سے ایک لو چمک کر بلند ہوئی اور ایک صورت میں اکٹھا ہونے لگی۔ اس میں رسول پاک ﷺ کی صورت تھی۔ پس اللہ نے فرمایا کہ تم برگزیدہ اور منتخب ہو اور تم ہی میں دوسرے انوار ودیعت ہیں۔ تمہاری ہی بنا پر پہاڑوں کو قائم کیا۔ آسمانوں کو بلند کیا اور پانی جاری کیا۔ عالمین کو قائم کیا جو پانی کی موج کے جھاگ تھے اور دھوئیں کو بلند کیا اور عرش کو پانی پر قائم کیا پھر مختلف قسم کے ملائکہ کو ایسے انوار سے خلق فرمایا جو بالکل نئی ایجاد تھے اس کے بعد مخلوقات کو پیدا کیا۔ (گنج الاسرار)

آپ ﷺ کے اس روحانی مقام ومرتبے کو صوفیائے کرام حقیقت محمدی ﷺ، مقام محمد ﷺ، مقام محمود ﷺ، نور محمدی ﷺ اور قاب قوسین کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔

۲: تجلیات کا نزول، حقیقت میں اللہ وحدہٗ لاشریک کے ذہن کی روشنیاں ہیں۔ یہ روشنیاں کائنات میں مخلوق کسی بھی طرح برداشت نہیں کرسکتی اس لیے کہ کسی مخلوق میں براہ راست روشنیوں کو قبول کرنے کی سکت اور طاقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان روشنیوں یا تجلیات کی ناقابل برداشت توانائی کو ہلکا کرنے کے لیے مقام محمود کا تعین کیا اور مقام محمود میں اپنے محبوب ﷺ کو اپنے اور تخلیقات کے درمیان میڈیا (ذریعہ) بنایا (بحوالہ روحانی ڈائجسٹ)

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس

اعتبارِ وفا

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا۔۔۔ گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے۔۔۔ کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سجھائی تک نہیں دیتی۔

ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے۔۔۔ لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے۔۔۔ اور مان لیا جائے۔۔۔ کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے۔۔۔ اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں۔۔۔ جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں





''معاف کیجیے گا صاحب......!'' وہ شخص قریب آ گیا تھا۔ ''دراصل ہم حیاتی دادا کا گھر ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہاں آس پاس ہی کہیں رہتے ہیں لیکن گھر کا نمبر اور صحیح ایڈریس پتا نہیں، آپ کو علم ہو تو مہربانی ہوگی صاحب......''

''حیاتی دادا؟'' رواحہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''جی صاحب......'' اس شخص نے بائیں مونچھ کو چٹکی میں لے کر بل دیا۔

''لیکن اس نام کا تو کوئی شخص آس پاس نہیں رہتا۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ ہاں اس بلاک کی کسی اور اسٹریٹ میں شاید۔''

تب ہی گاڑی کے پیچھے سے دو اور شخص نکل کر پہلے والے شخص کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

رواحہ یک دم محتاط ہوا اسے بابا کی تنبیہ یاد آئی تو اس نے گاڑی کی چابی عظام کی طرف بڑھائی۔

''عظمی تم گاڑی میں بیٹھو یار۔''

عظام نے جو ابھی، الجھی نظروں سے اجنبی شخص کو دیکھ رہا تھا چونک کر رواحہ کی طرف دیکھا رواحہ کی آنکھوں میں التجا تھی...... ''پلیز۔''

عظام نے خاموشی سے گاڑی کی چابی لے لی اور لاک کھول کر بیٹھ گیا۔

''لیکن ہمیں تو خبر ملی تھی کہ حیاتی دادا یہاں اسی اسٹریٹ پر رہتے ہیں۔'' وہ شخص متجسس نظروں سے رواحہ کو دیکھ رہا تھا۔

''کمال ہے آپ کو اپنے دادا کے گھر کا علم نہیں۔'' رواحہ کی رگِ ظرافت پھڑکی تھی۔

''نہیں صاحب......'' اس کا مونچھوں کو بل دیتا ہاتھ نیچے آیا تھا۔

''میرا دادا تو کب کا مرکھپ گیا......وہ تو......''

''اچھا......اچھا جگت دادا ہیں۔'' رواحہ نے سمجھنے کے سے انداز میں سر ہلایا۔

''اوہ...... ہاں جی ایسا ہی سمجھ لیں۔''

''تو اُن حیاتی دادا کا پورا نام کیا ہے؟''

''نام......؟ نام تو یہی ہے صاحب۔'' اس نے آس پاس کھڑے دونوں آدمیوں کی طرف باری، باری دیکھا۔ دونوں نے بیک زبان کہا۔

''ہاں صاحب یہی نام ہے جی، حیاتی دادا۔''

''تو محترم مرے علم میں اس نام کے کوئی شخص نہیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے صاحب تکلیف دینے کی معافی چاہتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں جناب، مجھے خود افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔''

''اللہ حافظ صاحب۔'' وہ تینوں اشخاص اس کی گاڑی کے پاس سے گزر کر سڑک کی طرف بڑھ گئے تھے......عظام دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آ گیا تھا اور اب انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔

''عظمی......'' رواحہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''کہاں کھو گئے؟''

''کہیں نہیں۔'' عظام نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''یار میں تو ڈر ہی گیا تھا۔''

''کیوں......؟'' عظام نے پوچھا۔

''میں سمجھا تمہارے پاپا کے دشمن نے بندہ بھیجا ہے۔شکل سے کچھ خطرناک ،خطرناک سا لگا تھا۔''
''خطرناک تو نہیں کچھ عجیب سا تھا۔''
''خیر جو بھی ہو لیکن میں نے سوچ لیا تھا چاہے میری جان بھی چلی جائے تمہیں گزند نہیں پہنچنے دوں گا۔'' رواحہ نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔عظام نے متشکر نظروں سے اسے دیکھا۔
''مجھے تمہارا دوست ہونے پر فخر ہے۔'' وہ چکر کاٹ کر دوسری طرف فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ رواحہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔عظام نے دیکھا وہ تینوں ابھی تک غالباً ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ رخسار پر زخم کے نشان والا اب بھی بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنی مونچھ کو بل دے رہا تھا۔ جب وہ روڈ پر آئے تو عظام کی نظریں اس سے ملیں' وہ مسکرایا اور اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔مسکرانے سے اس کے اوپر والے دانت کی جھلک سی عظام کو نظر آئی تھی سامنے والے دانت پر سونے کا خول ایک لمحے کو چمکا تھا۔عظام پھر الجھ سا گیا۔سونے کا خول پہلے کب اس نے کسی کے دانت پر چڑھے دیکھا تھا۔اس شخص کی عمر پچاس ،پچپن سال تھی۔اس نے آج سے پہلے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔اس کا حلقۂ احباب بڑا مختصر سا تھا۔ پاپا کے دوستوں سے اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور چند دوست پھر بھی پتا نہیں کیوں اس کا ذہن اسے دیکھ کر الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی اندر کہیں مبہم سا احساس تھا کہ ''اس شخص کو میں نے کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں......؟ شاید کہیں نہیں......ایسے ہی وہم ہوا ہے مجھے۔'' اس نے سر جھٹکا اور رواحہ کی طرف دیکھا جو خلافِ معمول کچھ سنجیدہ سا لگ رہا تھا۔
''کیا بات ہے روی......تم پریشان لگ رہے ہو......یار یہ لوگ عام راہ گیر تھے۔پاپا کے دشمن نہیں ہو سکتے۔''
''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔''

''کیا......؟'' عظام نے پوچھا۔
''جواد بتا رہا تھا کہ ظفری کے فارم ہاؤس میں کوئی پارٹی ہے تو اس نے ارفی کو بھی انوائٹ کیا ہے اور وہ بھی گئی ہے۔''
''نہیں۔'' عظام کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔''ارفی کی ظفری کے ساتھ ایسی بھی دوستی نہیں ہے کہ وہ ظفری کے فارم ہاؤس کی پارٹیوں میں شریک ہو......اور پھر ارتفاع......نہیں یار وہ اس طرح کی لڑکی نہیں ہے۔ ظفری کے فارم ہاؤس پر جس طرح کی پارٹیاں ہوتی ہیں۔وہاں ارفی جیسی لڑکی کا کیا کام۔''
''ہوں......جواد بھی کنفرمڈ نہیں تھا لیکن اسے اس کی کزن نے بتایا تھا کہ ارفی اور اس کی فرینڈز بھی جا رہی ہیں۔ظفری کے فارم ہاؤس میں۔''
''یار تم ارفی سے بات کیوں نہیں کرتے ،سمجھاتے کیوں نہیں کہ وہ ظفری وغیرہ سے میل ملاقات نہ رکھے۔'' عظام ،رواحہ کی بات سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔
''تم جانتے تو ہو عظمی کہ میری اس کے ساتھ اس حد تک بے تکلفی نہیں ہے کہ میں اس کی نجی باتوں میں انٹرفیئر کروں۔'' رواحہ نے آہستگی سے کہا تو عظام نے اسے بغور دیکھا۔
''یار تم اگر ارتفاع سے محبت کرتے ہو تو تمہیں کم از کم ظفری کے متعلق ضرور گائڈ کرنا ہوگا کیونکہ جو تم ظفری کے متعلق جانتے ہو یقیناً وہ نہیں جانتی۔''
''وہ یقین کرلے گی میرا؟'' رواحہ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا اسے نہیں کرنا چاہیے؟'' عظام کا لہجہ سوالیہ تھا لیکن اس نے رواحہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی جواب دیا۔ ''میرے خیال میں تم اس سے محبت کرتے ہو تو اسے اس کا ادراک ضرور ہوگا اور وہ تمہاری بات پر یقین نہ بھی کرے لیکن سوچے گی ضرور۔''

''یار کتنی بار اعتراف کراؤ گے کہ میں ارفی سے محبت کرتا ہوں، وہ مجھے پہلے روز ہی اچھی لگی تھی جب کلاس میں ہم سب نے اپنا اپنا تعارف کروایا تھا پھر میں اسے سوچنے لگا۔ تنہائی میں جب بھی اکیلا ہوتا وہ میرے تصور میں چلی آتی تو میرا جی چاہنے لگا کہ زندگی کے سفر میں وہ میرے ہم قدم میرے ساتھ چلے عمر بھر...... تو تب مجھے لگا یہ محبت ہے تو سب سے پہلے میں نے تمہارے سامنے اعتراف کیا اور تم......'' وہ مسکرایا۔ ''ہر تیسرے چوتھے دن مجھ سے اس محبت کا اعتراف یوں کرواتے ہو جیسے تم میرے ایسے محبوب ہو جسے ہر تیسرے چوتھے دن تجدید محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''نہیں یار، میں تو بس ایسے ہی......'' عظام نے جھینپ کر بات ادھوری چھوڑ دی تو رواحہ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے، رکھے ذرا سا رخ موڑ کر عظام کی طرف دیکھا۔

''کیا تمہیں کبھی کوئی اس طرح اچھا نہیں لگا کہ تمہیں لگے کہ اچھا لگنا دراصل محبت ہے؟''

''مجھے......؟'' عظام نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ''نہیں یار......؟'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھا...... وہ اب مین روڈ پر تھے اور جواد کے ہاسٹل کی طرف جا رہے تھے۔ ''نہیں یار......'' اس نے دُہرایا۔ ''مجھے اس طرح تو کبھی کوئی اچھا نہیں لگا۔''

''حالانکہ تم تو شروع سے ہی کوایجوکیشن میں تھے۔ کیا کبھی کسی لڑکی سے تمہاری دوستی نہیں ہوئی؟'' رواحہ اسے کھوج رہا تھا۔

''کلاس فیلو لڑکیوں سے ہمیشہ سلام دعا ہی رہی لیکن اس طرح کی دوستی تو کبھی نہیں ہوئی جس کی طرف تمہارا اشارہ ہے۔''

''حالانکہ تم نظر انداز کرنے والی شے تو نہیں ہو۔'' رواحہ ہنسا۔

''ویسے عالیہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟''

''کون عالیہ......؟'' عظام کے لہجے میں حیرت تھی۔

''حد ہوگئی، بے نیازی کی، وہی عالیہ، ارتقاع کی دوست......''

''ہاں...... اچھا...... وہ۔'' عظام کے انداز پر رواحہ کو پھر ہنسی آگئی۔

''حالانکہ اس کی نظریں ہمہ وقت تمہارا تعاقب کرتی ہیں...... جواد بھی کہہ رہا تھا کہ وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے۔''

''تو......؟'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں...... یوں بھی میں نہیں سمجھتا کہ ہماری عمر محبت کے لیے مناسب ہے۔ میرے خیال میں تو رئیل محبت میچور عمر میں ہی ہوتی ہے۔ یہ تو بس یوں ہے کہ کوئی اچھا لگا تو ہم نے جانا یہ محبت ہے۔''

''تو تم میری محبت پر شک کر رہے ہو؟'' رواحہ نے اسے گھورا۔

''نہیں یار...... میں تمہاری محبت پر شک نہیں کر رہا۔ وقت کے ساتھ اس میں یقیناً پختگی آئے گی۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں کہ......''

''پاگل......'' رواحہ مسکرایا۔

''اصل محبت تو یہی ہوتی ہے۔ اس عمر میں بے اختیار بغیر سوچے سمجھے ہر بات سے بے نیاز ہو کر دل کسی کو

شریک زندگی بنانے کو مچل اٹھے۔ میچور عمر میں تو آدمی سب سوچ سمجھ کر ٹھوک بجا کر محبت کرتا ہے۔ نفع و نقصان سود و زیاں کے پلڑے میں تول کر۔''

''نہیں یار...... محبت اگر محبت ہے سودا بازی نہیں تو میچور عمر میں بھی دل بے اختیار ہوسکتا ہے۔ سود و زیاں کا حساب کیے بغیر...... ویسے اپنا، اپنا نقطہ نظر ہے لیکن......'' عظام نے رواحہ کی طرف دیکھا جو ڈرائیو کرتے ہوئے بہت دھیان سے اسے سن بھی رہا تھا۔

''محبت ناپنے کا کوئی پیمانہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوسکا۔ محبت...... کے متعلق آپ کچھ بھی پورے یقین سے نہیں کہہ سکتے...... یہ ہر دل کا اپنا تجربہ ہے، کہیں یہ میچور عمر میں دل کو اسیر کر لیتی ہے کہ آدمی سدھ بدھ بھلا بیٹھتا ہے...... اور کہیں کم عمری میں ہی گھات لگا کر دل کے اندر ایسے مسند نشین ہوتی ہے کہ آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔'' رواحہ کو اس سے عظام بڑا مدبر سا لگا اور وہ ہولے سے ہنس دیا۔

''تم اس وقت کوئی نہایت تجربے کار، عشق کی بھٹی میں جل کر کندن بنے عاشق لگ رہے ہو۔''

''ارے نہیں یار......'' عظام ہنسا۔ ''میں نے تو ابھی عشق کا عین بھی نہیں پڑھا تم یقیناً عین تک پہنچ ہی گئے ہو۔''

''پتا نہیں...... کبھی، کبھی تو میں خود بھی متذبذب ہو جاتا ہوں۔'' رواحہ سنجیدہ ہوگیا۔ ''کہ یہ محبت ہے یا محض وقتی اٹریکشن...... لیکن ارنی مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور شاید میں بابا کے بعد سب سے زیادہ اسے سوچتا ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے مائی ڈیر کہ تمہیں محبت کا بخار چڑھ چکا ہے۔ اب یہ اتر جائے گا یا مزید بڑھے گا یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔'' عظام شوخ ہوا تو رواحہ نے چڑ کر کہا۔

''اللہ کرے تمہیں بھی کسی سے محبت ہو جائے۔ ایسی کہ تم ہر لمحہ اسے سوچو اور اس کے بغیر تمہیں زندگی بے معنی لگے۔''

''یار...... بددعا تو نہ دو۔'' عظام کے لبوں سے بے اختیار نکلا لیکن نہیں جانتا تھا کہ یہ کوئی لمحہ شنید تھا اور کوئی اس کے خالی دل کو آباد کرنے والا تھا۔

عظام کا فون بج رہا تھا۔ عظام نے دیکھا جواد کی کال تھی۔

''بس پندرہ منٹ میں پہنچ رہے ہیں، تم پندرہ منٹ بعد باہر آجانا۔''

عظام نے فون بند کر کے رواحہ کی طرف دیکھا۔ جس نے ایکسلیریٹر پر تھوڑا سا دباؤ بڑھا دیا تھا لیکن سگنل تک پہنچتے، پہنچتے ریڈ بتی جل چکی تھی۔

''ایک بات پوچھوں روی، کیا تمہارے بابا کی ارینج میرج تھی یا پھر......؟'' عظام کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''میرے بابا کی لو میرج تھی...... سو فی صد لو میرج۔'' رواحہ نے اپنے سامنے والی گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی ادھوری بات مکمل کی۔

''تو تم اپنے بابا کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے ہو۔'' عظام شرارت سے اسے دیکھ رہا تھا جب رواحہ نے اسٹیئرنگ پر بازو رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں تو کیا میں اپنے بابا سے کچھ کم ہوں...... محبت کے جراثیم ورثے میں ملے ہیں مجھے۔'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور آنکھوں میں شرارت......

''لیکن تم بتاؤ کیا تمہارے پاپا کی بھی لو میرج تھی کیونکہ انہوں نے بھی میرے بابا کی طرح تمہاری ماما کے

بعد پھر شادی نہیں کی۔"

"پتا نہیں......" عظام کی آنکھوں کی چمک ایک دم ماند پڑ گئی تھی۔

"میں تمہاری طرح اپنے پاپا سے بے تکلف نہیں ہوں۔ پاپا نے کبھی مجھے بتایا نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم بہت کم اکٹھے ساتھ رہے ہیں......اور جب، جب ہم ساتھ ہوتے تھے پاپا کے پاس کرنے کے لیے اور بہت سی باتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً میری پڑھائی، میرے اساتذہ، میرے دوست، میرا فیوچر...... میری ضروریات......" وہ ہولے سے ہنسا۔ "اپنے حوالے سے تو انہوں نے بہت کم بات کی اور ماما کے متعلق بھی......بس اتنا جانتا ہوں کہ خانیوال سے لاہور آتے ہوئے ماما اور بھائی دشمن کی گولیوں کا شکار ہو گئے تھے اور چونکہ ہم جڑواں تھے اس لیے میری پیدائش پر میری نانی مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ میں تین سال کا تھا جب ماما کا انتقال ہوا اور جب چار سال کا تھا تو نانی کا بھی انتقال ہو گیا اور پاپا مجھے اپنے ساتھ واپس لے آئے۔"

"اور تمہارے نانا اور دوسرے رشتے دار ماموں، خالہ وغیرہ؟" رواحہ نے پوچھا۔

"پتا نہیں...... پاپا نے کبھی کسی کا ذکر نہیں کیا...... ایک بار بتایا تھا کہ نانا ان کی شادی کے فوراً بعد فوت ہو گئے تھے...... باقی کسی رشتے دار کا ذکر نہیں کیا۔"

"تو یار......اب پاپا کے ساتھ پورا ایک ہفتہ رہو گے تو ضرور پوچھنا...... میں تو اکثر بابا سے پوچھتا رہتا ہوں لیکن بدقسمتی سے میرے بابا اور ماما دونوں اکلوتے تھے۔ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی بابا کی...... خدا بخش نے مجھے بتایا تھا لیکن کراچی آتے ہوئے وہ سوٹ کیس چوری ہو گیا جس میں بابا کی شادی کی البم اور دوسری تصاویر تھیں...... سو میں نے تو ماما کی تصویر بھی نہیں دیکھی...... خدا بخش نے ہی بتایا تھا۔ مجھے بہت پیاری اور اچھی تھیں وہ۔" رواحہ کے لہجے میں اداسی تھی۔

"میں نے ماما کی تصویر دیکھی ہے۔ پاپا کے کمرے میں ماما کی اور بھائی کی تصاویر لگی ہیں۔" عظام نے بتایا۔

"یار پھر تو تم لکی ہو بہت، اب کے میں آیا تمہارے گھر تو مجھے دکھانا۔"

"پاپا کے بیڈروم میں ہیں اور میری ماما بھی بہت پیاری تھیں۔"

"تمہاری ماما کا انتقال یہاں ہوا تھا تمہارے کراچی سیٹل ہونے کے بعد؟" اشارہ کھل گیا تھا رواحہ نے گاڑی آگے بڑھائی تو عظام نے پوچھا۔

"نہیں...... میں بھی تمہاری طرح تین سال کا تھا جب ماما کا انتقال ہوا تھا اور اس وقت ماما امریکا گئی ہوئی تھیں اپنے والدین کے پاس...... وہاں ہی کار کے حادثے میں ان کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ بابا مجھے لے آئے تھے چونکہ میرے نانا، نانی، بابا کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اس لیے ماما کے بعد انہوں نے رابطہ نہیں رکھا لیکن میں نے سوچ رکھا ہے کہ جب میں ہائر اسٹڈیز کے لیے امریکا جاؤں گا تو ان سے ضرور ملوں گا...... کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ لوں گا ان کے پرانے ایڈریس سے...... دراصل ان کے پاس ضرور ماما کی تصاویر ہوں گی اور میں ایک بار اپنی ماما کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ آدمی کا دل چاہتا ہے ناں کہ کبھی وہ اس ہستی کو دیکھے جس نے اسے جنم دیا۔ تم تو کبھی، کبھی اپنی ماما کی قبر پر جاتے ہو اور تمہیں وہاں سکون ملتا ہوگا...... قبر کے پاس بیٹھ کر تم نے ضرور اپنی ماما سے ہولے، ہولے دل کی باتیں بھی کی ہوں گی...... لیکن میری ماما کو تو وہاں ہی دفنا دیا گیا تھا۔" لمحے بھر کے توقف کے بعد اس نے گاڑی موڑتے ہوئے کہا۔ "ویسے یار یہ ہم دونوں کی زندگیوں

میں کتنی مماثلت ہے۔ رشتوں کے معاملے میں ہم دونوں ہی یکساں غریب ہیں۔'' وہ ہولے سے ہنسا لیکن اس ہنسی سے جھلکتا کرب صرف وہی محسوس کرسکتا تھا جس نے اس کرب کو خود جھیلا ہو اور عظام نے اس کرب کو پوری شدت سے محسوس کیا۔

''لیکن تم مجھ سے لکی ہو ردی کہ تین سال کی عمر سے لے کر اب تک تم اپنے بابا سے کبھی جدا نہیں ہوئے جبکہ مجھے اپنے پاپا کے ساتھ بہت کم رہنا نصیب ہوا۔''

اور رواحہ نے بھی عظام کے اس کرب کو پوری شدت سے محسوس کیا اور اسٹیئرنگ سے لمحے بھر کے لیے اپنا ہاتھ اٹھا کر اس کا بازو تھپتھپایا۔

باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا اور وہ جواد کے ہاسٹل کے پاس پہنچ چکے تھے۔ جواد ہاسٹل کے گیٹ کے باہر ہی کھڑا ان کا منتظر تھا۔ رواحہ نے گاڑی روک کر پچھلا دروازہ کھولا تو جواد دروازہ کھول کر بیٹھ گیا......اور بیٹھتے ہی اس نے جو پہلی بات کی وہ ارتقاع کے متعلق تھی۔

''یار ردی، ارفی نہیں جاسکی ظفری وغیرہ کے ساتھ، میری کزن نے بتایا ہے کہ وہ اور عالیہ واپس آگئی تھیں۔ ارفی کی مما کی طبیعت خراب ہوگئی تھی شاید...... عالیہ نے اسے بتایا ہے۔''

اور رواحہ نے یوں اطمینان بھری سانس لی جیسے اندر کہیں بہت دیر سے سانس اٹکی ہوئی تھی اس نے مڑ کر جواد کی طرف دیکھا۔

''پہلے کلب روڈ چلتے ہیں، مجھے کچھ بکس خریدنی ہیں پھر کہیں اور چلیں گے۔''

جواد نے سر ہلا دیا اور رواحہ نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ آن کر دیا۔ گاڑی میں عابدہ پروین کی آواز گونجنے لگی تھی۔

☆☆☆

فیروزی رنگ کی بنارسی ساڑی کا پلو درست کرتے ہوئے شاہجہان بیگم نے اپنے سامنے کھڑے شخص کی طرف دیکھا۔ جو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے مسلسل اپنی بائیں مونچھ کو بل دے رہا تھا۔

''تو تمہیں حیاتی دادا کا پتا ہی نہیں چلا؟''

''ہاں......'' سامنے کھڑے شخص نے سر ہلا دیا۔

''میں کہتا ہوں شاہجہان بیگم اس شیدے لمبے کی نظر ٹیسٹ کرواؤ۔ پتا نہیں کس کو حیاتی دادا بنا دیا۔ وہاں آس پاس اِدھر اُدھر اس نام کا کوئی بندہ نہیں رہتا۔ ویسے اتنے سالوں بعد کیا کام آپڑا حیاتی دادا سے؟'' یہ ظہورا ہی تھا جو شاہجہان بیگم سے یوں سوال جواب کرسکتا تھا ورنہ کسی اور کی جرأت نہ تھی کہ شاہجہان بیگم سے کوئی سوال کرسکتا۔ بس ظہورا ہی تھا منہ چڑھا۔

''مجھے کیا کام پڑنا تھا اس سے۔'' شاہجہان بیگم نے اس کی طرف دیکھا۔

''یوں کہو ملنے کو دل چاہا تھا۔'' ظہورا مسکرایا۔

''زیادہ بک، بک نہیں کرنے لگا تو......'' شاہجہان بیگم مڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''ویسے کیا بندہ تھا حیاتی دادا بھی۔'' اب اس کا دایاں ہاتھ دائیں طرف کی مونچھ کی طرف بڑھا۔

''کیسے بٹھے شاہ کو لمبا لٹا دیا تھا اور پھر مٹھے شاہ کی جرأت نہ ہوئی ہمارے چوبارے کی سیڑھیاں چڑھنے کی۔'' شاہجہان بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ اپنی انگوٹھیاں اتار، اتار کر پھر پہن رہی تھی۔

''سچ پوچھو تو ان دنوں یوں لگتا تھا جیسے شاہجان بیگم کا دل آگیا ہو حیاتی دادا پر۔''

ظہورا تیس پینتیس سال سے شاہجہان بیگم کے ساتھ تھا اور چوبارے کے سارے معاملات وہی سنبھالتا تھا۔ اس لیے اس کی بہت سی ناگوار باتوں کو بھی اکثر اوقات شاہجہان بیگم اگنور کر دیتی تھی۔ اس کی بات پر دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا...... لیکن پھر کان کا بندہ درست کرتے ہوئے ظہورے کی طرف دیکھا۔

''باہر دیکھ جا کر حیدر آباد سے گاڑی آگئی ہے تو لڑکیوں کو بتا دے۔''

''بات بدلنا تو کوئی تم سے سیکھے شاہجہان بیگم...... اب گاڑی کے انتظار میں سڑک پر تو کھڑا نہیں ہونا ہے۔ دروازے پر ہی آئے گی۔''

''اچھا جا چل اپنا کام کر۔'' شاہجہان بیگم بیڈ پر بکھرے زیورات سمیٹ کر جیولری بکس میں رکھنے لگی۔

''کیا سجل بھی جا رہی ہے تمہارے ساتھ؟'' وہ جاتے، جاتے مڑا۔

''ہاں...... نہیں، نہیں تو...... بس موتیا اور چنبیلی ہی جائیں گی۔''

''پر سچل سائیں نے تو کہا تھا کہ سجل بیٹا کو ضرور لانا۔'' اب کے شاہجہان بیگم کی تیوری پر بل پڑ گئے...... اس نے ایک تیز نظر ظہورے پر ڈالی تو وہ تیزی سے بولا۔

''ہاں تم جانو کس نے جانا ہے کس نے نہیں...... میں نے تو بس یاد دلایا تھا۔''

''میری یادداشت ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی ظہورے۔'' شاہجہان بیگم کا لہجہ سخت تھا ظہورا باہر نکل گیا۔ تب ہی وہ اندر داخل ہوئی' سترہ اٹھارہ سال عمر، لانبا قد، سانچے میں ڈھلا جسم، یوں لگا جیسے کمرے میں روشنی ہوگئی ہو۔ سفید ٹخنوں تک لمبا فراک، پاؤں میں سفید نگینوں والی دو پٹی کی چپل جس میں اس کے خوب صورت سفید مرمریں پاؤں...... ظہورا جو اسے آتے دیکھ کر دروازے کے باہر ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ لمحے بھر کو اس کی نگاہ جیسے اس کے پاؤں سے ہی چپک گئی اور پھر ہولے، ہولے نظریں اٹھیں۔ دائیں کندھے پر جھولتا دوپٹا، صراحی دار گردن میں گولڈ کی باریک چین اور گردن سے اوپر نگاہ چہرے کی تاب نہ لا کر جھک گئی۔ لپ اسٹک سے بے نیاز ذرا سا خم کھائے گلابی ہونٹ، لانبی خمدار پلکوں والی گھور سیاہ آنکھیں اللہ نے اسے بہت فراخدلی سے حسن کی دولت سے نوازا تھا۔

''پتا نہیں شاہجہان بیگم نے اس کے متعلق کیا سوچ رکھا ہے۔'' ظہورے نے کندھے اچکائے اور دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

وہ سجل تھی۔ پتا نہیں اس کا نام اس کی شخصیت سے میل کھاتا تھا یا شخصیت' نام سے لیکن یہ نام اس پر سجتا تھا...... اور وہ شاہجہان بیگم کی بیٹی تھی۔ اس نے دروازے کے پاس کھڑے ظہورے کی طرف نہیں دیکھا تھا اور سیدھی شاہجہان بیگم کے پاس آئی تھی۔

''اماں آپ کہیں جا رہی ہیں کیا؟''

''ہاں......'' شاہجہان بیگم نے اس کی طرف دیکھا۔

''حیدر آباد جانا ہے، سائیں سچل بادشاہ کی حویلی میں' ان کے پوتے کا عقیقہ ہے اسی کی خوشی میں...... موتیا اور چنبیلی بھی میرے ساتھ جا رہی ہیں۔'' شاہجہان بیگم نے زیورات کی صندوقچی اٹھا کر دیوار گیر الماری میں رکھ کر اسے تالا لگایا۔ اس نے سجل کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا تھا جس کا چہرہ یک دم سپاٹ ہوگیا تھا کسی بت کی طرح۔ ہر خوب صورت آنکھوں سے ایک دلگدازی کیفیت جھانکنے لگی تھی۔

''رات بھی تو یہ گئی ہوئی تھیں صبح کے قریب آئی تھیں۔ تھکی ہوئی ہوں گی۔''

''نہیں، رات صرف کرن اور سنہری گئی تھیں ملک صاحب کے ہاں گانے کی محفل تھی۔ وہ تو سو رہی ہیں۔''
شاہجہان بیگم پتا نہیں کیوں سجل سے بات کرتے ہوئے شرمندہ ہی ہو جاتی تھی..... شاید تب سے جب سے اس نے ان کے پیشے سے نفرت کا اظہار کیا تھا۔ شاہجہان بیگم نے ہمیشہ لڑکیوں سے اپنی ہی منوائی تھی لیکن سجل نے ہمیشہ اپنی منوائی تھی۔ یوں تو موتیا اور سنہری بھی اس کی بیٹیاں تھیں۔ شکل صورت میں بھی اچھی تھیں۔ موتیا تو ساری کی ساری اس پر تھی۔ اونچا لمبا قد، گورا چٹا رنگ، گول چہرہ، قدرے موٹے ہونٹ اور آنکھیں بھی بڑی، بڑی..... ہاں سنہری دبلی پتلی تھی..... اس کی ملیح رنگت میں جیسے سنہرا رنگ گھلا تھا اس لیے سب اُسے سنہری کہتے تھے ویسے اس کا نام ماہ جبیں تھا..... اور موتیا کا ماہ رخ..... کرن اور چنبیلی سگی بہنیں تھیں۔ لیکن چاروں کا خیال تھا کہ شاہجہان بیگم سجل کے حسن کی وجہ سے اس کو زیادہ چاہتی اور اس کی ہر بات مانتی ہے۔ موتیا اور سنہری نے کتنی ہی بار اس سے کہا تھا۔ ''ہمیں تو اتنی عمر میں تم نے محفل میں بٹھا دیا تھا۔ سجو کیا آسمان سے اتری ہے.....'' وہ آسمان سے تو نہیں اتری تھی لیکن شاہجہان بیگم نے سجل کے لیے کچھ اور ہی خواب دیکھ رکھے تھے اسی لیے تو چار سال کی عمر میں ہی اس نے اسے انگریزی اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ سجل شکل صورت میں نہ تو اپنی بہنوں جیسی تھی نہ اس میں شاہجہان کی مشابہت تھی۔ وہ تو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق تھی۔ شاید اپنے باپ پر گئی تھی..... اس کا باپ..... اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ جس روز حیاتی دادا نے آخری بار اس کے چوبارے کی سیڑھیاں چڑھی تھیں تو سجل ہونے والی تھی اور وہ ساری دنیا سے بیزار بیٹھی تھی۔

''واپسی کب تک ہوگی؟'' سجل کا لہجہ ہمیشہ سپاٹ ہوتا ہر جذبے سے خالی۔

''معلوم نہیں شاید کل کسی وقت، تم چلو گی؟'' اس نے یونہی پوچھا تھا۔

''میں.....؟'' سجل نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''میں بھلا کس لیے.....؟''

''یونہی رونق میلا دیکھنے کے لیے۔''

''مجھے کوئی شوق نہیں ایسے رونق میلے دیکھنے کا اور میں مارکیٹ جا رہی ہوں۔''

وہ ابھی تک کھڑی تھی پہلی بار شاہجہان کو لگا کہ وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر آئی ہے۔ اصل میں نظر لگ جانے کے خوف سے وہ اسے نظر بھر کر دیکھتی ہی نہیں تھی۔

''کیوں..... کہاں جانا ہے؟''

''کچھ کتابیں خریدنی ہیں۔''

''اچھا..... چلی جاؤ۔ موراں یا شیدے کو ساتھ لے جاؤ۔''

''موراں کو ساتھ لے کر جا رہی ہوں، شیدے کے ساتھ جا کر اپنا تماشا نہیں بنوانا مجھے۔'' وہ جانے کے لیے مڑی تو شاہجہان کو خیال آیا۔

''پیسے چاہیے ہوں گے؟''

''ہاں کچھ دے دیں، اگر ہیں تو ورنہ جتنے میرے پاس ہیں، اتنے ہی خرچ کر لوں گی۔'' شاہجہان اٹھی اور پھر سے دیوار گیر الماری کھولنے لگی۔

☆☆☆

''ممتاز خان میری بات اچھی طرح سمجھ لی ہے ناں!'' اس نے اپنے سامنے کھڑے ممتاز خان کی طرف دیکھا۔

''یس باس......'' ممتاز خان سر جھکائے مؤدب کھڑا تھا۔

''یہ آٹھ دن صرف میرے بیٹے کے لیے ہیں، کچھ بھی ہو جائے۔ ڈی ون میں آگ لگ جائے یا ڈی ٹو میں بم پھٹے......تم مجھے ڈسٹرب نہیں کرو گے۔ کوئی ملاقاتی آئے تو کہہ دینا میں ملک سے باہر ہوں۔''

''یس باس......'' ممتاز خان جانے کے لیے مڑا۔

''سنو ایک کپ کافی بھجوا دو۔'' اس نے جاتے ہوئے ممتاز خان سے کہا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ٹانگیں دراز کیں۔ وہ اس وقت لونگ روم میں تھا اور اس نے فان کلر کا آرام دہ شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ ڈی ٹو میں...سیمو اور منیر کے ولسن کے باس سے ملاقات کے متعلق رپورٹ دے کر آیا تھا۔

ڈی ون اور ڈی ٹو ڈیفنس میں بگ باکے ٹھکانے میں سیمو وغیرہ کی رہائش تھی......چونکہ بگ با کسی ڈیل کے سلسلے میں دبئی جا چکے تھے۔ اور سیمو مسلسل ان سے رابطے میں رہتا تھا......سو سیمو سے تفصیل جاننے کے بعد اگر بگ با چاہتے اور ضروری سمجھتے تو اس سے رابطہ کر لیتے ورنہ بگ بانے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک ہفتہ اسے ڈسٹرب نہیں کریں گے، وہ یہ آٹھ دن سکون سے اپنے بیٹے کے ساتھ گزارے...... بگ با کی یہ بات اسے بہت پسند تھی کہ وہ ہمیشہ اس کے دل کی آرزو جان لیا کرتے تھے۔ اب بھی اس کی بیزاری اور اندر چھپی خواہش کو جان لیا تھا اسی لیے تو آٹھ دن کے لیے اسے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ ڈی ون سے آنے والی گاڑی نے اسے ولسن کے ہوٹل پہنچا دیا تھا، ولسن بہت تپاک سے ملا تھا اور پھر اسے ایرک کے کمرے میں پہنچا کر چلا گیا تھا۔ ایرک ہی غالباً اس کا باس تھا۔ ایرک بھی ولسن کی طرح بہت تپاک اور گرم جوشی سے ملا تھا لیکن اسے اس کی آنکھیں کسی لومڑی کی آنکھوں کی طرح لگیں۔ جن سے مکاری جھلکتی تھی...... ''میں ایرک......''

''ثمر حیات......'' اس نے بھی اپنا تعارف کروایا تب ہی ایک لڑکا ٹرے میں دو گلاس رکھے اندر آیا...... وہ ویٹر تو نہیں لگتا تھا۔ غالباً ساتھ والے کمرے سے آیا تھا اور ایرک کا ذاتی ملازم تھا۔

''بیئر پلیز......''

''نو تھینکس......'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

''اوہ......'' ایرک نے ہونٹ سکیڑے۔

''تو تم نہیں پیتے......اورنج جوس'' پھر اس نے لڑکے سے کہا جو فوراً ہی دروازے سے باہر نکل گیا۔

''تم مسلمان......'' اس نے تنفر سے ہونٹ سکیڑے۔

''تمہارے مذہب میں یہ حرام ہے۔'' اس نے گلاس اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''لیکن جانتے ہو۔'' وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔ ''تمہارے اس پاکستان سمیت کئی اسلامی ممالک اس حرام شے کے بڑے امپورٹر ہیں۔'' وہ ہنسا تھا اور لڑکا جو اورنج جوس کا گلاس لے کر آ گیا تھا اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''خیر یہ میرا ٹاپک نہیں ہے۔ ہمارے لیے تو اچھا ہے کہ تم سب مسلمان ہمارے ہی رنگ میں رنگ جاؤ۔''

اس نے اپنے گلاس سے گھونٹ بھرا۔ اب اس کی نظریں ثمر حیات پر تھیں جو ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا اور ایرک کی نظریں جیسے اس کے اندر اتر رہی تھیں۔ گھونٹ، گھونٹ پیتے ہوئے اس کی نظریں ثمر حیات کے چہرے پر جمی رہیں...... پھر گلاس خالی کر کے اس نے شیشے کی ٹاپ والی کافی ٹیبل پر رکھا اور اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

''بہتر تھا کہ جلیل خان خود آتا تو آج ہی ڈیل ہو جاتی۔''

''میں یہاں ڈیل کرنے نہیں آیا مسٹر ایرک۔'' ثمر حیات نے اورنج جوس کا بھرا گلاس صرف ایک گھونٹ لے کر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

''ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کو کس قسم کا تعاون چاہیے۔''

''ہم تمہارے ملک میں فلاحی کام کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس ملک کے عوام کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہمارے پاس بہت پلان ہیں، ہمیں بہت سارے معاملات میں تمہارے تعاون کی ضرورت ہے لیکن.. فی الوقت یہاں کام کرنے کے لیے کچھ مقامی لوگوں کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جلیل خان ہمارے لیے کچھ نڈر نوجوانوں کا انتظام کردے۔ ان کو بہترین تنخواہ اور دوسری سہولیات دی جائیں گی۔ خدانخواستہ کسی حادثے کی صورت میں ان کے زیرِ کفالت افراد کی پوری مدد کی جائے گی اور اس کام کے لیے جلیل خان کو بھی اچھا معاوضہ دیا جائے گا...... اور اس کے بعد بھی ہمیں جلیل خان کے تعاون کی ہر لمحہ ضرورت رہے گی۔''

جتنی دیر تک ایرک گفتگو کرتا رہا ولسن اندر نہیں آیا تھا...... پتا نہیں کیوں امریکن لہجے میں بات کرتا یہ شخص ثمر حیات کو پسند نہیں آیا تھا۔ تاہم اس نے کہا تھا کہ وہ بگ باکو اس کی خواہش پہنچا دے گا۔

''ہمیں یقین ہے کہ ہم اچھے دوست ثابت ہوں گے۔'' ایرک نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا...... ایرک سے رخصت ہو کر وہ باہر آیا تو ولسن ساتھ والے کمرے سے نکل آیا تھا اور پھر وہ اس کے ساتھ ہی باہر تک آیا تھا۔ جہاں سے ٹیکسی لے کر وہ ڈی ٹو گیا تھا...... اسے ایک بات سمجھ نہیں آئی تھی کہ اگر وہ فلاحی کاموں کے لیے آئے تھے تو براہِ راست حکومت سے مدد لے سکتے تھے انہیں جلیل خان یعنی بگ با کے تعاون کی ضرورت نہ تھی اس کے پیچھے یقیناً کچھ اور مقصد تھا۔ ''بہر حال مجھے کیا......'' اس نے کندھے جھٹکے۔ ''اور یہ پورا ہفتہ مجھے عظام کے ساتھ گزارنا ہے۔ اتنے سالوں میں پہلی بار اس نے عظام کے لہجے میں تشنگی محسوس کی تھی۔ اس کا بیٹا اس کے قرب کے لیے برسوں سے ترس رہا تھا۔ ان سارے بیتے سالوں میں وہ کتنے مہینے، کتنے دن اکٹھے رہے تھے اتنے کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا...... سترہ اٹھارہ سالوں سے وہ کتنی مشینی زندگی گزار رہا تھا۔ اٹھارہ سال پہلے جب فرحی نے اس کا ساتھ چھوڑا تھا تب سے...... کتنے خوب صورت دن چپکے سے گزر گئے تھے۔ عظام کا برتھ ڈے، رزلٹ، اسکول کے فنکشن، اسپورٹس ڈے، پیرنٹس ڈے۔ وہ کہیں بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ان سارے دنوں میں جب اسے عظام کے ساتھ ہونا چاہیے تھا وہ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ سارے دن عظام نے تنہا سیلیبریٹ کیے تھے۔ جب وہ اسٹیج پر انعام لینے جاتا ہوگا تو اس کی نظریں سامعین میں اسے ضرور ڈھونڈتی ہوں گی لیکن اس کے فرسٹ آنے پر تالیاں بجانے والوں میں اس کے باپ کے ہاتھ نہیں ہوتے ہوں گے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی آج سے پہلے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

صرف ایک فون کال، مبارک باد یا قیمتی تحفہ...... اس رفاقت کا نعم البدل نہیں ہو سکتا تھا جو وہ اسے دے سکتا تھا۔ لیکن نہیں دے سکا تھا۔ اس نے یقیناً عظام کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا...... ''اگرچہ عظام نے کبھی شکوہ نہیں کیا... لیکن وہ کتنا سنجیدہ اور خاموش سا ہے۔ وہ رواحہ کی طرح نہیں ہے۔ رواحہ کے پاس اپنے باپ کی رفاقت کا مان ہے۔ لیکن عظام......'' ایک گہرے دکھ کا احساس اس کے اندر اترتا چلا گیا۔ ''میں بھی عظام کی عمر میں رواحہ کی طرح تھا شوخ، شریر اور برجستہ جملے چست کرنے والا'' ایک دم بے تحاشا تھکن نے اسے جکڑ لیا اس نے سر اٹھا کر ملازم لڑکے کو کافی ٹیبل پر کافی کا مگ رکھتے دیکھا اور سر کی جنبش سے اسے جانے کا اشارہ کر کے پھر صوفے کی پشت پر سر ٹیکتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

تھکن بے تحاشا تھکن جیسے اس کی رگوں میں اتر آئی تھی۔ ''میں بہت تھک گیا ہوں...... ایک ایسی زندگی گزارتے ہوئے جو نارمل لوگ نہیں گزارتے۔ دوسروں سے مختلف زندگی...... میں بگ باس سے التجا کروں گا وہ اب مجھے آزاد کردے۔ میں ایک نارمل زندگی جینا چاہتا ہوں۔ ایک عام سے آدمی کی زندگی۔ ہر خوف، خطرے، لڑائی جھگڑے سے پاک سیدھی سادی زندگی۔ ایک گھر جس میں عظام میں اور اس کی بیوی بچے...... اور میں وہ سب انجوائے کروں جو نہیں کرسکا...... وہ سب دیکھوں جو نہیں دیکھ سکا۔ عظمیٰ کے بچوں کی...... مسکراہٹیں...... ان کی شرارتیں، ان کی قلقاریاں...... عظام کی بیوی کی چوڑیوں کی کھنکناہٹ گھر میں اِدھر سے اُدھر سنائی دے اور وہ فرحی کی طرح کچن میں سے جھانک جھانک کر کہے۔

''پاپا پلیز میں چائے بنانے لگی ہوں آپ ذرا منے کا خیال رکھیے گا کہیں اٹھ نہ جائے۔'' فرحی یوں ہی تو کرتی تھی...... کبھی اسے گود میں دے جاتی۔

''ذرا سنبھالنا اسے ثمر میں جلدی سے اس کا فیڈر بنا لاؤں۔''

''میں بس ابھی آئی تم اِدھر ہی رہنا ثمر کہیں وہ اٹھ کر بیڈ سے اترنے کی کوشش میں گر نہ جائے۔'' کبھی سو رہا ہوتا تو پاس سے نہ اٹھنے کی تاکید کرتی۔

''فرحی......'' اس کے لبوں سے سسکی نکلی۔

فرحی کی محبت نے اس کی زندگی میں جیسے رنگ ہی رنگ بھر دیے تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ لائبریری، لان، کینٹین، لان ہر جگہ وہ اکھٹے نظر آتے تھے...... فرح اور ثمر...... ثمر اور فرح بیسٹ کپل آف دا ایئر...... ان کے گروپ کے دوستوں نے انہیں ٹائٹل دے رکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں اتنے گم تھے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور دو سال بیت گئے۔ ثمر نے فائنل پیپر ز دیے اور فرح کا بی ایس سی آنرز مکمل ہوا تو دونوں جیسے کسی خوب سے چونکے تھے۔

''اب کیا ہوگا فرحی میں تمہارے بغیر کیسے......؟'' اس کی محبت تو اس کے رگ وپے میں سرایت کرچکی تھی۔

''ہر کہانی کے آخر میں کیا ہوتا ہے ثمر...... ہیرو ہیروئن کی شادی اور دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔''

''لیکن ہر کہانی کا انجام ایسا نہیں ہوتا۔'' اس روز وہ بہت قنوطی اور افسردہ ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ فرح کے اصرار پر اپنی پسندیدہ جگہ کا پر کینٹل میں آئے تھے۔

''کیا خبر یہ ہماری آخری ملاقات ہو فرحی۔''

''خدا نہ کرے......'' فرحی نے بے ساختہ کہا تھا۔ ''ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے ثمر تم اس طرح کی باتیں کیوں کرتے ہو۔''

''دو سال تک ہم نے حقیقت سے آنکھیں بند کیے رکھی ہیں فرح۔''

''اور حقیقت کیا ہے؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''یہ کہ ہمارے درمیان بہت فاصلے ہیں اور ہم نے جو خواب مل کر دیکھے ہیں وہ محض خواب ہی ہیں...... ہماری منزل کبھی ایک نہیں ہوسکتی۔'' وہ بہت پریشان تھا۔

''ہماری منزل ایک ہی ہے ثمر......'' اس کے برعکس وہ بہت پُراعتماد تھی۔

''میں جانتا تھا ہمارا ساتھ ناممکن ہے پھر بھی میں نے...... پھر بھی کیوں نہیں خود کو روکا...... اور تمہیں بھی۔ اب اس مقام پر آکر بچھڑ جانا کتنا مشکل ہوگا ناں...... ہے ناں فرح......؟''

''تم اس طرح کی فضول باتیں کیوں کر رہے ہو۔ ثمر مجھے صرف اپنی اور تمہاری تعلیم ختم ہونے کا انتظار تھا اور آج مجھے تم سے یہی کہنا تھا کہ اپنے والدین کو ہمارے ہاں بھیجو۔''

''لیکن میرے اور تمہارے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے فرحی۔ تمہارے والدین میرا پروپوزل قبول نہیں کریں گے۔''

''تم اتنی منفی باتیں کیوں سوچ رہے ہو ثمر...... کیا کمی ہے تم میں...... ایجوکیٹڈ ہو...... اسمارٹ ہو، اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ اپنا گھر ہے، ایک روشن مستقبل تمہارے سامنے...... ایک لڑکی کے والدین اس کے علاوہ اور کیا دیکھتے ہیں۔''

''یہ تمہارا خیال ہے فرحی...... میرے طبقے کے والدین شاید یہی سب کچھ دیکھتے ہیں۔ لیکن تمہارے طبقے میں صرف یہی کچھ نہیں دیکھا جائے گا...... ایک اور چیز بھی دیکھی جائے گی۔ دولت اور اسٹیٹس...... اور اس پلڑے میں جب میرا وزن کیا جائے گا تو میرا پلڑا تو آسمان سے جا لگے گا۔''

''فار گاڈ سیک خواہ مخواہ اپنا اور میرا دل نہ جلاؤ۔ میں آج ممی سے تمہارے متعلق بات کروں گی اور تم دو دن تک اپنی اماں اور ابا کو بھیج دینا۔'' وہ مسکرائی تھی۔ ''تم جانتے ہو ناں ڈیڈی، ممی اور بھائی مجھے کتنا چاہتے ہیں اور پھر آپی ہیں وہ تو میری سپورٹ ضرور کریں گی۔'' وہ بہت پُر امید تھی لیکن وہ نہیں اس کا دل تو جیسے بار، بار ڈوب رہا تھا اور وہ حسرت سے فرحی کو دیکھتا تھا۔

''میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا ہوں اور......''

''میرے ابا کی اچھرہ میں چھوٹی سی کپڑے کی دکان ہے۔'' فرح نے ہنس کر اسی کی طرح نقل کر کے اس کی بات مکمل کی تھی... اس روز پہلی بار وہ فرح کو اپنے ساتھ گھر لایا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کا گھر دیکھ لے۔

''اماں یہ فرح......اور فرح یہ میری اماں......''

اس نے تعارف کروایا تھا اماں کی آنکھوں میں بس ایک لمحے کے لیے حیرت اتری تھی اور پھر انہوں نے مسکرا کر اسے گلے لگالیا تھا اور اس کی خاطر تواضع میں مصروف ہوگئی تھیں۔

''تم خود کو غریب اور اپنے گھر کو چھوٹا سا گھر کہتے ہو جبکہ تمہارے اس چھوٹے سے گھر میں ضروریاتِ زندگی کی ہر شے موجود ہے۔ حتیٰ کہ وُڈ، دوا ے کی لگے ہوئے ہیں جبکہ میں تو تمہارے ساتھ جھونپڑے میں بھی رہ سکتی ہوں۔'' فرح نے جانے سے پہلے کہا تھا۔

''اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟''

''اس سے بھی زیادہ......'' وہ مسکرائی تھی۔ اور فرح کو اس کی گاڑی تک چھوڑ کر جب وہ واپس آیا تو اماں برآمدے میں اپنے تخت پر سوچ میں ڈوبی بیٹھی تھیں۔ وہ ان کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گیا تھا۔

''میں نے تو تمہارے لیے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ شکر ہے میں نے اپنے منہ سے بات نہیں نکالی تھی ورنہ شرمندگی ہوتی۔''

''اماں......آپ......؟'' ثمر نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

''ماں ہوں تمہاری۔'' وہ مسکرائی تھیں۔

''آپ کو کیسی لگی وہ؟'' اس نے اماں کی مسکراہٹ سے شہ پا کر پوچھا تھا۔

''بہت اچھی لگی...... بہت پیاری پر کاکے۔'' (کبھی کبھی لاڈ میں آکر وہ اسے ایسے ہی بلاتی تھیں) ان کی

مسکراہٹ مدھم پڑ گئی تھی۔

''وہ تو بہت بڑے اور امیر گھر کی لگتی ہے۔تم نے بتایا تھا ناں اپنی گاڑی میں آئی ہے۔''

''جی اماں لیکن وہ...... اور میں......'' وہ جھجک کر خاموش ہو گیا تھا۔

''سمجھتی ہوں کاکے کوئی لڑکی یوں ہی کسی لڑکے کے ساتھ اس کے گھر نہیں چلی آتی پر......''

''اماں......'' اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ ''آپ اس کے گھر میرا رشتہ لے کر جائیں۔اس نے کہا ہے، اس نے اپنی ممی سے بات کر لی ہے۔آپ ابا سے بات کر لیں۔'' وہ جانتا تھا اماں کو اعتراض نہ ہوا تو وہ ابا کو منا لیں گی۔

''کب جانا ہے۔'' انہوں نے پوچھا تھا۔

''آپ ابا سے پوچھ کر بتا دیجیے گا کب جا سکتے ہیں، میں فرح کو بتا دوں گا۔'' اور جب فرح کا فون آیا کہ وہ اپنے اماں ابا کو بھیج دے۔وہ انہیں اس کے گھر چھوڑ کر آیا تو وقت کا کاٹنا مشکل ہو گیا...... بہت دیر تو نہیں ہوئی تھی۔وہ لوگ جلدی واپس آ گئے تھے لیکن اسے لگا تھا جیسے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا ہو...... جیسے صدیاں بیت گئی ہوں...... وہ برآمدے میں ہی ٹہل رہا تھا جب وہ گھر آئے تھے۔اماں کے چہرے سے جھلکتی افسردگی دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا تھا۔ابا اس کے پاس برآمدے میں رکے تھے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''آسمان کی طرف دیکھنے پر بعض اوقات اپنے سر کی ٹوپی نیچے گر جاتی ہے بیٹا اس لیے اتنی ہی اونچائی پر دیکھنا چاہیے کہ سر کی ٹوپی سلامت رہے۔'' اس کا سادہ دل باپ جس کی پورے محلے میں عزت تھی اور جس کی پیشانی پر سجدوں کا نشان دمکتا تھا کیا وہ اس کی بے عزتی کا باعث بنا تھا؟ کیا فرح کے ممی، ڈیڈی نے ان کی توہین کی تھی؟ اس نے پریشان ہو کر اماں کی طرف دیکھا تھا جو برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی اپنی چادر تہ کر رہی تھیں۔ابا سر جھکائے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

''انہوں نے انکار کر دیا؟''

اماں نے گہری سانس لی تھی۔

''اماں پلیز سب بتائیں کیا ہوا، کیا کہا انہوں نے؟'' وہ بے چینی سے انگلیاں مروڑ رہا تھا۔

''کیا انہوں نے آپ کے ساتھ......''

''تم اگر یہ سمجھ رہے ہو کہ انہوں نے ہمیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تو ایسا کچھ نہیں ہوا...... انہوں نے مہذب انداز میں ہمیں یہ جتاتے ہوئے انکار کر دیا کہ ہمارا اور ان کا کوئی میل نہیں اور ہمیں یہاں آنے سے پہلے اپنی اور ان کی حیثیت کے متعلق سوچ لینا چاہیے تھا اور سچ ہی تو کہا ہے انہوں نے کاکے، ہمارا ان کا بھلا کیا جوڑ......'' ہاں بھلا ان کا اور اس کا کیا جوڑ...... یہ بات وہ جانتا تھا پھر بھی...... پھر بھی اس نے خود کو اور فرح کو نہیں روکا...... روک بھی کیسے سکتا تھا بھلا ان جذبوں پر بند باندھے جا سکتے ہیں...... لیکن اب...... اب کیا ہو گا...... کیا وہ فرح کے بغیر جی پائے گا...... اس کا دل کٹ رہا تھا۔

اماں اٹھ کر اندر چلی گئی تھیں شاید ابا کی دلجوئی کرنے اور اسے سنبھلنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا تھا...... وہ تو ایک دم تہی دامن ہو گیا تھا بالکل خالی...... اس کے مستقبل کے سارے خوابوں میں تو فرح اس کے ساتھ تھی۔وہ نہ جانے کتنی دیر وہاں ہی بیٹھا رہا پھر برآمدے میں رکھے فون کی گھنٹی بجی...... اس نے فون اٹینڈ کیا...... دوسری طرف فرح تھی۔

''فرحی......'' اس کی سسکی نکل گئی۔اسے لگا جیسے وہ رو پڑے گا۔

''سنو ثمر مایوس مت ہونا۔ میں نے ممی سے کہا تھا کہ وہ ڈیڈی کو بتا دیں کہ میں ثمر حیات کو پسند کرتی ہوں ۔لیکن شاید ممی نے نہیں بتایا۔ ورنہ ڈیڈی کبھی انکار نہیں کرتے ۔ میں تو سمجھ رہی تھی انہوں نے رسمی طور پر سوچنے کا وقت لیا ہوگا لیکن بھابی نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے صاف انکار کر دیا...... اماں، ابا سے سوری کر لینا میری طرف سے لیکن تم پریشان مت ہونا۔ ڈیڈی اس وقت گھر پر نہیں ہیں جیسے ہی وہ گھر آتے ہیں میں ان سے بات کرتی ہوں......اور مجھے یقین ہے ڈیڈی کبھی انکار نہیں کریں گے۔''

فرح ہمیشہ یقین کے دیپ اس کی ہتھیلیوں پر رکھ دیتی تھی جب کبھی وہ مایوس ہوتا تھا اور اب بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا......اس کی مٹھی میں بند امید کی تتلیاں مرتے ، مرتے پھر سانس لینے لگی تھیں۔ ڈوبتا دل تیرنے لگا تھا وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

''فرح کتنی پُرامید ہے لیکن میں...... پتا نہیں کیوں رہ رہ کر مجھے کیوں خیال آتا ہے کہ جدائی مقدر ہوئی۔'' وہ کتنی ہی دیر تک بیڈ پر نیم دراز سوچتا رہا پھر گھبرا کر باہر آ کر تخت پر لیٹ گیا۔ اماں کچن میں مصروف تھیں۔ غالباً رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ ابا مسجد چلے گئے تھے۔ وہ وہاں ہی تخت پر لیٹا اماں کو کام کرتے دیکھتا رہا۔ اماں نے دو تین بار کچن سے جھانک کر اسے دیکھا تھا۔ قریب آ کر اس کا ماتھا بھی چھوا تھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دیتی ہوئی کچن میں چلی گئیں۔ وہ ابھی تخت پر ہی لیٹا ہوا تھا۔ جب ابا مسجد سے آ گئے اور اس کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گئے۔

''سوری ابا......!'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا۔'' وہ ہلکا سا مسکرائے تھے۔ ''بیٹوں کے رشتوں کے لیے دس گھروں میں جانا پڑتا ہے اور پھر ہر جگہ سے مثبت جواب تو نہیں ملتا ناں...... اگلے زمانے میں تو ماؤں کی جوتیاں گھس جاتی تھیں تب کہیں جا کر من پسند بہو ملتی تھی۔''

وہ جانتا تھا ابا اسے احساسِ ندامت سے نکالنا چاہتے ہیں۔

''ہمارے پیارے نبی ﷺ نے فرمایا ہے پہلے اپنے قبیلے میں رشتہ تلاش کرو۔ نہ ملے تو پھر اپنی بستی میں بستی میں نہ ملے تو پھر کہیں باہر تلاشو...... وہ کون سا شعبہ ہے جس کے متعلق نہیں آپ ﷺ کی تعلیمات سے رہنمائی نہ مل سکے۔'' ان کا لہجہ آپ ﷺ کی محبت اور عقیدت سے بھیگنے لگا تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔

''تمہارے دادا کہا کرتے تھے کہ رشتہ ہمیشہ برابر والوں میں کرنا چاہیے۔'' قدرے توقف کے بعد انہوں نے پھر کہا۔

''نہ اپنے سے برتر لوگوں میں اور نہ کمتر......''

''اپنے سے برتر لوگوں کے سامنے تمہاری نظریں ہمیشہ جھکی رہیں گی......اور کمتر لوگ تمہارے سر پر چڑھ کر بولیں گے۔ ان کی تنگ گتھیاں پھٹ جائیں گی۔ اماں مرحومہ بھی کہتی تھیں۔ ایسے لوگوں کے پیٹ کی بھوک ہی ختم نہیں ہوتی۔''

''جی ابا......!''

وہ اس کا بازو تھپتھپا کر چلے گئے۔

''محبت بے اختیار ہوتی ہے۔'' لیکن یہ کیسی بے اختیاری تھی جس نے اس کے والدین کو شرمندہ کروا دیا تھا۔ ''اب نہیں۔'' اس نے فیصلہ کیا تھا۔ ''اب میں اپنے والدین کو ہرگز فرح کے گھر نہیں بھیجوں گا۔ ہاں فرح کو خود یہ جنگ لڑنا ہوگی۔'' اسے فرح کے فون کا انتظار تھا لیکن کتنے ہی دن گزر گئے تھے، فرح نے فون نہیں کیا تھا۔

شاید اس کے ڈیڈی نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ وہ بہت دلگرفتہ تھا اور محبت کھودینے کے عذاب سے گزر رہا تھا۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ اماں، ابا اسے یوں خاموش اور اداس دیکھتے پر کچھ نہیں کہتے تھے۔ جانتے تھے کہ زخم گہرا ہے اور بھرنے میں وقت لگے گا۔ کبھی کبھی اماں اس کے پاس آکر بیٹھ جاتی تھیں اور پھر ادھر اُدھر کی لایعنی باتیں کرکے دل بہلانے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ چپ چاپ سنتا رہتا۔ امتحان کے بعد ابا نے اسے فارغ رہنے تک دکان پر بیٹھنے کو کہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ جب تک اسے جاب نہیں ملے گی وہ ان کا ہاتھ بٹائے گا بلکہ جاب کے دوران جو بھی فارغ وقت ملے گا وہ ان کی مدد کرے گا۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور اسے ہی ان کی مدد کرنا تھی...... لیکن ابا نے اسے اس کا وعدہ یاد نہیں دلایا تھا وہ بھی اسے سنبھلنے کا وقت دے رہے تھے...... لیکن سنبھلنا کیا اتنا آسان تھا...... کیا وہ فرح کو بھول سکتا تھا؟ شاید نہیں، کبھی نہیں...... فرح نے کہا تھا۔

''میرا اعتبار کرنا ثمر...... میری محبت کا اور میری وفاؤں کا۔ تم نہیں تو کوئی نہیں۔'' اسے یقین تھا وہ اپنے ڈیڈی کو منالے گی۔ پھر بھی کبھی کبھی وہ بے یقین ہونے لگتا...... وہ بے چین ہوجاتا اور رات، رات بھر جاگ کر گزار دیتا...... اس روز بھی وہ بہت بے چین تھا...... گھبراہٹ بڑھی تو کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا اور پھر صحن میں ٹہلنے لگا۔ اماں، ابا کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ شاید وہ سو گئے تھے۔ رات کا ایک بج رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی اور دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ اوپر آسمان پر اکا دکا ستارے چمک رہے تھے۔

''کیسی تاریک رات ہے میرے دل کی طرح۔'' اس نے ایک نظر آسمان پر ڈالی تھی اور پھر صحن میں ٹہلنے لگا۔ برآمدے میں ہلکی روشنی کا بلب جل رہا تھا۔

''تو اس ساری محبت کا انجام یہی ہونا تھا آخر تم بھی ہار گئیں فرح...... حالانکہ تم کہتی تھیں ایسا کچھ نہیں ہوگا ثمر...... ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے قدم سے قدم ملا کر زندگی کی آخری سانسوں تک ساتھ چلیں گے۔'' وہ دل ہی دل میں فرح سے مخاطب تھا...... اور ایسا کئی دنوں سے ہو رہا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے فرح سے ہم کلام ہوجاتا...... کبھی دل میں اور کبھی آہستہ آواز میں اس سے باتیں کرنے لگتا تھا کبھی اس کی آواز بلند بھی ہوجاتی تو وہ چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ اس وقت بھی اس کی آواز قدرے بلند ہوئی تھی تو وہ چونک کر رک گیا تھا۔ اس وقت وہ بالکل گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ جب اسے لگا کہ کوئی گیٹ کے باہر کھڑا آہستہ آواز میں بات کر رہا ہے۔ اس نے کان لگا کر سنا۔

''ہاں ٹھیک ہے تم جاؤ، یہ ہی گھر ہے۔''

''یہ آواز...... یہ تو فرح کی آواز ہے لیکن اس وقت...... رات کے اس پہر...... شاید میرے کان بجنے لگے ہیں...... کیا میں پاگل ہو رہا ہوں......'' وہ گھبرایا تب ہی گیٹ پر ہلکی سی دستک ہوئی پھر بغیر سوچے سمجھے اس نے گھبرا کر گیٹ کھول دیا۔ سامنے فرح کھڑی تھی۔

''فرح تم......؟'' وہ حیران سا اسے دیکھنے لگا۔ فرح نے پہلے مڑ کر دیکھا۔ گلی کے کونے سے ایک رکشا مڑ رہا تھا۔ اس نے فرح کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔

''ہاں میں...... ثمر میں گھر چھوڑ آئی ہوں۔'' وہ ششدر سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے پھٹ گئی تھیں لیکن وہ گیٹ کے پاس سے غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ فرح نے اندر قدم رکھا اس کے کندھے پر ایک شولڈر بیگ تھا...... اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔

''رات کے اس پہر تم......؟'' اس نے مڑ کر برآمدے میں دیوار پر لگے کلاک کی طرف دیکھا اور پھر

اماں، ابا کے کمرے کے دروازے کی طرف...... جہاں خاموشی تھی...... لمحے بھر کے لیے اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ کیا اماں، ابا کو جگائے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے فرح کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا...... اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا...... وہ دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے میں آیا تھا فرح بھی اس کے پیچھے اسی انداز میں چلتی اس کے کمرے میں آئی تھی۔

''فرح یہ سب کیا ہے...... تم اس طرح؟'' اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ اس نے دروازہ تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا تھا اور اب فرح کی طرف دیکھ رہا تھا...... اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

''فرحی پلیز بتاؤ کیا ہوا ہے تم اس طرح رات کے اس پہر کیوں آئی ہو؟'' وہ ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا۔

''ڈیڈی نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے ثمر'' اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

''اور یہی نہیں انہوں نے میری شادی بھی طے کر دی ہے۔ ٹھیک دو دن بعد میرا نکاح ہے۔''

''اور تم نے گھر چھوڑ دیا۔''

''ہاں میں اور کیا کرتی ثمر......''

''کیا گھر سے بھاگنا ہی اس مسئلے کا حل تھا؟'' دکھ سے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''تو اور کیا حل تھا......؟ بتاؤ!'' اس نے سوالیہ نظروں سے ثمر کو دیکھا جو تاسف اور افسوس سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ فرح ایسا کر سکتی ہے...... لیکن وہ ایسا کر سکتی تھی...... گھر بھر کی لاڈلی، ضدی، اپنی ہر بات منوانے والی کی جب یہ بات پوری نہیں ہوئی تو...... اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

''تم نے اچھا نہیں کیا فرحی......''

''میں تمہارے علاوہ کسی اور کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں نے تم سے محبت کی ہے میں بے وفا نہیں ہوں۔''

''لیکن یہ کیسی وفا ہے فرحی...... میرے ساتھ وفا نبھاتے ہوئے تم اپنے والدین اپنے بھائی بہن کو بھول گئیں، جنہوں نے تمہیں ہتھیلی کا چھالا بنا کر پالا، ان کی وفا کا بھی تو کوئی تقاضا ہوگا ناں فرحی...... مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم اس طرح یوں سب کا اعتبار کرچی، کرچی کر دو گی...... لیکن میں اپنے پرہیزگار باپ کا سر نہیں جھکا سکتا نہ اپنی سادہ دل ماں کا مان اور اعتبار توڑ سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تمہارے بغیر میرے لیے زندگی بے معنی ہوگی...... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں فرحی نہیں جانتا ہوں تمہارے بغیر کیسے جی پاؤں گا لیکن میں نہیں چاہتا کہ تمہارے والدین کو کل کی صبح شرمندہ ہونا پڑے۔ چلو اٹھو ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ شاید انہیں خبر بھی نہ ہو جس خاموشی سے تم گھر سے نکلی تھیں... اسی خاموشی سے چلی جانا...... شکر ہے تم آتے ہوئے کسی غلط آدمی کے ہاتھ نہیں لگیں۔ رکشے والا کوئی شریف آدمی تھا جو یہاں تک چھوڑ گیا تمہیں ورنہ......''

''میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی ثمر......'' اور اس کے آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے تھے۔

''یہ موت اس موت سے ہزار گنا اچھی ہوگی فرحی... جو تمہارے ممی، ڈیڈی ہر روز مریں گے۔ وہ اذیت جو میری جدائی میں تم برداشت کرو گی اس اذیت سے کئی ہزار گنا کم ہوگی جو ہر روز تمہارے والدین کو جھیلنا پڑے گی۔'' وہ بات کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور فرحی بھی مزید کچھ کہے بغیر کھڑی ہو گئی تھی۔

تب ہی باہر کھڑی اماں نے دروازہ کھول دیا تھا وہ پانی پینے کے لیے اٹھی تھیں...... اور اس کے کمرے کے

دروازے کو دیکھ کر اُدھر آ گئی تھیں پر باتوں کی آواز سن کر باہر ہی رک گئی تھیں۔

''اماں آپ......'' ثمر پریشان ہو گیا تھا۔

''بیٹا جلدی کرو اسے چھوڑ آؤ......اور فرحی بیٹی تم نے غلط کیا لیکن خیر ابھی دیر نہیں ہوئی۔ صبح ہونے سے پہلے گھر پہنچ جاؤ گی تو ماں، باپ کی عزت رہ جائے گی۔ ورنہ یاد رکھو جو عورت رات کے اندھیرے میں گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتی ہے وہ قدم اسے پاتال میں لے جاتا ہے۔'' وہ گیٹ تک دونوں کے ساتھ آئی تھیں۔ ثمر نے بائیک گھسیٹ کر گیٹ سے باہر نکالی تھی تا کہ ابا جاگ نہ جائیں۔

''فی امان اللہ......'' اماں کی آنکھوں میں ثمر کے لیے فخر تھا۔ مان تھا لیکن پتا نہیں کیوں ان کی آواز لرز گئی تھی اور گیٹ بند ہوتے ہی ثمر کا دل لمحے بھر کو ڈوب سا گیا تھا......بے اختیار اس نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ گیٹ بند ہو چکا تھا۔ رات کے دو بجے وہ فرحی کو واپس گھر چھوڑنے جا رہا تھا اور فرحی کی دبی، دبی سسکیوں کی آواز اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔

''پلیز فرحی اس طرح مت آنسو بہاؤ، تمہارے آنسو مجھے بہت تکلیف دے رہے ہیں۔'' اس نے ذرا رفتار کم کر کے کہا تھا۔ تب ہی دائیں طرف والی گلی سے وہ تین افراد نکلے تھے۔

''اے......کون ہو؟'' اس نے ان کی طرف دیکھا اور فل اسپیڈ سے بائیک بھگانے لگا۔

اس کا فون نہ جانے کب سے بج رہا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے جیسے چونک کر سر اٹھا کر پاس پڑے فون کی طرف دیکھا تھا۔ ماضی کی یادیں اسے ہمیشہ یوں ہی گرد و پیش سے بے خبر کر دیتی تھیں۔ فون خاموش ہو کر پھر بجنے لگا تھا۔ اب کے وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ہاتھ بڑھا کر فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف عظام تھا۔

''کیسے ہو میری جان؟'' عظام کی آواز نے جیسے اس کے نڈھال وجود میں جان ڈال دی تھی۔

''شام کا پروگرام کنفرم ہے ناں......اور وہ ایک ہفتے کا بھی۔'' عظام کو جیسے یقین نہیں تھا۔

''ایک دم کنفرم ہے......میں انشاء اللہ لنچ گھر پر کروں گا۔ تم چاہو تو لنچ تک گھر آ جاؤ۔ میں گاڑی بھجوا دیتا ہوں۔''

''نہیں پاپا......ہم اس وقت شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں رداحہ اور جواد کو کچھ بکس خریدنی ہیں اور پھر لنچ ہم باہر ہی کریں گے......آپ لنچ پر انتظار مت کیجیے گا۔''

''اوکے انجوائے کرو۔'' فون بند کر کے اس نے کافی کی طرف دیکھا جو ٹھنڈی ہو چکی تھی اور اس پر باریک سی تہہ جم گئی تھی۔ اس نے ملازم لڑکے کو آواز دے کر دوبارہ کافی لانے کے لیے کہا اور پھر صوفے کی پشت پر سر رکھ کر ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

☆☆☆

بابر آستینوں کے بٹن بند کرتا بہت خوشگوار موڈ میں ڈائننگ روم میں داخل ہوا تھا......ایمل ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی ناشتا لگوا رہی تھی۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بابر نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے بیٹھتے اس کی طرف دیکھا۔

''آر یو......اوکے......؟'' ایمل سر ہلا کر ملازمہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ٹھیک ہے نازو......دو فرائی انڈے بنا لو اور دو انڈوں کا آملیٹ......سلائس گرم کر لینا اور ایک پراٹھا بنا لینا، افنان شوق سے کھاتا ہے۔ رات کا قیمہ گرم کر لینا اور ہاں ارفی اور افنان کو بھی بلا لو ناشتے کے لیے۔''

نازو چلی گئی تو وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی بابر اس دوران بہت غور سے اسے دیکھتا رہا۔ ایمل نے بلاوجہ ہی

پلیٹیں اور گلاس دوبارہ سے اِدھر اُدھر رکھے۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ایمی؟'' ایمل نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر بنا بولے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ناراض ہو...... سوری یار رات میں بے حد تھکا ہوا تھا تو شاید کچھ غلط سلط بول دیا۔ ایک تو یہ شادیوں کے فنکشن اس قدر تھکا دینے والے ہوتے ہیں۔ اوپر سے تمہارا رونا، دھونا گلے، شکوے اور بلاوجہ کی پریشانی اور وہم...... I am extremely sorry اب منہ پھلا کر مت بیٹھو بچے بھی کیا سوچیں گے۔'' ایمل نے پلکیں جھپک کر آنسوؤں کو بہنے سے روکا۔ وہ رات ارتقاع کی وجہ سے بہت ڈسٹرب تھی۔ اگرچہ افنان نے اسے بہت تسلی دی تھی لیکن پھر بھی اس کا دل کٹ رہا تھا اور اسے بابر پر غصہ تھا۔ سارا قصور بابر کا ہے اگر وہ اس طرح ہر وقت ارتقاع کی بے جا حمایت نہ کرتا تو ارتقاع اسے بھی اہمیت دیتی...... لیکن وہ تو اسے اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ ماں ہی نہیں سمجھتی۔ وہ رات بیڈ روم میں آئی تو بابر فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے فون آف کر کے تکیے کے پاس رکھا اور اس کی طرف دیکھا۔

''اتنی دیر کر دی تم نے آخر ارتی سے کیا مذاکرات شروع کر دیے تھے تم نے...... وہ واپس آ گئی نہیں گئی ظفری کے فارم پر بس بات ختم......''

''بات ختم نہیں ہوئی بابر۔'' اس کے رکے ہوئے آنسو پھر بہہ نکلے تھے۔

''وہ مجھے ماں نہیں سمجھتی۔ کہتی ہے میں اس کی سوتیلی ماں ہوں اور یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا بابر...... آپ نے اس کی بے جا حمایت کر کے اسے مجھ سے دور کر دیا ہے۔''

''بچے یا ماں کے قریب ہوتے ہیں یا باپ کے...... افنان تمہارے زیادہ قریب ہے اور ارتی میرے قریب ہے۔ میری جان ہے وہ...... تم خوامخواہ جیلس مت ہوا کرو۔''

''میں کیوں جیلس ہوں گی۔ مجھے تو خوشی ہوتی ہے کہ آپ اس سے اتنی محبت کرتے ہیں لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ اس کی ہر غلط ضد مت مانیں...... اب یہ ظفری کے فارم ہاؤس......''

''اوہ خدا کے لیے بس کرو اب ظفری...... ظفری۔ کیا قیامت آ گئی جو میں نے اسے اجازت دے دی۔'' وہ ایک دم غصے میں آ گیا تھا۔ ''بند کرو یہ رونا دھونا اور خوامخواہ مجھے موردِ الزام مت ٹھہراؤ۔ اگر وہ تمہیں سوتیلی ماں سمجھتی ہے تو اس کے ساتھ تم نے کہیں نہ کہیں سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا ہوگا۔ تب ہی تو اس نے تمہیں سوتیلی ماں سمجھا ورنہ، بس اب لائٹ آف کرو اور سو جاؤ اور اگر رونا دھونا ہے تو کسی اور روم میں چلی جاؤ۔'' اس نے بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے کروٹ بدل لی تھی۔

''السلام علیکم...... مما، پپا......'' افنان مسکراتا ہوا ڈائننگ ایریا میں آیا تو ایمل نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وعلیکم السلام۔'' دونوں کے لبوں سے اکٹھا نکلا تھا۔

''یہ ارتی نہیں آئی ابھی تک کیا یونیورسٹی نہیں جانا؟'' اس نے بیٹھتے بیٹھتے پوچھا۔

''نہیں جی، باجی کہہ رہی ہیں انہیں ناشتا نہیں کرنا۔'' ٹیبل پر آملیٹ کی پلیٹ رکھتے ہوئے نازو نے بتایا تو ایمل مضطرب سی ہو گئی جبکہ بابر نے جتاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''لگتا ہے وہ ابھی تک ناراض ہے میں منا کر لاتا ہوں... اپنی لاڈو کو۔''

''پپا آپ رہنے دیں، میں جاتا ہوں۔'' افنان باہر نکل گیا۔

''پلیز ایمل اب کوئی بات کر کے میرا مطلب ہے نصیحت وغیرہ کر کے اس کا موڈ نہ خراب کرنا۔'' ایمل نے جواب نہیں دیا اور نازو کے ہاتھ سے قیمے کا ڈونگا لے کر ٹیبل پر رکھا۔

''آپ ناشتا شروع کریں ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' اس نے سلائس پر مکھن لگا کر بابر کی پلیٹ میں رکھا...... اور فرائی انڈا اس کی طرف بڑھایا کہ وہ ہمیشہ فرائی لیتا تھا۔

''نہیں آج بس تھوڑا سا آملیٹ لوں گا۔'' پھر کانٹے کی مدد سے آملیٹ اپنی پلیٹ میں رکھا۔'' ابھی تک ناراض ہو۔ سوری تو کرلیا ہے ناں۔ مجھ سے کبھی ناراض مت ہونا ایمل...... ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔''

''میں ناراض نہیں ہوں آپ سے، بس مجھے دکھ ہوا تھا آپ نے اس سے پہلے اس طرح اس لہجے میں کبھی بات نہیں کی مجھ سے۔''

''کہا... ناں بہت تھکا ہوا تھا۔ بس کبھی کبھی آدمی ایسے ہی شیطان کے بہکاوے میں آجاتا ہے تو معاف کردیا ناں تم نے۔'' اس نے سر ہلا دیا اور اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آکر ٹھہر گئی تب ہی افنان، ارتقاع کا ہاتھ پکڑے اندر آیا اور مسکرا کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

''لیجیے آپ کی شہزادی کو لے آیا ہوں۔'' ارتقاع کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور ہمیشہ والی شوخی مفقود تھی۔ وہ خاموشی سے آکر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ایمل کے دل کو کچھ ہوا۔'' خواہ مخواہ میں نے اس کا دل دکھایا۔'' اس کے دل میں لمحے بھر کے لیے خیال آیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سوچا'' نہیں اس نے اسے واپس بلا کر ٹھیک کیا۔ ابی کہہ رہا تھا ظفری کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ دو تین روز میں خود ہی اس کا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔'' حسب معمول اس نے سلائس پر بٹر لگا کر افنان اور ارتقاع کی پلیٹ میں رکھے لیکن ارتقاع نے وہ پلیٹ ایک طرف کردی اور سادہ سلائس اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

''ارے میری گڑیا آج چپ، چپ کیوں ہے اور یہ آج تیار بھی نہیں ہوئی، کیا یونیورسٹی نہیں جانا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟'' ایمل کے لبوں سے بے اختیار نکلا لیکن اس نے ایمل کی بات کا جواب نہیں دیا اور سر جھکا کر چھوٹے، چھوٹے نوالے لینے لگی۔ ایمل کی آنکھیں جھلملا گئیں اور چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ افنان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی اور مسکرا کر خوشگوار لہجے میں کہا۔

''محترمہ آج آرام کرنے کے موڈ میں ہیں۔ بستر سے اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے اٹھایا ہے کہ بھئی پڑھائی سے چھٹی بے شک کرلو لیکن ناشتا تو ہمارے ساتھ کرلو ورنہ پاپا کے حلق سے نوالہ بھی نہیں

اترے گا تمہارے بغیر۔''

''یہ تو ہے۔'' بابر مسکرایا۔

''چلو اچھا ہے آج اپنی مما کو کمپنی دینا۔ خوب گپ شپ لگانا ماں بیٹی۔'' ارتقاع نے یک دم سر اٹھا کر بابر کی طرف دیکھا۔

''پاپا آج مجھے عالیہ کی طرف جانا ہے، وہ بھی یونیورسٹی نہیں جا رہی پلیز آفس جاتے ہوئے مجھے چھوڑ دیجیے گا۔ میری گاڑی رات عالیہ لے گئی تھی۔''

''اوکے تم ناشتا کر کے تیار ہو جاؤ۔'' بابر نے اس سے کہا اور پھر ایمل کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں عالیہ کے گھر جانے پر تو اعتراض نہیں ہے ناں؟'' ایمل کا رنگ مزید پھیکا ہوا جبکہ ارتقاع نے بے حد عجیب نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور پھر بابر سے پوچھنے لگی۔

''آپ کو تو اعتراض نہیں ہے ناں پاپا؟''

''ارے نہیں میری جان، مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔ عالیہ تمہاری دوست ہے۔''

''تو پھر مجھے کسی اور کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔ ''میں تیار ہو کر آتی ہوں۔''

ایمل ساکت بیٹھی تھی۔ بابر نے نازو کو آواز دے کر چائے لانے کے لیے کہا اور ایمل کی طرف دیکھا۔

''ابھی بچی ہے بالکل، غصے میں ہے ناں تو اس لیے ایسا کہہ رہی ہے۔ تم پلیز اپنا موڈ نہ خراب کرنا ایک دو روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔ میں سمجھاؤں گا اس سے کہوں گا کہ تم سے سوری کر لے۔''

''اور اسے سوری کرنا بھی چاہیے پاپا۔ اسے ماں کے مقام اور رتبے کو سمجھنا چاہیے۔'' افنان کو اس کے رویے سے دکھ پہنچا تھا اور وہ ماں کے احساسات کو سمجھ رہا تھا۔

ٹیبل پر پڑا بابر کا فون بج رہا تھا۔ بابر فون اٹھا کر ڈائننگ روم سے باہر نکل گیا تو افنان ماں کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مما پلیز آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ دو دن، تین دن، چار دن کتنے دن ناراض رہے گی آپ سے۔ خود ہی دماغ درست ہو جائے گا اس کا۔''

''تم نے دیکھا تھا افی وہ کس طرح مجھے دیکھ رہی تھی جیسے..... جیسے میں اس کی دشمن ہوں۔''

''کہا ناں مما ٹھیک ہو جائے گی خود ہی۔'' افنان نے ماں کا بازو تھپتھپایا تب ہی بابر اندر آیا۔

''مجھے ایک ضروری کام سے لاہور جانا ہے ابھی۔ وہاں آفس میں کچھ مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیسا مسئلہ؟'' ایمل نے پوچھا۔

''معلوم نہیں، شمسی صاحب کا فون آیا تھا کہ فوراً آ جاؤ۔''

''آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ آپ وہاں کا آفس ختم کر دیں جب سارا بزنس وغیرہ یہاں ٹرانسفر کر لیا ہے تو یہ ہیڈ آفس ابھی تک وہاں کیوں رکھا ہوا ہے۔ ہر دس بارہ دن بعد جانا پڑتا ہے آپ کو۔''

''ضروری ہے کہ وہاں بھی ہمارے قدم جمے رہیں۔ یہاں کراچی کے حالات کا تو ویسے بھی کچھ پتا نہیں۔ کیا خبر کبھی پھر واپس جانا پڑ جائے۔''

''پتا نہیں آپ کو اچانک لاہور چھوڑ کر کراچی سیٹل ہونے کی کیا سوجھی تھی۔'' ایمل بڑبڑائی۔ بابر، افنان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''انی تم ارنی کو عالیہ کے گھر ڈراپ کر دینا یا اگر تمہیں دیر ہو رہی ہو تو ڈرائیور کو بلوا لو آفس سے۔''

''نہیں، میں ڈراپ کر دوں گا۔'' افنان نے چائے کا کپ اٹھایا۔

''آپ کتنے دن رہیں گے لاہور میں؟'' ایمل نے پوچھا۔

''چھ سات دن تو لگ ہی جائیں گے۔ اب جاؤں گا تو اور بھی کئی کام نبٹا دوں گا پلیز اسی حساب سے میرا اٹیچی تیار کر دو۔'' ایمل خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈائننگ روم سے باہر نکل گئی۔ افنان نے دیکھا وہ لاؤنج سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''پاپا آپ کو ارنی کو ڈانٹنا چاہیے تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ اسے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں' اسے بتانا چاہیے تھا کہ اسے مما کی اجازت کی بھی ضرورت ہے۔ پاپا وہ مما کو بالکل اہمیت نہیں دیتی۔'' افنان بے حد سنجیدہ تھا۔

''اوہ یار۔'' بابر ہنس دیا۔ ''یہ تم کیا اپنی ماما کی طرح باتیں کرنے لگے ہو۔ کیا پہلے کبھی ارنی نے بدتمیزی کی ہے ایمل سے؟''

''نہیں' بدتمیزی نہیں کی کبھی لیکن ہمیشہ جس بات سے ماما نے منع کیا آپ سے منوالی۔''

''ہاں یہ تو ہے لیکن میری بیٹی بدتمیز نہیں ہے انی بس ابھی وہ بہت ہرٹ ہوئی ہے ناں اس لیے۔''

''لیکن اس نے ماما کو بھی ہرٹ کیا۔ آپ کو پتا ہے ماما رات یہاں لاؤنج میں بیٹھی رو رہی تھیں کیونکہ ارنی نے رات بھی ان سے بدتمیزی کی اور انہیں کہا کہ وہ اس کی سوتیلی ماں ہیں۔''

''پتا ہے یار تمہاری ماما نے بتایا ہے مجھے لیکن وہ ایسا رویہ رکھتی کیوں ہے ارنی کے ساتھ کہ اسے لگے کہ وہ اس کی سوتیلی ماں ہے۔ وہ اس طرح کا سلوک کیوں نہیں کرتی اور ایسا رویہ کیوں نہیں اپناتی کہ ارنی کو لگے وہ ہی اس کی سگی ماں ہے۔''

افنان، ارتقاع کو آتے دیکھ کر کچھ کہتے کہتے رک گیا اور لاؤنج سے ڈائننگ روم میں آتی ارتقاع کے چہرے کا رنگ یک دم بدلا تھا۔ وہ بے شک ایمل کی نسبت بابر سے زیادہ قریب تھی لیکن یہ انکشاف کہ ایمل اس کی سگی ماں نہیں ہے اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ دل کے اندر عجیب سی ٹوٹ پھوٹ مچی تھی۔ رات اس نے ناراضی اور غصے میں کہہ تو دیا تھا کہ وہ اس کی سوتیلی ماں ہیں لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ ایمل ہی اس کی ماں ہے بس وہ پاپا کے مقابلے میں سخت ہیں۔ ظفری کے فارم ہاؤس پر نہ جاسکنے کا اسے بے حد دکھ تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ ظفری کو بہت پسند کرتی تھی بس اسے وعدہ پورا نہ کرنے کا دکھ تھا جو اس نے ظفری اور نازش کے ساتھ کیا تھا۔



نازش ظفری کی کلاس فیلو اور دوست تھی۔ وہ بہت غصے میں اپنے بیڈ روم میں آئی تھی لیکن کچھ دیر بعد جب اس کا غصہ کم ہوا تھا وہ ایمل سے سوری کرنے کے لیے ان کے بیڈ روم کی طرف آئی تھی اور نیم وا دروازے سے اس نے بابر کو بیڈ پر بیٹھے اور پھر کہتے سنا تھا۔

''اگر وہ تمہیں سوتیلی ماں سمجھتی ہے تو تم نے اس کے ساتھ کہیں نہ کہیں سوتیلی ماں جیسا سلوک کیا ہوگا۔''

اور وہ یہاں سے ہی پلٹ آئی تھی۔ شک پر یقین کی مہر لگ گئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک روتی رہی تھی اور اب پھر پاپا ایسی ہی بات کر رہے تھے کہ ''ایمل ایسا رویہ کیوں نہیں اپناتی کہ ارفی کو لگے وہ۔ اس کی سگی ماں ہے۔ گویا وہ میری سگی ماں نہیں ہیں۔'' جو تھوڑا بہت تذبذب تھا وہ بھی ختم ہوا یقین کی ایک اور لہر۔ اس نے بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا اور وہاں سے ہی آواز دی۔

''پاپا میں تیار ہو کر آ گئی ہوں۔'' بابر اور افنان ڈائننگ روم سے نکل آئے۔ افنان نے نازو کو آواز دے کر برتن سمیٹنے کو کہا اور دو منٹ میں آنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بابر نے غور سے ارتفاع کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں پھیلتی نمی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔

''سوری بیٹا مجھے ابھی لاہور جانا ہے۔ میں نے پتا کیا ہے کہ ایک گھنٹے بعد کی فلائٹ مل جائے گی مجھے۔ تم انی کے ساتھ چلی جاؤ وہ تمہیں ڈراپ کر دے گا میں نے اسے کہہ دیا ہے۔''

''پاپا میں بھی آپ کے ساتھ لاہور چلوں؟'' یک دم اس کے لبوں سے نکلا۔ ''آپ مجھے ساتھ لے جائیں ناں۔'' بابر نے لمحہ بھر سوچا۔

''اس وقت تو مشکل ہے گڑیا۔ اگلی بار ضرور لے جاؤں گا پھر تمہاری پڑھائی کا بھی تو حرج ہوگا۔''

''ہم کبھی لاہور نہیں گئے پاپا، نانا جان، نانو خود ہی دو تین بار آئے آپ مجھے نانا جان کے گھر چھوڑ دیجیے گا اور خود اپنا کام کر لیجیے گا...... نہیں بلکہ مجھے سیالکوٹ دادو کے پاس بھجوا دیں یا چاچو کے پاس میں وہاں رہ لوں گی اتنے دن۔'' اسے ایک دم ہی خیال آیا تھا کہ اگر ایمل سوتیلی ہیں تو نانا، نانو بھی تو اس کے کچھ نہیں لگتے تو بس چاچو کے گھر۔ اس نے جیسے بابر کی بات سنی نہ تھی اور لاڈ سے کہہ رہی تھی۔

''پرامس اگلی بار۔'' بابر نے اس کا گال تھپتھپایا اس کا فون بجا تو اس نے کان سے لگا لیا۔

''اوہ..... ہاں ٹھیک ہے میری سیٹ بک کروا دیں نذیر صاحب۔ میں بس آدھ گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔'' وہ بات کرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

ایمل نے اس کے کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان اٹیچی میں رکھ دیا تھا اور اب اٹیچی بند کر رہی تھی کہ بابر بیڈ روم میں آیا۔

''میں نے آپ کا سامان رکھ دیا ہے۔ کپڑے، شیو وغیرہ کا سامان کچھ اور تو نہیں رکھنا؟''

''نہیں تھینکس، نازو کو کہو یہ نیچے گاڑی میں رکھوائے۔'' بابر نے ہاتھ میں پکڑا موبائل بیڈ پر رکھا اور واش روم میں چلا گیا۔ ایمل، نازو کو بلانے کے لیے بیڈ روم سے نکلنے ہی لگی تھی کہ بیڈ پر پڑا فون بج اٹھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے فون اٹھا لیا۔ اسکرین پر عنبرین کا نام چمک رہا تھا۔

''عنبرین؟'' اس نے دہرایا اور فون آن کر دیا۔

''ہیلو بابر.....!'' دوسری طرف ایک نسوانی آواز تھی۔

جاری ہے

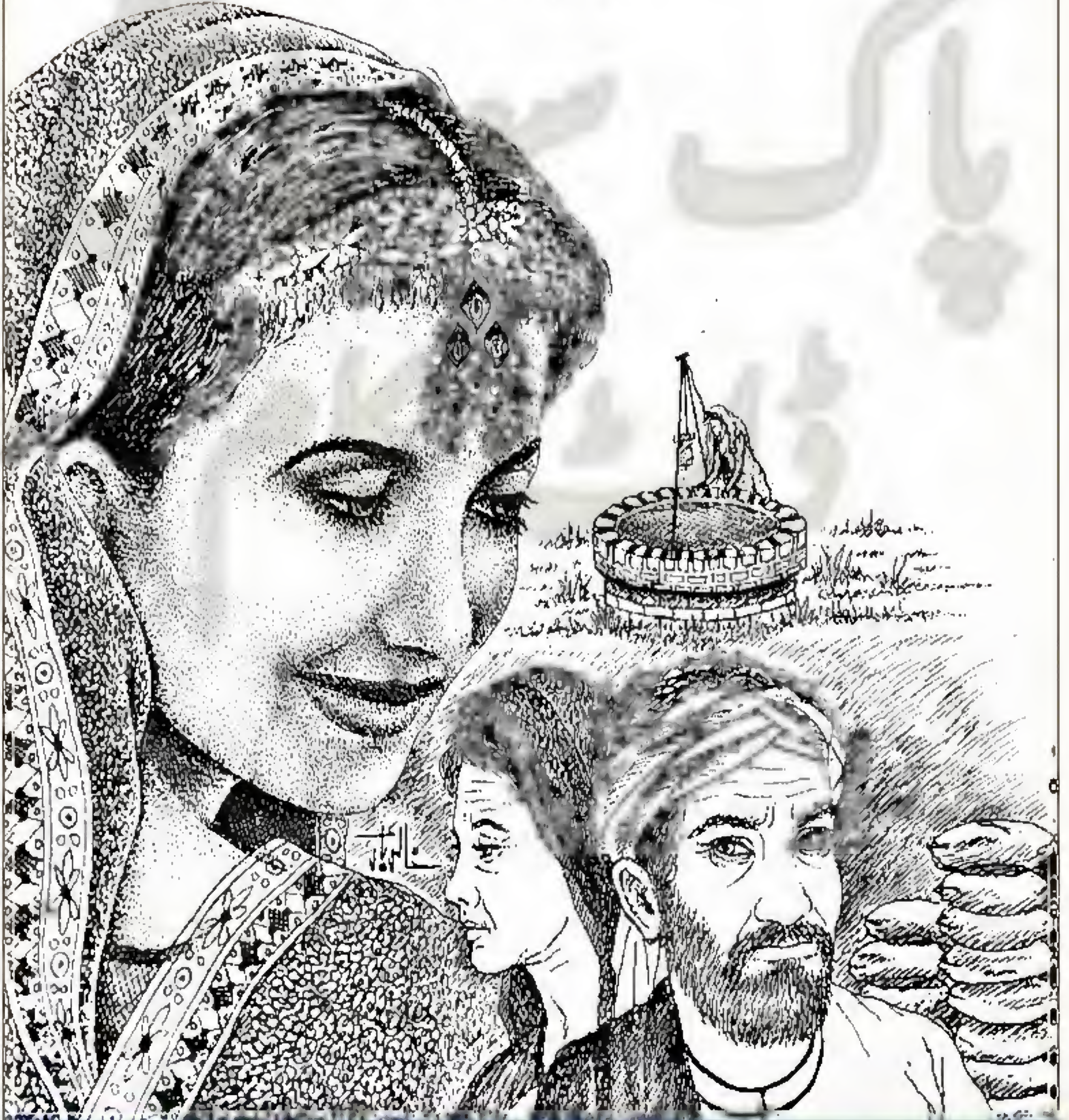
غربت

ریحانہ حسن

لالٹین اور دیے کی مدھم روشنی میں سوکھے ہوئے رخسار کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور پھیلا ہوا منہ بے حد خطرناک معلوم ہو رہا تھا۔ کوٹھڑی کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں پر بیٹھے، بیٹھے اس نے پانچویں بار آواز نکالی۔

''گلاب کی ماں! گلابو تیار ہو چکی ہے کہ نہیں؟''

''ہو رہی ہے۔'' اندر کمرے سے ایک



نقاہت بھری آواز آتی۔ ان سب آوازوں کے پس منظر سے ایک ہی مطالبہ سنائی دے رہا تھا۔ اور وہ تھا روٹی، روٹی، روٹی کا مطالبہ، سوکھا ہوا جسم باسی تباسی روٹی کھانے کے لیے بھی بے قرار تھا۔ ہر گھر کا یہی حال تھا۔ بھوک سے نڈھال بچے رو، رو کر سو جاتے تھے۔ گاؤں میں قحط پڑنے کے بعد سے جو درخت کھانے کے قابل تھے وہ بھی اتنے لوگوں کی وجہ سے ختم ہو چکے تھے۔ گھاس پھوس کا نام ونشان باقی نہ رہا تھا۔ لوگ جائیں تو کدھر جائیں اور کھائیں تو کس سے مانگ کر کھائیں۔

زمیندار نے اپنا گودام تو غلے سے بھر رکھا تھا۔ پر گاؤں کے لوگوں پر اسے بالکل ترس نہ آتا تھا۔ اگر کوئی فریاد کر بھی لیتا تو یہ کہہ کر کہ ”میں نے گاؤں والوں کا ٹھیکا تو نہیں لیا ہے جو ہر کسی کا خیال رکھوں۔“ ٹال دیتا تھا۔

یہ تو بس اچانک کرم دین پر زمیندار کا کرم ہو گیا تھا جو اس نے کرم دین کی بیٹی کے بدلے اناج کے تین بورے اسے دینے کا وعدہ کر لیا تھا اور کرم دین کی بیٹی بھی کوئی معمولی چیز تھوڑی تھی جو وہ اس کا انتخاب کر رہا تھا۔ گاؤں بھر کی تمام لڑکیوں کو چھوڑ کر گلابو کا انتخاب کیا اور اس سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کوئی کرم دین سے وہ اسے خرید تھوڑی رہا تھا۔ بس گلاب تھی ہی اتنی حسین کہ اس کے بدلے تین بورے اناج کرم دین کو دے رہا تھا جو کم تھا۔ یہی تو موقع تھا۔ کرم دین کو رام کرنے کا...... جب پیٹ ہڈیوں سے چپک جائے اور منہ سے آواز تک نہ نکل رہی ہو تو کون سے ماں، باپ زمیندار جیسے ادھیڑ عمر بوڑھے کا رشتہ قبول کرنے سے انکار کریں گے۔

کرم دین نے بھی انہی حالات سے مجبور ہو کر...... زمیندار کا رشتہ قبول کر لیا تھا کہ ان حالات میں وہ کیا اپنی بیٹی کے لیے کوئی اچھا لڑکا تلاش کر سکتا تھا؟ اور بھوک سے دم توڑتے بچے اپنی بہن کی شادی کی خوشی میں اگرچہ شریک تو نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ڈھول کی تھاپ پر نہ تو سکھیاں گانے گا کر اپنی چہیتی گلابو کو رخصت کریں گی اور نہ اس بات کی خبر گاؤں کے غریبوں کو معلوم ہو گی۔ وہ تو اس رات کے اندھیرے اور سناٹے میں اپنی بیٹی ... زمیندار کے حوالے کر رہا تھا۔ ہر آنکھ سے چھپا کر کہ کوئی یہ نہ دیکھ لے کہ زمیندار، کرم دین کی کوٹھڑی میں اناج کے بورے رکھوا رہا ہے۔ ابھی گلابو مکمل طور پر تیار بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ماں نے اسے سمجھانا شروع کر دیا۔

”دیکھ بیٹی تو نصیبوں والی ہے جو زمیندار کے گھر اس کی جورو بن کر جا رہی ہے، اللہ تجھے بھاگوں والی بنائے۔ دیکھ تو اسے پریشان مت کرنا جو وہ کہے اس کی ہر بات مان لینا، وہ تجھے خوش رکھے گا۔ تو مالکن ہو گی تیرے ہاتھوں میں وہ سونے کے کنگن بھی پہنائے گا... بس تو ماں، باپ کی لاج رکھنا، اگر تو اس گھر میں رہتی تو قحط سے مر جاتی تیرا یہ گلاب سا وجود مزید کملا جاتا لیکن اب تو زندہ رہے گی، آباد رہے گی میری لاڈلی۔ ہمارا کیا ہم تجھے بھلانے کی کوشش کریں گے۔“ یہ کہتے ہوئے گلابو کی ماں بھل بھل رونے لگی۔ چودہ سالہ گلابو تو ابھی اتنی سمجھدار بھی نہ تھی کہ ماں کی باتوں کا کوئی جواب دے سکتی۔ وہ تو اچھے، اچھے کپڑے اور زیور دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ کسی دیس کی شہزادی کی طرح زندگی میں پہلی بار لالی سرخی لگا کر تیار ہوئی تھی۔ ماں کو یوں بکھرتے دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئی۔ اور اس کی گود میں سر رکھے وہ خاموشی سے جیسے سوچنے لگی یہ کیسی شادی ہے کہ جس میں ڈھول تاشے ہیں نہ ہی سکھیوں کے گیت سنگیت...... ماں نے فوراً اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے سامنے دیوار پر بنے طاق پر سے سرمہ

اٹھایا اور گلابو کی نشیلی آنکھوں میں ڈال دیا۔ ماں یہ بات خوب اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی لاڈلی سرمہ لگانے کے بعد جو حسن پاتی ہے اس میں صداقت اور سادگی دونوں دیکھنے کو ملتی ہے۔

الغرض چودہ، پندرہ برس کی یہ معصوم سی لڑکی اپنے ماں، باپ کا آنگن سونا کر کے صرف ان کی خاطر ایک ایسے شخص کے پاس عمر بھر کے لیے جا رہی تھی جو کبھی اس کے دل میں جگہ نہیں بنا سکتا تھا کیونکہ وہ گلابو کے جوڑ کا نہیں تھا مگر یہ بات اس کی ماں بخوبی جانتی تھی کہ زمیندار گلابو کے باپ کی عمر کا نہیں، نزدیک کا تو ضرور ہوگا۔

ماں، ماں تھی اسے یہی ایک غم کھائے جا رہا تھا جبکہ باپ اس بات سے بے خبر صرف پیچھے رہ جانے والوں کی بھوک مٹانے کا سوچ رہا تھا اور گلاب...... وہ معصوم ان تمام باتوں سے بے فکر دل میں ایک انجانی خوشی کا احساس لے کر رخصت ہو رہی تھی کہ اب تو اس کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن زمیندار پہنائے گا اور وہ اس گاؤں کی مالکن بن جائے گی اور پھر کبھی بھوک اسے یا اس کے گھر والوں کو نہ ستائے گی۔

اِدھر گلابو کے جاتے ہی دو تین بندے کرم دین کے گھر میں تانگے سے غلے کی بوریاں پہنچا گئے تھے۔ پالکی روانہ ہو چکی تھی۔ کرم دین کی بیوی نے جلدی، جلدی باجرے کے آٹے سے روٹیاں بنائی اور پودینے کی چٹنی بنائی اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ محلے والوں کو کوئی آہٹ نہ سنائی دے۔ روٹی کھاتے، کھاتے دونوں میاں، بیوی کی آنکھیں نم ہوگئیں شاید یہ دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ ہم نے آج اپنی بیٹی کو دوسرے گھر رخصت کیا ہے یا بیچ دیا ہے؟ صرف اور صرف تین بوری اناج کی خاطر......؟

☆☆☆

''گلابو یہ لو مٹھائی تم کو پسند ہے ناں؟ اور یہ کیا تیری اماں نے تیرے ہاتھ پر مہندی کیوں نہیں لگائی؟ تجھے کیا مہندی پسند نہیں؟'' سجے سجائے کمرے میں داخل ہونے کے بعد زمیندار نے بڑے پیار سے کہا۔ گلابو نے قریب آتے عمر رسیدہ زمیندار کو دیکھ کر سرمہ لگی آنکھیں حیرت سے پھیلائیں۔ معصوم اپنے دل میں سمجھے بیٹھی تھی کہ جس سے شادی ہوئی ہے وہ تو زمیندار کا بیٹا ہوگا، وہ کیا جانتی تھی کہ باپ نے اپنے آپ کو پیش کر دیا تھا۔ وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ زمیندار کے قریب آتے ہی گلابو پلنگ سے کود کر دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی اور بڑی معصومیت سے کہنے لگی۔

''اچھا پہلے میرے سونے کے کنگن مجھے دو۔ پھر تمہاری بات سنوں گی۔''

''سونے کے کنگن، کیسے کنگن......؟'' وہ بولا۔

''وہی کنگن جو تمہارے پاس ہیں، ماں نے کہا تھا کہ تم مجھے کنگن دو گے۔'' زمیندار ذرا پس و پیش کے بعد اٹھا۔

''اچھا، اچھا ہاں، ہاں دے دوں گا ضرور دوں گا مگر پہلے تم میری رانی تو بن جاؤ۔'' معصوم گلابو کو سب کچھ سمجھ آ گیا تھا، اماں نے اسے سونے کے کنگن کی لالچ میں زمیندار کو چپکے سے سونپ دیا تھا۔ وہ بری طرح گھبرا رہی تھی، سوچ رہی تھی کہ باپ نے اس کی شادی کیسے اتنی عمر کے آدمی سے کر ڈالی تھی اور پورے گاؤں میں اس نے گلابو کو ہی کیوں چنا تھا۔ وہ اپنے الھڑ حسن کی رعنائیوں سے خود بے خبر تھی۔

''تم ایک بار میری بانہوں میں آ کر میری رانی بن جاؤ، تمہیں سونے کے کنگن بھی بنوا دوں گا اور ان تین بوری اناج کے علاوہ اور بوریاں بھی تیرے گھر بھیج دوں گا۔'' زمیندار یہ کہتے ہوئے کسی بھوکے کتے کی طرح اس پر حملہ آور ہونے ہی والا تھا کہ گلابو چیخ پڑی۔

''کیا میرے ماں، باپ نے تین بوری اناج کے بدلے میرا سودا کیا ہے؟''

''ہاں، ہاں ایک طرح کا سودا سمجھ لے کیونکہ تیری ماں نے تیرے ہاتھوں پر مہندی لگائی ہے نہ گاؤں والوں کو بتایا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ لالچی اور خود غرض ہیں۔ اب تیرے دماغ میں بات آئی۔'' زمیندار قدرے غصے سے بولا۔ وہ ایک دم گلابو کے اداس چہرے کو دیکھ کر پھر گویا ہوا۔ ''تیری رچاہت میں مجھے ہر شرط منظور ہے۔ اری بھلی مانس تو، تو بہت خوش نصیب ہے کہ پورے گاؤں سے میں نے ایک تیرا انتخاب کیا ہے۔ ورنہ مجھے لڑکیوں کی کیا کمی ہے کسی کے باپ کو ایک بوری اناج پر بھی راضی کر سکتا تھا۔ مگر صرف تیری خاطر، ہاں صرف تیری خاطر تیرے باپ کو پوری تین بوری اناج کی دی ہیں۔''

''دیکھ زمیندار منہ سنبھال لے...... ورنہ۔'' گلابو نے اپنی جانب بڑھتے زمیندار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو جھوٹا ہے میرے بابا ایسے نہیں ہیں کہ تجھ جیسے بوڑھے سے صرف تین بوری اناج کی خاطر میرا سودا کر دیں گے۔'' گلابو نے زمیندار کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

''اری جا بڑی آئی بابا والی۔'' زمیندار نے اپنی پوری توانائی دکھانے کی کوشش کی تبھی گلابو نے میز پر رکھے پیتل کے گلدان کو اٹھا لیا اور آناً فاناً اس کے سر پر دے مارا۔ بہتے خون کو دیکھ کر اس نے خوفزدہ ہو کر دروازہ کھول کر باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ فجر کا وقت ہونے کو تھا کہ وہ گھر پہنچ گئی تھی ابھی وہ دروازے پر ہی کھڑی تھی کہ اندر سے آواز آئی۔

''اری گلابو کی ماں جلدی بچوں کو اٹھا اور جلدی انہیں کچھ کھانا پیٹ بھر کے دے، دے ورنہ

صبح لوگ باتیں نہ بنائیں کہ کہاں سے آٹا آیا ہے کیسے تیرے گھر سالن بن رہا ہے؟ تو جانتی تو ہے لوگ ایک دوسرے کے بارے میں سب جان لیتے ہیں۔ خوشبو سے پہچان جائیں گے کہ روٹی پک رہی ہے۔ ہمیں کچھ ظاہر نہیں کرنا ہے روٹی کی خوشبو بھوکے کو اپنی طرف کھینچتی ہے تو سمجھ رہی ہے ناں!''

بابا کی آواز سن کر وہ اپنے قدم روکنے پر مجبور ہوگئی۔ تبھی ماں کی آواز ابھری۔

''گلاب کے بابا روٹی تو بنائی ہے پر میرا دل کھانے کو بالکل نہیں چاہتا، پتا نہیں میری بیٹی کس حال میں ہوگی۔''

''اری اچھی ہوگی، زمیندار عمر میں بڑا ہے مگر محبت کرنے والا اور سمجھدار ہے وہ اسے بہت خوش رکھے گا۔ بس تو بچوں کو سمجھا دینا کہ روٹی کا ذکر باہر گاؤں والوں سے نہ کریں۔ اگر کوئی گلابو کا پوچھے تو کہہ دینا کہ کل شام اپنے چچا کے ساتھ فتح پور دادی کے پاس چلی گئی ہے۔''

دروازے پر کھڑی گلابو سے اب برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ ماں، باپ کی مزید باتیں سنتی، دوسرے دروازے سے کوٹھڑی کی جھری سے جھانکا تو تین بوریاں اناج کی نظر آرہی تھیں۔ اب کسی قسم کا شک اس کے دل و دماغ میں بابا کے لیے نہیں تھا۔ گنجائش ہی نہیں تھی۔

''کل میں نے بھی رات جب زمیندار کے گھر پیٹ بھر کے طرح، طرح کے کھانے کھائے تو مجھے بھی ماں، باپ، بہن، بھائی کوئی یاد نہیں آیا تھا۔ پھر آج اگر ماں، باپ نے میرے، بہن، بھائیوں کی خاطر غربت سے تنگ آکر میری شادی ایک بوڑھے سے کر دی تو کیا ہوا۔ اتنی جانیں تو محفوظ ہوگئی ناں..... کنگن کی خوشی اور بڑے گھر کی چاہت نے میرے بچپن کے پیار احمد کو بھی بھلا دیا تھا۔ وہ جس نے میری خاطر کچھ بھی کرنے کا وعدہ کیا تھا، محبت بھری نظروں سے میرے وجود کو دیکھتا تھا وہ تو اب خود غربت کی چکی میں پس رہا ہے۔ اب میں کیا کروں خدایا!'' گلابو کمال ضبط سے آنسو چھپانے گھر کے سامنے والے کنویں پر آبیٹھی۔ دل واپس زمیندار کی دہلیز پر جانے کو تیار نہیں تھا اور والدین کی مجبوری اور بے بسی سامنے تھی۔ دل چاہا کنویں میں کود کر جان دے دے مگر اتنی ہمت نہیں تھی۔

ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ اندر سے کرم دین منہ ہاتھ دھونے باہر آیا اور کنویں پر بیٹھی گلابو کو دیکھ کر حیران و پریشان اس کی جانب بڑھا۔

''میری بچی تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ کیا ہوا زمیندار کہاں ہے؟'' کرم دین کے بے شمار سوالات سن کر گلابو چیخ پڑی۔

''میرے قریب مت آنا۔'' خوف و دہشت سے اس کی آنکھیں باہر آرہی تھیں۔

''میرے قریب مت آنا، مجھے پانی سے خوف تو آتا ہے مگر میں اپنی جان اس کنویں میں کود کر دے دوں گی۔'' گلاب نے قدم اوپر منڈیر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''بابا تم میرے قاتل ہو تم نے صرف تین بوری اناج کے لیے میرے وجود کا سودا کر دیا۔''

''نہیں، نہیں..... میری بچی، میں نے تیرے آرام و سکون کے لیے یہ سب کیا تھا۔ میں تجھے مرنے ہرگز نہیں دوں گا۔'' باہر کے شور کو سن کر ماں بھی باہر آگئی۔

''گلابو میری بچی.....!'' ماں آگے بڑھی مگر گلابو نے اگلے ہی لمحے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ کنویں کی گہرائی اپنے اندر گلابو کی خوشبو بسا چکی تھی۔ کرم دین اور گلاب کی ماں زار و قطار رو رہے تھے اور اندر بچے گرم، گرم روٹیاں کھا رہے تھے..... کرم دین کو کیا معلوم تھا کہ صبح کا اجالا ان کی دہلیز پر اپنے ساتھ زندگی بھر کا اندھیرا لے کر آئے گا۔



ترکِ وفا

نایاب جیلانی

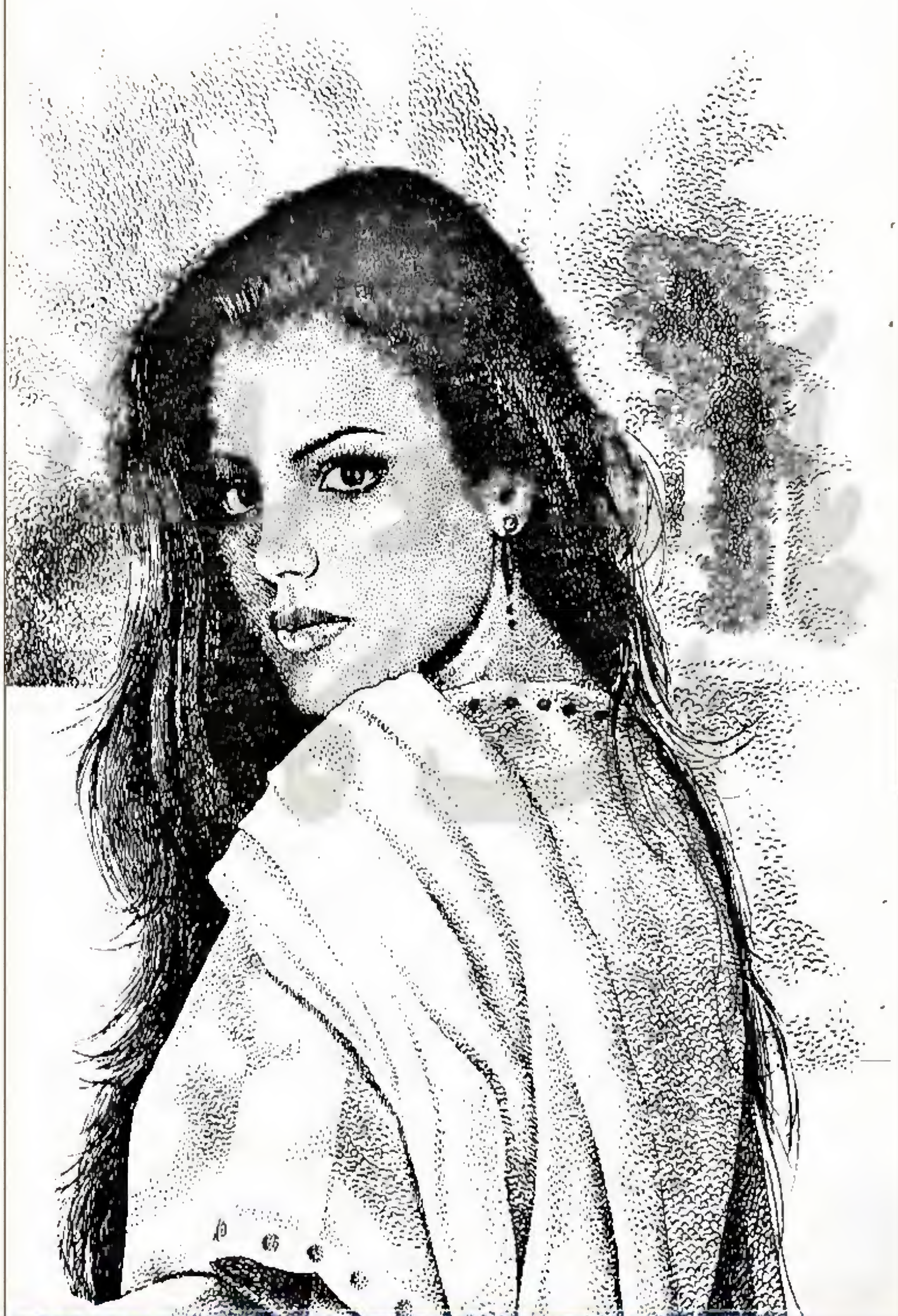
ناولٹ



گیارھواں حصہ

تایانے اگر کچھ سنا بھی تھا تو ظاہر کچھ نہیں ہونے دیا۔ عیسیٰ کے خدشے بے بنیاد ثابت ہوئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں شکر کرتا رہا، اگر تایا کچھ سن لیتے تو بھلا وہ کیسے ان سے نگاہ ملا سکتا تھا؟

حالانکہ اندر سے وہ کچھ بجھ سا گیا تھا۔ مون کی... خودسرانہ باتیں اسے غصے میں مبتلا کر چکی تھیں مگر اب اس غصے پر بے بسی حاوی تھی۔ مما ان دنوں اچانک بیمار ہوگئی تھیں۔ ان کی صحت گری، گری تھی مگر وہ تایا اور



عیسیٰ کے لیے فرشتہ نظر آتی تھیں۔ بھلا تایا ابا سوچتے؟ وہ بھی بہاران کے گھر آئے تھے اور پاپا ان فراؤ بیمار پڑ گئیں۔ مہمان نوازی کی خاطر مریم کو ہشاش بشاش رہنا پڑ رہا تھا ورنہ وہ تو اچانک اندر سے ڈھے گئی تھی۔

پھر انہی دنوں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا تھا......

دراصل عیسیٰ کے لیے یہ ایک واقعہ یا پھر خوشگوار حادثہ تھا۔ اس دن وہ اسکول سے گھر آیا تو پاپا اور تایا کو اسٹڈی روم میں دیکھ کر اُدھر ہی چلا آیا تھا مگر اندر سے آتی آوازیں سن کر ٹھٹک گیا۔ پاپا اور تایا کسی اہم موضوع پر بات کر رہے تھے۔ آخر موضوع کیا تھا؟ وہ جیسے سن کھڑا رہ گیا۔ وہ لوگ تو عیسیٰ کی شادی کے متعلق بات کر رہے تھے مگر شادی ہو کس سے رہی تھی؟

''میری تو خواہش ہے مالا اور علی عیسیٰ کی شادی ہو اور مون کا جوڑ ذی شاہ سے بنتا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں بھائی صاحب......؟'' پاپا بے تابی سے بول رہے تھے۔ عیسیٰ جیسے ٹھٹک گیا تھا۔ ''مالا اور علی عیسیٰ ...... مالا یعنی تایا جان کی بیٹی......'' اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ جیسے کوئی گھنٹی سی ہوا کے جھونکے سے اچانک بج اٹھی ہو۔

''مالا اور عیسیٰ تو ٹھیک ہیں...... عیسیٰ تو جان ہے اپنی...... پر مون کی بات رہنے دو۔'' تایا کی آواز سنجیدہ تھی۔ جیسے وہ بہت تول تول کر بول رہے تھے۔

''مون کی بات کیوں رہنے دوں...... کیا آپ کو میری بیٹی بطور بہو پسند نہیں آئی؟'' پاپا بچوں جیسی ضد سے بولے تھے۔ جیسے تایا کے انکار نے ان کے دل کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ مگر عیسیٰ تو جان گیا تھا، تایا کس وجہ سے انکار کر رہے تھے۔ مون کی زبان کے جوہر دیکھ کر انہیں انکار ہی کرنا چاہیے تھا۔

''یہ بات نہیں......'' تایا نے سابقہ سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''مون مجھے بہت پیاری ہے۔ تمہاری بیٹی بہت خوب صورت ہے پر مجھے نہیں لگتا ذی شاہ اور مالا ایک دوسرے کے ساتھ چل سکیں گے۔ وہ بھی مزاجاً گرم ہے اور مون بھی گرم مزاج۔ ہاں عیسیٰ اور مالا ایک ہی طرح کے دل ہیں۔ ٹھنڈے میٹھے اور مدھم...... مجھے امید ہے یہ بہت اچھا زندگی کا سفر طے کریں گے ایک ساتھ۔'' انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی مگر پاپا نے بہت بحث کی۔ وہ مون کی بکواس سے واقف نہیں تھے۔ جبکہ تایا سن چکے تھے اس کے جواب میں ان کی مون کے لیے اتنی حلاوت بھی عیسیٰ کے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔ انہوں نے مون کی شکایت بھی نہیں کی تھی۔ بس کہا تو صرف اتنا......

''حسیب اپنی کی شادی میں تاخیر مت کرنا۔'' ان کے لہجے میں جو واضح تنبیہ تھی اسے عیسیٰ بخوبی سمجھ چکا تھا۔ وہ مون کے رنگ ڈھنگ سے خوفزدہ تھے۔ مگر پاپا اُن کی بات کو سمجھ نہیں سکے۔ وہ اپنی ضد پر اَڑے رہے تھے۔

''آپ ذی کو اِدھر بھیجیں گے تب ہی مون کا کچھ سوچ سکوں گا۔ میں نے مون کو کہیں اور نہیں صرف ذی شاہ سے ہی بیاہنا ہے۔'' پاپا کا لہجہ بھی اٹل تھا۔ ان کا انداز بچوں جیسا ضدی تھا۔ جیسے وہ ہر صورت اپنی بات منوانا چاہتے ہوں۔

''اس طرح تو وٹہ سٹہ ہو جائے گا۔'' تایا بھی بے بس سے ہو گئے۔

''تو کیا فرق پڑتا ہے......؟'' پاپا کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔

''تم فی الحال اس بات کو رہنے دو...... صرف عیسیٰ اور مالا کی بات کرو......'' تایا نے بڑی محبت سے جیسے التجا کی تھی۔ وہ چپ کر گئے تھے پھر کافی دیر کی خاموشی کے بعد بولے۔

''ٹھیک ہے...... پھر میں عیسیٰ اور مالا کا رشتہ پکا سمجھوں......؟'' انہوں نے آس بھری آواز میں کہا۔

''ہاں...... کیوں نہیں......'' تایا بھی مسکرا دیے۔ ''مگر عیسیٰ سے تو پوچھو......'' انہوں نے بڑی

اہم بات کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''میرا بیٹا، میری ہر بات مانتا ہے۔'' پاپا کا سینہ بے انتہا فخر سے پھول گیا۔

''یہ تو ٹھیک ہے...... عیسیٰ کی رضامندی زیادہ اہم ہے۔'' تایا بھی ہلکے پھلکے سے مسکرا دیے...... جیسے کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔

''وہ تو اب بھی شادی کے لیے تیار ہوگا...آپ بے شک بلا کر پوچھ لیں۔'' پاپا یقیناً دروازے کے پیچھے کھڑا اسے دیکھ چکے تھے۔ تبھی شرارتی انداز میں بولے تھے جبکہ عیسیٰ ایک دم جھینپ گیا تھا۔ اب چھپنے کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ دونوں اسے دیکھ چکے تھے۔

''سامنے آجاؤ سرکار......'' پاپا نے ہانک لگائی تھی۔ وہ جھینپا جھینپا سا اندر آگیا۔

''باتیں تو سن چکے ہو تمام...... اب بتاؤ، کیا رائے ہے تمہاری؟'' پاپا نے اسے چھیڑا تھا۔

''جیسے آپ کی مرضی......'' عیسیٰ نے مشرقی بچوں کو بھی شرمانے میں مات دے ڈالی تھی۔ وہ دونوں بھائی اس کی حالت سے حظ اٹھا رہے تھے۔

''صاحبزادے! ہم آپ کی مرضی پوچھ رہے ہیں؟'' تایا بھی اسے تنگ کرنے لگے۔

''مجھے آپ کی ''مرضی'' سے بھی اختلاف نہیں......'' اب وہ ذرا پُراعتماد ہوا تھا۔ وہ دونوں اس کی... جی داری پر ہنس پڑے۔

''دیکھ لیا...... اب کیا کہتے ہیں...... ! رشتہ پکا سمجھوں......؟'' پاپا نے ہتھیلی پر سرسوں جما ڈالی تھی۔

''بالکل جناب! اب میں کیا کہوں......؟ تم باپ بیٹا بڑے جلد باز ہو......'' تایا سرشار سے ہوئے۔ گویا اک گونا سکون محسوس کر رہے تھے۔ تب علی عیسیٰ اور مالا کی زندگی کا فیصلہ بڑے اچانک حالات میں ہوا...... اور مون کی بات بیچ میں رہ گئی تھی۔ مون کی بکواس اگر تایا نہ سن چکے ہوتے تو شاید حالات مختلف ہوتے اور مون کا بھی ذی شاہ سے

رشتہ طے پا جاتا مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا...... تایا نے وٹے سٹے کا بہانہ کر کے ایک طریقے سے پاپا کو ٹال دیا تھا۔ وہ مون کو اپنی بہو ہرگز نہیں بنانا چاہتے تھے۔ شاید ان کی زیرک نظری اور دور اندیشی نے بعد کے حالات بھی دیکھ لیے تھے۔ یقیناً انہیں لگتا تھا مون کبھی ان کے بیٹے کا ساتھ نہیں دے سکتی پھر رشتے داری خراب کرنے سے بہتر تھا، وہ لوگ یہ نیا رشتہ کرتے ہی نہیں۔ شاید تایا کا فیصلہ درست تھا مگر پاپا کو بھلا کون سمجھاتا...... وہ تو ہر صورت مون اور ذی شاہ کا رشتہ بھی جوڑنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دونوں بچوں کا مستقبل روشن اور محفوظ دیکھنے کے خواہش مند تھے اور یہ خواہش بے جا نہیں تھی۔

تایا کو جانے سے پہلے فوٹو والا البم دکھانا یاد آیا تھا۔ انہوں نے البم عیسیٰ کو پکڑا کر شرارتاً کہا۔

''اسی البم میں اپنی بھی فوٹوز لگا دینا...... پاکستان والے بھی دیکھنے کو بے تاب ہوں گے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے عیسیٰ کو چھیڑا تھا اور وہ ہنستا ہوا البم پکڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے اپنے کزنز کو دیکھنے کی بہت بے چینی تھی۔ عیسیٰ دروازہ... بند کر کے بیڈ پر آبیٹھا...... پھر اس نے البم کھول کر جلدی سے دیکھا۔ دراصل یہ میٹھا، میٹھا اٹھنے والا اضطراب صرف مالا کو دیکھنے کے لیے اسے بے قرار کر رہا تھا۔ اسے مالا کو دیکھنا تھا جو سمندروں کے فاصلے پر بیٹھی تھی مگر عیسیٰ کو لگتا اس کے آس پاس ہی کہیں ہے۔ یہ کیفیات بہت اچانک رونما ہوئی تھیں۔ وہ اپنے محسوسات میں تبدیلی پاتا تھا۔ یوں لگتا جیسے اندر کا پورا سسٹم ہی بدل گیا ہے۔ پھر مالا کو دیکھنے کے بعد تو جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ اس کا دل، دھڑکنوں کا ردھم بدل گیا تھا۔ حالانکہ وہ کوئی بہت حسین نہیں تھی۔ عام سی لڑکی تھی مگر عیسیٰ کو ہمیشہ خاص لگتی تھی۔ اس کا دل جیسے اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ مالا کی محبت میں بن دیکھے گرفتار ہو گیا

تھا۔ جیسے اسے بیلے کی کلیوں سے گندھی بہت معصوم سی مالا سے محبت ہوگئی تھی۔ یہ رشتہ پاپا اور تایا نے طے کیا تھا۔ مگر ماما کو کچھ اختلاف ہوا...... انہوں نے دبے، دبے الفاظ میں انکار کرنا چاہا تھا۔ وہ سوزن کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں اور یہ بات عیسیٰ کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔

ایک طرف پاپا کی خواہش تھی اور دوسری طرف مما کی...... وہ تو جیسے بے بس ہوگیا تھا۔ اگر مما زیادہ مجبور کرتیں تب وہ بھلا انکار کرسکتا تھا؟

وہ تایا کا دیا فوٹوز والا البم کھولے افسردہ سا ہوگیا۔ اس البم میں مالا کی صرف ایک تصویر تھی۔ وو چار بندیا کی تھیں۔ ذیشان، ذی شاہ اور شامی کی زیادہ تھیں بلکہ ذی شاہ کی زیادہ تھیں شاید تایا وہ تصویریں مون کے لیے لائے تھے۔ اسے ذی شاہ کو دیکھ کر مون کی بدنصیبی پر دکھ سا ہوا۔ کاش کہ یہ رشتہ بھی طے ہوجاتا مگر ہر خواہش پوری ہونے کے لیے تو نہیں ہوتی۔ مون کی جلد بازی، تلخ کلامی اور زہریلے الفاظ نے تایا کو اس سے بدول کردیا تھا۔

مون، عیسیٰ اور مالا کے رشتے کا سن کر شاکڈ رہ گئی تھی۔ اس کا ذہن جیسے سن ہوکر رہ گیا۔ مون نے تو عیسیٰ اور سوزن کے متعلق سوچ رکھا تھا پھر یہ مالا بیچ میں کہاں سے آگئی تھی؟ مون کے اندر باہر آگ لگ گئی۔ تایا کی چالاکی پہ اسے سخت تاؤ آتا رہا مگر اب تو اسے تایا جیسے مطلبی انسان پر گویا زہر چڑھ رہا تھا۔ تایا گھر میں ہوتے تو وہ ان کو ایسی، ایسی باتیں سناتی کہ اپنی بیٹی کا رشتہ وشتہ سب بھول جاتے۔ مگر تایا کہیں نکلے ہوئے تھے۔ اور عیسیٰ جانے کہاں تھا؟ وہ عیسیٰ کی تلاش میں آگ بگولا ہوتی اس کے کمرے میں آئی تو عیسیٰ وہاں بھی نہیں تھا۔ مون کو زہر اگلنا تھا۔ اس کے سامنے کوئی بھی ہوتا تو بچ نہ پاتا۔ وہ کمرے میں چکراتی غصہ پھونک رہی تھی۔ وہ عیسیٰ کے سارے طبق روشن کرنے آئی تھی اور اسے مجبور کرنے آئی تھی تاکہ وہ تایا کے منہ پر اس رشتے سے انکار کردے۔

آخر تایا کی مطلب پرستی کھل کر سامنے آہی گئی تھی۔ بیٹا نہ سہی بیٹی کو جرمنی بھیجنے کا منصوبہ کامیاب ہوہی رہا تھا۔ مون ایسا ہرگز بھی نہیں ہونے دے گی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ آخر اس کے خدشے اور چھٹی حس کے اشارے بے بنیاد نہیں تھے۔

یوں ہی کمرے میں چکراتی مون کی نگاہ تکیے کے نیچے البم تک گئی تھی۔ اس نے کچھ تجسس کے عالم میں تکیہ پیچھے ہٹا کر دیکھا۔ نیچے ایک البم پڑا تھا۔ وہ حیرانی کے عالم میں تصویریں ایک، ایک کر کے دیکھنے لگی۔

''تایا اور ان کے بچے......'' مون نے زیرلب بڑبڑا کر ایک اور ننھا سا لفافہ کھولا۔ اس میں الگ سے آٹھ دس تصویریں رکھی تھیں۔ وہ تجسس کے عالم میں دیکھتی چلی گئی۔

''یہ کون ہے......'' اس کا دل جیسے دھک، دھک کر رہا تھا۔ وہ ایک، ایک تصویر کو ساکت بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ اندر دور کہیں اکھاڑ پچھاڑ ہو رہی تھی۔ دل کی عمارت پر دھڑا دھڑ کچھ گر رہا تھا۔ کیا......؟ شاید اس کے بڑے بول...... شاید تکبر بھرے الفاظ، شاید حقارت، نفرت اس نے تایا کو کیا کچھ نہیں سنایا تھا۔ اپنے بیٹوں کا مستقبل سنوارنا چاہتا ہے۔ ان کے ویزے لگوانا چاہتا ہے۔ اور جانے کیا کیا......؟ اس کے کہے ایک، ایک لفظ نے جیسے مون کا منہ چڑانا..شروع کردیا تھا۔ ادھر دل کے اندر قیامت کا تلاطم بپا تھا۔ اور مون کی پوری ہستی تہ خاک ہو رہی تھی۔ اس نے تصویر کو اٹھا کر مہ بار دیکھا۔ اس کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ وہ اس چہرے کو بار بار دیکھنا چاہتی تھی۔ مون حسیب کو آخر ہو کیا رہا تھا؟' کیا ایسا ہونا چاہیے تھا؟

ہاں، ایسا ضرور ہونا چاہیے تھا۔ اس کے غرور کی سزا یہی تھی۔ اسے تایا کے اسی بیٹے سے محبت ہوتی، جس کے لیے انہیں مون قطعاً نامناسب لگی تھی اور

مون کے ساتھ کتنا انہونا واقعہ رونما ہوا تھا۔

کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے؟ تصویر دیکھ کر کسی سے محبت ہو جانا؟ تصویر دیکھ کر سوچیں، دل، جذبات، احساسات بدل جانا اور اس محبت میں سالوں کی مسافت طے کرنا۔

وہ ذی شاہ کے نقش، نقش کو دیکھ کر، دل کے اندر بسا رہی تھی..... مگر آنکھ تھی کہ ہٹتی نہیں تھی اور دل تھا کہ بھرتا ہی نہیں تھا۔

اس نے خود کو بارہا مجبور کیا..... سمجھایا، بجھایا تاویلیں اور دلیلیں دیں..... جیسے نگاہ بچا، بچا کر اور رستہ بدل، بدل کر گزرنا چاہا تھا مگر اس کے ہر رستے میں انوکھی سی یہ محبت دیوار بن کر آکھڑی ہوئی تھی۔

ان دونوں بہن، بھائی کو بڑی عجیب سی محبت ہوئی تھی۔ وہ صرف تصویر دیکھ کر عین عشق کی سیڑھیاں چڑھنے لگے تھے۔ بھلا ایسے بھی کبھی ہوتا ہے؟ بھلا اس طرح بھی ہوتا ہے؟ مگر ان دونوں کے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا۔ عیسیٰ کا معاملہ پھر بھی الگ تھا مگر مون کے ساتھ تو بہت ہی عجیب ہوا۔ وہ لمحوں میں پرائی ہوگئی تھی۔ جیسے کچھ بھی اس کا اپنا نہیں رہا تھا۔ دل سمندر پار تایا کے اس بیٹے کے حصار میں چلا گیا، جو کل تک اس کی نظر میں کچھ نہیں تھا۔ اور آج پورا عالم سمیٹے بیٹھا تھا۔

مون نے چاہا کہ وہ خود کو جھٹلا دے مگر بوئے گل نے کہا۔ میں روکے سے نہیں رکتی۔ بڑی عجیب محبت ہوں، نشے کی طرح چڑھتی ہوں، عمر بھر نہیں اترتی......

راستے بدلنے سے دل کہاں بدلتے ہیں
شہر کی فصیلوں کی جس قدر بلندی ہو
بوئے گل نہیں رکتی آنکھ موند لینے سے
جو نمی ہو آنکھوں میں وہ کبھی نہیں چھپتی
ہاتھ کے کواڑوں سے چاندنی نہیں ٹلتی
بے رحم ہواؤں سے پیار کے چراغوں کی
روشنی نہیں بجھتی، نارواتغافل کی دل شکن اداؤں سے
جذبہ ہائے الفت کو ماند کر نہیں سکتی

اور پھر ''بوئے گل'' رکی کہاں تھی! فصیلیں توڑ، توڑ کر سر چڑھنے لگی۔ نشہ بن کر مدہوش کرنے لگی تھی۔ خواب بن کر آنکھ میں اترنے لگی تھی۔ وہ خود کو جھٹلا، جھٹلا کر تھک گئی تھی اور بوئے گل کو روک، روک کر لاچار ہوگئی۔ محبت نے اپنا پنجہ اس کے دل پر بالآخر جما ہی دیا تھا اور اسے تایا کے ذی شاہ سے بڑی پاگل کر دینے والی محبت ہوگئی تھی۔

وہ ایک عجیب لڑکی تھی، اس کی زندگی عجیب تھی، اس کے احساسات عجیب تھے، اس کی محسوس کرنے والی ہر حس عجیب تھی اور اس عجیب لڑکی کو بڑی عجیب سی محبت ہوگئی تھی۔

اس نے ذی شاہ کی تصویر کو اٹھا کر اپنی آنکھ کے سامنے کر لیا تھا۔ وہ اس کا ایک، ایک نقش کھوج رہی تھی بھلا کوئی چہرہ اتنا پُرکشش اور مقناطیس جتنی صلاحیت رکھتا ہے؟ جو دل، جذبات اور احساسات کو بیک وقت کھینچ سکے؟ وہ دم بخود بے جان تصویر کو دیکھ رہی تھی مگر اسے لگتا تھا، تصویر سے نکل کر کوئی مجسم اس کے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔ اس کا دل جیسے توے پر رکھے مکھن کی ٹکیہ کا ایک کونا تھا جو لحظہ لحظہ پگھلتا جا رہا تھا۔

اسے اپنے متکبر الفاظ یاد آرہے تھے..... نخوت اور غرور میں لپٹے..... ''کیا کبھی کوئی اتنا بھی بے بس ہو جاتا ہے؟'' اس نے اپنے پرائے ہوتے دل سے سوال کیا..... محبت جس میں فنا ہو رہی تھی۔ اور وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ کیا سزائیں اتنی جلدی بھی ملا کرتی ہیں؟

مون کی چھٹی حس کہہ رہی تھی۔ محبت اس کے دل پر کوئی سزا بن کر یا عذاب بن کر نازل ہوئی ہے۔ ہاں، محبت اس کے لیے بن سنور کر نہیں آئی تھی، وہ اس کا امتحان لینے آئی تھی۔ اس کے تکبر کو مٹی میں رولنے آئی تھی۔ اسے تہ خاک کرنے آئی تھی۔ اسے

برباد کرنے ہی تو آئی تھی۔ اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں کو تصویر پر جمایا۔

پھر اس نے ذی شاہ کی تمام تصویروں کو اسی لفافے میں بند کر دیا۔ شاید وہ تصویروں کو نظر سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

خواب پوش آنکھوں میں
آنسوؤں کا بھر جانا
حسرتوں کے ساحل پر
تتلیوں کا مر جانا
حبس کی ہواؤں میں
خوشبوؤں کا ڈر جانا
دل کے گرم صحرا میں
حشر ہی بپا ہونا
دردِ لا دوا ہونا
کیا بہت ضروری ہے
اب تیرا جدا ہونا

اس کا دل جیسے کٹ، کٹ کر گرنے لگا تھا۔ وہ اپنی کیفیات پر دم بخود تھی۔

☆☆☆

گردشِ دوراں نے اسے کس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا......؟ وہ نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی، نہ آگے بڑھ سکتی تھی۔ عقل، عمر کی محتاج نہیں ہوتی۔ پھر بھی وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ کرے کیا...... ابھی وہ انہی الجھنوں میں گرفتار تھی جب تایا کی واپسی کا دن آ گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ جانے سے پہلے تایا کا دل اپنی طرف سے صاف کر دے گی اور اپنے گزشتہ رویّے کی معافی مانگ لے گی۔ خود غرض تو وہ بلا کی تھی۔ اپنے مفاد کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔

سو، رات کو وہ خود کو سمجھا بجھا کر گیسٹ روم کی طرف لے آئی تھی۔ مگر یہ کیا...... اندر سے پاپا اور تایا کی آوازیں آ رہی تھیں۔ موضوعِ گفتگو مون کی ذات ہی تھی۔ وہ جیسے ٹھٹک کر منجمد ہو گئی تھی۔ وہ دونوں کیا بات کر رہے تھے؟ دونوں بے انتہا سنجیدہ تھے۔ مون سانس روکے دروازے کے باہر کھڑی ہو گئی پھر جیسے دھیرے دھیرے اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

''مون کی بات مت کرو، میں نے پہلے بھی تمہیں منع کیا ہے حسیب......'' تایا نے بے انتہا سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا۔ پھر پاپا کی بے بس سی آواز سنائی دی تھی۔ مون کی سانس تک رک گئی۔

''کیوں نہ کروں......؟ میری بیٹی میں کیا کمی ہے؟'' انہیں گہرا دکھ سا ہوا۔

''میں نے کب کہا ہے مون میں کوئی کمی ہے۔ بس ذی شاہ نہیں مانے گا۔'' صاف لگ رہا تھا وہ بجھے لہجے میں بولتے ہوئے ٹال رہے تھے۔

''کیوں نہیں مانے گا؟ آپ اسے ایک مرتبہ اِدھر بھیجیں تو سہی......'' پاپا نے افسردگی سے کہا تھا، جیسے ان کی بات مانی نہیں جائے گی۔

''وہ یہاں بھی نہیں آئے گا، بڑا مختلف مزاج ہے اس کا...... اور مون بھی کم نہیں...... یہ رشتہ غیر مناسب ہے۔'' تایا گویا تول، تول کر بول رہے تھے۔ وہ کس کے رشتے کی بات کر رہے تھے؟ مون اور ذی شاہ کی......؟ وہ جیسے تھرا اٹھی تھی۔ تو تایا اسے ریجیکٹ کر رہے تھے؟

''شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آپ بات تو پکی کریں۔'' پاپا کی لجاجت پر وہ متھم سی گئی تھی۔ پاپا اپنی بیٹی کے لیے گڑگڑا رہے تھے۔ کیا بوئے گل پاپا تک بھی پہنچ گئی تھی؟ کیا مون کی محبت کا اعلان ہو گیا تھا۔ خوشبو بکھر رہی تھی؟ مہک نکھر رہی تھی؟

''کچھ ٹھیک نہیں ہوتا، نہ ہوگا...... رشتے داری میں دراڑ آ جائے گی۔'' تایا بے بس ہو گئے۔

''نہیں آئے گی...... بس میں نے کہہ دیا ہے عیسیٰ اور مالا...... مون اور ذی شاہ...... چند سال گزر

جانے دیں...... بچے پڑھ لکھ جائیں پھر ان کی شادیاں کردیں گے۔'' پاپا نے عجلت پسندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ شروع سے ہی جلد باز تھے۔ تایا کا مسلسل انکار کرنا مون کو اذیت سے دوچار کررہا تھا مگر پاپا اصل حقیقت سے واقف نہیں تھے۔ وہ تو مون کی بدلتی کیفیت سے بھی واقف نہیں تھے۔

''تم کیوں نہیں سمجھتے حسیب! ذی شاہ نہیں مانے گا۔'' تایا نے انتہا کی سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا۔

''آخر نہ ماننے کی کوئی وجہ تو ہو......'' پاپا کو غصہ آگیا۔

''تمہاری بیٹی کا مزاج مختلف ہے۔'' تایا پھر سے بے بس ہوگئے۔ وہ کیسے بھلا مون کے مزاج کی تشریح کرتے؟ انہوں نے مون کو دیکھ کر ہی جانچ لیا تھا۔ وہ ان کی بہو بننے کے قابل نہیں تھی۔

''شادی کے بعد ٹھیک ہوجائے گی۔'' پاپا کی وہی ایک ضد...... مون کو لگا وہ اب چکرا کر گرنے ہی والی ہے۔ تایا کے الفاظ اسے دھڑام، دھڑام زمیں بوس کررہے تھے۔

''کبھی نہیں ہوگی...... وہ انتہائی بدتمیز اور... بدلحاظ بچی ہے، تم نے اس کی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پھر بھی مجھے لگتا ہے وہ تمہارا امتحان بن کر دنیا میں آئی ہے۔ بعض بچے والدین کو آزمانے کے لیے ہی آتے ہیں۔ وہ تمہارے لیے بہت اذیت کا باعث بنے گی۔ میں دیکھ رہا ہوں، مجھے خوف ہے...... وہ بہت خسارے اٹھانے والی ہے۔'' تایا کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی تھی۔ دراصل وہ مون کی سرکشی اور خودسری کی انتہا کو کھوج چکے تھے۔ وہ بہت زیرک انسان تھے۔ مون کی ذات میں موجود کجیوں کو جانچ چکے تھے۔ اور اُدھر مون کے سر پر جیسے پہاڑ آگرے تھے۔ وہ آخری سیڑھی سے منہ کے بل کر پڑی تھی۔ تو کیا پاپا کے اس بھائی نے مون کو اپنے بیٹے سے رشتے کے قابل نہیں سمجھا تھا؟

مہکتی کلیاں

☆اگر آپ اپنے احباب کو ایسے واقعات سناتے ہیں جن سے آپ کے دوستوں کو نیچے گرایا جائے تو آپ خود ایک گری ہوئی شخصیت ہیں۔

☆یتیم وہ نہیں جس کے والدین نہ ہوں بلکہ وہ ہے جو حسنِ اخلاق سے محروم ہو۔

☆کنجوس آدمی دولت کا مالک نہیں ہوتا بلکہ دولت اس کی مالک ہوتی ہے۔

☆مٹ جانے والی چیزوں کو چھوڑ دو اور باقی رہ جانے والی چیزوں کو اختیار کرو۔

مرسلہ: انجم گلزار، کراچی

ابدی نیند

ہر گھر کے کشادہ صحن میں\
کتنے کمرے اگ آتے ہیں\
پھر ان کمروں کے باسی\
چپکے چپکے، دھیرے دھیرے\
اپنا رستہ چن لیتے ہیں\
دور دیس میں جا بستے ہیں\
جاتے جاتے طفل تسلی کی ایک گٹھڑی\
بوڑھے ہاتھوں میں دے کر\
اشک بھری آنکھوں سے نظریں چرا کر\
چل دیتے ہیں\
ایک دن ایسا آتا ہے کہ\
بوڑھی آنکھیں، رستہ تکتے تھک جاتی ہیں\
چوکھٹ پر ہی سو جاتی ہیں

شاعرہ: حجاب عباسی

مرسلہ: افتخار شوق، میاں چنوں

”خود سوچنا ذرا...... عیسیٰ مغرب زدہ ہے، مغرب کی پیداوار...... پھر بھی شریکِ حیات میں مشرقیت کی خواہش رکھتا ہے۔ پھر ذی شاہ تو ہے ہی مشرق کی پیداوار...... وہ مون کی مغربیت کے ساتھ کبھی سمجھوتا نہیں کرے گا۔“ تایا سچ کہہ رہے تھے۔ مگر وہ ان کے سچ کو دھتکار بھی سمجھی تھی۔ تو کیا تایا نے اسے ٹھکرا دیا تھا؟ اسے دھتکار دیا تھا؟ آخر انہوں نے مون میں کون سی خرابی دیکھی تھی؟ وہ بدکردار تھی؟ شرابی تھی؟ جواری تھی؟ اس کے غیر لوگوں سے ناجائز تعلقات تھے؟ آخر انہوں نے مون میں کیا دیکھ کر اسے ٹھکرا دیا تھا؟

اس کی زخمی انا منہ کے بل گری دہاڑ رہی تھی۔ ٹھکرائے جانے کی ذلت کوئی معمولی نہیں ہوتی۔ اس کے نفرت بھرے جذبات ابل کر باہر آ گئے تھے۔ غصہ بھانبڑ کی طرح جل رہا تھا اور انتقام کے شعلے اسے فنا کر رہے تھے۔ وہ ایک جلد باز باپ کی جلد باز بیٹی تھی۔ اس سے یہ ذلت، یہ ٹھوکر برداشت نہیں ہو سکی تھی۔ ابھی تو محبت اس کے دل میں اتری ہی تھی جب ذلت کی آگ نے اسے راکھ، راکھ کر دیا تھا۔

اس کا بس چلتا تو پاپا کے اس بھائی کا منہ نوچ لیتی۔ اسے گالیاں دیتی...... اور اس کے منہ پر کیچڑ پھینکتی کہ آخر وہ ہوتا ہی کون تھا جو مون کو ریجیکٹ کر رہا تھا۔

ذلت، توہین، غصہ، نفرت اور انتقام کی آگ نے اسے جھلسا رکھا تھا۔ بات اتنی بڑی تو ہرگز نہیں تھی مگر مون کی شدت پسندی نے اسے انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ اس سے آگے بس ذلت کا سفر تھا مگر وہ نادانی میں سمجھ ہی نہیں پائی۔

تایا، اب پاپا کو بڑی محبت کے ساتھ اگلے مرحلوں کے طے کرنے کی تفصیل بتا رہے تھے۔

”عیسیٰ پڑھائی سے فارغ ہو لے...... پھر تم مالا کو آ کر لے جانا...... مالا اب تمہاری بیٹی ہے۔“ تایا اور پاپا مستقبل کے سہانے سپنے بُن رہے تھے اور مون ان کے سپنوں کو تار، تار کرنے کی پلاننگ کر رہی تھی۔

”عیسیٰ اور مالا...... کبھی نہیں، ہرگز نہیں...... میں انہیں کبھی ایک ہونے نہیں دوں گی...... اگر ایسا ہو بھی گیا تو غضب کی جدائی ڈالوں گی۔ عمر بھر کی ایسی ذلت، جدائی اور رسوائی کہ داغ کبھی نہ دُھل پائیں گے۔“ مون نے گویا اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ اس کے اندر کا غصہ تھا۔ ٹھکرائے جانے کا انتقام تھا۔ جب ذی شاہ اس کے لیے نہیں تھا تو پھر مالا کیسے عیسیٰ کے لیے ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں، قیامت تک نہیں...... فیصلہ تو ہو چکا تھا...... وہ اپنی ذلت کا بدلہ لینے، انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور تایا کو نیچا دکھانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کچھ بھی میں سب کچھ ہی شامل تھا...... محبت اور جنگ میں اس نے سب کچھ ہی جائز کر رکھا تھا۔ تایا کو اپنی بیٹی کی مشرقیت پر مان تھا اور مون حسیب نے اس مان کو تہ خاک کرنا تھا۔ مالا کی مشرقیت کو ذلتوں میں بدلنا تھا مگر اس کے لیے طویل ریاضت درکار تھی۔ بہت صبر اور ضبط کے ساتھ وقت گزرنے کا انتظار کرنا تھا۔ ہاں، عیسیٰ اور مالا کی شادی تک کا انتظار......

اور اس کے بعد گیم مالا کے ہاتھ سے نکل کر مون کی طرف آ جاتی۔ شطرنج کی اصل بازی وہ عیسیٰ کی شادی کے بعد کھیلنے والی تھی۔ بساط پر مہرے رکھ دیے گئے تھے۔ اب بس داؤ چلنے تھے۔ مگر بیچ میں کچھ سفر ابھی باقی تھا۔ عیسیٰ اور مالا کی شادی تک کا سفر...... اور مون اتنے سالوں میں نفرت کے ان جذبات کو نوچنا نہیں بلکہ اور تازہ دم کرنا چاہتی تھی۔

آخر بدلہ لیے بغیر تو وہ رہ ہی نہیں سکتی تھی پھر تایا کو مزہ بھی تو چکھانا تھا۔ جو پاپا کو اب مالا نامہ کھولے ایک، ایک لفظ کھول، کھول کر سنا رہے تھے۔ جیسے در پردہ مون کو جتا رہے ہوں۔

”مالا اتنی سادہ سی ہے، معصوم، کم گو، شریف......

باحیا دیکھنا، عیسیٰ تو عمر بھر مجھے اور تمہیں دعائیں دیتا رہے گا۔'' تایا کے لہجے میں فخر تھا۔ جو مون کو تازیانے کے مانند لگ رہا تھا۔ تو گویا وہ اسے جتلا رہے تھے پاپا کو بتا رہے تھے کہ تمہاری بیٹی ان اعلیٰ مقدس اور پاکیزہ صفات سے مبرّا ہے۔ وہ در پردہ اسے کوڑے مار رہے تھے اور مون ذلت و توہین کے احساس سے بھڑ بھڑ جل رہی تھی۔

''ہونہہ...... پاکیزہ...... باحیا...... معصوم...... دیکھوں گی، یہاں آکر کتنی معصوم، پاکیزہ اور باحیا رہتی ہے؟'' وہ تنفر و حقارت سے زہر آلود ہو رہی تھی۔ اور تایا کا فخر بڑھتا جا رہا تھا۔

''میری بیٹی بہت بھولی ہے، سگھڑ، سمجھدار، وفا شعار، محبت کرنے والی عیسیٰ کا نام لیا تو سر جھکا کر اپنی رضامندی دے دی۔ ایسی بیٹیاں تو والدین کی آنکھوں اور سینوں میں ٹھنڈک بھرتی ہیں۔'' وہ نم آواز میں کہہ رہے تھے اور مون کے سر پر ہتھوڑے لگ رہے تھے۔ تایا کا ایک، ایک لفظ اس کے لیے تیزاب کے مانند تھا۔ وہ جیسے سر تا پا جھلس رہی تھی۔ تایا جانتے نہیں تھے۔ مالا کی بے ضرر تعریفیں اس کے لیے آئندہ زندگی میں کیسی قیامت لانے والی ہیں۔ اگر جان جاتے تو کبھی مالا کی اتنی تعریف نہ کرتے۔

مون جب الٹے قدموں پلٹ رہی تھی تب وہ پہلے والی مون نہیں تھی۔ وہ تو غصے، حسد، نفرت اور انتقام میں بھری مون تھی جس نے تایا کو نیچا دکھانا تھا۔ اپنے ٹھکرائے جانے کا حساب لینا تھا۔ حالانکہ بات بڑی نہیں تھی مگر اسے مالا کے مقابل لا کر، مالا کی شخصیت کے ساتھ موازنہ کر کے ریجیکٹ کیا گیا تھا۔ ایسی توہین مون عمر بھر نہیں بھول سکتی تھی۔ تایا نے اپنی بیٹی کے خاکے میں رکھ کر مون کا جائزہ لیا تھا...... یہ کہاں کا انصاف تھا؟ اب مون، مالا کی طرح سگھڑ نہیں تھی، اس کی طرح دبّو نہیں تھی، اس کا یہ مطلب نہیں تھا مون میں سرے سے کوئی خوبی ہی نہیں تھی۔ تایا نے کتنی معمولی بنیاد پر اسے دھتکارا تھا۔ اس کا اولین محبت کا ذائقہ چکھنے والا دل بہت بری طرح سے کرچی، کرچی ہوا تھا۔ وہ اگر بے باک، نڈر، دلیر یا منہ پھٹ تھی تو یہ کوئی اتنا بڑا عیب نہیں تھا جس کی بدولت وہ سگی بھتیجی کو ٹھکرا جاتے۔ مون کے نزدیک تو کوئی بھی عیب نہیں تھا مگر ایک بات پر اسے بھی یقین ہو چلا تھا، یہ جو اس کی چھٹی حس تھی یہ کبھی غلط اشارہ نہیں دیتی تھی۔

وہ جو دل کو بڑا کر کے تایا سے اپنے سابقہ رویوں کی معافی مانگنے آرہی تھی تب ہی اس کی چھٹی حس نے الارم بجایا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں ہونے والا۔ کچھ غلط اور بہت برا ہوگا...... اور ایسا ہو کر رہا تھا۔

وہ صرف تایا سے نہیں بلکہ اس شب جان چھڑکنے والے پاپا سے بھی بدظن ہوگئی تھی۔ اس کا باپ اتنا کمزور ثابت ہوا تھا جو بیٹی کے حق میں ذرا سی دلیل بھی نہیں اٹھا کر لایا تھا۔ وہ چاہتے تو تایا مان بھی سکتے تھے۔ پاپا ان پر دباؤ بھی ڈال سکتے تھے مگر پاپا نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ ذرا سی کوشش بھی نہیں کی تھی اگر وہ چاہتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے۔ کم از کم عیسیٰ اور مالا کا رشتہ توڑنے کی دھمکی ہی دے ڈالتے۔ پھر تایا کی کیا مجال تھی جو وہ انکار کرتے...... اتنا تو مون جان ہی چکی تھی۔ تایا، عیسیٰ کے لیے۔۔۔ بے انتہا حساس ہو چکے تھے اور عیسیٰ کو ہر صورت اپنا داماد بنانا چاہتے تھے۔ عیسیٰ اپنی پیاری، پیاری عادتوں کے باعث تایا کے دل میں کھب گیا تھا مگر اس کے پاپا نے بغیر لڑے ہی ہتھیار پھینک دیے تھے۔ جاتے، جاتے تایا انہیں باور کروا گئے تھے۔

''ذی شاہ کے لیے مون کو مت بٹھانا...... جلد از جلد شادی کر دینا...... بیٹیوں کو وقت کے ساتھ ہی رخصت کرنا چاہیے۔'' تایا کے یہ الفاظ تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے تھے۔ مون کا انتقام اور

بھی بڑھ گیا تھا۔ اب تو وہ کسی بھی صورت تایا اور مالا کو معاف کرنے والی نہیں تھی۔ مالا اس کے دشمنوں کی فہرست میں ایک دم ٹاپ پر چلی گئی تھی۔ اب اسے اپنا انتقام پورا کرنا تھا۔ تایا کو نیچا دکھانا تھا مگر اس کے لیے عیسیٰ اور مالا کی شادی بہت ضروری تھی۔ مون کا منصوبہ بڑا مختصر اور جامع تھا۔ مالا کو بدنام، ذلیل اور خوار کر کے عیسیٰ کی زندگی سے بے دخل کرنا...... پھر اسے ذلتوں کے داغ لگا کر واپس پاکستان بھجوانا...... تاکہ عزت مآب تایا صاحب اپنی لاڈلی کے کرتوت دیکھ کر شرمسار ہو جاتے پھر اپنے ہی کہے الفاظ کے کوڑوں سے لہولہان ہوتے رہتے۔ ان کی لاڈلی بھولی، باحیا، باوفا بیٹی کو ذلیل کرنا مون کا اولین مقصد بن گیا۔ اس سے نہ صرف انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی بلکہ تایا کو ان کے تکبر کی سزا بھی مل جاتی جو نیک اور فرمانبردار اولاد پر اتراتے پھرتے تھے۔ ایک جامع پلاننگ بناتے ہوئے مون حسیب بھول چکی تھی کہ اس کے پاس جزا اور سزا کا کوئی اختیار نہیں...... ہر شخص اپنے عمل کا بھگتان خود اپنی ذات پہ ہی بھگتنے والا ہے اگر کوئی غرور یا تکبر میں مبتلا بھی تھا تو بھلا مون کون ہوتی تھی اسے سزا دینے والی؟ ذرا سی غلطی، ہلکی سی سرزنش انسان کے لیے عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہے۔ اور مون کے دفتر تو ویسے بھی بھرے پڑے تھے۔ جس صفحے کو بھی کھولتی، اندر سے خسارے اور نقصان کی فہرست نکل آتی تھی مگر انسان ٹھوکر کے بنا کہاں سمجھتا ہے...... اور مون تو ٹھوکروں پہ سب کو رکھتی تھی، اسے چھوٹی موٹی ٹھوکر نے کیا کہنا تھا؟ اندھا دھند بھاگتے ہوئے انسان رائل روڈ کو بھول جاتا ہے...... پھر جب تک کوئی بریکر نہیں آتا، رکتا نہیں...... اور یہی بریکر چاہے تو گڑھے میں پھینک دے چاہے تو قبر میں......

اور مون صرف ان دو لفظوں اور ایک لائن کا مفہوم عمر بھر نہیں سمجھی تھی کہ سارے معاملے تقدیر کے آگے سرنگوں ہیں اور تدبیر جتنی بھی مضبوط سہی، تقدیر کی رسی اسے اکھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

محبت کو اس نے امرت نہیں، سم قاتل بنالیا تھا پھر مرنا تو تھا ہی...... سلگنا تو تھا ہی...... محبت کو شہد سمجھ کر پینے والے ہارے ہوئے انسان بہت کم ہوتے ہیں...... جو ہار کر بھی شہد بنے رہتے ہیں۔ شہد کی دلدل میں عمر بھر ڈوبے رہتے ہیں۔ محبت کے مارے ہوئے اکثر زہر بن جاتے ہیں اور یہ زہر وہ کسی نہ کسی کی رگوں میں ضرور اتارتے ہیں، کسی نہ کسی انتقامی جذبے کے باعث۔

مون کے ساتھ بھی کچھ یوں ہی ہوا تھا۔ تایا چلے گئے مگر مون کے اندر ہمیشہ تازہ رہنے والا زخم چھوڑ گئے۔ اور ان کے چلے جانے کے بعد ان کے گھر کا ماحول بھی کچھ اچھا نہیں رہا تھا۔ مما اور پاپا کی پہلی مرتبہ زندگی میں بحث ہوئی تھی۔ مما کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اسی وجہ سے پاپا نرمی برت رہے تھے ورنہ جو مما نے شور اٹھایا تھا وہ انہیں سخت گراں گزر رہا تھا۔ مما، مالا کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ یہ نہیں تھا انہیں مالا سے کوئی پرخاش تھی، وہ بس سوزن کے لیے اپنے دل میں کچھ زیادہ نرم گوشہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے پاپا سے پہلی مرتبہ بحث کی تھی۔

''میں سوزی کے لیے موتر سے بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔'' مریم نے بجھے سے انداز میں کہا تھا جیسے اس کی دیرینہ خواہش پوری ہونے سے دور ہو چکی تھی۔ مون اس وقت وہیں تھی اور وہ ٹھہر کر ان کی باتیں سننا چاہتی تھی۔

''مگر بات کی تو نہیں...... اور کرنا بھی نہیں...... میں سوزی کو بہو نہیں بنا سکتا......'' پاپا کا لہجہ اٹل تھا۔ جیسے وہ فیصلہ کر چکے تھے اور اب اپنے فیصلے سے ہٹنے

والے نہیں تھے۔ اس سے مون کو پاپا بہت ہی برے لگے تھے۔

''سوزی میں کیا برائی ہے؟'' مریم دکھی سی ہوگئی۔

''میں نے یہ نہیں کہا......'' پاپا برا مان گئے۔

''تو پھر......؟'' وہ رونے لگی تھی اور ماں کے آنسو مون کے دل پر گر رہے تھے۔ اس کا دل چاہا، وہ پاپا کو روک دے مگر بے بسی کے باعث کچھ نہیں کرسکی تھی۔

''میں بھائی صاحب سے بات کرچکا ہوں مریم......'' پاپا بھی جیسے بے بس ہوگئے تھے۔ مما کے آنسوؤں نے انہیں پگھلا دیا تھا۔

''آپ معذرت کرلینا...... پلیز، میری خاطر...... میں سوزی کو بہت چاہتی ہوں......وہ بہت اچھی بچی ہے۔ ایک ٹوٹے گھر کا درد اپنے دل میں رکھتی ہے۔ اسے یہاں محفوظ جگہ اور محبت کرنے والے لوگ مل جائیں گے۔'' مریم نے اپنے جذبات پاپا تک پہنچا دیے تھے۔ پاپا سوچ میں پڑ گئے تھے۔

''مریم! تم ایسا کیوں سوچتی ہو...... سوزی کی شادی میں خود کروں گا۔ تم سوزی کی فکر مت کرو۔'' پاپا کے لیے مما کو روتا دیکھنا بہت مشکل تھا۔ پھر مریم ان دنوں بہت بیمار تھی۔ اس کی رپورٹس کچھ بہتر نہیں آئی تھیں۔ مزید ٹیسٹ وغیرہ کروائے جارہے تھے۔ ان حالات میں وہ اسے کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے۔

''سوزی کے لیے عیسیٰ بہت مناسب ہے، وہ بہت تعاون کرنے والا سمجھدار لڑکا ہے۔ سوزی کے ساتھ اچھا رہے گا۔'' مریم، بھانجی کا مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتی تھی۔ جبکہ وہ عجیب دوراہے پر کھڑے ہوگئے تھے۔ ایک طرف بھائی کو زبان دے رکھی تھی اور دوسری طرف بیمار بیوی کی خواہش تھی۔ کچھ سوچ کر انہوں نے مریم کو مژدۂ جاں فزا سنا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے مریم......! تم عیسیٰ سے پوچھ لو...... میری بات...... چلو، خیر ہے، میں اپنے بھائی کو سمجھالوں گا۔ پر تمہاری خواہش کیسے رد کردوں۔'' پاپا عجیب ٹوٹے سے لہجے میں بولے تھے۔ مون کے لیے پاپا کے الفاظ بہت حیران کن تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی پاپا، مما کی خاطر تایا کو جواب دے دیں گے۔ اسے پاپا کی یہ کوئی سازش ہی لگتی تھی۔ شاید وہ مما کا دل نہیں توڑنا چاہتے تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ عیسیٰ خود ہی انکار کردے گا۔ کیا خبر، پاپا کی یہی پلاننگ ہو...... فی الوقت مون کوئی حتمی رائے قائم نہیں کرسکی تھی۔ پر پاپا کی دوراندیشی پہ اش اش ضرور کر اٹھی تھی۔ جیسے انہوں نے مما کو چکما دے دیا تھا۔ اب وہ انتظار میں تھی کہ مما کب عیسیٰ سے بات کرتی ہیں مگر اس سے بھی پہلے مما کی بھیانک رپورٹس آگئیں۔ انہیں کینسر تشخیص ہوا تھا۔ شاید پاپا کے ان جاننے کی وجہ بھی مما کی بیماری تھی۔ وہ مما کی تکلیف بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ مون نے غور کیا تو اسے احساس ہوا تھا، پاپا بہت دنوں سے بہت اجڑے، اجڑے ویران لگ رہے تھے۔ جیسے مما کی بیماری کا انہیں پہلے سے ہی شک تھا۔ پاپا کی حالت ایک طرف، عیسیٰ بھی بہت اذیت میں تھا اور خود مون بھی ماں کی بیماری کا سن کر اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔ مریم کی اذیت، درد اور بیماری نے انہیں پھر سے جوڑ دیا تھا۔ اور مریم کی بیماری کا موضوع ایسا تھا جس پر مون اپنے تمام اختلافات اور پاپا کے لیے دل میں موجود عناد کو بھی بھلا کر بات کرلیا کرتی تھی۔ ان دنوں بس مریم کی صحت اور زندگی ان سب کے لیے اہم ہوگئی تھی۔ باقی ہر بات ثانوی حیثیت اختیار کرگئی تھی۔ مما کا مہنگے سے مہنگا علاج جاری تھا۔ پاپا کاروبار بھلا کر مما کی پٹی سے لگ گئے تھے اور عیسیٰ کو اپنا کالج تک بھول گیا تھا۔ دن رات ماں کے گرد گھومنے کے سوا اس کا کوئی اور دوسرا کام نہیں تھا۔ جیسے وہ کسی خدشے کا شکار تھا کہ جوں ہی وہ مما کی نگاہ سے اوجھل ہوا۔ مما ان کے درمیان نہیں رہیں گی۔

اور اِدھر مون کی مشہور زمانہ چھٹی حس بھی خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔ اسے لگتا تھا، عیسیٰ کا خدشہ مجسم کھڑا ہونے والا ہے۔ ان کے دل جس خوف کا شکار تھے۔ وہی خوف موت کی آہٹیں لیے دھیرے، دھیرے ان کے گھر میں قدم رکھ رہا تھا۔ وہ عیسیٰ سے اپنے دل کی بات کہنا، عرصہ پہلے چھوڑ چکی تھی۔ ان کے درمیان تایا کے موضوع پر آخری مرتبہ جو بحث ہوئی تھی، اس کے بعد کوئی تکرار نہیں ہوئی۔ مون خود ہی عیسیٰ سے کھنچ گئی تھی اور اس سے دور، دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ حالانکہ اس نے بار ہا محسوس کیا تھا عیسیٰ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے، یقیناً مما کے موضوع پر بات کر کے اپنا دل ہلکا کرنا چاہتا تھا مگر مون اس کی خواہش کو پیروں تلے روندتی رہی تھی۔ اس نے عیسیٰ سے جو فاصلہ روا رکھا تھا اس میں کمی نہیں آنے دی تھی بلکہ اسے اور ہی بڑھا لیا تھا۔

مالا کے لیے ان کے گھر میں جو چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوئی تھیں ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مما کی بیماری کے ساتھ ہی گویا ہر موضوع خود بخود بند ہو گیا تھا مگر ایک روز جب مما کو اسپتال ایڈمٹ ہوئے چوتھا دن تھا مما نے خود ہی عیسیٰ کو بلا کر سوزن کے متعلق بات کر لی تھی وہ جیسے اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھیں اور بیٹے کی زندگی کا کوئی فیصلہ کر لینا چاہتی تھیں۔ اِدھر عیسیٰ جیسے عجب مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایک طرف مما تھیں، ان کی آخری خواہش تھی اور دوسری طرف پاپا اور اس کی پہلی محبت...... فیصلہ مشکل تھا، انتہائی پُر اذیت تھا۔ جیسے رشتوں کا پل صراط...... آخر وہ کس کا انتخاب کرتا؟ کسے چُنتا؟ ماں کی آنکھوں میں امید بجھتی دیکھنے کا بھی حوصلہ نہیں تھا اور پاپا کا سر جھکانے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ یہ وہ گھڑی تھی جب اس نے بڑی شدت کے ساتھ اپنے اللہ کو پکارا تھا۔ وہ ٹھیک فیصلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتا تھا۔ اسی لیے اللہ سے مدد مانگ رہا تھا...... اور اللہ جو شہ رگ سے بھی قریب تھا۔ کیسے نہ عیسیٰ کی پکار پہ پہنچتا...... ! جیسے فیصلے کی مشکل ساعت اس کے لیے آسان ہو گئی تھی۔ جیسے وہ پل صراط سے آنکھیں موند کر ہی گزر گیا تھا۔ دماغ نے ایک دلیل دی تھی اور دل نے اس پر مہر ثبت کی۔ وہ ماں کی ہتھیلیاں چومتا، ماں کے پیروں پر جھک آیا تھا۔

”آپ کی خواہش سر آنکھوں پر مما! جو آپ چاہیں گی، وہی ہوگا مگر پہلے آپ ٹھیک تو ہو جائیں۔“ اس کے الفاظ نے بسترِ مرگ پر پڑی مریم کو نہال کر دیا تھا۔ وہ جو دنوں میں بیماری کے ہاتھوں چت ہو گئی تھی۔ جانے کب سے کینسر جیسا ناسور اس کے اندر پل رہا تھا۔ وہ چھوٹی موٹی تکلیف کو نظر انداز کرتی آئی تھی۔ جس کا نتیجہ آج بھگت رہی تھی۔ فی الوقت علی عیسیٰ کے الفاظ نے مریم کے اندر زندگی کی برقی لہر دوڑا دی تھی۔ اس نے بیٹے کی پیشانی چوم کر کہا۔

”اتنی مہلت نہیں میری جان...... ! بس سوزی کی زندگی کو محفوظ دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ بہت اچھی اور شفاف لڑکی ہے۔ مجھے خوف ہے بھٹک نہ جائے۔“

مریم نے جیسے اپنے اندر کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ اس لیے بھی سوزی کو بہو بنانا چاہتی تھی کہ کہیں ماحول کا طلسم اور حالات کی کٹھنائیاں اسے دلبرداشتہ نہ کر دیں، وہ بھٹک نہ جائے۔ یہاں کے رنگ میں رنگ نہ جائے۔ اس کا خالص پن کھو نہ جائے۔ محبت میں ناکامی اس کی راہیں نہ کھوٹی کر دے۔ وہ سوزن کے جذبات سے باخبر تھی مگر مون کے جذبات سے قطعاً بے خبر تھی۔

”سوزی نہیں بھٹکے گی مما! آپ اس وہم میں نہ پڑیں۔ وہ سچی اور اچھی لڑکی ہے۔ اپنے مذہب پر ثابت قدمی سے چل رہی ہے۔ کوئی بھی رکاوٹ اسے ڈگمگا نہیں سکتی۔“ عیسیٰ نے نرمی سے کہا تھا۔ در پردہ اس نے مریم کو احساس دلایا تھا۔ وہ سوزن کی مذہبی روح کو نظر انداز نہ کریں۔ سوزی اپنے مذہب

پہ کچھ بھی قربان کر سکتی ہے۔

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔'' مریم جیسے گہری سوچ میں پڑ گئی تھی۔ یہ پہلو ایسا نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جاتا اور یہ بھی سچ تھا۔ وہ عیسائی بہولانے کے حق میں نہیں تھی۔ وہ عیسیٰ کے بچوں کو کسی گڑھے میں کیونکر پھینکتی۔ آخر شادی کے بعد بچے تو ہونے تھے پھر ماں اور باپ کے درمیان لٹکی تلوار کو کیسے اِدھر اُدھر کرتے۔ مذہب جو واضح حقیقت تھا۔ ایک طرف باپ ہوگا...... صوم وصلوٰۃ کا پابند...... ایک کھرا اور سچا مسلمان...... اور دوسری طرف ماں ہوگی۔ ایک کٹر مذہبی، عیسائی... بچے آخر کسے درست سمجھیں گے؟ کیا یہ باریکیاں نظر انداز کرنے والی تھیں؟ مریم لمحہ بھر کے لیے گم صم رہ گئی تھی۔ لوہا گرم تھا...... پھر ذرا سی چوٹ سے اور نرم ہو جاتا۔ علی عیسیٰ نے سابقہ نرم، حلیم اور محبت بھرے لہجے میں ماں سے کہا۔

''مجھے سوزی سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں...... شرط یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کرلے۔ جیسے آپ نے اسلام قبول کیا تھا پھر اسی رستے کو سچا تسلیم کیا...... اور اسی راہ پر چلتی رہیں......'' عیسیٰ نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ مریم خاموش ہو کر اسی پہلو پر سوچتی رہی۔ عیسیٰ کی ڈیمانڈ کچھ غلط نہیں تھی۔ اس نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ مریم دل سے قائل ہوگئی...... پھر اس نے اپنی ماں سے بات کرنے کا ارادہ کرلیا تھا مگر اس سے بھی پہلے بلی کی چال چلنے والی مون نے ان ماں، بیٹے کی پوری بات من وعن سن کر سوزن کو فون کھڑکا دیا۔ وہ کب سے سوزن کے روبرو بیٹھ کر بات کرنا چاہتی تھی مگر ماں کی بیماری کی وجہ سے اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کا نخرہ، غرور، نخوت یا پاپا اور عیسیٰ پر غصہ ایک طرف، ماں سے مون کو بھی شدید قسم کی محبت تھی...... اور مریم کی تکلیف نے اسے کچھ عرصے تک کے لیے بہت کچھ بھلا رکھا تھا۔ حتیٰ کہ پروفیسر بشر کو بھی...... جو مریم کی عیادت کے بہانے کئی مرتبہ آیا تھا اور جسے حسیب احمد نے روبرو بلا کر دوٹوک انداز میں اپنے گھر آنے سے منع کر دیا تھا۔ پاپا نے اپنے بھائی کی تنبیہ کو بھلایا نہیں تھا۔ مون کو پاپا کا رویہ برا لگا تھا۔ گھر آئے مہمان کو بے عزت کرنے کا انہیں کیا حق پہنچتا تھا۔ وہ اس وقت تو خاموش رہی تھی مگر بعد میں پاپا سے بھی الجھ گئی تھی۔ اس نے انہیں ٹھوس لفظوں میں کہا تھا کہ وہ پروفیسر کے خلاف دل میں تایا کی وجہ سے بغض نہ رکھیں...... دراصل تایا، پروفیسر کو ناپسند کر گئے تھے۔ اب زمین اِدھر سے اُدھر ہو جاتی۔ پاپا نے کبھی پروفیسر کو پسندیدگی کی سند نہیں بخشنی تھی۔ اور جسے تایا اور پاپا ناپسند کر چکے تھے، مون بس انہی کی ضد میں اس شخص کو اچھا ثابت کرنے پر تل گئی تھی۔ پاپا نے اس کی خاطر تایا سے جنگ نہیں کی تھی بلکہ ہتھیار پھینک دیے تھے اور تایا نے اسے دھتکارا تھا، اپنے بیٹے کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ سو یہ دونوں شخص مون کے لیے باعثِ اذیت بنے تھے۔ وہ ان دونوں کو تکلیف دے کر حظ اٹھانا چاہتی تھی۔ وہ کیسی نادان، احمق اور خسارے اٹھانے والی تھی۔ خود کو عقلِ کُل سمجھ کر بھی نادانیاں کرتی رہی......

فی الحال پاپا نے اسے پروفیسر کی حمایت پہ جھاڑا نہیں تھا۔ دراصل مما کی بیماری نے ان کی سدھ بدھ بھلا رکھی تھی۔ وہ بے شمار گھریلو معاملات سے دور ہو چکے تھے۔ ان دنوں پاپا کو مما کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ اور عیسیٰ بھی ہمہ وقت اسپتال میں رہتا تھا۔ یہ وہی دن تھے جب پروفیسر نے مون حسیب کے گرد اپنی ہمدردیوں کا جال پھینک کر اسے اپنے بس میں کرلیا تھا۔

پروفیسر روزانہ ان کے گھر آجاتا تھا۔ وہ دو تین گھنٹے بیٹھتا اور مون سے ہر ٹاپک پر بات کرتا۔ یوں ہی باتوں، باتوں میں اس نے انتقالِ افکار کی برقی لہروں کے باعث مون سے بہت کچھ اگلوا لیا تھا۔ وہ کم عمر اور نادان تھی۔ پروفیسر ایک گھاگ شکاری

تھا۔ وہ مون کی کچی کلی جیسی محبت کی بُو بھی پا گیا تھا۔ اپنے پاپا، بھائی، تایا اور ہونے والی بھابی کے لیے مون کی بیزاری، بدگمانی اور نفرت بھی جانچ گیا تھا پھر اس نے مون کے گرد اپنی ہمدردی کا جال پھینکا تھا۔ وہ پوری دنیا میں پروفیسر کے علاوہ کسی اور کو اپنا ہمدرد نہیں سمجھتی تھی حالانکہ اس کی چھٹی حس اپنا مخصوص خطرے والا الارم بجاتی رہی تھی اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا جو اس نے چھٹی حس کے الارم پر کان نہیں دھرے تھے۔ حالانکہ یہ اللہ کی طرف سے اسے جو صلاحیت ملی تھی وہ اس کی زندگی کو امان میں رکھے ہوئے تھی۔ خطرات سے پہلے اسے الرٹ کرتی تھی اور اس کے اعصاب کو آنے والے حالات کے لیے پہلے سے تیار کر دیتی تھی مگر یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا جو اس نے الارم کی آواز سن کر بھی اپنے کان بند کر لیے تھے۔ جس کا مطلب تھا، وہ کچھ سننا ہی نہیں چاہتی۔

پروفیسر کو گفتگو کا فن آتا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لا کر مریم کی طویل عمری کے لیے دعائیں کرتا۔ مون کے ساتھ بیٹھ کر دکھی ہوتا اور اس کی تنہائی پر افسوس کرتا تھا۔ مما کی بیماری کے مہینوں میں پروفیسر، مون کے دل میں اپنا ایک الگ مقام پا چکا تھا۔ اب وہ پروفیسر سے ہر قسم کا مشورہ کرنے لگی تھی اور گھر کی ہر بات اسے ضرور بتاتی تھی۔

عیسٰی اور مما کے درمیان ہونے والی گفتگو کو اس نے پروفیسر سے شیئر کیا تھا اور پروفیسر کے مشورے پر ہی اس نے سوزن کو فون کھڑکا دیا تھا۔ دراصل پروفیسر نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ سوزن کو عیسٰی سے اظہارِ محبت کرنے پر مجبور کرے...... اس طرح سوزن بھی مون کو اپنا خیر خواہ سمجھے گی مگر جب مون نے سوزن کو نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ مشورہ دیا تو وہ چھتے سے ہی اکھڑ گئی۔ سوزن نے اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

''عیسٰی سے محبت اپنی جگہ...... مگر میں اپنی انا کو زمیں بوس نہیں کر سکتی۔'' سوزن کا جواب نہایت ٹھوس تھا۔ مون کو شدید غصہ آ گیا۔ اس پل اسے سوزن کی بکواس، انا، خودداری اور عزتِ نفس پر بھی شدید تاؤ چڑھا تھا۔

''تو پھر عیسٰی کو گنوا دینا۔'' مون نے چیخ کر کہا۔

''وہ نصیب میں ہوا تو ضرور ملے گا۔'' سوزن کا یقین بھی ہلکا نہیں تھا۔ مون لال انگارہ ہو گئی تھی۔

''تمہارا صبر...... تمہیں لے ڈوبے گا۔ جانے کس خمار میں ہو تم...... خود سے کوشش نہیں کرو گی تو عیسٰی تمہارے قدموں میں نہیں گرے گا۔'' مون کو زہر چڑھ گیا تھا۔ یہ پروفیسر کی پڑھائی پٹیاں تھیں جنہیں وہ دُہرا رہی تھی۔

''صبر کسی کو لے کر نہیں ڈوبتا...... کیسی سوچ ہے تمہاری، جانے کن لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگی ہو، پہلے تو ایسی نہیں تھیں۔'' سوزن جیسے حیرانی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مون کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

''میں پہلے بھی ایسی ہی تھی۔'' اسے غیظ چڑھ گیا تھا۔

''نہیں...... اب بدل گئی ہو......'' سوزن جیسے سوچ، سوچ کر بول رہی تھی۔ مون اسے موضوع سے ہٹتا دیکھ کر بگڑ کر بولی۔

''کام کی بات کرو، جو تم کرنا نہیں چاہتیں...... عیسٰی کا رشتہ پاپا نے طے کر دیا ہے۔'' اپنے تئیں اس نے دھما کا کیا تھا مگر سوزن جیسے نارمل ہی رہی...... بڑے کمال کا صبر رکھتی تھی۔ ایک کلمہ پڑھ لیتی تو سیدھی جنتی ہوتی مگر اس نے کہا بھی تو کیا۔

''جانتی ہوں میں...... پر کیا کر سکتی ہوں۔'' پہلی مرتبہ اس کی آواز میں نمی بھر گئی تھی۔ مون کو جیسے حوصلہ ہوا۔

''بہت کچھ کر سکتی ہو...... اگر تم چاہتی ہو تو......'' مون کا لہجہ پُر جوش تھا۔ جیسے وہ سوزن کو بہترین حل بتانے والی تھی۔ دوسری طرف سوزن

ضبط کی گہری سانسیں کھینچ رہی تھی۔ اس محبت پر صبر کرنا آسان کہاں تھا؟

''کیا......؟'' سوزن غائب دماغی سے بولی۔

''تم عیسیٰ سے کہو کہ تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتیں اور تم خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔'' مون نے بڑا ٹھوس حل اسے بتایا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے چپ سی کر گئی تھی۔ اس کی خاموشی نے مون کو کچھ اور شہ دی تھی۔

''عیسیٰ اتنا نرم دل ہے کسی کو اپنی وجہ سے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ تم مرنے کی دھمکی دو گی تو وہ آسانی سے مان جائے گا۔ مجھے یقین ہے۔'' مون اسے نئی راہ دکھا رہی تھی۔ یہ راہ نسبتاً آسان بھی تھی......صرف دھمکی تو دینا تھی۔ عمل تو نہیں کرنا تھا اور سوزن کو یقین تھا، یہ دھمکی بہت کارگر ثابت ہوسکتی تھی۔ عیسیٰ کا دل بڑا ہی نرم تھا۔ بہت نرم، سچا اور خالص دل...... وہ اپنی وجہ سے سوزن کو قبر میں بھی نہ اترنے دیتا...... وہ مالا سے محبت بھلا کر سوزن سے شادی بھی کر لیتا پھر عمر بھر کبھی جتاتا بھی نہیں کبھی طعنہ بھی نہ دیتا......مگر سوزن بھلا اپنے ضمیر کا کیا کرتی؟ جو اسے دن رات کچوکے لگاتا۔ راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ ذہنی طور پر اسے بے آرام کرتا اور پھر سوزن بھلا عیسیٰ کے ساتھ سے کیا خوشی پاتی؟

''میں اسے خودکشی کی دھمکی نہ بھی دوں تب بھی تانتے (مریم) کی خاطر وہ مجھ سے شادی کے لیے رضامند ہوجائے گا۔ مگر کیا ہے مون کہ میں نے عیسیٰ سے خود شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔'' بہت دیر مون کی تقریر سن لینے کے بعد سوزن نے گویا بم مون کے سر پر بلاسٹ کیا تھا۔ وہ جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''تم نے انکار کر دیا...... تم پاگل تو نہیں؟'' مون جیسے چیخ پڑی تھی۔

''میں پاگل نہیں......'' وہ مطمئن تھی۔

''تو پھر کیا ہو......؟'' مون کو پھر سے غیظ چڑھ گیا تھا۔ سوزن کی حرکتیں کبھی کبھی ناقابلِ برداشت ہوجاتی تھیں۔ وہ سوزن کے لیے اتنی محنت کر رہی تھی مگر سوزن......؟

''میں صرف اپنے اندر ضمیر رکھتی ہوں۔'' سوزن کے جواب نے مون کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی۔ اس سے کوئی اور بات نہیں بن پائی۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ دھیرے سے بولی۔

''تم پاگل ہو یقیناً......'' مون کی آواز سرگوشیانہ قسم کی تھی۔ سوزن کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''میرا جواب وہی ہے۔ سوزن باضمیر ہے۔'' اس نے آنکھ کے کونے صاف کر لیے تھے۔ جب فیصلہ ہوچکا تو پھر پچھتانا کیسا......؟ اس نے اس محبت کو سر کا بھوت نہیں بنایا تھا شاید اسی لیے مطمئن تھی۔

''ہونہہ...... جھوٹ مت بولو...... تمہاری محبت ہی پانی کا بلبلہ ہے۔ دراصل اہلِ مغرب کی عورتوں کو محبت کرنا ہی نہیں آتا۔ اگر کرتی بھی ہیں تو محض ڈھکوسلا......'' مون نے زہر خند ہو کر کہا تھا۔ کہاں تو عیسیٰ پر وہ جان وارتی تھی۔ اوائل عمری سے ہی چپکے چپکے اسے چاہنے لگی تھی۔ بہت سالوں سے عیسیٰ کے لیے اپنے من میں محبت کا جذبہ رکھے ہوئے تھی۔ اور اب ضمیر کا ٹنٹنا لگا کر جیسے جان چھڑوانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید سوزن کی نظر کسی اور پر ٹک گئی تھی۔ وہ میکس وان یا پھر کوئی اور ایرا غیرہ...... بھی تو آج نگاہیں بدل گئی ہیں۔'' لگتا ہے، سوزن نے کوئی اور تاڑ لیا ہے جو عیسیٰ سے بڑھ کر شاندار ہوگا......؟'' یہ مون کے اپنے انداز ے تھے جو کسی کیچڑ میں لتھڑے جوتے کی طرح ہی مون کے منہ پر آ پڑے تھے۔ اس کے کانوں نے سوزن کی آواز سنی تھی۔ وہ جیسے لمحے بھر کے لیے دم بخود رہ گئی۔

''میں عیسیٰ کی خاطر ہر قربانی دے سکتی ہوں...... میں علی عیسیٰ کی خاطر عیسیٰؑ اور مقدس انجیل کو

نہیں چھوڑ سکتی۔ عیسیٰ کہتا ہے میں اسلام قبول کرلوں جبکہ میں اسلام قبول نہیں کرسکتی۔ میرے اور عیسیٰ کے رستے جدا ہیں۔ ہم کبھی مل نہیں سکتے۔ اور میں اجنبی راہوں پر اندھا دھند دوڑنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' سوزن نے بہت ٹھوس، مفصل اور جامع جواب دیا تھا۔ مون جیسے اپنا سامنہ لے کر رہ گئی تھی۔

''جہنم میں جاؤ۔'' جب کچھ اور نہ سوجھا تو مون نے غیظ کے عالم میں فون بند کردیا تھا۔

☆☆☆

سوزن کا معاملہ جہاں سے شروع ہوا تھا وہیں ختم ہوگیا۔ مریم نے سوزن کو بہت سمجھایا تھا مگر اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ وہ اپنے مذہب کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے محبت کو مذہب پر قربان کردیا تھا۔ وہ بواریا کی عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی، اس نے سپر لگژری لائف کو ٹھوکر ماردی تھی۔ اور گروسی کے باڑے میں اپنے لیے مصروفیت ڈھونڈلی...... چرچ کے علاوہ گروسی کا باڑا اس کی واحد پناہ گاہ تھا۔ وہ خود کو بھینسوں اور بکریوں کے ساتھ مصروف رکھتی۔

مون نے اپنے تئیں سوزن پر لعنت بھیج دی تھی، جب اسے اپنی محبت کا خود احساس نہیں تھا تو پھر مون کیوں کڑھتی...... مگر پروفیسر بشر نے اسے ہتھیار پھینکنے سے منع کردیا تھا۔ پروفیسر کا خیال تھا، سوزن وقتی طور پر جذباتیت کا شکار ہے۔ جلد اسے اپنی غلطی کا ادراک ہوجائے گا مگر تب تک کوئی رستہ نہیں بچے گا۔ سو مون کو چاہیے وہ پتھر میں سوراخ کرتی رہے۔ اور سوزن کو عیسیٰ کے حوالے سے قائل کرلے...... مون نے اپنے کریہہ منصوبے کو پروفیسر سے بھی شیئر کیا۔ مالا اور عیسیٰ کی شادی کے بعد ان کی طلاق اور پھر عیسیٰ کو سوزن کی طرف مائل کرنا...... پلاننگ ایک دم مضبوط تھی۔ کہیں بھی جھول نہیں تھا۔ وہ یقیناً جلد کامیابی پاجاتے مگر ایک صبح اچانک مریم کا انتقال

ہوگیا۔ یہ صدمہ مون کے لیے بہت بھیانک تھا۔ وہ مہینوں ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہی تھی باقی پاپا اور عیسیٰ پر کیا بیت رہی تھی۔ ایک بیٹی اور بہن ہونے کے ناتے بھی اسے مہینوں پتا نہ چلا...... عیسیٰ شدید بیمار پڑ گیا تھا۔ مما کی جدائی نے اسے ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب کردیا تھا۔ پاپا، مما کا غم بھول کر عیسیٰ کی فکر میں لگ گئے تھے مگر وہ سنبھلنے میں نہیں آرہا تھا۔ اسپتال سے گھر آکر سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتا یا پھر اسٹوڈیو میں وقت گزارتا...... پاپا کے لیے عیسیٰ کی تکلیف بہت اذیت ناک تھی پھر انہوں نے عیسیٰ کا دل بہلانے کا یوں سامان کیا کہ اسے گروسی کی طرف بواریا بھجوادیا تھا۔ خود وہ اتنے مہینوں بعد دفتر کیا گئے کہ پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے تھے۔ اگرچہ وہ مون سے بے نیاز ہرگز نہیں تھے مگر مون خود ہی ان سے کترائی، کترائی رہتی تھی۔ باپ سے ایسی بدگمان ہوئی کہ دوبارہ ان کے قریب آہی نہیں سکی تھی۔ وہ بھی خسارے میں جاتے کاروبار کے غم میں گھلنے لگے تھے۔ عدم توجہی کے باعث کاروبار میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ بزنس کی فکر نے انہیں گھر سے دور نہیں کیا تھا۔ وہ مون کے لیے دن میں کئی مرتبہ فون کرتے تھے۔ نینی سے پورے دن کی رپورٹ لیتے...... مون کیا کرتی ہے؟ اسکول سے کب آتی ہے؟ اور گھر میں تعزیت کے لیے کون، کون آرہا ہے؟ گھر اور کاروبار کو ایک ساتھ دیکھنا بہت مشکل تھا مگر پھر بھی زندگی کی گاڑی آگے بڑھنے لگی تھی۔

یہ وہی حالات تھے جب مون نے پروفیسر سے باقاعدہ بات چیت کا آغاز کرلیا تھا۔ پروفیسر کبھی کبھار گھر بھی آجاتا۔ مگر مون نے نینی کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ پاپا کو پروفیسر کے متعلق کچھ نہیں بتانا۔ وہ نینی کا منہ نوٹوں سے بھردیتی تھی سو نینی بھی لالچ میں آکر پاپا سے بہت کچھ چھپالیتی۔

عیسیٰ ابھی تک بواریا میں تھا...... اس کا دل

گروسی کے گھر میں خوب لگتا تھا۔ پھر گروسی ہمہ وقت مریم کی باتیں کرتی رہتی تھیں...... ''میری ایسی تھی، میری کو یہ ناپسند تھا، میری بہت باہمت لڑکی تھی، وہ شادی سے پہلے میرے ساتھ بواریا میں بہت کام کرتی تھی...... چھٹیوں میں گھر آتی اور میرے مہینے بھر کے کام کرجاتی۔'' گروسی کے لیے بھی بیٹی کی جدائی کا صدمہ معمولی نہیں تھا۔ وہ مریم کی یاد میں آبدیدہ رہتیں...... عیسیٰ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مما کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا، وہ ہر وقت مما کی باتیں کرے...... مما کی باتیں سنے...... کبھی کبھار تانتے بھی گفتگو میں حصہ لے لیتی۔ تانتے شوہر سے علیحدگی کے باعث اب مستقل یہیں آچکی تھی۔

سوزن کا رویّہ البتہ بہت مختلف تھا۔ وہ روزمرہ کام سرانجام دیتے ہوئے چپکے، چپکے علی عیسیٰ کو دیکھتی رہتی۔ عیسیٰ کی بھیگی آنکھیں...... ضبط کی شدت سے سرخ چہرہ سوزن کو بہت اذیت میں مبتلا کردیتا تھا۔ اس کا دل چاہتا، وہ کوئی ایسا گیت گائے، کوئی ایسا نغمہ سنائے کہ علی عیسیٰ کی آنکھوں میں مسکراہٹ بھر جائے...... مگر اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کی یہ خواہش ہمیشہ ادھوری ہی رہی۔

ایک دن آبشار کی طرف جاتے ہوئے پھولوں کے کھیت میں سے گزرتی سوزن نے عیسیٰ سے سوال پوچھا۔

''کیا مالا نے تمہیں میری تانتے کی وفات کے لیے تعزیتی فون کیا......؟'' وہ دونوں پھولوں کی مختلف قسموں پر بات کررہے تھے۔ وہ بلب کی شکل کے ٹیولپ کو دیکھ رہا تھا جب سوزن نے موضوع کے برخلاف اِک انوکھی بات کہی تھی۔ تب عیسیٰ قدرے حیران رہ گیا تھا۔

''نہیں تو......'' وہ جو آبشار کی گھنٹیاں بجاتی آواز سن رہا تھا ایک دم ٹھٹک سا گیا۔ ''ہماری کون سا کبھی بات ہوئی ہے جو وہ مجھے فون کرتی۔'' عیسیٰ کو وضاحت دیتے ہوئے اپنا لہجہ کھوکھلا سا لگا تھا۔ کیا مالا کو اسے فون کرنا چاہیے تھا؟ آخر وہ اس کی منگیتر تھی...... اور مما کی وفات کا ایک تعزیتی فون تو کرویتی، اس کا حق یا فرض تو بنتا تھا مگر اس نے شاید ضروری نہیں سمجھا ہوگا۔ باقی لوگوں نے تو فون کیے ہی تھے مگر مالا کی طرف سے کوئی خصوصی کال نہیں آئی تھی۔ وہ چاہے دوبارہ کبھی بات نہ کرتی مگر ایک مرتبہ مما کے لیے تو ضرور کرتی؟ عیسیٰ کے ذہن میں بھی یہ سوچ بالآخر ابھر آئی تھی...... اگرچہ سوزن کا مقصد اسے مالا سے بدگمان کرنا نہیں تھا۔ وہ تو صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ آیا عیسیٰ اور مالا کے درمیان کوئی ٹیلی فونک رابطہ ہے یا نہیں......؟

''تو کیا خط بھی نہیں لکھا؟ فون کرتے ہوئے شاید وہ شرماتی ہو مگر خط تو ضرور لکھتی۔'' سوزن نے بے پروائی سے ٹیولپ کے ڈھیروں پھول بڑے سے ٹوکرے میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ مشین کے ذریعے پھولوں کی کٹائی کررہی تھی۔ کچھ دیر بعد ٹرک آجاتا اور پھر انہی پھولوں کو مختلف کیمیکل لگا کر سائنٹیفک طریقے سے محفوظ کرکے مختلف شہروں اور ملکوں میں بھیجا جاتا تھا۔ وہ اپنے کام میں بہت مصروف تھی تاہم اس کا دھیان عیسیٰ کی طرف بھی ضرور تھا۔ جو ایک دم ذرا گم صم سا ہوگیا تھا۔ سوزن کو کچھ افسوس ہوا۔ اس نے مالا کا ذکر کرکے عیسیٰ کو افسردہ جو کردیا تھا۔

''اچھا، یہ بتاؤ، واپس کب جاؤ گے؟'' سوزن نے فی الفور گفتگو کا موضوع بدل دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، اس نے عیسیٰ کو دکھی کردیا ہے۔ وہ خود کو ملامت کررہی تھی۔

''لگتا ہے، تم بیزار ہوچکی ہو مجھ سے۔'' عیسیٰ پھیکے سے لہجے میں مسکرا رہا تھا۔ حقیقتاً مالا کے متعلق سوچتے ہوئے وہ کچھ ڈسٹرب ہوگیا تھا۔ یعنی مالا کے نزدیک اس کی اتنی بھی امپورٹنس نہیں تھی؟ پھر عیسیٰ نے سوچا، کیا خبر...... وہ شرماتی ہو...... اور پاکستان

میں شادی سے پہلے فیانسی (منگیتر) سے بات کرنے کو برا خیال کیا جاتا ہو۔

''ایسی بات تو نہیں...... میں تو مون کے خیال سے کہہ رہی ہوں...... وہ آج کل بہت عجیب ہو چکی ہے۔'' سوزن نے مون کا ذکر چھیڑ کر علی عیسیٰ کو.... بے قرار کر دیا تھا۔ اپنے صدمے میں گم وہ مون کو تو یکسر بھول چکا تھا۔ آخر مون کا غم بھی تو کم نہیں تھا۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی......؟ کیا کرتی ہوگی؟ وہ تو جیسے لمحوں میں بے تاب ہو گیا تھا۔

''میں آج واپس جا رہا ہوں......'' اس نے کھڑے، کھڑے جیسے فیصلہ کر لیا تھا۔ سوزن قدرے متفکر ہوئی۔

''اتنی جلدی......؟ میں نے تو ایسے ہی ایک بات کہی تھی۔ تم ابھی کچھ دن تو رہو......'' سوزن نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ اس کی بات سن کر اچانک تیار ہو جائے گا، یہ تو سوزن نے نہیں چاہا تھا۔

''نہیں، مجھے گھر جانا ہے۔ نہ جانے مون کس حال میں ہوگی؟'' وہ بے قرار سا گھر کی طرف چلنے لگا تھا۔ سوزن مشین بند کر کے اس کے پیچھے بھاگی آئی تھی مگر عیسیٰ پھر بھی رکا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ گردسی اور تانتے نے بھی اسے بہت روکا تھا مگر وہ اسی سہ پہر گھر چلا آیا تھا۔ سارے رستے بھی مون کے لیے سوچتا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن مما کے بعد کتنی اکیلی تھی اور وہ اپنے صدمے میں گم اس کی فکر بھلائے بوار یا کی... ہریالیوں میں ماں کی یادیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ حالانکہ زندہ لوگوں کو اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ پاپا جو مما کے بعد بکھر گئے تھے اور خود کو سنبھالنے کے بجائے عیسیٰ کے غم میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اسے اچانک پاپا کی تنہائی اور مون کے اکیلے پن کا احساس بے قرار کر گیا تھا۔ اگر سوزن احساس نہ دلاتی تو وہ ابھی تک اپنے صدمے میں ہی مگن رہتا۔ اسے اب خیال آ رہا تھا۔ پاپا اور مون کو اس کی کس قدر ضرورت تھی اور وہ ان کو سنبھالنے کے بجائے خود بھی جیسے بوجھ بنا پھر رہا تھا۔ انہی سوچوں کے درمیان الجھتا جب وہ گھر پہنچا تو پہلا ٹاکرا نینی سے ہوا تھا۔ جو عیسیٰ کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ جیسے اسے عیسیٰ کے چلے آنے کی امید نہیں تھی۔ عیسیٰ اس کی گھبراہٹ کو نظر انداز کرتا آگے بڑھا تو لاؤنج سے آتی پروفیسر کی بلند آواز پر ٹھٹک گیا۔

''یہ پھر یہاں آیا ہوا ہے......؟'' عیسیٰ کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ دراصل پروفیسر کو دیکھ کر اسے پہلے بھی اتنا ہی غصہ آیا کرتا تھا مگر تب وہ مروتاً خاموش ہو جاتا۔ مگر اس وقت پروفیسر کو دیکھ کر اس کا بھڑک جانا فطری عمل تھا۔ پاپا اور عیسیٰ کی غیر موجودگی میں اول تو وہ آتا ہی نہیں...... آیا بھی تھا تو پاپا کو نہ پا کر واپس چلا جاتا۔ مون کے پاس بیٹھنے کی اسے ضرورت کیا تھی؟ اور پھر مون نے اسے بٹھایا ہی کیوں تھا؟ وہ جانتی بھی تھی کہ پاپا اور عیسیٰ دونوں کو پروفیسر سے سخت نفرت ہے۔ وہ پروفیسر بشر کے لسوڑے سے جان چھڑاتے پھر رہے تھے۔ اور مون نے اسے گھر بٹھا رکھا تھا پھر بھلا عیسیٰ کو غصہ کیوں نہ آتا۔

''تمہیں منع بھی کیا تھا، تم پھر منہ اٹھا کر پہنچ گئے ہو۔'' عیسیٰ نے غضبناک تیور لیے پروفیسر کو گھورا تھا۔ وہ ایک دم بوکھلا کر صوفے سے اٹھ گیا۔ اسے امید نہیں تھی، علی عیسیٰ اچانک آجائے گا۔ تبھی شدید گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''میں مون کی خبر گیری کرنے آیا ہوں...... بیچاری ماں کے بعد بہت اکیلی ہوگئی ہے۔'' پروفیسر نے مون کے لیے گہری ہمدردی جتائی تھی جبکہ اس کے الفاظ نے عیسیٰ کو اور بھی آگ بگولا کر دیا تھا۔

''بکواس بند کرو اپنی...... مون کی خبر گیری کے لیے اس کا بھائی اور باپ ابھی زندہ ہے۔ سو تمہیں تردد کرنے کی ضرورت نہیں...... نکلو میرے گھر سے۔'' عیسیٰ کا چہرہ لال بھبھوکا ہو چکا تھا۔ اس نے پروفیسر کا گریبان

پکڑ کر اسے زور سے جھٹکا دیا تھا۔ پروفیسر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پایا تھا۔ تبھی منہ کے بل گر پڑا۔ عیسیٰ نے جھک کر اس کی کمر پر مکا رسید کیا تھا۔

''اب دوبارہ اپنی شکل دکھائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' پروفیسر کی جھکی کمر پر لاتیں، گھونسے اور مکے رسید کر کے وہ ہانپنے لگا تھا۔ دراصل پروفیسر توازن برقرار نہ رکھ سکنے کی وجہ سے اب اپنا بچاؤ بھی نہیں کر پایا تھا اور عیسیٰ کے ہاتھوں بری طرح سے پٹ رہا تھا۔ صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ مون دم بخود رہ چکی تھی۔ وہ عیسیٰ کو روکنا چاہتی تھی مگر روک نہیں پائی۔ بے بسی کے عالم میں پروفیسر کی دُرگت بنتی دیکھ رہی تھی۔

''اپنا یہ شیطانی وجود لے کر یہاں سے گم ہوجاؤ۔ دوبارہ کبھی مجھے کہیں بھی دکھائی مت دینا۔'' عیسیٰ کو جنون چڑھ گیا تھا سو پروفیسر کا بچنا مشکل تھا۔ وہ پروفیسر کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ تب پروفیسر بھی جوابی حملے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مکے اور گھونسے مارے تھے مگر پروفیسر کو چونکہ زیادہ چوٹیں لگی تھیں تبھی وہ جلدی نڈھال ہوگیا تھا۔

''تم نے اچھا نہیں کیا عیسیٰ...... میں تمہارا وہ حشر کردوں گا، تمہیں پاگل کردوں گا...... تمہیں بھی اتنا ہی ذلیل کروں گا جتنا تم نے مجھے کیا......'' وہ خون آلود ناک کو پکڑے ہوئے دہاڑ رہا تھا۔ جیسے کسی زخمی کتے کی طرح بھونک رہا تھا۔ عیسیٰ نے اسے ٹھوکریں مار، مار کر سڑک پر پھینک دیا تھا۔

''یہ ذلت تمہیں ہمیشہ یاد رہے گی۔ ویلس ہاؤس کی طرف اب کبھی قیامت تک رخ نہ کرنا۔'' عیسیٰ اپنی شرٹ جھاڑتا پروفیسر پر تھوک کر اندر چلا گیا تھا جبکہ پروفیسر باہر آدھا گھنٹا بھونکتا رہا۔

''اس ذلت کو میں کبھی بھلاؤں گا نہیں...... اور تمہیں بھی اتنا ہی ذلیل کروں گا۔'' پروفیسر خون کی تھوکیں سڑک پر پھینکتا رہا ''تو میری دی گئی ذلت کو عمر بھر نہ بھول پائے گا۔'' پروفیسر چیخ، چیخ کر نکل گیا تھا جبکہ علی عیسیٰ اپنے ہاتھ جھاڑتا اندر آگیا۔ جہاں مون خونخوار تیور لیے بیٹھی تھی۔ اس کے انداز بہت غیظ بھرے تھے۔ جیسے وہ عیسیٰ پر پھٹنے ہی والی تھی۔

''تم نے گھر آئے مہمان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' مون نے خون رنگ آنکھیں علی عیسیٰ پر جما دی تھیں۔ جو بڑے برہم تیور لیے مون کو گھورنے لگا تھا۔ اسے مون کا پروفیسر کی حمایت میں بولنا آگ بگولا کر گیا تھا۔

''اسے مہمان کون کہتا ہے؟ وہ تو شیطان ہے...... ایک دم ذلیل، پاپا نے تو انسان سمجھ کر انسانیت کی خاطر مدد کی تھی اس کی اور وہ تو شیطان نکل آیا......'' عیسیٰ نے غیظ کے عالم میں وضاحت کی تھی۔

''تم نے اسے مار کر اچھا نہیں کیا...... وہ پولیس کو بلوائے گا۔'' مون اسے دھمکا رہی تھی۔ یعنی اپنے بھائی کو دھمکا رہی تھی۔

''تو بلوالے...... مجھے پروا نہیں...... اور اب ایک بھی لفظ پروفیسر کی حمایت میں مت بولنا...... ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ دہاڑ کر مون کو خبردار کررہا تھا مگر مون بھلا سمجھنے والی کہاں تھی؟ عیسیٰ کے الفاظ اسے آگ بگولا کر گئے تھے۔

''تم کیا کرلوگے؟'' مون نے بے خوفی کے عالم میں عیسیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لی تھیں۔ عیسیٰ کو جیسے دھچکا لگا تھا۔ مون کی بدلحاظی اسے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

''میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔'' عیسیٰ نے زہر خند لہجے میں کہا۔ وہ صرف اسے خاموش کروانا چاہتا تھا مگر مون......

''اور میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گی۔'' مون ایک مرتبہ پھر اسے دم بخود کرچکی تھی۔ اس کے الفاظ نے عیسیٰ کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا۔

''کیا بکتی ہو؟ تمہیں ذرا شرم، لحاظ نہیں......

میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔'' عیسیٰ کا ہاتھ غصے اور جذباتیت کی انتہا میں اٹھ گیا تھا اور مون جیسے پتھر کا مجسمہ بن گئی تھی۔ اس کی لمحے بھر کے لیے سانس تک رک گئی تھی۔ کیا عیسیٰ نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا؟ اسے مارا تھا؟ کیوں......؟ کس لیے؟ وہ جیسے صدمے اور نفرت کے جذبات سے راکھ ہوگئی تھی۔ مما کے بعد اس پر یہ بھی وقت آنا تھا؟ آج ایک تھپڑ مارا تھا، کل کئی تھپڑ مارنے لگتا...... عیسیٰ کا ہاتھ جیسے کھل گیا تھا اور مون کی زبان بھی کھل گئی تھی۔

''میں اسی طرح بکتی رہوں گی، اب مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو پولیس کو بلوالوں گی...... جہاں تک پروفیسر کا تعلق ہے تو وہ یہاں آتا رہے گا۔ وہ میرا اتالیق ہے اور میں عنقریب اس سے ہیومن سینس اور اسٹرانگ پاور کا علم لوں گی۔ تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے......؟'' مون نے جیسے بے خوفی کے عالم میں عیسیٰ کو منہ توڑ جواب دیا تھا، وہ جیسے گم صم رہ گیا۔ بہت دیر تک اس سے کچھ بولا نہیں گیا تھا۔ آخر مون کو ہوا کیا تھا؟ مما کے بعد اس کا دماغ صدمے سے چل تو نہیں گیا تھا؟ سوزن بھی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ مون بہت عجیب ہوچکی تھی۔

''تم پروفیسر سے نہیں ملوگی...... یہ میرا حکم ہے...... تمہارے بڑے بھائی کا حکم......'' بہت دیر بعد جیسے عیسیٰ نے سنبھل، سنبھل کر بہ مشکل کہا تھا۔ دراصل مون کی بے خوفی نے اسے اندر سے سہما دیا تھا۔ وہ بظاہر بہت مضبوط نظر آرہا تھا مگر درحقیقت وہ اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ یہ مون اس کی بہن تو نہیں تھی، یہ تو کوئی سرکش، باغی اور خودسر لڑکی تھی جسے کم از کم علی عیسیٰ نہیں جانتا تھا۔ وہ تو کوئی اور ہی روپ لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''ٹھیک ہے...... میں پروفیسر سے نہیں ملوں گی...... پر تم بھی مالا سے منگنی توڑ کر سوزن سے شادی کروگے......'' مون نے ترپ کا پہلا پتا پھینک دیا تھا...... اب وہ عیسیٰ کی تڑپ کا مزہ لے رہی تھی۔ دراصل پروفیسر سے ہر بات شیئر کرنے کا ایک فائدہ تو یہ ہوا تھا اسے موقع کی مناسبت سے پتے کھیلنے کا فن ضرور آگیا تھا۔

''کیا بکواس ہے یہ؟ یہاں مالا کا کیا ذکر......؟'' عیسیٰ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسے مون کے دماغ چل جانے کا اب پورا یقین ہوچکا تھا۔

''مالا کا ذکر تو ضروری ہے، تم مالا کو بھول جاؤ، میں پروفیسر کی بات نہیں کروں گی...... تم سوزن سے شادی کرلو۔'' اس نے دوسرا پتا بھی آرام سے پھینک دیا تھا۔ وہ عیسیٰ کی متغیر رنگت کو دیکھ کر لطف اندوز ہورہی تھی۔ جیسے اس کھیل کا مزہ تو اب ہی دوبالا ہوا تھا۔

''سوزن سے کیسے شادی کرلوں؟ تم جانتی تو ہو......'' وہ برہم ہوکر چیخا تھا۔

''اپنی شرط واپس لو...... ضروری نہیں سوزن اسلام قبول کرلے...... یہاں کتنے پاکستانیوں نے عیسائی اور یہودی لڑکیوں سے شادی کررکھی ہے۔ تم بھی کرلوگے تو قیامت نہیں آجائے گی۔'' مون بھی جیسے پھنکاری تھی۔

''جتنی تمہاری عمر ہے، بس اتنی بات کیا کرو، میں پاپا کو بتاؤں گا۔ تم تو پاگل ہوچکی ہو۔'' عیسیٰ کو پھر سے غیظ چڑھ گیا تھا۔ مون کی بکواس اس کا دماغ پھر سے گرما گئی تھی۔ آخر مون کو ہوا کیا تھا؟ یہ خناس اس کے دماغ میں کس نے بھرا تھا؟ اس کے بوارپا رہنے کے دوران آخر ادھر کون سا انقلاب آیا تھا جو مون سرتاپا بدل گئی تھی۔ اتنی بدزبان، سرکش، باغی اور خودسر ہوچکی تھی۔ عیسیٰ کو لگا، اس کے دماغ کی کوئی شریان تو ضرور پھٹ جائے گی، اگر مون اس کے سامنے رہی تو یا وہ خود کو مار ڈالے گا یا مون کا گلا گھونٹ دے گا۔ فی الوقت اس کے دماغ پر ایسی ہی گرمی چڑھ رہی تھی۔

"تم پاپا کو کچھ مت بتاؤ...... یہ تردد میں خود کر چکی ہوں اور اگر تم بھی میری بات مان کر سوزن سے شادی نہیں کرو گے تو پھر میرا فیصلہ بھی اٹل ہوگا۔" مون نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ ممکن ہی نہیں......" علی عیسیٰ نے مستحکم اور ٹھوس لہجے میں اپنی بات مکمل کی تھی...... اور مون حسیب جیسے اس کے آس پاس ایٹمی دھماکے کرتی ٹک، ٹک کی آواز پیدا کیے ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔

"تو پھر پاپا کو بتا دینا...... میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ مجھے ایسی جگہ پر نہیں رہنا۔ جہاں میری کسی خواہش کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہو۔ جہاں میری بات کو رد کر دیا جائے۔" وہ ساڑھے سولہ سال کی عمر میں ایک معمولی بات کو پہاڑ بنا کر اپنے باپ کا گھر چھوڑ گئی تھی۔ گھر تو اسے ہر صورت چھوڑنا تھا۔ کیونکہ وہ اس گھر میں کبھی رہنا ہی نہیں چاہتی تھی جہاں ذی شاہ کی بہن راج کرنے عنقریب آنے والی تھی۔

ذی شاہ جو اس کے دل کا ناسور تھا، اس کی پہلی محبت تھا اور جسے خبر ہی نہیں تھی، مس ہائیم کی مون حسیب اس کے عشق میں خود کو فنا کرنے والی تھی۔ اور پھر تاریخ گواہ تھی مون حسیب نے اپنے دل کے زہر کدے میں خود کو ڈبو کر فنا بھی کر لیا تھا۔

اس نے بڑی عجیب سی محبت کی تھی۔ کروڑوں لوگوں کی دنیا میں وہ ایک عجیب لڑکی پیدا ہوئی تھی اور اس عجیب لڑکی نے اپنی زندگی کے ساتھ بھی بڑے عجیب و غریب معاملے کیے تھے۔ بڑے عجیب و غریب کھیل کھیلے تھے۔ وہ عجیب تھی تو اس نے کچھ نہ کچھ عجیب ہی کرنا تھا۔

☆☆☆

پھر یوں ہوا کہ مون حسیب ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ آئی تھی۔ اس کا پہلا پڑاؤ گروسی کا مکان تھا۔ وہ اپنا سامان اٹھا کر یہیں چلی آئی تھی۔ اگرچہ تانتے، گروسی اور سوزن نے اسے بہت سمجھایا تھا۔ پھر پاپا اور عیسیٰ اسے منانے کے لیے آئے تھے۔ حتیٰ کہ عیسیٰ نے کئی مرتبہ فون کر کے معافی بھی مانگی تھی...... مگر مون نے پھر ایسا دل کو پتھر کیا کہ کسی نرمی، آنسو اور محبت نے اس کے دل کو پگھلایا نہیں تھا۔ وہ فیصلہ کر کے آئی تھی پھر اس فیصلے کو پاپا کی التجائیں تک اکھاڑ نہیں سکی تھیں۔ پاپا اور عیسیٰ کئی مرتبہ آئے اور ہر دفعہ مایوس ہو کر چلے گئے تھے۔ مون کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

وہ اپنے باپ اور بھائی سے ایسی بدگمان ہوئی کہ دوبارہ اس نے اپنا دل صاف ہی نہیں کیا تھا۔

ویسے بھی اب سفر کچھ پا لینے کے لیے تھا۔ پروفیسر نے اسے بڑے خوش آئند خواب دکھائے تھے اور وہ نئے، نئے جہان فتح کرنے کی کوشش میں مختلف ایڈونچرز کرتی رہی...... اس کی نیچر میں تجسس تھا، اس کی جبلت میں بے چینی تھی۔ اس کے اندر کچھ مقناطیسی قوتیں اور دنیا کو تسخیر کرنے کا جذبہ تھا۔ پروفیسر نے دراصل اسے اندر تک کھوج نکالا تھا۔ اس نے ایک ہیرے کی بالکل ٹھیک پہچان کی تھی۔ وہ مون حسیب کی پرکھ میں سو فیصد کامیاب ہوا تھا۔ اسے جیسا اپنا گوہرِ مقصود مل گیا تھا۔

بواریا کے ہی ایک علاقے میں پروفیسر کی چھوٹی سی اکیڈمی تھی جسے مون کے تعاون سے وہ گروسی کے گاؤں میں اٹھا لایا تھا۔ بیدی نونگ کے نام سے اس ادارے کو پروفیسر بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہا تھا۔ بظاہر یہ ایک لینگویج انسٹی ٹیوٹ تھا مگر اس کنوئیں میں اترنے کے بعد مون کو اندازہ ہوا تھا کہ بیدی نونگ بالآخر ہے کیا......؟

یہ مون کے لیے بڑی ہی دلچسپ دنیا تھی۔ ایک الگ سا جہان تھا۔ بڑی مختلف سی زندگی تھی۔ یہاں سیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ حیران کچھ اس لیے بھی تھی کہ اس نے جو یہاں دیکھا، جانا اور سیکھا تھا وہ کہیں بھی نہیں تھا نہ کسی اسکول میں نہ کسی تعلیمی

ادارے میں۔

پروفیسر نے مون سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ پارٹنر شپ کرلے...... وہ بلڈنگ کو خریدنا چاہتا تھا۔ اور اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا...... مون کو پروفیسر کی بات پسند آئی تھی۔ وہ کسی بھی ادارے میں کام ضرور کرتی مگر مالکانہ حقوق کے ساتھ...... اگر پاپا کی ہیر لخ عیسیٰ کے لیے تھی تو مون بھی بیدی نونگ کے ذریعے اپنا ایک الگ نام اور مقام بنانا چاہتی تھی اور اسی مقصد کے تحت اس نے پاپا سے براہِ راست بات کرلی تھی۔

''مجھے آپ کی پراپرٹی میں اپنا حصہ چاہیے......''

مون نے اگلے ہی دن پاپا کو فون کھڑکایا تھا۔ اگرچہ بات غلط نہیں تھی...... مگر اس کا طریقہ کار سراسر غلط تھا...... حسیب احمد کو جیسے دھچکا سا لگا۔ پہلے وہ گھر چھوڑ گئی تھی اور اب پراپرٹی میں حصہ مانگ رہی تھی۔ وہ کیوں نہ اپ سیٹ ہوتے...... انہیں لگتا جیسے مریم کے چلے جانے کے بعد ان کی زندگی میں بدبختی نے اودھم مچا دیا تھا۔ جیسے سارا سکون و چین اور سکھ وہ اپنے ساتھ ہی سمیٹ کرلے گئی تھی۔ ان کے پاس سوائے بے سکونی، دکھ اور صدمات کے کچھ نہیں بچا تھا۔

''میرا سب کچھ تم دونوں کا تو ہے......'' بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ بہ مشکل بول پائے تھے۔ حالانکہ یہ شاک اتنا معمولی نہیں تھا جو وہ سنبھل پاتے مگر پھر بھی انہوں نے مون کو جواب دیا تھا۔ اگرچہ بولنا ان کے لیے آسان ہرگز نہیں تھا۔ ان کی بیٹی کیسے ان کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی۔ انہیں یقین نہیں آیا تھا۔

''آپ صرف میری بات کریں...... مجھے حصہ دے رہے ہیں یا نہیں......؟'' مون نے انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی ڈھے گئے تھے۔

''یہ تم کس لہجے میں بات کررہی ہو......؟'' پاپا کا لہجہ مدھم ہوگیا تھا۔ سینے کے بائیں جانب سے اچانک ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ ان کا پورا وجود پسینہ پسینہ ہوگیا تھا۔

''میری بات کا جواب دیں...... فضول بات نہ کریں۔ میرے پاس وقت نہیں......'' مون نے انتہائی خودسری سے کہا تھا۔ پاپا جیسے بالکل ختم ہوگئے تھے۔ کیا یہ ان کی بیٹی مون ہی تھی؟

''میں تمہیں حصہ ضرور دوں گا...... مگر تمہاری شادی کے بعد......'' بہت دیر سوچنے کے بعد انہیں بہ مشکل جواب سوجھا تھا۔ اور مون دوسری طرف بھڑک اٹھی تھی۔

''مجھے آپ کی شرط منظور نہیں......'' وہ دہاڑ کر بولی تھی۔ مون بہت دھیما مزاج رکھتی تھی پھر اسے اب کیا ہوا تھا؟ اس میں اتنی تبدیلیاں کیسے آگئیں......؟ کیا ماں کی جدائی نے اس کے ذہن پر برا اثر ڈالا تھا؟ وہ جتنا بھی سوچتے، اتنا ہی الجھتے...... مون انہیں کس دوراہے پر لے آئی تھی؟ وہ ان کے لیے آزمائش کیوں بن رہی تھی؟ وہ ان کے لیے امتحان کیوں بن رہی تھی؟ اور حسیب احمد تو جانتے ہی نہیں تھے، وہ ان کے لیے سزا ہی تو بن رہی تھی۔

مون کی یہ فون کال ان کے پہلے ہارٹ اٹیک کا سبب بنی تھی مگر وہ اتنی کٹھور تھی کہ سن کر بھی علی عیسیٰ کے بے حساب اصرار پر بھی باپ کو دیکھنے نہیں آئی تھی۔ باپ کی بیماری کا سن کر بھی اس کا مطالبہ ختم نہیں ہوا تھا۔ پروفیسر نے کہا تھا، وہ اپنا حق کبھی نہ چھوڑے...... اور مون نے پروفیسر کی یہ بات بھی گرہ میں باندھ لی تھی۔

پھر جب وہ بیدی نونگ میں مالکانہ حقوق کے ساتھ داخل ہوئی تو اس کا دماغ کچھ اور آسمان پر چڑھ رہا تھا۔ بیدی نونگ ایک سرسبز و شاداب اور پُراسرار دنیا تھی۔ جو اس دنیا میں ایک مرتبہ داخل ہوجاتا تو پھر عمر بھر نہ نکل پاتا۔ دراصل یہ ـــ

پُراسراریت کی دلدل تھی جو اس میں جتنا اترتا، اسی قدر دھنستا چلا جاتا۔

وہ یہاں کچھ سیکھنے کے لیے آئی تھی۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔ اس نے زمانے میں اپنی ایک الگ پہچان بنانی تھی۔ ایک مختلف مقام بنانا تھا۔ خود کو بہت اعلیٰ اور بلند مقام پر دیکھنا تھا۔ اپنے سراہے جانے کا نشہ تھا۔ انفرادیت پر وہ جان دیتی تھی اور خود کو نکولس جیسی پہچان، عزت و مرتبے تک پہنچانا چاہتی تھی۔

وہ پُراسراریت کی ایک عظیم الشان دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ بیدی نوتنگ خوابوں کا سر سبز کھیت تھا..... جس میں ذہانت، علم اور سوچ کی فصل کاشت ہوتی تھی۔ بیدی نوتنگ میں بڑے اعلیٰ شاہکار موجود تھے۔ وہ لوگ جو آنکھوں سے گفتگو کرتے تھے اور مقابل کی سوچ تک میں گھس جاتے ..... مقناطیسی نگاہوں سے اندر تک کھوج لیتے۔ برقی لہروں سے دماغوں میں گھس جاتے تھے۔

بیدی نوتنگ میں اعلیٰ ذہانت کی، اعلیٰ سوچ اور حد درجہ صحت مند دماغ کی اعلیٰ فصل تیار ہوتی تھی۔ جیسے سفید دھنکی ہوئی روئی سے تصوراتی مجسمے تیار کرنا اور پھر ان مجسموں سے برقی لہروں کے ذریعے کسی بھی انسان کے اندر تک اتر جانا..... دراصل یہ کام معمولی ذہنوں کا نہیں تھا۔ یہاں صحت مند، تر و تازہ اور بہترین لہریں چھوڑنے والے دماغ تھے۔ ایسے اعلیٰ دماغ جو مثبت رخ پر بہتے تو جارج کی طرح ائیر بریک، کارل بینز کی طرح آٹو موبائل، نکولس کی طرح نظامِ شمسی، جان ڈالٹن کی طرح ایٹمی نظریہ، سر جوزف کی طرح مصنوعی فائبر، ولیم کی طرح زمین کی مقناطیسی قوت، جیمز کی طرح مشین گن اور ولیم اسٹینلے کی طرح الیکٹرک ٹرانسفارمر جیسی اعلیٰ ترین ایجادیں یا دریافتیں کرتے۔

ایسے اعلیٰ دماغ سالوں میں نہیں صدیوں میں دریافت ہوتے ہیں۔ ایسا آلہ (کمپیوٹر) جیسا دماغ جو پہلے سے مہیا کردہ منظم معلومات کو بوقتِ ضرورت فراہم کرتا ہے..... بھلا ایسے دماغ کوئی معمولی ہوسکتے ہیں اور ان کی پہچان کرنا، انہیں دریافت کرنا بھی معمولی ہرگز نہیں تھا۔

مگر پروفیسر بشر کے پاس قیراط جیسا آلہ موجود تھا۔ وہ قیمتی پتھروں اور سونے کو ناپ سکتا تھا۔ وہ ہیرے، سونے کے پتھر اور تانبے کی پہچان کرسکتا تھا اور اس نے مون حسیب جیسے ہیرے کو کھوج لیا تھا۔

وہ مون کو اپنے انداز، طریقے، اسلوب اور مرضی کے ساتھ تراشنا چاہتا تھا..... اور اس ضمن میں اس نے مون کو پہلی کلاس میں پہلا سبق پڑھایا تھا۔ مون کے لیے یہ سب بہت مختلف، منفرد اور انتہائی دلچسپ تھا۔

پروفیسر بشر جان گیا تھا کہ مون حسیب کا دماغ کوئی معمولی دماغ نہیں ہے..... بلکہ نکولس، ڈالٹن اور سر جوزف جیسا غیر معمولی اور انتہائی نایاب قسم کا دماغ ہے..... اب پروفیسر بشر پر ڈیپینڈ کرتا تھا کہ وہ مون حسیب کے دماغ سے کس قسم کا کام لینا چاہتا تھا اور وہ مون حسیب کے دماغ کو کس طرح سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

پہلی کلاس میں پروفیسر بشر نے مون حسیب کو اس کے اندر موجودہ پوشیدہ غیر مادی قوتِ متحرکہ کے متعلق بتا کر چونکا دیا تھا۔

''نفسیاتی لحاظ سے بہت خاص لوگوں میں پائی جانے والی سپر فزیکل قوت، جو تمہارے اندر بدرجۂ اتم موجود ہے، جسے بس تھوڑا سا پالش کرنا ہوگا..... یہ نفی قوتوں کی وہ معجزاتی قوت ہے جو اپنے مادی وجود کو چھوڑ کر غیر مادی یا روحانی وجود میں منتقل ہوکر غیر فانی کام انجام دینے کی صلاحیت سے بھرپور ہوتی ہے..... اور اس سے لاکھوں ناممکن کام بغیر کسی سہارے کے ممکن ہوجاتے ہیں۔ یہ ایسی قوت ہے

جس کا کام بندے کو مادی وجود سے الگ کر کے، ماورا کر کے کائنات کے روحانی وجود سے ملاپ کرانا اور غیر اجسام میں زندگی بیدار کر کے ان سے ناممکن العمل کام لینا ہے۔ یہ لافانی قوت جہاں انسان کو بہت بلند، اعلیٰ اور منفرد ترین مقام سے نوازتی ہے تو دوسری طرف انسان کو اس کے اصل مقام سے گرا کر شیطان بھی بنا دیتی ہے۔'' پروفیسر بشر کلاس کے بیس اسٹوڈنٹس کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ سپر فزیکل قوت کا تعارف دے رہا تھا۔ ان میں موجود مون حسیب جیسے سانس روکے سن رہی تھی۔ اس کے دل کی کیفیت بہت عجیب تھی اور اندر کہیں چھٹی حس خطرہ، خطرہ ہے کا الارم بھی بجا رہی تھی مگر دل کہتا تھا کہ اس نئے جہان کو دریافت کر کے ہی دم لو...... وہ جیسے دم سادھے سن رہی تھی۔

''میں تم لوگوں کو انتقالِ افکار (telepathy) کا پہلا اور ابتدائی سبق دوں گا۔'' پروفیسر نے پہلا پتا پھینک دیا تھا...... اب وہ اسٹوڈنٹس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کم حیران اور زیادہ مطمئن لوگ تھے تاہم مون حسیب کے لیے کم از کم یہ انکشاف کسی دھچکے سے کم نہیں تھا۔ وہ جیسے دم بخود سانس روکے پروفیسر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تو کیا ہمیں بیدی نونگ میں ٹیلی پیتھی کے اسرار و رموز سکھائے جائیں گے؟'' اس کے عجیب اور احمقانہ سوال نے پوری کلاس کو متحیر کر دیا تھا۔ وہ جیسے گردن موڑ، موڑ کر اس نئی احمق ترین اسٹوڈنٹ کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے ہم لوگ یہاں ٹیلی پیتھی کے معانی ہی سمجھنے آئے ہیں۔'' ایک لڑکے نے اٹھ کر مون کو جواب دیا تھا۔ یہ کلاس کا سب سے خوب صورت لڑکا تھا اور پروفیسر کے ساتھ اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ مون کو بعد میں پتا چلا تھا یہ لڑکا میکس وان تھا۔ انڈیا میں طویل عرصہ رہ کر آیا تھا۔ اردو اور ہندی میں ایکسپرٹ تھا۔ اس کی جرمن کمزور تھی اور وہ یہاں لینگویج کورس کے لیے ہی آیا تھا مگر بیدی نونگ کی... پُراسراریت میں ایسا جکڑا کہ یہاں سے دور جا ہی نہیں سکا تھا۔ پروفیسر نے ٹھیک کہا تھا، یہ بڑی مسحور کن دنیا تھی۔ وہ اس کے سحر سے کبھی نکل ہی نہیں سکتی تھی، یہی حال میکس وان کا بھی تھا۔ وہ آیا تو کسی اور مقصد کے لیے تھا مگر پروفیسر کی شخصیت نے اسے بھی اپنے حصار میں کر لیا تھا۔ پھر پروفیسر خیالات اور تصورات کی ایسی حسین دنیا کا ذکر کرتا تھا جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان کے ذہن پر قابض ہو سکتا تھا۔ وہ اس کی سوچ میں گھس سکتا تھا اور اس کے خیالات کو جان سکتا تھا۔ پروفیسر نے کہا تھا۔

''تم میں سے کون، کون دلوں اور دماغوں کو... تسخیر کر کے پورے عالم پر راج کرنا چاہتا ہے؟'' قریب، قریب ہر اسٹوڈنٹ نے ہاتھ بلند کر لیا تھا مگر مون کو جیسے کوئی غیر مرئی طاقت ہاتھ اٹھانے سے روکتی تھی۔ اس کے اندر وہی الارم بجنے لگتا تھا۔ جیسے وہ ایک بڑا خطرہ مول لے کر غلطی کر رہی ہے۔ اس کے بد اثرات بھی تو ہو سکتے تھے۔ اندر بجتے الارم کو نظر انداز کر کے وہ بھی آہستہ، آہستہ ہی سہی، ان اسٹوڈنٹس میں شامل ہوگئی تھی جو روحانی طاقت یا غیر مادی قوتِ متحرکہ کی بدولت لوگوں کے ذہنوں کو تسخیر کرنا چاہتے تھے۔

دراصل یہ دنیا بڑی سحر انگیز اور پُرکشش تھی۔ کچھ ہی عرصہ گزرنے کے بعد مون کو اس علم کے اسرار میں کمال درجے کا لطف اور کشش محسوس ہونے لگی تھی۔ البتہ میکس وان بہت الجھتا تھا۔ شروع، شروع میں وہ بھی بہت پُرجوش تھا مگر مون نے محسوس کیا تھا وہ آئندہ آنے والے دنوں میں بیزار نظر آنے لگا ہے۔ جیسے وہ بہت بچار میں پڑ گیا تھا۔ بہت سوچتا، الجھتا اور سوال کرتا تھا پھر ایک دن کلاس کے

دوران ہی میکس نے پروفیسر سے کچھ سوال کیے تھے۔ جن کے جوابات دیتے ہوئے پروفیسر گھبرایا نہیں تھا۔ وہ جیسے پورا ہوم ورک کر کے ہی میدان میں اترا تھا۔

’’یہ ٹیلی پیتھی ہے کیا؟ میں کس طرح کسی دوسرے انسان کی سوچ کو پڑھ سکتا ہوں اور کیسے امواجِ خیال کے ذریعے جان سکتا ہوں کہ مجھ سے دور بیٹھے شخص کے ذہن میں کیا ہے؟‘‘ میکس کے اس سوال نے پوری کلاس کو بے چین کر دیا تھا۔ دراصل یہ سوال تو تقریب، قریب ہر طالب علم کے ذہن میں کھد بد ... مچاتا تھا مگر پروفیسر کی باتوں کا سحر کچھ اتنا طاقت ور ہوتا تھا کہ دورانِ لیکچر وہ لوگ صرف سنا کرتے تھے۔ بول سکنے کی قوت جیسے مفلوج ہو جاتی تھی۔

ٹیلی پیتھی کے فن میں ماہر کرتا پروفیسر انہیں جیسے ہپناٹائز کر دیا کرتا تھا۔’’ٹیلی پیتھی کے معانی روحانی رابطے کے ہیں۔ اصطلاح میں اسے خیالات کی منتقلی کا نام دیتے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔ کافی دور سے کسی چیز کو محسوس کرنا یا ایک قلب کا بغیر کسی مادی وسیلے کے دوسرے قلب پر اثر کرنا۔‘‘ پروفیسر بشر میکس کا سوال سن کر بڑے جذبات بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔ جیسے میکس کا سوال اسے اپنے لیے خطرہ محسوس ہوا تھا اور وہ تمام اسٹوڈنٹس کے ذہنوں سے آج زنگ اتار دینا چاہتا تھا تاکہ پھر کوئی ٹیلی پیتھی کے حوالے سے شبہات میں نہ پڑے۔ اسے محسوس ہوا تھا، اس کے یہ بیس بائیس اسٹوڈنٹس غیر معمولی ذہین تھے۔ وہ ان پر جلد اپنا رنگ اور تسلط جمالینا چاہتا تھا، وہ انہیں بیزار کر کے بیدی نونگ سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

’’مختلف ڈاکٹرز، ماہرِ نفسیات، سائنس دان، یوگی، فلاسفر اور ماہرین ٹیلی پیتھی کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں کہ یہ ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک خیال کی منتقلی ہے۔ اس میں انسان کے خیالات کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا پڑتا ہے کہ وہ کس کیفیت یا سوچ میں ہے؟ پھر ٹیلی پیتھی کا تیسرا درجہ شروع ہوتا ہے۔ جس میں ایک انسان اپنے خیال کو دوسرے کے ذہن میں منتقل کر سکے...... اور اس کے بعد ایک آخری درجہ شروع ہوتا ہے جس میں خیالات کی قوت میں دوسروں کو اپنا مفعول بنالینا ہوتا ہے۔ یعنی اس میں دوسروں کے ذہن پر قبضہ جما کر اسے مجبور کرنا ہوتا ہے کہ وہ آپ کے خیال کے عین مطابق کام کرے۔ .... یہ ٹیلی پیتھی کا کامیاب ترین مرحلہ ہے۔‘‘

پروفیسر اپنے جادو اثر الفاظ کا سحر پھونک رہا تھا۔ وہ لوگ پھر سے ایسی ہی کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔ جیسے کبھی سانس تک نہ لے سکیں گے یا بول نہیں سکیں گے۔ پروفیسر ان پر ایسا ہی کوئی جادو کر دیا کرتا تھا۔ سوال ان کے اندر ڈوبنے لگتے تھے اور وہ چاہ کر بھی پروفیسر سے اختلاف نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس کی بات ماننے، سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔

’’یہ ٹیلی پیتھی آخر چیز کیا ہے؟‘‘ پروفیسر ایک ضخیم کتاب کھولے کلاس کی طرف متوجہ تھا۔

’’اونچے درجے کا کشف و ادراک رکھنے والا علم......؟‘‘

’’چھٹی حس ESP کی حامل قوت...... یا پھر ایک سپر سائیکک قوت جو ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں معلومات حاصل کر پائے یا شاید انسان کی اندرونی توانائیوں اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے والی قوت......؟‘‘ یہ اور اس طرح کے بے شمار خیالات ان لوگوں کے ذہنوں میں تھے یا پھر مسحور کر دینے (hypnotism) اور غیب دانی (clairvoyance) کا علم یعنی ذہنی ٹیلی گرافی جس کے ذریعے دوربین سے بھی زائد دوری تک انسان دیکھنے کی قوتِ عمل اور علم، جن کو ماہرینِ نفسیات انسان کی تیسری آنکھ سے مشابہت

دیتے ہیں۔

آخر یہ ٹیلی پیتھی کوئی حقیقت بھی تھی یا محض لفاظی اور کتابیں پڑھنے تک کا صرف کتابی علم......؟ پروفیسر جو کہتا تھا جو بتاتا تھا آخر اس میں سچائی کتنی تھی؟ کیا وہ انہیں محض بے وقوف بنا رہا تھا؟ یا پھر وہ لوگ جلد کوئی جادوئی علم سیکھنے والے تھے؟

وہ لوگ ابھی حقیقت سے دور کتابوں کے علم تک محدود تھے۔ پروفیسر ان کے سامنے کوئی پریکٹیکل (عملی کارنامہ) نہیں کر پایا تھا پھر جس دن میکس نے پروفیسر کو اس نکتے کی طرف متوجہ کیا تھا، یہ اسی دن کی بات تھی۔ پروفیسر نے پوری کلاس سے کہا تھا کہ کل کوئی بھی غیر حاضر نہ ہو......وہ ان کو سکھائے گئے علم کی حقیقت کو سامنے لانے والا تھا۔"آخر پروفیسر کل کیا کر دکھانے والا تھا؟"

گروسی کے گھر میں اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑے ہو کر...... پھولوں کے سنسان کھیتوں کو دیکھتی وہ سوچ رہی تھی۔ پھولوں کی کٹائی ہو چکی تھی اور اب کہیں بھی خوشنما پھولوں کی چادر نہیں تھی۔ پھول اپنے موسم کے حساب سے مدت پوری کر چکے تھے۔ جیسے انسان اپنی عمر کے حساب سے مدت پوری کرتا ہے۔ بالآخر اسے اپنے ٹھکانے کی طرف جانا ہوتا ہے مگر اس بات سے واقف ہونے کے باوجود کچھ لوگ عمر بھر نادانیاں کرتے رہتے ہیں۔ وہ انہی خیالوں میں گم تھی معاً اس کے موبائل کی بیپ بج اٹھی۔ اس نے چونک کر فون اٹھایا تھا۔ عیسیٰ کی کال تھی وہ بہت اپ سیٹ تھا اور مون کو گھر آنے کے لیے بہت مجبور کر رہا تھا۔

"غصہ جانے دو مون...... پلیز، گھر آجاؤ، کسی کے گھر کتنے عرصے تک بھی رہیں، آخر اپنے گھر واپس تو آنا ہوتا ہے۔" عیسیٰ کی آواز بھرا رہی تھی۔ وہ اپنی تنہائی اور اکیلے پن کی وجہ سے سخت عاجز لگ رہا تھا۔ اسے مون کی یاد آ رہی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت بے چین تھا۔

"یہ کسی اور کا گھر نہیں...... میری نانی کا گھر ہے۔" مون جیسے جتا کر بولی تھی۔

"اپنا گھر پھر بھی نہیں......" عیسیٰ نرمی سے بولا تھا۔ وہ مون کو واپس گھر لانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اسے فون کالز کے ذریعے مجبور کرتا یا خود آ کر لے جاتا، وہ نہ مانتی تب بار، بار چکر لگاتا، کبھی تو وہ عاجز آ کر اس کے ساتھ چل پڑتی۔ اگر امید پر دنیا قائم تھی تو پھر عیسیٰ اپنی امید کو ختم کیوں کرتا۔

"میرا تو کوئی گھر نہیں۔" مون جیسے رو پڑی تھی۔ مگر اس نے ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ عیسیٰ پر اپنی کمزوری کیوں ظاہر کرتی۔

"ایسے مت کہو، مجھے تکلیف ہوتی ہے مون! یہ گھر تمہارا اپنا ہے، تم کیوں ایک معمولی ضد میں ہمارا چین سکون ختم کر چکی ہو۔" عیسیٰ اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ وہ اب تلخ کلامی کر کے مون کو خفا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر مون کون سا کسی کے جذبات کو سمجھتی تھی۔ اب بھی ازلی کٹھور پن سے بول رہی تھی۔

"میں نے کسی کا چین سکون ختم نہیں کیا، میں تو آپ کی زندگیوں سے نکل آئی ہوں تاکہ آپ لوگ ڈسٹرب نہ ہوں۔" وہ زہر خند سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ عیسیٰ کے دل کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔

"ایسی بات کہو گی تو سراسر تکلیف دو گی...... مگر تمہیں احساس کہاں ہے۔" عیسیٰ نے افسردگی سے کہا تھا۔ مون کا کٹھور پن اسے کتنی اذیت دیتا تھا۔ وہ اس حقیقت سے واقف نہیں تھی۔

"اور تمہیں بہت احساس ہے کیا؟" وہ بھی غضبناک ہو گئی تھی۔

"احساس ہے تو فون کر رہا ہوں ناں۔" عیسیٰ کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔ دل پر جیسے بوجھ لد گیا تھا مون ہمیشہ دل دکھانے والی ہی بات کرتی تھی۔ اب بھی مزید اس کی سنے بغیر فون بند کر چکی تھی حالانکہ

عیسیٰ ابھی اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ مون کے لیے عجیب وغریب باتیں سن رہا تھا کہ مون نے نہ جانے کس قسم کا ادارہ جوائن کر رکھا تھا جس کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی مگر ہمیشہ کی طرح مون نے فون بند کر دیا تھا۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے تھے۔ پروفیسر نے انہیں پہلا کامیاب عمل کر کے دکھایا تھا جس میں اس نے میکس وان کو ہپناٹائز کیا تھا۔ پوری کلاس جیسے دم بخود رہ گئی تھی۔ پروفیسر نے میکس کو ہپناٹائز کیا اور اسے جو، جو سجیشن دیتا رہا، میکس اسے وصول کر کے وہی بولتا رہا۔ یہ پہلا پُراسرار عمل تھا کم از کم ان لوگوں کے لیے اسے پُراسراریت ہی کہنا تھا۔ یہ پُراسراریت ہی کی کوئی قسم تھی۔ گویا پوری کلاس بھی مسمرائز ہوگئی تھی۔ پروفیسر نے جیسے انہیں کوئی جادو کر کے دکھایا تھا۔ پروفیسر جیسے کوئی شعبدہ باز تھا۔

مون کے لیے یہ ایک دلچسپ ترین تجربہ تھا کیا وہ پروفیسر جیسی طاقت رکھتی تھی؟ کیا وہ کسی کو ہپناٹائز کر سکتی تھی؟ کیا وہ کسی کا ذہن کھوج سکتی تھی؟

پروفیسر اس کے دل کی بدلی کیفیات سمجھ رہا تھا۔ جیسے گرم لوہے پہ ہلکی چوٹ پڑی تھی۔ کلاس میں مون کے علاوہ ایک اور لڑکی ڈیزی تھی جو مون کی طرح ہی پروفیسر سے اس کا سارا علم سیکھ لینا چاہتی تھی۔ مون کو یہ بات بھی بعد میں پتا چلی تھی۔ ڈیزی، پروفیسر کی لور بھی تھی اور پروفیسر کی خاطر کچھ بھی کر سکتی تھی۔ البتہ پروفیسر کے دل میں ڈیزی کے لیے کیا جذبات تھے اس بات سے کوئی واقف نہیں تھا۔

پروفیسر نے میکس کو ہپناٹائز کر کے کلاس کے تمام طالب علموں کا دل جیت لیا تھا۔ اب انہیں لگتا تھا وہ محض کتابی باتیں نہیں پڑھتے بلکہ کچھ عملی طور پر بھی سیکھنے والے ہیں۔

''امواجِ خیال کی کوئی مشق ہمارے سامنے کی جائے۔'' ایک دن ڈیزی نے پروفیسر سے

سوال کیا۔ ڈیزی کا سوال ان سب کے دل کی آواز بھی تھا تب میکس نے کلاس میں اٹھ کر ایک عجیب سوال کیا تھا۔

''پروفیسر! تم ٹیلی پیتھی کے بہترین عامل ہو، تم ہمیں عمل کر کے دکھاؤ کہ ایک ذہن سے خیال دوسرے کے ذہن میں کیسے اترتا ہے؟'' میکس کا سوال چونکا دینے والا تھا۔ مون کے ساتھ ڈیزی بھی ٹھٹک گئی تھی۔ میکس چاہتا تھا یہ عمل کلاس کے اسٹوڈنٹس کریں کیونکہ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کی یہ آخری مشقیں جاری تھیں۔ پروفیسر کی انتھک کوششوں کے بعد..... کلاس کے بیس اسٹوڈنٹس میں سے صرف مون اور ڈیزی ہی اس کی توقعات پر پوری اتری تھیں۔ فائنل ایگزامز تک صرف تین لوگ... نشریاتی رابطے کا پہلا تجربہ کر سکتے تھے۔ ان میں مون، ڈیزی اور ایک لڑکی ڈیانا تھی۔ باقی میکس سمیت تمام لوگ فیل ہو چکے تھے اور درجۂ اول کی کلاس میں صرف ڈچ سیکھنے چلے گئے تھے۔

اب یہ تین لوگ بیدی نونگ کا حقیقی ماڈل تھے۔ مون، ڈیزی اور ڈیانا..... پروفیسر انہیں شعور کی سرگرمیوں سے لے کر انتقالِ افکار، حقیقتِ احوال، امواجِ خیال اور اس کی رفتار، انتقالِ افکار کا فن، دماغی میکانزم سے لے کر سجیشن اور آٹو سجیشن تک پڑھا۔۔ چکا تھا۔ آٹو سجیشن یعنی خود تسخیری میں مون نے کمال درجے کی مہارت حاصل کر لی تھی اور پوسٹ ہپناٹک سجیشن میں اسے اس سال کا ایوارڈ دینے کا اعلان کر دیا تھا۔

پوسٹ ہپناٹک سجیشن کا مطلب معمول کو... ہپناٹزم کے دوران ایسی ہدایات دینا ہے جن پر معمول سے بعد میں عمل کروانا مقصود ہوتا ہے کیونکہ جو ہدایت اس عمل کے دوران معمول کو دی جائے گی بعد میں وہ اس پر لازمی عمل کرتا ہے۔ پوسٹ ہپناٹک سجیشن کو مون حسیب نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے انتہائی حد پر جا کر استعمال کیا تھا، جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی نکلا..... مگر تب وہ نئے جہان دریافت کرنے کے شوق میں کچھ نہیں سمجھتی تھی اور جب تک اسے ادراک ہوا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

پھر ایک سبق کے دوران پروفیسر بڑے موڈ کے عالم میں تھا۔ اس دن بوار یا بارش میں بھیگ رہا تھا اور مون حسیب کو گیلے پن سے الجھن ہوتی تھی۔ اس نے سوچا، وہ کلاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے۔ جب تک بارش نہ رکے وہ کمرے میں ہی رہے گی مگر پروفیسر کے سبق نے مون حسیب کو پھر سے سحر زدہ کر دیا تھا۔ وہ کلاس سے اٹھ ہی نہیں سکی تھی۔

آج پروفیسر انہیں علم تسخیر کے فائدے بتا رہا تھا۔

اس سے بہ آسانی انسان بری عادتیں ترک کر لیتا ہے۔ برائیوں اور بیماریوں کا بہترین علاج ہے یہ عمل..... والدین اپنے شرارتی بچوں کو کنٹرول کر کے انہیں تابعِ فرمان بنا سکتے ہیں۔

طالبِ علم قوتِ یادداشت، علم بصیرت اور یکسوئی حاصل کر کے اپنے، اپنے شعبے میں مہارت اور ترقی پا سکتے ہیں۔ یہ ذہنوں میں رسائی، قبضہ اور سوچ تک پہنچنے میں معاون ثابت ہے۔

شعبدے بازی کے کرشمے اور کئی طرح کے کمالات حاصل کر کے بے تحاشا دولت بھی کمائی جا سکتی ہے۔ اپنے دل پسند مرد یا عورت کی محبت، توجہ اور دوستی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ ہپناٹزم کے بے شمار فوائد تھے مگر مون حسیب اس آخری بات پر جیسے اٹک گئی تھی۔ اپنے دل پسند مرد سے محبت اور اس کی توجہ حاصل کرنا..... مون کے اندر جیسے محبت کی کلی چٹکنے لگی تھی۔ امید کی ننھی سی کرن چمکنے لگی تھی۔ ایک تصویر روشن سی ہو گئی۔ اس کا معمول تھا، وہ گھر آ کر ٹیلی پیتھی کی مشق ضرور دہراتی تھی گھر میں پہلے تو کوئی اس کے معمولات کو سمجھ نہیں سکا تھا مگر مون کو لگتا تھا کہ سوزن

کچھ، کچھ شکوک وشبہات میں پڑ گئی ہے۔ مگر فی الحال اسے براہِ راست ٹوکا نہیں تھا۔ نہ اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔

مون نے سیلف ہپناسز میں خود کو کئی مرتبہ کامیاب طریقے سے ہپناٹائز کرلیا تھا۔ پروفیسر اسی لیے تو اس کے متاثرین میں شامل تھا۔ وہ پروفیسر کی پہلی اسٹوڈنٹ تھی جو بہت جلد کامیابی اور ترقی کے مراحل طے کررہی تھی۔ پروفیسر نے اپنے گزشتہ لیکچرز کے درمیان اسے بہت کچھ سمجھایا تھا۔ جیسے ضمیر کا زندہ رکھنا اور اس علم سے کسی کو نقصان نہ پہنچانا اور ملک وقوم کی خدمت وغیرہ..... دراصل اس فن کو سیکھنے سے پہلے یہی بنیادی اصول تھے جن پر ہر صورت ایک ماہرِ انتقالِ افکار کو عمل کرنا ہوتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اسے اپنے غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ بہت جلد اپنی اس صلاحیت سے ہاتھ بھی دھو بیٹھتے تھے۔ کیا مون حسیب بھی انہی لوگوں میں سے تھی؟

فی الوقت وہ یہ اٹھارویں مشق اپنے بیڈروم کو لاک کر کے دُہرا رہی تھی۔ self - hypnosis میں اس نے کئی کامیاب تجربے کرلیے تھے۔ اپنے تئیں اس نے کئی جہان فتح کرلیے تھے۔ یہ بڑی دلچسپ، پُرکشش اور انتہائی دل لبھانے والی دنیا تھی۔ عامل خود کو کچھ لمحوں کے لیے اس جہان سے الگ سمجھنے لگتا ہے جیسا کہ وہ کسی اور ہی دنیا میں محوِ پرواز ہو۔

جب وہ عام لوگوں کو ہپناٹائز آسانی کے ساتھ کرلیتی تھی سو خود کو ہپناٹائز کرنا کہاں مشکل تھا؟ اس نے پہلی مرتبہ پروفیسر کی دی گئی ہدایات کے مطابق خود کو ہپناٹائز کرلیا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ پہ کچھ سوال ترتیب دیے تھے پھر لیپ ٹاپ کو اونچی جگہ پر رکھ کر خود ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی تھی۔ یوں کہ لیپ ٹاپ اس کی آنکھوں کے عین سامنے تھا پھر مون نے خود کو پہلی سجیشن دی تھی۔

''میں اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ رہی ہوں۔''

مون نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ نگاہ جما کر پہلا سوال دُہرایا تھا۔

''اور میں اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ رہی ہوں۔'' اس نے متعدد بار یہی لائنیں دُہرائی تھیں۔

''میرے جسم پر استراحت طاری ہورہی ہے۔'' مون نے اپنے جسم پر واضح استراحت اترتی محسوس کی تھی۔

''اور میرے ذہن پر بھی استراحت طاری ہورہی ہے۔'' اس نے کئی مرتبہ یہ لائن دُہرائی تھی۔ بغیر پلکیں جھپکائے اسکرین کی طرف دیکھنا ایک کٹھن مرحلہ تھا مگر مون حسیب نے بالآخر طے کرلیا۔ وہ کروڑوں لوگوں کی اس دنیا میں بڑا اعلیٰ قسم کا دماغ رکھتی تھی۔ اس کا ذہن اَسی میل فی گھنٹا کی رفتار سے پیغام وصول کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ اس کے اعصاب بہت مضبوط تھے اور قوتِ ارادی پہاڑوں جیسی سخت تھی۔ مون حسیب کو آسانی کے ساتھ ڈھایا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ تو پروفیسر تھا جو اسے نہ جانے کس مقناطیس سے باندھ کر اِدھر لے آیا تھا اور اب مون اسی مقناطیسی طاقت کے زیرِ اثر کئی لوگوں کو ہپناٹائز کرسکتی تھی۔ اور خود کو ہپناٹائز کرنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا پھر مون نے خود کو ایک اور سجیشن دی۔

''میرا جسم اور ذہن خوشگوار طور پر بوجھل ہورہا ہے۔'' وہ سکون کی لہروں کو اپنے دماغ میں اترتا محسوس کررہی تھی۔ مون جیسے بادلوں کے رتھ پر سوار تھی۔ وہ ہواؤں کے سنگ تیر رہی تھی مگر یہ کیا......؟

''میرے تمام اعضا وزنی ہوتے جارہے ہیں۔'' وہ پل بھر کے عرصے میں بادلوں کو چھوڑتی کسی جزیرے میں تیر رہی تھی۔

''میری ٹانگیں بھاری ہونے لگی ہیں۔'' اس نے پیروں پر واضح بوجھ پڑتا محسوس کیا تھا۔

"میرے کندھے بھی بھاری ہو رہے ہیں۔" مون کے شانوں پر بھی وزن لدرہا تھا۔

"میرا ذہن بوجھل ہو رہا ہے۔" مون کی پلکوں پر بھی وزن اتر آیا تھا۔

"اب میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔" اس کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی تھی۔

"جب میری آنکھ بند ہو جائیں گی تب میں گہری نیند میں چلی جاؤں گی۔" کوئی پلکوں کو مقناطیس کی طرح پپوٹوں کی طرف کھینچ رہا تھا۔

"میں تین گنوں گی اور نیند میں اتر جاؤں گی۔" اس نے خود کو آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا تھا۔

"میں اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتی ہوں۔" وہ خود کو آخری سجیشن دے رہی تھی۔

"میں جب چاہوں اپنے آپ کو بیدار کر سکتی ہوں۔" اس کا عمل مکمل ہو چکا تھا وہ ٹائمنگ کے مطابق نیند میں چلی گئی تھی۔ اور سیٹ ٹائمنگ کے ساتھ ہی بیدار ہو گئی۔ سلیف ہپناسز کے ذریعے جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ مون حسیب نے خود کو تر و تازہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ پوری طرح چاق و چوبند تھی اور ایک کامیاب تجربے کی خوشی محسوس کر رہی تھی۔

پھر اس نے بیدی نونگ کے اسٹوڈنٹس سے ہٹ کر عام لوگوں کے چہرے چھاننے شروع کر دیے تھے۔ پروفیسر نے کہا تھا، مون، ڈیزی اور ڈیانا کے ساتھ مل کر ایک دوسرے پہ تجربے کریں مگر مون ان سب سے کچھ الگ کرنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی پروفیسر کا سکھایا علم کہاں تک عملی زندگی میں کارگر ثابت ہوتا ہے۔

مون، پروفیسر کے اسٹوڈنٹس میں سب سے کم تعلیم یافتہ تھی۔ ڈیزی اور ڈیانا تو یونیورسٹی کی پوزیشن ہولڈر تھیں۔ خود پروفیسر بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا مگر پھر بھی ڈیزی اور ڈیانا سے زیادہ مون کی دماغی کارکردگی سے متاثر تھا۔ پروفیسر کا خیال تھا۔۔۔ جلدی کامیابی پا کر اس نے بھی زیادہ انتقال افکار میں مہارت رکھ لی ہے پھر ایک دن پروفیسر نے انہیں نفسیات اور ہپناٹزم کے اخلاقی میڈیکل کے طالب علموں کا ایک تجربہ بتایا تھا جو پوسٹ ہپناٹک سجیشن میں غیر اخلاقی، جنسی یا نظریاتی نقطۂ نظر سے انتہائی پست، کریہہ اور غلیظ تھا۔ پروفیسر نے ایک مثال بھی دی تھی مگر لڑکی اس عمل کے کرنے والے لڑکوں کے ناپاک عزائم سے بچ .... گئی تھی۔ عین وقت پر اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی کوئی بھی علم تعمیری بھی ہوتا ہے اور تخریبی بھی جب شیطانی قوتیں غالب آنے لگیں تو وہی علم منفی رخ اختیار کر لیتا ہے۔ شاید یہی سب کچھ مون حسیب کے ساتھ ہوا تھا۔

وہ ایک ٹھوس قسم کا تجربہ کرنا چاہتی تھی مگر بیدی نونگ کے اسٹوڈنٹس سے ہٹ کر..... ایک دن وہ مرکز کی مارکیٹ میں سے گزر رہی تھی۔ جوتوں کی دکان کو دیکھ کر اس کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دکان کے اندر تھی۔ اسے انتہائی خوب صورت اور کم عمر مالکن کو ہپناٹائز کرنا تھا۔ وہ یہاں سے ایک جوتا چرانا چاہتی تھی۔ اگرچہ اس کا پاؤچ نوٹوں سے بھرا تھا اور وہ کوئی عادی چور بھی نہیں تھی۔ اسے تو صرف ایک تجربہ کرنا تھا اور وہ اس کے لیے خاصی پُرجوش تھی۔

دکان کی مالکن زیتا یعنی زیتون تھی۔ اس کا شوہر آغا ایک پاکستانی لڑکا تھا۔ وہ ابتدائی معلومات کے بعد دکان میں گھسی تھی۔ اس وقت گاہک نہیں تھے اور آغا بھی آس پاس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مون کا مقصد..... دکان کی مالکن کو ہپناٹائز کرنا تھا، چوری کرنا نہیں..... اور اس ضمن میں مون نے ایک چمکتی دمکتی انتہائی خوب صورت پین لائٹ پاؤچ میں پہلے سے رکھی تھی۔ مگر مون کا ارادہ زیتون (زیتا) کو پین لائٹ سے ہپناٹائز کرنے کا نہیں تھا۔

وہ ہپناٹائز میتھڈ کے تین بنیادی طریقوں میں سے ایک یعنی ٹکٹکی باندھ کر زیبا کو ہپناٹائز کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اس نے زیبا پر پہلی نگاہ ڈالی تو تیز، تیز بولتی بلا کی ہنس مکھ زیبا ہنستے، ہنستے ایک دم رک سی گئی۔ وہ مون کی آنکھوں میں دیکھتی لمحے بھر کے لیے ٹھٹکی تھی پھر جیسے مون کی آنکھ میں دیکھنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ کاؤنٹر پر دو چار جوتے رکھے مون کو ہنس، ہنس کر بتا رہی تھی۔ یعنی اپنے جوتوں کی اعلیٰ کوالٹی کے بارے میں معلومات دے رہی تھی۔ مگر اب کسی چینی کی مورتی جیسے ساکت ہو چکی تھی۔ بنا پلک جھپکے مون کی سحر طراز آنکھوں میں دیکھنا ایک پرکشش تجربہ تھا۔ شاید ہی زیبا نے اپنی زندگی میں اتنی گہری اور مقناطیسی آنکھیں دیکھی تھیں۔

پروفیسر نے ایک مرتبہ مون کو بتایا تھا کہ تمہاری آنکھیں قدرتی طور پر ہپناٹائز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مون کو اس لمحے یقین آ گیا تھا۔ ابھی اس نے کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی پھر بھی جیسے زیبا ہپناٹائز ہو چکی تھی۔ اس نے زیبا کو پہلا حکم دیا...... اور اسے معمول کی کارروائی کے بعد حالتِ نیند میں لے آئی تھی۔

''مجھے یہ جوتا پیک کر دو......'' وہ حکم دینے کے دوسرے سیکنڈ میں پیک شدہ جوتا اٹھا رہی تھی۔ زیبا نے کسی معمول کی طرح اس کے حکم پر جوتا پیک کر دیا تھا۔ پھر مون نے اسے دوسری ہدایت دی تھی۔

''میں یہ جوتا پسند کر چکی ہوں۔'' مون کے ہونٹ ہلے تھے اور آواز زیبا کی سماعتوں میں اتر گئی تھی۔ اب وہ زیبا کو ایک مختلف ہدایت دے کر بولنے پر اکسا رہی تھی۔

''کسٹمر یہ جوتا خرید چکا ہے۔ اور بل میرے پاس ہے۔'' مون نے اسے آخری سجیشن دی تھی اور اس کے بعد ہلکا سا اشارہ دے کر زیبا کی نیند کو توڑ دیا تھا۔ اب وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گلاس ڈور کھول کر باہر نکل گئی تھی جبکہ زیبا کچھ حیران، کچھ متحیر سی خود کو دیکھنے لگی۔ وہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی ترو تازہ اور ہشاش بشاش ہو چکی تھی۔ جیسے کھڑے، کھڑے ہلکی سی نیند نے اسے اتنا فریش اور ترو تازہ کر دیا تھا۔ زیبا کو خیال آیا۔ وہ پچھلی رات سے جاگ رہی تھی۔ آغا کچھ سامان لینے شہر سے باہر گیا تھا۔ رات سے زیبا ڈیوٹی پہ تھی کافی تھکی ہوئی، اندرونی طور پر پژمردہ تھی مگر بظاہر ہنس، ہنس کر بات کرنے پر مجبور تھی۔ مگر ان چند سیکنڈ میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اس کے لبوں پر ابھی تک کچھ الفاظ تھے۔ وہ الفاظ کیا تھے؟

''کسٹمر یہ جوتا خرید چکا ہے اور بل میرے پاس ہے۔'' زیبا جیسے دھک سے رہ گئی تھی۔ گویا ہوش میں آ گئی ہو۔ کسٹمر جوتا اڑا کر لے جا چکا تھا مگر بل اس کے پاس نہیں تھا۔ اسی پل آغا اندر داخل ہوا تھا۔ اور شاید اس نے زیبا کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔

''کسٹمر نے کون سا جوتا خریدا ہے؟ کہو جی میرے سوہنے! کدھر ہے بل؟'' آغا نے مسکراتے ہوئے دھواں، دھواں چہرے والی زیبا سے پوچھا تھا۔ جو ابھی تک چینی کی مورت بنی کھڑی تھی۔

''بل نہیں ہے۔'' زیبا نے رو دینے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ جیسے ہڑبڑا کر بول رہی تھی۔

''تو پھر جوتا کہاں گیا؟'' آغا نے حیرت سے پوچھا، وہ سفر سے آ رہا تھا آتے ساتھ نقصان کا سن کر متوحش ہو گیا۔

''وہ تو کسٹمر لے گیا۔'' زیبا اب منہ بنا کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ارے کیسے؟'' آغا دھک سے رہ گیا۔ تو گویا سچ میں نقصان ہو چکا تھا۔

''جانے کیسے، میں سو گئی تھی شاید......'' وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ آغا کا منہ کھل گیا۔

''تم سو گئی تھیں؟ پھر تو سمجھو، ایک کے بجائے کئی جوتے غائب ہوئے۔'' آغا سر تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

''نہیں، صرف ایک ہی جوتا......'' زیتا نے اِدھر اُدھر دیکھ کے جیسے اپنی تسلی کر لی تھی پھر اس نے باہر نکل کر دیکھا تھا۔

گلاس ڈور کے ایک طرف رکھی کوڑے (ڈاسٹ بن) میں پیک شدہ جوتا پڑا تھا۔ زیتا کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔

''آغا جوتا یہ رکھا ہے۔'' وہ بے ساختہ خوشی سے چیخ پڑی تھی۔ آغا بھی بھاگا بھاگا باہر کی طرف آیا۔

''ارے...... یہ کہاں سے آ گیا؟'' آغا جو نقصان کا سن کر پژمردہ ہو چکا تھا ایک دم کھل اٹھا۔

''وہ لڑکی یہاں رکھ گئی ہے۔ کہیں پاگل تو نہیں تھی، پہلے چوری کی اور اب......'' وہ دونوں خوشی، خوشی جوتا اٹھا کر اندر لے جا رہے تھے۔ جب سڑک کے پار موجود ایک کیفے کی گلاس وال سے انہیں دیکھتی مون مسکرا رہی تھی۔ کافی پیتے ہوئے اپنے دوسرے کامیاب تجربے سے لطف اٹھانے کا اپنا ہی الگ مزہ تھا۔ وہ مسرور سی شیشے کے پار کا منظر دیکھتی رہی تھی۔ وہ چوری کرنے نہیں آئی تھی جو کام وہ کرنے آئی تھی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا اب اسے دوبارہ زیتا کی شاپ پر کبھی نہیں آنا تھا۔ ایک بات تو طے تھی۔

☆☆☆

مون کو گھر چھوڑے اسی طرح کئی سال گزر گئے تھے۔ شاید پانچ یا چھ سال...... وہ اپنی زندگی میں بہت مطمئن تھی اور اب پروفیسر کے ساتھ مل کر بڑے بڑے اہم پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی۔ سیکنڈ ٹائم میں ٹیلی پیتھی کی کلاسز لیتی تھی۔ صحیح معنوں میں مون نے پروفیسر کا سارا علم گھول کر پی رکھا تھا۔ وہ مون کو اپنا جانشین سمجھتا تھا۔

اس نے کچھ ہی عرصے میں بڑے کامیاب تجربے کیے تھے اور پروفیسر کے ساتھ مل کر ایک غیر ملکی ایجنسی کے لیے ایک بڑا اہم پروجیکٹ ہاتھ میں لے کر اس پر کام کیا تھا اور ایک بڑے بینک پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یوں بیدی لوتنگ کو راتوں رات شہرت مل گئی تھی اور کئی غیر ملکی ایجنسیاں ان سے کانٹیکٹ کی کوشش میں رہتی تھیں۔ مون پر ذہن پہ ستے لگا تھا اور پروفیسر اس دولت سے خوب فائدہ اٹھا رہا تھا بلکہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔

انہی دنوں سوزان کو مون کی خفیہ کارروائیاں جاننے کا موقع ملا تھا۔ دراصل ہوا کچھ یوں تھا کہ پاکستان سے ایک لڑکا آفاق، عیسیٰ سے ٹکرا گیا۔ وہ لڑکا خاصا محنتی تھا اور اپنے مستقبل کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ کوئی پاکستانی عیسیٰ کے کانٹیکٹ میں ہو اور وہ اس کی مدد نہ کرے...... یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ علی عیسیٰ نے اسے اپنے پاپا کی خواہش پر گھر میں ہی ٹھہرا لیا تھا اور اب اس کے لیے کسی انسٹی ٹیوٹ کا بندوبست کر رہا تھا۔ انہی دنوں سوزان نے عیسیٰ کو مشورہ دیا تھا کہ آفاق کا مون کے انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمشن کروا دے۔ تاکہ وہ جرمن زبان پر عبور حاصل کر لے۔ عیسیٰ نے آفاق کو بوار یا بھیج دیا تھا۔ یوں آفاق کی مون سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ پہلی نظر میں ہی اس ساحرہ سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ وہ بیدی لوتنگ کے جس حصے میں پڑھ رہا تھا وہاں صرف ڈچ سکھائی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اتفاقاً وہ میکس وان (جو اس کا کلاس ٹیچر تھا) کے ساتھ ایک دوسرے ڈپارٹمنٹ میں آیا تھا کاریڈور سے گزرتے ہوئے وہ ایک ہال کمرے میں آ گئے تھے...... مگر یہاں کا منظر دیکھ کر آفاق دنگ رہ گیا تھا۔ یہاں کوئی عجیب سا پُراسرار ماحول طاری تھا۔ آفاق کے دل پر جیسے ہیبت طاری ہو گئی تھی۔

کیا مون حسیب نے اسی ٹیلی پیتھی کے ذریعے عیسیٰ اور مالا کی زندگی میں دراڑ ڈالی مگر اس کا انجام کیا ہوا یہ جاننے کے لیے پڑھیے آخری قسط انشاءاللہ اگلے ماہ!

مس رضیہ، دانیہ کو اپنے ہمراہ لے کر کلاس روم میں داخل ہوئیں اور کلاس کے بچوں سے اس کا تعارف کروانے کے بعد انگریزی کی کتاب اس کے حوالے کرتے ہوئے اپنی پسند سے سبق پڑھانے کے لیے کہا۔

دانیہ نے کتاب کی فہرست دیکھی اور ایک سبق منتخب کر کے بچوں کو پڑھانے لگی...... اس کے سمجھانے کا انداز کافی دلچسپ و آسان تھا۔ بچے بڑے غور سے سن اور سمجھ رہے تھے اور سبق سے متعلق پوچھے گئے سوال کا جوش و خروش سے جواب بھی دے رہے تھے۔ بچوں کی دلچسپی مس رضیہ کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ بہ مشکل ہی چند لمحے خاموش رہ پائیں۔

''مس دانیہ، آپ یہ چیپٹر پڑھائیں۔'' انہوں نے کتاب ہاتھ میں لے کر ایک دوسرے سبق پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ان کی نظر میں volcanoes

سنہری موقع ۲

ندا حسنین



(آتش فشاں یہ پہاڑ) پر مشتمل یہ سبق پوری کتاب کا مشکل ترین سبق تھا مگر دانیہ اس سبق کو بھی بڑی ہی آسان مثالوں سے اپنے مخصوص نرم لب و لہجے میں بچوں کو سمجھاتی چلی گئی۔

بچوں کی بڑھتی دلچسپی اس بات کا واضح اشارہ تھی کہ وہ دانیہ کو اپنی ٹیچر کی حیثیت سے قبول کر چکے ہیں۔

مس رضیہ اس دوران دانیہ کو کینہ توز نظروں سے دیکھتی رہیں۔ ان کا دل دانیہ کو ٹیچر اپائنٹ کرنے کو نہیں مان رہا تھا۔

بہر کیف اگلے دن ہی مینجمنٹ نے دانیہ کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر اسے ٹیچر رکھ لیا۔ وہ پوری تندہی سے اپنی ذمے داری نبھا رہی تھی۔ مگر مس رضیہ آئے دن اس کے خلاف کوئی نہ کوئی شکایت مینجمنٹ کے سامنے پیش کر دیتیں۔ کبھی والدین کی طرف سے جھوٹی شکایتیں لگاتیں تو کبھی ضرورتاً کی گئی چھٹی کو بھی بلا جواز بنا ڈالتیں۔ کسی ٹیچر کے چھٹی کرنے پر اس کے اضافی پیریڈ بھی اس کے کاندھوں پر ڈال دیتیں۔ وہ یہ سب کچھ اس قدر ہوشیاری سے کرتیں کہ دوسروں کو ان کی غلطی ذرا بھی محسوس نہیں ہوتی اور تب سارا اسٹاف دانیہ کو قصوروار سمجھتا۔

روز، روز کی شکایتوں سے تنگ آ کر اس بار مینجمنٹ نے دانیہ کو بلا کر بڑی سخت وارننگ دی۔ وہ جان چکی تھی یہ سب کچھ مس رضیہ کی وجہ سے ہو رہا ہے مگر وہ ان کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ باوجود لاکھ.. کوششوں اور احتیاط کے مس رضیہ کوئی نہ کوئی ایسا ٹھوس ثبوت کھڑا کر دیتیں اور وہ ہمیشہ انتظامیہ کی نظروں میں قصوروار ٹھہرتی۔

ان تمام حالات سے تنگ آ کر دانیہ چند مہینوں میں ہی یہ ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔ جس دن اسکول میں اس کا آخری دن تھا، مس رضیہ کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔

☆☆☆

مس رضیہ شہر کے ایک مشہور اسکول کی انتظامیہ کی سب سے سینئر رکن تھیں، ان کا عہدہ کوآرڈینیٹر کا تھا۔ اسٹاف اور ٹیچرز کی اپائنٹمنٹ اور ٹریننگ انہی کی ذمے داری تھی۔ ان کے کیے گئے فیصلوں اور رائے کو ہمیشہ سے ہی بڑی اہمیت حاصل رہی تھی۔ ان کا تعلق انسانی سوچ کے اس طبقے سے تھا جو کسی دوسرے کو خود سے آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتے.... کسی کو ملتی کامیابی ان سے برداشت نہیں ہوتی، دوسروں کی خوشیوں میں بھنگ ڈالنے میں انہیں کمال حاصل ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح مس رضیہ کی بھی سوچ تھی۔ نہ صرف اسکول بلکہ اپنے گھر میں بھی ان کا کردار کچھ اسی طرح کا تھا۔

☆☆☆

''رضیہ بیگم کچھ سبق حامد میاں کی بیگم سے ہی حاصل کر لیں۔ کتنے سادہ اور شائستہ انداز میں گفتگو کرتی ہیں اور ایک آپ ہیں جو ذرائی برابر بات کی بھی کھال ادھیڑنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔'' محمود صاحب، گھونٹ، گھونٹ چائے پیتے اپنی بیگم کو جتاتے ہوئے بولے۔

''شرم کریں محمود صاحب، اس عمر میں دوسروں کی بیویوں کے ساتھ اپنی بیوی کا تقابلی جائزہ لے رہے ہیں۔ اب یہ عمر نہیں رہی آپ کی اس طرح دوسروں کی بیگمات کے لب و لہجے میں کھو جانے کی۔'' رضیہ بیگم نے جم کر لتاڑا۔

''حد کرتی ہیں آپ بھی...... میری ایک عام سی مثال کو آپ کہاں سے کہاں لے گئیں، لاحول ولا قوۃ!'' محمود صاحب کو چائے پیتے، پیتے زبردست اچھو لگا۔ وہ جواب دے کر اب تلملائی نظروں سے بیگم صاحبہ کو دیکھ رہے تھے۔

''چلیں... دفع کریں اس بات کو...... یہ بتائیں دیور جی کس سلسلے میں آئے تھے؟'' لاحاصل گفتگو کرنے میں انہیں کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی سو فوراً

اپنی بات پر پلٹ آئیں۔

''پہلے بھی بتا چکا ہوں رضیہ بیگم..... پر آپ کے کمزور حافظے کے پیش نظر ایک مرتبہ پھر کہے دیتا ہوں کہ معمول کی خیر خیریت دریافت کرنے تشریف لائے تھے حامد میاں.....'' محمود صاحب نے بھرپور طنز کر کے اپنا حساب برابر کیا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔اب کی بار رضیہ بیگم تلملا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

حامد میاں اور ان کی اہلیہ سے رضیہ بیگم کی کبھی نہیں بنی تھی۔ وہ دونوں ہی سلجھے ہوئے مزاج کے لوگ تھے۔ پورے خاندان میں ان کی خوش اخلاقی، مہمان نوازی اور اعلیٰ ظرفی مشہور تھی۔

اس کے برعکس رضیہ بیگم پورے خاندان میں منہ پھٹ، ضدی، بد اخلاق قسم کی خاتون سمجھی جاتی تھیں۔ خاندان کے لوگ زیادہ تر اُن سے دور رہنا ہی پسند کرتے تھے۔

حامد میاں اور ان کی بیگم کی خاندان میں مقبولیت سے وہ بے طرح خار کھاتی تھیں۔ حامد میاں جب بھی اپنے بڑے بھائی کی خیر خیریت معلوم کرنے آتے، وہ بے چین روح بنی پورے گھر میں پھرتی دکھائی دیتیں۔

محمود صاحب ان کی سوچ، کیفیت غرض ہر بات سے آگاہ تھے مگر جب آدھی عمر اُن کے سنگ بغیر کسی چون و چراں کے گزار چکے تو اب بھی مصلحت آمیز خاموشی کا لبادہ اوڑھے ہر بات برداشت کر جاتے.....رضیہ بیگم کی حتی الامکان کوشش ہوتی کہ دونوں بھائیوں کے آپس میں خوشگوار تعلقات نہ رہیں پر یہیں آ کر محمود صاحب ان کا کوئی داؤ چلنے نہ دیتے۔

بالآخر دونوں بھائیوں کی روز، روز کی ملاقاتیں ایک دن رنگ لے ہی آئیں۔ جس کا انکشاف محمود صاحب نے ایک شام اپنی بیٹی شازیہ کا رشتہ حامد میاں کے بیٹے زاہد سے طے کرنے کی صورت میں کیا۔ جسے سنتے ہی رضیہ بیگم کے ہوش اڑ گئے۔ سونے پر سہاگا یہ کہ شازیہ بھی اس رشتے پر بے حد خوش اور مطمئن تھی اور یہی بات رضیہ بیگم کے تن بدن میں آگ لگا گئی۔ سو بلا کا ہنگامہ گھر میں برپا ہوا مگر محمود صاحب نے اس دفعہ ان کی ایک نہ چلنے دی۔

رضیہ بیگم پہ مزید ستم یہ ہوا کہ شازیہ کے رشتے کے کچھ ہی دنوں بعد (بیٹے) سعود نے ایک لڑکی کو پسند کرنے کا گھر میں شوشا چھوڑ دیا۔ جس پر محمود صاحب نے لڑکی کے گھر والوں سے ملنے کی بھی منظوری دے دی...... وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئیں۔ مگر بیٹے کو خود سے بدگمان نہیں کرنا چاہتی تھیں لہٰذا خاموش رہیں۔

اگلے جمعے کو یہ لوگ لڑکی والوں کے ہاں مدعو تھے۔ ڈرائنگ روم میں بڑے رعب و کروفر سے بیٹھے، بیٹھے انہوں نے پورے گھر کا معائنہ کر لیا۔ گھر سلیقہ مندی کا منہ بولتا ثبوت تھا مگر وہ اس لڑکی سے ملنے کے لیے بے چین تھیں جو سعود کے ساتھ آفس میں کام کرتی تھی اور سعود اس لڑکی کا دیوانہ ہو چکا تھا۔

چونکہ وہ خود ایک ملازمت پیشہ خاتون تھیں سو وہ زمانے کے چال چلن سے بخوبی واقف تھیں۔ ان کے خیال سے جس طرح وہ مختلف قسم کے لوگوں سے مل کر ایک تیز طرار عورت بن چکی تھیں ٹھیک اسی طرح وہ لڑکی بھی ہوشیار ہوگی۔ جس کا ثبوت انہیں بیٹے کی دیوانگی دیکھ کر ہی مل گیا تھا مگر ایک تیز طرار اور ہوشیار لڑکی کو اپنی بہو بنانے کو وہ کسی صورت بھی راضی نہ تھیں پر مصلحتاً خاموش بیٹھی تھیں کہ وقت کا تقاضا... فی الحال یہی تھا۔

اور جب سلیقے سے دوپٹا اوڑھے وہ لڑکی ان کے سامنے آئی تو ان کی سانسیں رک گئیں۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس لڑکی کو ان کے صاحبزادے نے پسند کیا وہ لڑکی دانیہ ہوگی۔ جسے چند مہینوں قبل ہی انہوں نے اس قدر ستایا تھا کہ وہ جاب

چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ دانیہ بھی انہیں پہچان چکی تھی۔

☆☆☆

محمود میاں جب واپس گھر آئے تو بے انتہا خوش تھے۔ انہیں دانیہ اور اس کے گھر والے بے حد پسند آئے تھے سعود، باپ کی رضامندی ملنے پر بہت خوش تھا پر ماں کی خاموشی اسے اچنبھے میں ڈال رہی تھی۔ آخر ہمت کر کے اس نے ماں سے پوچھ ہی ڈالا۔

''امی آپ کو کیسی لگی دانیہ......؟'' بڑے ہی ارمانوں کے ساتھ سعود نے پوچھا تھا۔

''سعود بیٹے وہ لڑکی بالکل بھی تمہارے قابل نہیں......تم اسے بھول جاؤ، میں اس سے بھی کہیں اچھی لڑکی ڈھونڈوں گی تمہارے لیے......'' بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں جبکہ وہ ہکا بکا ماں کو جاتا دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

محمود صاحب کو جب علم ہوا تو انہوں نے رضیہ بیگم سے رشتے سے انکار کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے صفاچٹ جواب دے ڈالا۔

''شازیہ کی شادی کا فیصلہ آپ کر چکے، بس اب سعود کی شادی کا فیصلہ میں خود کروں گی۔''

''شازیہ کی شادی کا فیصلہ میں نے اس کی مرضی جان کر کیا تھا جبکہ آپ بیٹے کی پسند کو نظر انداز کر کے اپنا حکم چلا رہی ہیں۔'' محمود صاحب بھی دو بدو تھے......رضیہ بیگم نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ مطلب تھا کہ اب اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔ سعود ماں کے رویے سے بے حد بدگمان ہو چکا تھا۔ وہ اب گھر میں کم سے کم وقت گزارتا تھا پر رضیہ بیگم چکنا گھڑا بن چکی تھیں۔ حالات دیکھ کر آخر کار محمود صاحب کو ایک بار پھر کمر کس کر میدان میں اترنا پڑا۔

''سچ، سچ بتائیں رضیہ بیگم آپ سعود کے رشتے کے خلاف کیوں ہیں؟'' رات کو جب رضیہ اپنے تمام کاموں سے فارغ ہو کر کمرے میں آئیں تو انہوں نے سوال داغ ڈالا۔

''محمود صاحب آپ بھی ناسمجھ بنے بیٹھے ہیں۔ دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں بڑی ہی تیز طرار ہوتی ہیں، ہمارا بچہ سیدھا سادہ سا ہے۔ شادی کے بعد دیکھیے گا کیسے رعب جمائے گی اور انگلی کا ناچ نچائے گی۔'' وہ پہلے سے تیار بیٹھی تھیں اس گفتگو کے لیے۔ جانتی تھیں گھر کے حالات کے پیش نظر جلد ہی ان سے باز پرس کی جائے گی۔

''ملازمت پیشہ خاتون تو آپ بھی ہیں پھر اپنے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے......ذرا آپ تفصیلاً سمجھائیں گی مجھے......؟'' انہوں نے بیگم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کچھ اس لہجے میں کہا کہ وہ سٹپٹا کر رہ گئیں۔

''آپ میرا مقابلہ اس لڑکی سے کر رہے ہیں جو ابھی ہمارے گھر آئی بھی نہیں۔ محمود صاحب تیس سال میں بھی آپ رضیہ کو نہ جان سکے۔'' انہوں نے جذباتی انداز میں بولنا شروع کر دیا۔

''ہم سے زیادہ بھلا آپ کو کون جان سکتا ہے رضیہ بیگم'' محمود صاحب مسکرا کر زیر لب بڑبڑائے۔

''میں اسکول میں ملازمت کرتی ہوں محمود صاحب اور وہ لڑکی غیر مردوں کے ساتھ......ایسے ہی تو سعود اس پر لٹو نہیں ہو گیا ناں......کچھ چالیں تو ضرور چلی ہوں گی اس لڑکی نے۔'' وہ اپنی ہی جھونک میں بولتی چلی گئیں۔

''بس کریں رضیہ بیگم......کسی پر بھی بنا سوچے سمجھے الزام لگانا کسی طور پر مناسب نہیں......اور یہ بات خوب کہی آپ نے کہ وہ نامحرم مردوں کے ساتھ کام کرتی ہے جبکہ آپ کا دامن اس معاملے میں بالکل صاف ہے......اگر ایسی بات ہے تو ذرا مجھے بتائیں کیا آپ کے یہاں مرد کلرک نہیں؟ مالی نہیں؟ ڈرائیور نہیں......؟ اور سب سے بڑھ کر...آپ کے

اسکول کے پرنسپل صاحب کیا مرد نہیں......؟ آفس ہو یا اسکول، کسی بھی جگہ مرد تعداد میں کم ہوں یا زیادہ...... حیثیت میں اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ ہوتے تو... نامحرم ہی ہیں ناں...... آپ خود سارا دن نامحرموں کے ساتھ کام کرتی ہیں پھر دوسرے پر کس حق سے انگلی اٹھا رہی ہیں......؟'' محمود صاحب کے تابڑ توڑ حملوں کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ بنا چوں و چرا اں ہر بات ماننے والا شوہر آج اس طرح آئینہ دکھا کر باز پرس کرنے لگے گا۔

''اگر میں آپ کے خیال سے متفق ہو بھی جاؤں تو پھر آپ خود بتائیں میں جب بیٹے کے لیے ایسی لڑکی پسند نہیں کر رہا جو نامحرموں کے ساتھ کام کرتی ہے تو پھر اپنے لیے ایسی بیوی کیسے پسند کروں گا جو نامحرموں کے ساتھ کام کرتی ہے، جواب دیجیے۔ کوئی حل ہے آپ کے پاس......؟'' اِک سرد لہر رضیہ کے جسم میں بجلی کے مانند سرایت کر گئی۔ شوہر صاحب کے سوالات نے ان کی زبان گنگ کر دی۔ وہ تو سوچے بیٹھی تھیں کہ یہ بولیں گی، وہ بولیں گی کوئی نہ کوئی جواز گھڑ لیں گی، کوئی بہانہ بنا لیں گی......اور پھر بالآخر یہ معرکہ سر کر ہی لیں گی پر یہاں تو اب سب کچھ ناممکن ہی دکھائی دے رہا تھا۔

''اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ لڑکی پہلے آپ کے اسکول میں ملازمت کے لیے آئی تھی۔ جاب مل بھی گئی تھی اور جوائن بھی کر لیا تھا مگر پھر کچھ نامعلوم وجوہات کی بنا پر وہ خود سے جاب چھوڑ کر چلی گئی۔'' محمود صاحب نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے اپنی کمان سے ایک اور تیر پھینکا۔

''یہ آپ کو بھلا کیسے معلوم ہوا؟'' وہ بے اختیار پوچھ بیٹھیں...... جواب میں محمود صاحب کی مخصوص مسکراہٹ دیکھ کر خود ہی بوکھلا کر کہنے لگیں۔

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ دانیہ......'' ان کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ محمود صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کروا دیا۔

''چلیں چھوڑیں اب اس قصے کو......اپنی ضد ختم کریں اور بچوں کی خوشی میں پورے دل سے شامل ہوں۔ یہ انا، ضد، ہٹ دھرمی آپ کو کبھی کوئی خوشی نہیں دے گی اور نہ ہی سکون...... بلکہ آپ کو تنہا کر دے گی......'' انہوں نے اپنی بات مکمل کر کے بیگم کو ایک نظر دیکھا اور پھر کہا۔

''آئیں رضیہ بیگم...... میرے ساتھ چلیں اور بیٹے کی خوشی میں اپنی رضامندی کی مہر ثبت کریں......'' وہ اب پورے خلوص سے مسکراتے ہوئے اپنی بیگم کی طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے۔

رضیہ بیگم کے سامنے اب دونوں راستے واضح تھے۔ ایک خوشیوں بھرا......اپنوں کے ساتھ سفر طے کرنے والا راستہ...... دوسرا کینہ پروری، انتقام، بدلہ اور نفرت جیسے منفی جذبوں کے سنگ طے کرنے والا راستہ......انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے ہم سفر کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا...... وہ اب اپنے گھر والوں کے ساتھ پورے دل سے ان کی خوشیوں میں شریک تھیں۔

قدرت کا یہی نظام ہے، جلد یا بدیر ہر کوئی اپنا صحیح راستہ کسی نہ کسی حد تک پہچان لیتا ہے۔ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو وقت پر صحیح راہ پہچان کر اس پر گامزن ہو جاتے ہیں اور یقیناً یہ سنہری موقع ان کا رب ہی فراہم کرتا ہے۔ رضیہ بیگم نے اپنے دیور، دیورانی سے ہمیشہ بیر رکھا مگر قدرت نے اُنہی کی بیٹی کو اُن کے گھر کی زینت بنا دیا......اور وہ لڑکی جسے اسکول میں اس کی قابلیت سے بے پناہ متاثر ہو کر انہوں نے چند ماہ بھی ٹکنے نہیں دیا تھا وہی لڑکی آج اِن کے گھر کی بہو بننے جا رہی تھی تو اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے کا یہ سنہری موقع انہوں نے گنوایا نہیں تھا۔

منی ناول

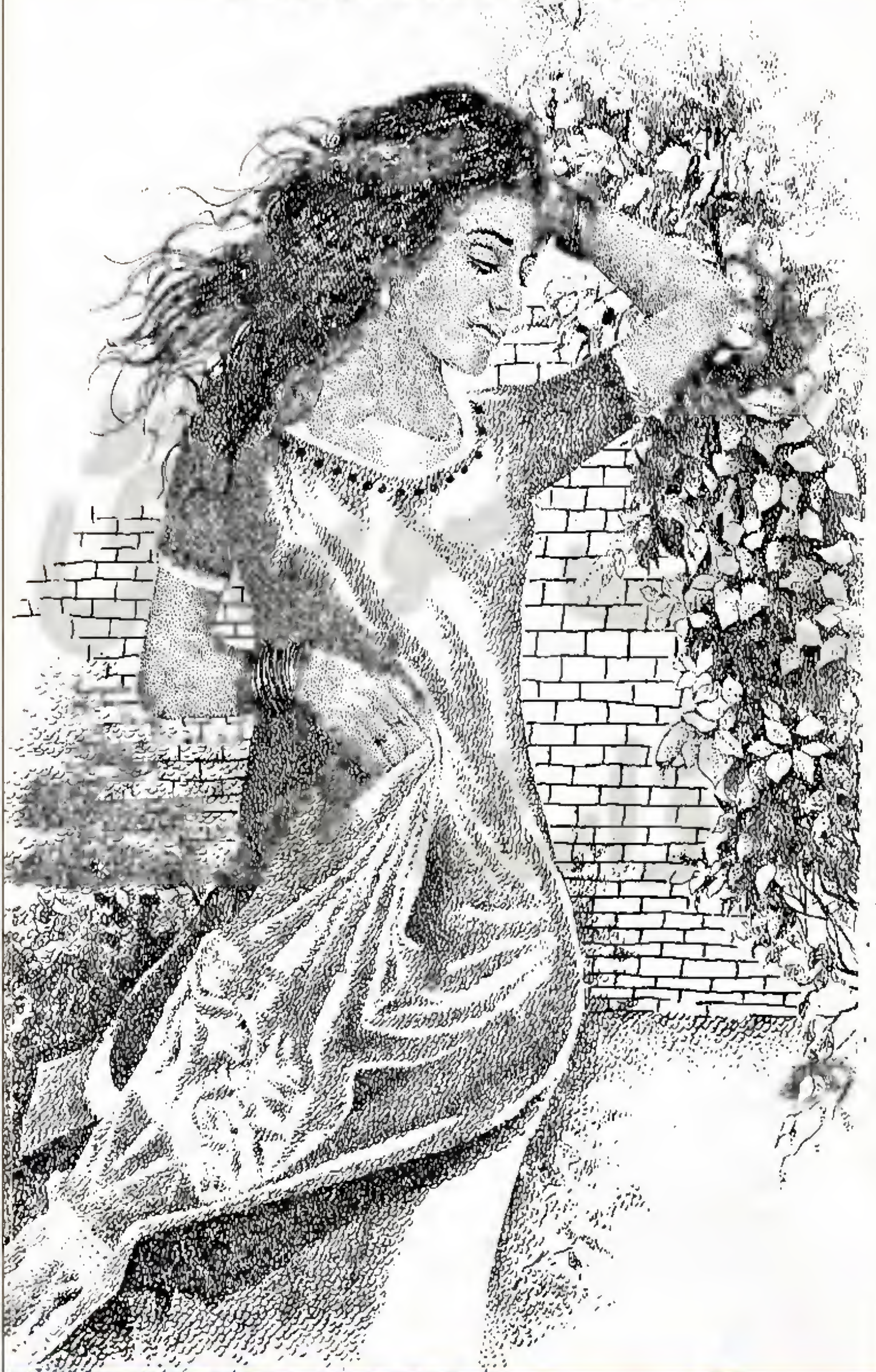


چوتھا حصہ

جنگل کا پھول

زاہدہ پروین

دھیرے، دھیرے شرمین کو اس گھر میں آتے اور بچوں کو پڑھاتے سال بھر کا عرصہ ہو چلا تھا۔ بچوں کو اس نے سچ مچ زبردست طریقے سے کنٹرول کرنے کے ساتھ ساتھ گائڈ بھی کیا تھا...... نہ صرف یہ کہ بہترین انداز میں پڑھا رہی تھی بلکہ بھرپور طریقے سے تربیت بھی دے رہی تھی۔ وہ شرارتوں سے زیادہ تعلیم کی طرف متوجہ رہتے...... چنانچہ گھر کا ہر فرد اس سے مطمئن تھا۔



ڈاکٹر شاکرہ کے بچے کالج اسٹوڈنٹ ہو چکے تھے اس لیے وہ اُدھر سے فارغ ہو چکی تھی لہٰذا اب ان بچوں پر زیادہ توجہ اور وقت دیتی۔

اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ ویسی ہی ... ریزرو ٹائپ تھی۔ بچوں کے علاوہ گھر کے دوسرے افراد سے بہت کم مخاطب ہوتی۔ تاہم معصومہ اور روبی نے کسی نہ کسی صورت کچھ نہ کچھ رسائی حاصل کر لی تھی۔

ڈاکٹر خاور کا رویہ وہی محتاط سا تھا۔ بس اتنا فرق ضرور آیا تھا کہ بعض اوقات ان کی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا۔ دل اسے دیکھ لینے کو زیادہ مچل جاتا تو آنے بہانے اسے دیکھ لیا کرتے مگر اماں کے خوف سے بات چیت کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔

خود تو وہ مجبور تھے ہی مگر اصل حیرت انہیں شرمین کے رویّے پر تھی۔ اگر کبھی وہ قریب سے گزر جاتے یا دورانِ اسٹڈی کسی بچے سے کوئی بات کرنے کھڑے ہو جاتے تو وہ نگاہ تک اٹھا کر نہ دیکھتی۔

ہر گزرنے والا لمحہ اور بیتنے والی گھڑی ان کی قوتِ برداشت اور صبر و تحمل کو چیلنج کر رہی تھی۔ ہر دن ان کی جھنجلاہٹ بڑھ رہی تھی۔ بسا اوقات دل بغاوت پر آمادہ ہونے لگتا۔ خیالات باغی ہو جاتے...... کیا ستم تھا کہ وہ ہزار چاہنے کے باوجود آج تک اس سے ایک... سرسری ملاقات نہ کر پائے تھے...... اظہارِ مدعا اور وارداتِ دل کا احوال سنانا تو درکنار اس کے حضور پہلا سلام تک نہ پہنچا پائے تھے اور یہ سب ان کے گھریلو ماحول اور پابند فضاؤں کا قصور تھا۔ انہیں روبی اور معصومہ سے بھی سخت شکوہ تھا جو اک ذرا سی راہ بھی ان کے لیے ہموار نہ کر سکی تھیں ایسی نامعقول بہنوں سے آئندہ کیا امید باندھی جا سکتی تھی۔

آج وہ اسپتال سے پکا ارادہ کر کے نکلے تھے کہ اس سے راہ و رسم کی ابتدا کریں گے۔ خواہ کوئی کچھ کہے مگر یہاں تو دشمنِ جاں تھی ہی نہیں۔ معلوم ہوا کہ غیر حاضر ہے۔

''آج مجھے اپنے جذبوں کی صداقت پر شبہ ہونے لگا ہے۔'' انہوں نے دل ہی دل میں خود کو پھٹکارا۔ ''یقیناً میری نیت میں فتور ہے، ارادوں میں جھول ہے...... میرے ہی جذبۂ طلب میں کھوٹ ہے۔ ورنہ قدرت میرا ضرور ساتھ دیتی۔ آخر آج جبکہ میں اس سے بات کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا تو اس نے چھٹی کیوں کی؟'' دل پر منوں بوجھ آ پڑا۔

وہ افسردہ دلی سے تیار ہو کر ایک دوست کے ہاں کی تقریب میں چل دیے۔ دیکھنے والوں نے ہنس مکھ و خوش اخلاق ڈاکٹر کو پہلی بار مضطرب دیکھا۔ بہترین تراش خراش کے کریم کلر سوٹ میں وہ حد درجہ بے چین نظر آ رہے تھے۔ فراخ پیشانی پر خمدار بالوں کے سنہرے گچھے پڑے تھے لیکن ساحر آنکھوں میں وحشتیں بسیرا کر رہی تھیں۔ وہ خوش اطوار، بنے سنورے مہمانوں کے درمیان اپنے دوست کو تلاش کرتے پھر رہے تھے کہ زمین نے گویا ان کے پاؤں پکڑ لیے۔

سامنے کرسی پر بیٹھی شرمین اسد اللہ انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جگمگ جگمگ کرتی تیز دودھیا روشنیوں میں اس کی ہیروں کے مانند چمکتی دمکتی شفاف آنکھوں کی جھیلوں میں وہی شناسا چمک لہریں مار رہی تھی جو انہوں نے مدت پہلے ڈاکٹر شاکرہ کے ہاں دیکھی تھی۔ سیاہ شال شانوں کے گرد لپیٹے وہ چاندنی راتوں میں چٹک اٹھنے والے شگوفے کی طرح لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر خاور پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتے رہے۔ خود اس کی کیفیت بھی ان سے مختلف نہ تھی۔ شاید سانس لینا بھی بھول گئی تھی...... وہ یک ٹک متحیر سے انداز میں انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

خاور غیر ارادی طور پر قدم اٹھاتے ہوئے مدہوش سی کیفیت میں آگے بڑھے اور اس کے سامنے جا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

دفعتاً شرمین نے ایک ہلکی سی جھرجھری لی پھر خاور کا سراپا بظاہر نظر انداز کر کے نگاہیں اپنی گود میں رکھے

ہاتھوں پر نکادیں۔ چہرہ گو آہستہ آہستہ سرخ ہو رہا تھا۔

خاور کو اپنی بصارت پر یقین کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ ابھی شام کو تو انہیں اپنے جذبوں کی بے ثباتی پر رنج ہو رہا تھا اور اب اپنی تمام تر بے تابیوں اور بے قراریوں پر بے ساختہ پیار آرہا تھا۔ بہ مشکل تمام وہ ساری قوتِ گویائی کو بروئے کار لا کر صرف اتنا کہہ سکے۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ آپ یقیناً مجھے پہچان چکی ہوں گی...... ہے ناں......؟'' شرمین نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا...... یاقوتی لبوں پر اقرار کا ہلکا سا تبسم رینگ گیا...... خاور کی روح گنگنا اٹھی۔ حسرت و یاس نے سمٹ کر مسرت و شادمانی، امید اور آرزوؤں کے لیے جگہ خالی کر دی۔ وہ مست خرام، دلنواز جھونکے کی طرح بکھر کر بولے۔

''اور...... یہ بھی جانتی ہوں گی کہ میں نے بھی پہلی نظر میں آپ کو پہچان لیا تھا......'' شرمین کے چہرے پر پھر ادھ کھلی کلیوں کی سی مسکراہٹ چٹک پڑی۔

خاور کو خود احساس نہیں تھا کہ انہوں نے یہ دو جملے کس ناتے یا کس تعلق کے تحت کہہ ڈالے تھے۔ بس یونہی محسوس ہوا تھا جیسے ان کے سامنے بیٹھی چھوٹی موئی سی لڑکی سے جنم جنم کی شناسائی ہو۔ یوں جیسے وہ کبھی ان سے بچھڑی نہ ہو، ہمیشہ ہر حالات میں دل کے آس پاس ہی منڈلاتی رہی ہو۔

اور ...... وہ شرمین بھی تو کس اپنائیت سے مسکرائے جارہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ایسا کوئی تعلق...... کوئی ناتا...... کوئی ربط...... یا کوئی رشتہ خود بخود ہی استوار ہو گیا تھا جو صدیوں میں قائم ہوتے ہیں۔ دونوں کے درمیان ہنستی مسکراتی، باتیں کرتی ہوئی خاموشی کھڑی کھلکھلا رہی تھی اور خاور سوچ رہے تھے کہ ہزاروں لاکھوں باتوں میں سے تلاش کر کے کون سی ایسی بات پوچھیں جو مفصل اور مکمل ہو۔ بہت کچھ سوچ کر پہلو بدلتے ہوئے انہوں نے بدقت کہا۔

''بلیک آؤٹ کی اس رات...... کے بعد آپ نے مجھے کبھی بلوایا ہی نہیں...... میں نے دنوں انتظار کیا تھا۔''

شرمین کا دمکتا ہنستا ہوا چہرہ سپید پڑ گیا۔ آنکھوں کی جھلملاتی قندیلیں بجھنے لگیں...... ہونٹوں کی مسکراہٹ پل کی پل ماند پڑ گئی۔ اس نے مضطرب ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ضبط و تحمل کی جانے کن منزلوں سے گزر رہی تھی کہ اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھی۔

خاور اس کی بدلتی کیفیت کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے۔ جی میں سوچا۔ ''خبر نہیں کیا بات ہے؟ میں نے ناحق بات چھیڑ دی۔'' پریشان ہو کر بولے۔

''معاف کیجیے...... مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کو میرے سوال سے دکھ پہنچے گا۔ مجھے بھی افسوس ہے، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔'' اس نے چونک کر خاور کو دیکھا...... آنکھوں میں ناقابلِ بیان کرب کا الاؤ جل رہا تھا۔ انہوں نے پہلی بار اس کی آواز سنی...... وہ کہہ رہی تھی۔

''نہیں...... آپ پریشان مت ہوں...... دراصل مجھے تین چار سال قبل کے واقعات کی یاد نے خاموش کر دیا تھا...... وہ رات...... گزرنے کے بعد ہمیں کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ...... اسی دن امی جان کا انتقال ہو گیا تھا۔''

''اوہ......'' خاور کی زبان سے بے اختیار نکلا...... دل دھک سے رہ گیا۔

ضبط کی کوشش میں شرمین کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں شبنمی ہو گئی تھیں اور وہ انجانے میں دونوں ہاتھ مسلے جارہی تھی۔

خاور کے پاس ایک بار پھر الفاظ کا خزانہ ختم ہو گیا۔ وہ سر جھکائے افسردہ بیٹھے تھے۔ اس خبر سے ان کے دل کو درحقیقت بہت تکلیف پہنچی تھی۔ شرمین کے حالات اب ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہے۔

تھے۔ دل ہی دل میں اس غمزدہ لیکن باہمت اور معصوم لڑکی کو ہمیشہ کے لیے اپنانے کا عزم مزید پختہ ہوگیا تھا اور وہ انہیں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ کر عزیز اور محبوب ہوگئی۔

''آپ...... چپ کیوں ہوگئے! میں ویسے ہی اپنے حالات کسی پر ظاہر کرنے کی عادی نہیں...... آپ نے چونکہ خود پوچھا، اس لیے میں نے بتادیا۔ ڈاکٹر صاحب! میں اس حقیقت سے خوب واقف ہوں کہ اس دنیا میں ہر کسی کو اپنے حصے کا بوجھ خود اٹھانا ہوتا ہے۔ کوئی کسی کی ذمے داری اپنے سر لینے پر راضی نہیں ہوتا اس لیے کسی کو اپنے دکھ، اپنے صدمے اور اپنے غم سنانے سے کیا فائدہ...... اگر خبر نہیں آپ سے یہ ساری باتیں میں کیوں کیے جارہی ہوں...... شاید اس بے تکلفی کی وجہ یہ ہے کہ آپ امی جان کے آخری معالج تھے، اس رات کے بعد پھر ایسی کوئی رات نہیں آئی... اور... میں وہ رات کبھی نہ بھول سکی......'' شرمین نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پالیا اور کرب چھپا کر مسکراتے ہوئے بولی۔ خاور کا دل غم کے بوجھ سے دبا جارہا تھا۔ کلیجا شدتِ احساس سے پھٹ رہا تھا مگر ہزار کوشش کے باوجود وہ تعزیت بھی نہ کرسکے۔ بس چپ کے چپ رہ گئے۔

''میں آپ کو سارا واقعہ سناؤں ڈاکٹر صاحب! دراصل اپنے آپ سے تنہا باتیں کر کر کے میں تھک چکی ہوں...... مجھ سے میرے صدمے کوئی نہیں پوچھتا...... نہ میں خود بتاتی ہوں لیکن جی چاہ رہا ہے کہ آپ سے بہت ساری باتیں کروں۔ اپنی ذاتی باتیں...... اپنے ذاتی دکھ...... اپنے گھریلو مسائل...... اپنی جیتی جاگتی زندگی کے غم اور...... محرومیاں چند لمحے چپ رہنے کے بعد وہ دوبارہ آپ ہی آپ پھر بولی۔ وہ ان کے سامنے پرت در پرت کھل رہی تھی۔

''جب میں نے آپ کو تین چار برس کے بعد اچانک ڈاکٹر شاکرہ کے ہاں دیکھا تو پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا بلکہ پہچاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی...... اتنے برسوں میں، میں ایک دن بھی آپ کو بھول نہیں پائی تھی...... آپ اور امی جان...... ایک ساتھ ہی یاد آتے رہے ہیں...... میں آپ کو بتاؤں...... بلیک آؤٹ کی اس رات...... آپ کی تسلی کے بعد میں بہت راتوں کی جاگی ہوئی، چین کی نیند سوئی تھی...... لیکن ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس صبح امی جان ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گی......'' وہ یکلخت چپ ہوگئی۔ ضبط کی کوشش میں اس کا چہرہ دوبارہ سرخ ہونے لگا تھا۔

''شرمین ایک کمزور ناتواں لڑکی ہوتے ہوئے بھی کس صبر وتحمل کا مظاہرہ کررہی ہے جبکہ میں کس بزدلی اور کم ہمتی سے کام لے رہا ہوں...... وہ مجھ سے اپنے دکھ بیان کر کے اپنے زخمی دل کی بھڑاس نکالنا چاہ رہی ہے، میں اگر مضبوطی اور حوصلے سے کام لوں تو بہت ممکن ہے وہ ہلکی پھلکی ہوجائے۔'' اچانک ڈاکٹر خاور کو خیال گزرا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھے، بیمار انسانیت کے معالج، ایسی کم ہمتی اور مسلسل خاموشی انہیں زیب نہیں دیتی تھی۔ بالآخر بہت سنبھل کر بولے۔

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھے کسی لائق سمجھتی ہیں۔ خدا کرے میں اس ذمے داری کا اہل ثابت ہوسکوں...... آپ کہیے کیا کہہ رہی تھیں...... شاید آپ کے دماغ کا بوجھ کم ہوسکے۔'' لیکن انہیں یوں محسوس ہوا جیسے شرمین نے ان کی بات سنی ہی نہیں...... اس نے ایک دبی ہوئی سانس کھینچی اور دوبارہ بولنے لگی۔

''یہ تو آپ کو دادی اماں نے اسی رات بتادیا تھا کہ میرے ابو جی تو محاذِ جنگ پر گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب! میرے بہادر اور دلیر ابو جی 65ء کی جنگ کے غازی تھے گو کہ میں اس پہلی جنگ میں

زیادہ سمجھدار نہیں تھی تاہم مجھے یہ اچھی طرح سے یاد ہے کہ میری امی جان اس جنگ کے دوران ایک دن بھی پریشان نہیں ہوئی تھیں۔ انتہائی صبر و حوصلے سے گھر کے سارے کام کاج کرتیں...... میرے سارے کام انہی کے ذمے تھے۔ رات کو اگر کسی پہر میری آنکھ کھلتی تو انہیں مصروفِ عبادت ہی دیکھتی۔

”اور پھر میری امی جان کی دعاؤں اور اللہ کی رحمت سے جنگ کامیاب رہی اور ابو جی غازی بن کر لوٹے...... ہماری خوشیوں میں اضافہ ہوا...... مگر دوسری جنگ میں اپنی زندگی میں کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ امی جان کی طبیعت ان دنوں ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ بیماری نے امی جان کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ بھی ابو جی کو موجودہ بنگلا دیش بلوالیا گیا۔ جاتے وقت...... ابو جی اس درجہ سنجیدہ تھے کہ میں نے کبھی ان کو اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب میرے حافظے سے...... اس دھندلی، دھندلی صبح کی یاد نہیں مٹتی۔

”اس روز ابو جی نے مجھے اتنا پیار کیا تھا اور اتنی دیر تک کلیجے سے لگائے رکھا تھا کہ میں گھبرا اٹھی تھی۔ دادی جان ہمارے پاس تھیں۔ ہم دن گننے لگے۔ ابو جی کو گئے چند دن ہوئے تھے، خدا نے مجھے دو جڑواں بھائیوں سے نوازا۔ بڑے ہی پیارے اور گول مٹول بھائی، صحت منداور تندرست، خوشی سے میرے پیر زمین پر نہ ٹکتے...... مگر ابو جی کی کمی نے خوشی ادھوری رکھی۔

”پھر ایسا ہوا کہ امی جان کو مسلسل بخار رہنے لگا۔ عبداللہ اور ولی اللہ کو تو دادی اماں نے سنبھال لیا مگر امی جان کی حالت سنبھلنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ حتیٰ کہ غفلت طاری رہنے لگی۔

”جب بھی ذرا ہوش آتا، ابو جی کا پوچھتیں۔ ایک دن حالت بہت ہی بگڑ گئی۔ جنگ جاری تھی، کئی دن گزر چکے تھے سرِ شام بتیاں بجھا دی جائیں، سخت سردی اور بلیک آؤٹ کی سیاہ راتیں امی جان کی بیماری کی وجہ سے بہت بھیانک ہو، ہو کر گزرتیں۔ اس رات طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ تھک ہار کر دادی اماں نے رات کو پہرہ دینے والے ایک رضا کار سے ڈاکٹر لانے کو کہا۔ اس رات آپ پہلی بار ہمارے گھر آئے تھے۔ امی جان کی جیسی حالت تھی وہ آپ نے خود دیکھ لی تھی لیکن آپ کے تسلی آمیز الفاظ نے مجھے اتنی تقویت دی تھی کہ میں اس رات گھوڑے بیچ کر سوئی۔ ویسے امی جان کی حالت بھی دوا کھا کر پہلے سے بہتر دکھائی دے رہی تھی۔ صبح تک بخار بہت ہلکا ہوگیا۔ آپ کا لکھا ہوا نسخہ بازار بھیج کر ہم نے مزید دوا منگوالی۔

”امی جان اس حد تک اچھی ہوگئی تھیں کہ دس بجے کے قریب خود کہہ کر میرے ہاتھوں سے سوپ پیا، میں بہت خوش تھی اور دل ہی دل میں آپ کی احسان مند تھی۔ دادی اماں بھی مطمئن تھیں۔ انہوں نے امی جان کے سر میں تیل ڈال کر بال سنوارے اور کپڑے تبدیل کرائے پھر مجھ سے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب سے حال کہہ کر شام سے پہلے دوا لے آنا۔“ بس وہی وقت تھا۔ باہر سے جیپ رکنے کی آواز آئی۔ میں دیوانہ وار ابو...... ابو کہتی باہر دوڑی۔ میرے ساتھ دادی جان بھی لپک کر آئیں۔ دروازے پر ابو جی کے بجائے دو فوجی جوان کھڑے تھے۔ انہوں نے چند رسمی جملوں کے بعد ہمیں ابو جی کی شہادت کی اطلاع دی۔ میں اور دادی ابھی حالات کو پوری طرح سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ ایک مدھم سی آہ کے ساتھ زور کا دھماکا ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ میری امی جان پکے فرش پر اوندھے منہ پڑی تھیں اور پیشانی سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔

”وہ خبر نہیں کب ڈگمگاتی، کانپتی ہمارے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ مجھ میں اور دادی میں بھلا کہاں اتنی سکت تھی کہ ان کو اٹھاتیں۔

”گرنے کی اور چیخ کی آواز سن کر دونوں فوجی اندر

آ گئے۔ انہوں نے ہی ان کو سیدھا کیا مگر......"

شرمین خاموش ہو کر رومال سے آنکھیں خشک کرنے لگی۔ ڈاکٹر خاور نے ایک گہری سانس لے کر جلتا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور نرمی سے بولے۔

"مقدرات اٹل ہوا کرتے ہیں شرمین، خدا آپ کے والدین کو غریقِ رحمت کرے...... میں آپ کی حوصلہ مندی کی تعریف کروں گا۔ ورنہ ایسے ... پے درپے کٹھن اور صبر آزما حالات میں ایک ناتواں لڑکی کا ثابت قدم رہنا ہی انتہائی دشوار ہے جبکہ آپ تو اپنے گھر کا چراغ ہیں۔"

"جی ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اگر امی جان کے بعد عبداللہ اور ولی اللہ کی ذمے داری مجھ پر نہ ہوتی تو شاید...... کب کی میں اپنی زندگی ختم کر لیتی۔"

"ایسا کچھ ارادہ کر لیا تھا آپ نے؟" خاور کو جھرجھری سی آگئی۔ وہ چند لمحے چپ رہی۔ پھر اقرار میں گردن ہلا کر گویا ہوئی۔

"ایسا ہو جانا کچھ بعید از قیاس نہ رہا تھا۔ بس ہمیشہ انہی دونوں کی تنہائی کا خیال رہا اور دوسرے دادی اماں کی ضعیفی کا...... چنانچہ آج تک میں زندہ ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ براہِ راست اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"ارے ہاں...... خوب یاد دلایا آپ نے...... آپ کی دادی اماں کہاں ہیں؟ اور آپ یہاں...... اس شہر میں کب سے رہنے لگیں؟" خاور نے موضوع بدل دیا اور پوچھا۔ شرمین ذرا کی ذرا رکی...... پھر دھیرے سے بولی۔

"ابو جی کی شہادت کے بعد ہمارا وہاں رہنا ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ وہ ہمارا اپنا مکان نہیں تھا۔ ابو کا آبائی گھر اس شہر میں تھا اس لیے ہمیں یہیں آنا پڑا۔ اب ہم چاروں یہیں رہتے ہیں۔ ابو جی کی پنشن کچھ زیادہ نہیں ہے لہٰذا اپنے دیگر اخراجات میں ٹیوشنز سے پورے کر لیتی ہوں۔ اللہ کا کرم ہے بہتر گزر بسر ہو رہی ہے۔"

اس کے حالات سن کر خاور کو بہت افسوس ہو رہا تھا مگر اس کی سچائی اور صاف گوئی پر بہت حیران تھے اور خوش بھی۔

"لیکن آپ...... اس شہر میں کیسے؟ وہاں سے کیوں چلے آئے؟" اچانک شرمین نے شوخی سے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں دوبارہ ستاروں کی جوت جگمگا...... اٹھی تھی۔

"پھر میرا دوست محاذِ جنگ سے لوٹ آیا۔ وہ کیپٹن ڈاکٹر ہو گیا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کے اسپتال میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ہی پھوپا صاحب نے کوشش کر کے مجھے یہاں ٹرانسفر کرا لیا کیونکہ پوری فیملی تو یہیں ہے۔" خاور نے موقع غنیمت جانا اور شروع سے آخر تک تمام واقعات سنا کر...... جرأت سے کام لے کر آگے ٹکڑا جوڑا۔

"یہ تو نہیں کہتا کہ آپ کی تلاش میں گلیوں، گلیوں، کوچہ، کوچہ گھوما یا قیس کی طرح گریبان چاک کر کے صحراؤں، بیابانوں کو نکل گیا...... لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ کہیں نہ کہیں میرے ذہن میں محفوظ رہیں...... واضح طور پر تو میں نے ڈاکٹر شاکرہ کے ہاں آپ کو محسوس کیا۔ تب پتا چلا کہ دراصل بلیک آؤٹ کی وہ یادگار رات میں کبھی بھول ہی نہ پاؤں گا۔"

شرمین کا چہرہ رنگین ہو گیا۔ ان کی طرف سے قدرے رخ پھیر لیا۔

"سچ تو یہ ہے کہ یہاں اس تقریب میں آپ کو اچانک دیکھ کر مجھے ایک ناقابلِ بیان خوشی حاصل ہوئی ہے۔ وہاں گھر میں تو آپ بات کرنے کی بھی روادار نہیں لگتیں۔ میں نے کئی بار کوشش کی...... آپ نے لفٹ نہ کرائی...... اب بالآخر مجھے یقین آنے لگا تھا کہ سب میرا وہم ہے شاید...... ورنہ آپ شناسائی تو ظاہر کرتیں۔" اس کی باتوں پر وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنسنے سے اس کے رخساروں میں دو ننھے

سے گڑھے پڑ رہے تھے اور چہرے کی کشش میں.... بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ وہ شوخی سے بولی۔

"پہلے تو آپ کی پہلی بات کا جواب دے دوں۔ یہاں اس تقریب میں میری موجودگی کا سبب یہ ہے کہ صاحب خانہ کا بچہ میرا اسٹوڈنٹ ہے اور اس کی ضد کے نتیجے میں مجھے آنا پڑا ورنہ میں کہیں نہیں جاتی اور اب سنیے دوسرے سوال کا جواب...... جناب! پہلے روز جب آپ کی والدہ محترمہ نے میرا انٹرویو لیا تھا میں اسی وقت ان کی افتادِ طبع سے واقف ہو گئی تھی۔ اگر جو میں ان پر یہ ظاہر کر ڈالتی کہ درحقیقت آپ کی لائی ہوئی ہوں تو یقیناً آپ کی شامت آجاتی۔ چنانچہ اول تو مجھے محتاط ہو جانا پڑا۔ دوسرے میں ہر جگہ بے تکلف ہو بھی نہیں پاتی۔ ڈاکٹر شاکرہ کے ہاں چونکہ ٹیوشن ختم ہو چکی تھی، مجھے یوں بھی اپنے اور بھائیوں کے اخراجات کے لیے ٹیوشن تلاش کرنی ہی پڑتی، اس لیے یہاں کا شریفانہ ماحول دیکھ کر میں نے یہیں کی ٹیوشن کو غنیمت جانا۔ ورنہ یہ اندازہ تو میں نے لگا لیا تھا کہ آپ بھی مجھے پہچان گئے ہیں کیونکہ آپ ایک لائق فائق ڈاکٹر ہیں اور معالج اپنے سیکڑوں مریضوں میں سے ہر ایک کو تو یاد نہیں رکھ سکتا مگر میں آپ کو دیکھ کر بے اعتنائی دراصل آپ کی والدہ کی وجہ سے برتتی ہوں۔"

خاور اس ذرا سی لڑکی کی فہم و فراست، دور اندیشی، معاملہ فہمی اور ذہانت پر حیران رہ گئے۔

بظاہر وہ کس قدر سادہ اور معصوم تھی مگر درحقیقت گہری اور کافی ذہین لڑکی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس کی ذہانت کے قائل ہو گئے۔ اندر ہی اندر انہیں ایک بے پایاں فخر کا سا احساس ہوا۔ وہ کیسے خوش نصیب اور بامراد تھے کہ ایسی ہمہ صفت لڑکی سے راہ و رسم نکل آئی تھی لیکن اپنے گھر کے ماحول کا خیال آیا تو ان کے احساسات گھٹ کر رہ گئے۔ اپنی اماں کی سخت گیری اور انا پرستی سے بھی خوب واقف تھے۔ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ تو کبھی شرمین کو پسند نہیں کر سکتیں۔ وہ انتہائی خود پسند اور مغرور خاتون تھیں۔ شرمین ان کی نظر میں ایک معمولی سی ٹیوشن پڑھانے والی لڑکی سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ گھر میں سناٹا تھا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا خلافِ معمول شمسہ بیگم بھی کہیں اپنی طرف پڑی تھیں۔

اس وقت فقط نائمہ بیگم تھیں جو بڑے کمرے میں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک عورت بڑے قاعدے کے ساتھ بڑا سا دوپٹا اوڑھے ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ اچھا بڑھیا سا ریشمی جوڑا پہنے۔ چہرے بشرے سے خاصی سمجھدار اور دبدبے والی لگ رہی تھی۔ یہ دوہرے بدن والی مضبوط کاٹھی کی عورت ہنس، ہنس کر ان سے باتیں بھی کر رہی تھی اور میز پر سجے لوازمات سے انصاف بھی کیے جا رہی تھی۔

"نہیں بھئی...... تین ماہ تو بہت ہیں، مجھ میں اس قدر صبر کا حوصلہ نہیں ہے تم بس ایک ماہ کے اندر، اندر تمام معاملات طے کرا دو۔" نائمہ بیگم نے کسی بات پر بے صبری سے کہا۔

"اوئی بی بی...... اتنی جلدی کیا گڑیا گڈے کا کھیل سمجھا ہے آپ نے کہ ہو جائے گا؟ آخر کو وقت تو لگے گا ہی۔ ابھی تو میں ابتدائی بات چیت کروں گی۔" وہ قدرے برا مان کر بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ اس طرح ٹہل ٹہل کر بات چیت کی ابتدا کرو گی تو ظاہر ہے مہینوں لگ جائیں گے۔"

"لگ جائیں تو لگ جانے دیں۔ ایسے کاموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" یک بیک نائمہ بیگم مایوس سی نظر آنے لگیں۔

"بس بھئی ہم تو ایسا نظریہ نہیں رکھتے، تم تو

بہت باریک ہیں بلکہ ست ہیں۔" وہ عورت ان کی بات پر ہنسنے لگی پھر چبا چبا کر بولی۔

"میرا نام اصغری ہے اصغری..... بتیس سال کا تجربہ ہے میرا اس کام میں جا کر معلوم کرلیں کسی سے بھی..... اگر آج تک بھی کسی کو میرے کام سے گلہ شکوہ ہو تو نام بدل دیں۔ مولا کے کرم سے جو بیڑا اٹھایا اسے پار ہی کرایا ہے۔ اصل میں جلد بازی کا کام ہوتا ہے شیطان کا۔"

"جلد بازی نہیں، بس میں غیر ضروری تاخیر کرنے کے خلاف ہوں، دراصل ایک دو نہیں میرے سر پر کئی طرح کی ذمے داریاں ہیں اس لیے میری پریشانی بجا ہے۔ تم جتنی دیر کرتی جاؤ گی میری پریشانی اتنی ہی بڑھتی جائے گی..... دوسری بات یہ کہ میں فی الحال اس بات کا چرچا بھی نہیں چاہتی، جو کرو رازداری شرط ہے۔" نائمہ بیگم دوبارہ پُرامید نظر آنے لگیں، اصرار کر کے بولیں۔

"بی بی! آپ کی سب باتیں بجا ہیں، آپ کی پریشانی کا بھی احساس ہے۔ مجھ کو مگر اپنی فرمائش بھی تو دیکھیں آپ؟ اتنے بڑے گھرانے میں رشتہ لے کر جانا معنی رکھتا ہے، سو دفعہ سوچوں گی تب قدم بڑھاؤں گی ناں........" اصغری اور بھی زیادہ اترا کر بولی۔

"نہ بھیا..... ہم بھر پائے ایسی تاخیر..... ویسے ہی ہمارے بچوں کی شادیاں رہی جا رہی ہیں۔ اب تمہارے چکر میں مزید دیر ہو جائے گی۔ ہمیں منظور نہیں..... بس بھئی تم تکلیف مت کرو۔"

اصغری ایسا لکا سا جواب پا کر ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے جلدی سے کھانا پینا موقوف کر دیا اور لجاجت سے بولی۔

"بیگم صاحبہ آپ کیسی غیریت والی بات کر رہی ہیں؟ میں کیا میری اوقات کیا..... مولا نے چاہا تو میں کل شام چراغ جلتے ہی ان کے ہاں جا پہنچوں گی۔ پھر جو بھی بن پایا کر گزروں گی۔ آپ فکر نہ کریں..... ہاں! یہ معلم کھلا کہے دیتی ہوں کہ جب بات پکی ہو جائے گی تو..... دو ہزار سے ایک پیسہ بھی کم نہ لوں گی اور جوڑا کپڑا لوں گی..... ہاں....."

"دیکھو اصغری! زیادہ ٹرٹرانے کی ضرورت نہیں ہے..... جیسا کہتے ہیں ویسا کرو۔ نقصان میں تم ہرگز نہ رہو گی۔ تمہاری توقعات سے کہیں بڑھ کر تمہیں انعام واکرام سے نوازیں گے بس ہماری حسبِ منشا کام کر کے دکھاؤ فٹافٹ۔" نائمہ بیگم کے ہونٹوں پر پہلی مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر نمودار ہوئی مگر اسے دھمکانے کو بڑے رعب سے بولی تھی۔

اصغری کے جوش و خروش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اس نے نہایت برق رفتاری سے دو چار رس گلے، دو تین گلاب جامن اور ایک دو برفی کی بڑی، بڑی ڈلیاں نگلیں، شربت کا گلاس چڑھایا اور ڈکار لے کر بولی۔

"بس جی آپ بے فکر ہو جائیں۔ آپ نیاز مان لیں۔ میں یوں گئی اور یوں آئی۔ بس آنے جانے کا خرچ عنایت کر دیں مہربانی ہو گی۔"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔" نائمہ بیگم نے بڑی فیاضی اور اپنائیت سے ہامی بھری، جلدی سے اپنا بھاری بھرکم پاندان کھولا۔ اپنا پان لگایا۔ ایک پان اصغری کو دیا اور ایک ڈبیا سے چند نوٹ نکال کر اسے تھماتے ہوئے آہستہ سے بولیں۔ "خرچ ورچ کی تم فکر مت کرو، وہ سب تمہیں ملتا رہے گا۔ تمہارا حق نہیں رکھیں گے ہم..... بس تم بھی ذرا حلال کر کے کھانا۔"

"مولا آپ کو خوش رکھے بی بی..... میں بھی نمک حرام نہیں ہوں۔ اپنے قول کی پکی ہوں۔ باقی رہی بات رازداری کی تو یہ پیٹ نہیں، کنواں ہے کنواں..... کسی کا بھید کھولنا اپنی عادت نہیں..... اگر یہاں کی وہاں لگائی بجھائی کرنے والی لتری ہوتی تو کس کا رشتہ ناتا طے نہ کرا سکتی تھی۔" نوٹ دیکھ کر

اصغری کی باچھیں کھل گئیں۔ خوش ہو کر بولی۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔'' انہوں نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ''اب تم جاؤ...... اور ہاں...... یہ سب سامان لیتی جاؤ، یہاں کون کھائے گا۔'' اصغری خوشی سے نہال ہوگئی۔

اس نے خوشی خوشی تمام مٹھائی، بسکٹ، نمک پارے، شکر پارے اور دال موٹھ وغیرہ سمیٹی اور پوٹلی بغل میں دبائے عجلت میں رخصت ہوگئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد نائمہ بیگم نے سکون کی ایک گہری سانس لی اور تخت پر لیٹ کر سوچوں کے تانے بانے میں کھو گئیں۔ کچھ عرصے سے وہ دماغی طور پر بہت مصروف رہنے لگی تھیں۔ اندر ہی اندر اپنے خیالات کی کھولا باندھی میں مشغول رہتیں۔ ویسے تو وہ اپنے گھریلو معاملات میں ہمیشہ اپنی نند شمسہ بیگم کے رائے مشورے کو اہمیت دیتی تھیں بلکہ ان کے بغیر کوئی کام کرنے کی عادی نہ تھیں مگر موجودہ قصہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کو اکیلے ہی تن تنہا سر کر لینے کے بعد سامنے لانا چاہ رہی تھیں۔

سیٹھ رستم علی خان علاقے کے ایک سرکردہ اور بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے۔ دنیا جہان میں ان کی دولت و ثروت کے چرچے تھے۔ کئی چلتے ہوئے کاروبار کے مالک و مختار تھے۔ کوٹھی، بنگلے، کاروں والے...... زندگی بھر کی کمائی ان کی دو ہی لڑکیاں...... نہایت حسین و جمیل اور نازک اندام جو دیکھے بس دیکھتا ہی رہ جائے۔ ان دونوں میں سے بڑی کی شادی تو ہوگئی تھی مگر چھوٹی لڑکی فرخندہ ابھی باقی تھی۔ چھوٹی، بڑی سے زیادہ خوب صورت تھی۔

کسی شادی کی تقریب میں نائمہ بیگم کی نگاہوں سے یہ لڑکی گزری، وہ سو جان سے اس کی پیاری اداؤں پر مر مٹیں۔ دل ہی دل میں اس پر اس درجہ فدا ہوئیں کہ اپنا چین و سکون غارت کر بیٹھیں۔ اس لڑکی کی ایک، ایک معمولی ترین حرکت بھی ان کے دل پر نقش ہو کر رہ گئی۔ بس تبھی سے وہ فرخندہ کے حسن دلنواز کے گن گانے لگی تھیں اور ایک زبردست جستجو میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ اسی جستجو کا نتیجہ تھی اصغری...... جانے کہاں، کہاں کی معلومات کے بعد اصغری ان کے ہاتھ لگی تھی اور انہوں نے ہزار طرح کی چھان بین کے بعد اس کے سامنے اظہارِ مدعا کیا تھا۔ اور اس پر اپنے دل کا راز افشا کیا تھا۔ وہ بھی ایک چھٹی چھٹائی پختہ کار عورت تھی۔ بہت دنوں تک تو محض ان کی گھسائی ہی کرتی رہی اور نائمہ بیگم کے اشتیاق کو ہوا دیتی رہی۔

آج کی ملاقات اور گفتگو بھی اسی قصے کا ایک حصہ تھی۔ نائمہ بیگم کو اپنی نظر میں منزل قریب ہی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ معاملہ تھوڑا سا آگے کو بڑھ کر کسی امید افزا مقام تک رسائی حاصل کر لے تب وہ شمسہ بیگم کو اچانک ہی آگاہ کر کے حیران ہونے پر مجبور کر دیں گی۔ اس لیے انہوں نے چپ سادھ رکھی تھی۔

فرخندہ انہیں خرم کے لیے دل و جان سے پسند آچکی تھی اگر جو اُن کے اپنے بس میں ہوتا تو وہ...... ایک دن کی بھی تاخیر گوارا نہیں کرتیں اور فوراً سے پیشتر سیٹھ رستم علی خان کے ہاں خرم کا رشتہ لے کر پہنچ چکی ہوتیں مگر وہ تو بھلا ہوا اصغری کا، جس نے ان لوگوں کے خاندانی پس منظر اور دولت کے کروفر کے سیکڑوں واقعات اس فراٹے اور متاثر کن انداز میں بیان کیے کہ نائمہ بیگم کی سی جہاں دیدہ خاتون اپنی جگہ گویا سکڑ کر رہ گئیں اور اپنی کشتیِ حیات کے پتوار محترمہ اصغری کے سپرد کر ڈالنے اور اس کی انگلی پکڑ کر چلنے پر مجبور ہوگئیں۔

نائمہ بیگم بہت دیر تک تخت پر لیٹی خوابوں ہی خوابوں میں فرخندہ کو خرم کی دلہن کے روپ میں دیکھ، دیکھ کر مسرور ہوتی رہیں بالآخر مسکراتے، مسکراتے ہی ان کی آنکھ لگ گئی۔

تبھی ڈاکٹر خاور گھر میں داخل ہوئے اور اماں کو سوتا جان کر دبے پاؤں ان کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنے کمرے میں آئے۔ وہاں نہ جی لگا تو معصومہ کے کمرے میں آکر جھانکا...... وہ بڑے سکون سے بیٹھی اسٹڈی کررہی تھی۔ اگلے دن اس کا پرچہ تھا لیکن خاور کا دماغ تو اس وقت کسی اور ہی خیال سے معطر ہورہا تھا۔ مارے خوشی کے وہ بے آپے ہوئے جارہے تھے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بہن کو شانوں سے پکڑ کر دو تین چکر دے ڈالے اور بے اندازہ سرشاری کے عالم میں گویا ہوئے۔

''مابدولت آج بہت خوش ہیں، فوراً بندی نمبر 2 کو حاضر کیا جائے۔''

''اللہ خاور بھائی......'' وہ ڈر کر گھگھیائی۔ ''کیا ہوگیا آپ کو؟''

''بس کچھ ہوگیا ہے، سٹھیا گئے ہیں جو تم سے کہا ہے وہ کرو۔'' وہ اسی انداز میں اترا کر بولے۔

''کیا......؟ کیا کروں؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔

''جاؤ...... دوڑ کر جاؤ اپنی بی ملانی کو بلالاؤ۔''

''بی ملانی......؟'' معصومہ نے دماغ پر زور دیا...... پھر آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ ''آپ کا مطلب ہے شرمین کو......؟''

''چلو تمہاری مرضی...... بلاسکتی ہو تو اسی کو بلالو۔'' خاور نے آنکھیں کھول کر بغور اسے دیکھا پھر شرارت سے بڑبڑائے۔

''مگر...... وہ تو ابھی ٹیوشن پر نہیں آئی۔ وقت نہیں ہوا ہے۔'' معصومہ نے اسی حیرت کے عالم میں گویا انہیں اطلاع پہنچائی۔

''اچھا......'' خاور بدستور اسی انداز سے بولے۔ ''اگر ابھی اس کا وقت نہیں ہوا ہے تو اسے بعد میں بلالینا، ابھی جس کا وقت ہے اسے بلالاؤ۔''

''یہ آج آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ خدا کے واسطے اپنے حواسوں پر سے صدقہ دیجیے۔'' معصومہ بے اوسان ہوکر بولی۔

''یہ تو...... تمہارا کام ہے۔'' وہ مزے سے جھوم جھوم کر بولے۔

''بھائیوں کے حواس جاتے رہیں تو صدقہ بہنوں کو چاہیے ہے کہ دیں۔''

''اور سب تو سو رہے ہیں، میں ابھی روبی آپا کو بلا کر لارہی ہوں، کہتی ہوں جا کر کہ خاور بھائی معلوم نہیں کیسی الٹی پلٹی باتیں کررہے ہیں۔'' معصومہ بالکل ہی بدحواس ہوگئی اور باہر جاتے ہوئے بولی۔ خاور نے بے ساختہ ہنسی ضبط کرلی، بولے کچھ نہیں۔

''کیا کر کے آئے ہیں؟ کہیں سے کچھ کھا پی کر تو نہیں آگئے؟'' کچھ دیر بعد روبینہ، معصومہ کے ساتھ آنکھیں ملتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور آتے ہی بولی۔

''ارے، ایسی بادلوں بھری دوپہر میں بھی بھلا کوئی سوتا ہے۔ اس گھر کا تو دستور ہی نرالا ہے، کوئی من میں ہے تو کوئی بن میں۔'' خاور اسے آنکھیں ملتے دیکھ کر نارمل انداز میں بولے۔

''لو اور سن لو، معصومہ ڈر، ڈر مری جارہی تھی اور یہ حضرت بھلے چنگے اپنی راگنی الاپ رہے ہیں، انہیں جو بدحواس جانے وہ خود بدحواس۔'' روبی منہ بنا کر بولی۔

''اچھا...... تو معصومہ نے ہمیں بدحواس کہا؟ آخر ہے ناں معصومہ......'' خاور نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ معصومہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑی اسے تکے جارہی تھی۔

''ابھی آپ کے...... دشمنوں کا دماغ نہیں پلٹ گیا تھا؟'' جھلا کر پوچھا۔

''اچھا...... آپ شرمین کو نہیں بلوا رہے تھے؟'' خاور نے دوسرا قہقہہ نشر کیا اور اسے ایک چپت رسید کر کے بولے۔

''اچھا اب سمجھ میں آیا۔ شرمین کا نام اگر کوئی

لے گا تو اس کا دماغ پلٹ جائے گا۔''

''اللہ آپ کس قدر حرفوں کے بنے ہوئے ہیں۔'' معصومہ نے منہ بنا کر کہا۔ ''اتنی دیر میں میری جان ہی نکال ڈالی۔ میں تو سمجھی آج کچھ ہو گیا۔''

''میں نے بی ملانی کے الفاظ آپ کے لیے استعمال کیے اور اس احمق کو دیکھیے کہ یہ بلانے چلی تھیں شرمین کو...... حد ہو گئی بھئی، معلوم ہوتا ہے کہ وہ محترمہ کوئی جادوگرنی ہیں جو سب کے حواسوں پر چھائی رہتی ہیں۔'' خاور نے روئے سخن روبی کی طرف کر کے کہا۔

''ہاں...... سب کے حواسوں پر چھائی رہتی ہیں۔ ان سب میں آپ جناب بھی تو شامل ہیں۔ اب بولیے، کیا بولتے ہیں۔'' روبی نے معنی خیزی سے کہا۔

''دریں چہ شک!'' خاور نے برجستہ جواب دیا۔

''اور...... آج تو ایک زبردست خوشخبری ہے میرے پاس۔''

''وہ تو ہم پہلے ہی بوجھ گئے تھے کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ مکاریاں کرنے کا کیا فائدہ......! جلدی اگلو کیا خوشخبری ہے؟'' روبی منہ بنا کر بولی۔

''ایمان سے کیا خوشخبری ہے! بس کیا بتاؤں؟ یہ سمجھ لیجیے کہ مزہ آ گیا۔'' وہ چبا چبا کر بولے۔

''خاور بھائی میں یہی خرابی والی بات ہے کہ سسپنس پھیلاتے رہیں گے مگر اصل بات نہیں بتائیں گے۔ لے کے پڑھائی خراب کر دی میری۔'' معصومہ بھی چڑ گئی۔

''بس اتنی سی بات......؟'' وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور مزید چھیڑنے کو بولے۔ ''پریشان کیوں ہوتی ہو؟ اسی اپنی بی ملانی سے تم بھی پڑھ لیا کرو ناں......''

''دیکھو خاور......!'' روبی نے تنگ آ کر دھمکی دی۔ ''اصل بات شرافت سے اگل دو ورنہ ممانی جان اٹھ بیٹھیں تو سارے کا سارا سسپنس دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ یوں بھی میں نوٹ کر رہی ہوں آج کل 'شمع' کے گرد 'پروانہ' کچھ زیادہ ہی دیوانہ وار منڈلانے لگا ہے۔ اگر ممانی جان کو بھنک بھی پڑ گئی تو دن میں تارے دکھا دیں گی۔''

خاور یک بیک سنجیدہ ہو گئے۔

''اللہ خاور بھائی...... اب تو مذاق ختم کر دیں۔ صبح میرا پیپر ہے اور ابھی بہت سی تیاری باقی ہے کرنے کو۔'' معصومہ ٹھنک کر بولی۔

خاور کو آج بات بے بات ہنسی...... آ رہی تھی۔ باغ و بہار طبیعت لوٹ آئی تھی۔ ہر کسی کو گدگدا ڈالنے کا موڈ ہو رہا تھا مگر روبی کے بروقت خبردار کر دینے سے ہوش کی دنیا میں چلے آئے۔ جلد ہی انہوں نے خوب مزے لے لے کر اپنی اور شرمین کی اس خوب صورت ملاقات کا احوال سنا ڈالا۔

یہ دونوں حیرت اور خوشی سے اچھل پڑیں۔ ان کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں گزرا تھا کہ اصل بات یہ ہو گی۔ رات گئے تک روبی اور معصومہ ان کو مبارک باد پیش کرتی رہیں اور وہ خوش ہو، ہو کر وصول کرتے رہے۔ تینوں نے مل کر اس قدر خوشی منائی، اتنے قہقہے لگائے کہ بابر کو بھی اس صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے آنا پڑا کیونکہ معصومہ کے کمرے سے نزدیک ترین انہی کا کمرا تھا پھر وہ بھی ان کے قہقہوں اور مبارک باد میں شریک ہو گئے۔

☆☆☆

ماگھ کی اس کالی کاجل رات میں خرم، بابا رحمت کے ہاں سے رخصت ہو کر ریسٹ ہاؤس آیا تو...... واقعی اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سائیں، سائیں کرتی رات جیسے دماغ میں اتر گئی تھی۔

وہ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد دوبارہ اٹھ بیٹھا۔ بابا کے ہاں ایک پیالی قہوہ اور دوسری پیالی چائے کی پینے کے باوجود سر کا درد جوں کا توں جما بیٹھا تھا...... سر درد تو نہ گیا تھا مگر...... نیند ضرور چلی گئی

تھی۔ وہ سخت بے چین اور بے قرار تھا۔
رات کے اس پہر وہ نیند سے تو لڑ ہی رہا تھا مگر یوں محسوس کررہا تھا جیسے دُہرے عذاب سے دوچار ہو۔
ریشم کے عجیب وغریب اعتراف نے اسے اچھی خاصی کوفت میں مبتلا کردیا تھا۔ رہ، رہ کر اس کا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہ رہا تھا۔
وہ دیر تک کیروسین لیمپ کی روشنی میں ایک کتاب کے اوراق الٹ، پلٹ کرتا رہا لیکن کوئی لفظ پلے نہ پڑسکا۔ نہ روٹھی نیند مہربان ہوئی۔
رات کے اس سمے جنگل کے سناٹے میں راگ الاپتے والے جھینگروں اور مینڈکوں کی آواز میں کبھی کسی بڑے جانور کی آواز بھی شامل ہوجاتی یا کسی درخت کی شاخوں میں رکھے گھونسلے سے کسی پرندے کے پر پھڑ پھڑانے کی صدا گونج اٹھتی پھر سکوت طاری ہوجاتا۔
عام طور پر وہ ایک پُرسکون اور مطمئن مزاج طبیعت کا مالک تھا۔ فقط اپنے کام سے کام رکھنے والا..... مگر آج دن بھر کی ذہنی جمناسٹک اور سوچ.....
اور پھر اس سوچ کے ردِعمل نے بالآخر اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ ریشم کی بے خبری اور سادہ لوحی مزید اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوئی تھی اور وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ آج کے واقعے سے پہلے اس کے احساسات اس حد تک ریشم سے متاثر نہ ہوئے تھے۔ جذبات اور خیالات کنٹرول میں ہی تھے۔
شاید اسے ریسٹ ہاؤس کے گیٹ پر دیکھنے سے اس کے جھونپڑے میں جانے تک کا درمیانی دقفہ، اس ذہنی فاصلے کو مٹا گیا تھا جو اس سے قبل ان دونوں کے درمیان حائل تھا۔ ریشم سے کچھ کہنے، کچھ سننے کی خواہش اور تمنا آنا فاناً ہی انگڑائی لے کر بیدار ہوبیٹھی تھی..... اور یکلخت شدت اختیار کرگئی تھی۔
گو کہ ریشم کی طرف سے کوئی اشارہ یا شائبہ تک ناپید تھا۔ تاہم جن مست خرام ہواؤں کے دلنواز جھونکے خرم کے محسوسات اور جسم و جاں کو چھو کر گزر چکے تھے ان کی مسحور کن مہک سے دامن چھڑا لینا اسے اپنی زندگی کا بہت دشوار گزار مرحلہ نظر آرہا تھا۔
اگلے کئی روز تک اس کی دماغی کیفیت بہت بکھری، بکھری سی رہی۔ بالآخر وہ خود کو پُرسکون... کرنے کے لیے گھر چلا آیا اور کئی دن تک وہیں رہا۔ جب دل و دماغ کو قدرے قرار اور چین نصیب ہوا اور محسوسات نارمل سے ہوگئے تو واپس لوٹ آیا۔
لیکن آتے ہی قدم بلاسوچے سمجھے، خودبخود بابا رحمت کے جھونپڑے کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ وہ اپنے ارادے کے بودے پن پر ہکا بکا رہ گیا۔
یہاں زندگی اپنے معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ ان کے ہاں خرم یوں بھی روز، روز نہیں جایا کرتا تھا۔ آج تو کافی دنوں کے بعد آیا تھا۔ بابا نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔
وہ حسبِ معمول جھونپڑے سے باہر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ خرم کو اچانک دیکھ کر خوش ہوگئے اور اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولے۔
''آؤ، آؤ بیٹا..... کب آئے شہر سے؟ تمہارے تو نہ آنے کا پتا چلے نہ جانے کا۔'' خرم سلام کرتے ہوئے شرمندہ ہوکر بولا۔
''اچانک ہی جانا ہوگیا تھا پھر وہاں جا کر کئی کام نکل آئے۔ اس طرح واپسی میں دیر ہوتی گئی۔ آپ سنائیں سب خیر خیریت ہے ناں؟''
''ہاں.....اللہ کا شکر ہے۔'' انہوں نے حقے کی نے منہ سے ہٹا کر جواب دیا۔
''مجھے تو تمہارے جانے کا پتا ہی نہ چلا، وہ تو تین دن پہلے ریشم نے آلو بھرے پراٹھے پکائے تھے۔ اس کی ہمجولی بستی آئی ہوئی تھی۔ دونوں نے مل کر پکائے تھے۔ میں تمہارے لیے چٹنی اور پراٹھے لے کر گیا تھا مگر معلوم ہوا تم شہر گئے ہوئے ہو..... سو الٹے قدموں واپس لوٹ آیا۔''

''اوہ......اچھا، اچھا......'' خرم جلدی سے بولا۔
''پھر تو آپ نے بڑی زحمت کی، چلیں میں آج آ گیا آپ سے ملنے۔''
''ہاں بہت اچھا کیا تم......اب کھانا کھا کر جانا۔ بیسنی روٹی پکا رہی ہے ریشم......'' بابا سادگی سے بولے۔
''ارے......آپ ہر دفعہ کھانے کا تکلف مت کیا کیجیے۔''
''کیوں......؟'' بابا برا مان کر بولے۔ ''جو چٹنی روٹی ہوتی ہے اس میں تمھیں کیوں نہ پوچھیں؟ غیریت والی بات مت کیا کرو بیٹے، ہمارے لیے یہ زحمت نہیں رحمت ہے۔'' خرم کے دل پر ان کی...... بے لوث محبت کے اثرات نقش ہو گئے۔
''بابا! روٹی تیار ہے، اندر آجاؤ۔'' اندر سے ریشم نے پکار کر کہا۔
''چلو بیٹا......'' بابا نے فوراً اسے چلنے کا اشارہ کیا۔
خرم کچھ سامان ساتھ لایا تھا۔ موقع غنیمت جان کر وہ سامان اٹھائے ان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ریشم حسبِ معمول چولھے کے پاس بیٹھی کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ جھونپڑے کی فضا باہر کی نسبت بے حد گرم اور نرم تھی۔
''بابا! آپ کیوں باہر اتنی سردی میں بیٹھے سکڑ رہے تھے؟ اگر خدانخواستہ آپ کو ٹھنڈ لگ جائے تو کتنا مسئلہ ہو جائے۔'' خرم چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
''مجھے کیا ہونا ہے بیٹا۔'' بابا بے نیازی سے بولے۔ ''بعض دن اندر جھونپڑی میں دل گھٹتا سا ہے، جب سانس زیادہ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے باہر کھلی ہوا میں جا بیٹھتا ہوں۔''
''میں نے تو آپ سے بہت مرتبہ کہا ہے کہ میرے ساتھ شہر چلیے۔ دوا دارو سب ہو جائے گا مگر آپ سنتے ہی نہیں۔'' خرم نے ہمدردی سے کہا۔
''کیا رکھا ہے بیٹا دواؤں میں، اب تو چل چلاؤ کا زمانہ ہے، گزر جائے گا یہ بھی۔'' وہ بے پروائی سے ہنس کر بولے۔
خرم ان کے لیے شہر سے کئی ڈبے اعلیٰ برانڈ کی چائے کی پتی، بہت سا بیکری کا سامان، ماچسوں کے بنڈل، گرم مسالے کے علاوہ ایک عدد مٹی کے تیل کا چولھا بھی لایا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے یہ سامان بابا کے آگے رکھ دیا۔ لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ ریشم کے لیے کوئی شہری تحفہ لانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ ڈرتے، ڈرتے کہ کہیں جنگل کا یہ غیور بوڑھا آدمی بھڑک ہی نہ اٹھے اور بھڑک کر اس سے تعلقات نہ قطع کر ڈالے۔
''بھلا یہ سب لانے کی کیا ضرورت تھی......تمہارا آجانا ہی ہمارے لیے بہت غنیمت ہے۔'' اس وقت بھی رحمت بابا نے اس پر سخت تنقید کی۔
''کیوں بابا......؟'' اس نے ہمت کر کے صاف گوئی سے جواب دیا۔
''اگر اس جنگل کی چیزوں پر آپ میرا حق بتاتے ہیں تو شہر کی چیزوں پر آپ کا حق نہیں؟'' بس اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ پایا۔ ورنہ دل اندر سے کچھ کہہ ڈالنے پر آمادہ تھا۔ کیسا، کیسا اس کا جی مچلا تھا کہ وہ اور کچھ نہیں تو شہر سے کم از کم ایک عدد ریڈیو ہی خرید لے جائے اور ریشم تن کے قدموں میں ڈال کر عرض کرے۔
''اے جنگل کی شہزادی......! یہ ریڈیو اصرف اور صرف تمہارا ہے، تم اس کی مالک ہو، جتنا چاہے اسے بجاؤ اور اچھے، اچھے گیت سنو......تمہارے لیے سیکڑوں نغموں کے ریکارڈ لا کر ڈھیر کر دوں...... مگر......خدا کے لیے اپنے بابا سے اس گستاخی کی اجازت تو دلواؤ۔'' مگر وہ اندر ہی اندر دل مسوس کر رہ گیا۔ زبان سے یہ سب کہنے سے مجبور تھا۔ لیکن جب بھی ٹھنڈے دل و دماغ سے اس مسئلے پر غور کرتا تو اسے بابا کا رویّہ غلط نہ لگتا۔ محض ایک اجنبی کی حیثیت سے جتنا بے لوث خلوص اور پیار اسے مل رہا

تھا، وہ غنیمت تھا۔ ورنہ حقیقت یہی تھی کہ اس نے شروع، شروع میں بابا رحمت کے بہت دفعہ کام آنا چاہا تھا لیکن...... انہوں نے خرم کے عہدے اور حیثیت کا احساس کیے بغیر اسے بری طرح جھڑک ڈالا تھا بلکہ صاف لفظوں میں کہا تھا۔

''بھیا دیکھو! میرا ایک عدد سیانی بچی کا ساتھ ہے...... اس لیے تمہاری غیر ضروری عنایات اور نوازشیں میرے لیے مشکلات کا باعث بن سکتی ہیں...... مارتے کا ہاتھ ہر کوئی پکڑ سکتا ہے کہتے کی زبان کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ اس لیے زیادہ مناسب یہی ہے ہمارے لیے...... نیک خیالات اور دعائیں ضرور رکھو...... مگر انہیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہ کرو۔''

اس منہ در منہ کہی گئی باتوں اور دی گئی ہدایات کی روشنی میں خرم بہت پھونک، پھونک کر قدم رکھنے پر مجبور رہتا۔

ظاہر ہے بابا کی باتیں کھری ضرور تھیں مگر غلط ہرگز نہیں تھیں۔ پھر شریف انسان اپنی شرافت کی حفاظت کرتا ہے۔ اپنی فطری دور اندیشیوں اور عقل و فہم کی بدولت خرم اس سچائی سے خوب واقف تھا کہ بستی کے لوگ خواہ کتنے ہی سادہ لوح اور شہری آداب سے ناآشنا کیوں نہ ہوں مگر ہوتے تو بہرحال انسان ہی ہیں ناں بندے بشر ہی...... جو بعض حالات میں تو فقط کانوں سے سنی پر ہی بھرپور یقین کر لیتے ہیں کجا کہ آنکھوں دیکھی کسی بات کو نظر انداز کر دینا...... ناممکن...... اس لیے اسے بہت سنبھل، سنبھل کر رہنا پڑ رہا تھا۔

جنگل میں بے شمار پھل دار درخت تھے۔ جن سے قسم، قسم کا منوں پھل اترتا، چاروں طرف جنگلی پھولوں کی باس مہک اٹھتی۔ اس برس بھی ماگھ اور پھاگن کے مہینے آتے ہی جنگل میں کئی مقامات پر لہراتے ہوئے مالٹوں کے پیڑ جھوم اٹھے۔ کہیں کہیں سیب بھی اپنے ہی پھلوں کے بوجھ سے لدے پھندے کھڑے لہرا رہے تھے۔

تازہ تازہ مالٹوں اور خوب صورت جی کو بھلے لگنے والے سیبوں کے حسین کھڑے دیکھ، دیکھ کر خرم کا دل مچل گیا۔ بے ساختہ ریشم کا سراپا، ریشم کی مسکراہٹ اس کے آس پاس بکھرنے لگی۔ وہ جی ہی جی میں سوچنے لگا۔

''یہ سب پھل جنگل کی پیداوار ہیں، میرا تو کوئی نقصان نہیں ہے اگر وہ لوگ بھی فیض اٹھالیں گے تو بابا کو ناراض ہونے کا کیا حق ہے؟'' یہ سوچ کر اس نے چند پیٹیاں تیار کروائیں اور بابا رحمت کی طرف بھجوا دیں۔ ابھی ایک گھنٹا نہ گزرا تھا کہ وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے آپہنچے۔

خرم جنگل کے دورے پر نکلا ہوا تھا لیکن بابا گئے نہیں، وہیں برآمدے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ کافی وقت گزر گیا۔ اتفاق سے اس روز خرم کو واپسی میں خاصی دیر ہو گئی۔

بابا دیوار سے ٹیک لگائے' لگائے اونگھ گئے تھے۔ اول تو ان کو دیکھتے ہی خرم کا ماتھا ٹھنکا، اوپر سے بیچارے نیند میں غوطے کھا رہے تھے۔ اسے بے حد ترس آیا۔ جلدی' جلدی اندر لا کر بٹھایا۔ اپنے ہاتھ سے پانی پلایا پھر خیر خیریت دریافت کی۔

اس دوران بابا نے خاموشی اختیار کیے رکھی مگر جیسے ہی خرم نے حال چال پوچھا۔ یہ گویا پھٹ پڑے۔

''کیوں مذاق اڑاتے ہو ہم غریبوں کا؟ ہم سے کوئی انجانے میں بھول چوک ہو گئی ہو تو معاف کر دو۔ معافی مانگنے آیا ہوں تم سے۔''

''کیا ہو گیا بابا! میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔'' خرم کو سخت جھٹکا لگا۔ ان کا لہجہ اور انداز قطعی نیا اور عجیب سا تھا۔ تھوڑی دیر چپ کا چپ رہ گیا پھر اٹک' اٹک کر پوچھا۔ انہوں نے اکھڑ لہجے میں الٹا سوال کر ڈالا۔

''کیوں؟ میں کیا کسی دوسری تیسری زبان

میں بول رہا ہوں؟''

''نن..... نہیں..... میرا مطلب ہے..... آ.....آپ شاید مجھ سے ناراض ہیں..... ہے ناں؟'' خرم سٹپٹا کر بولا۔

''میں کسی سے ناراض وراض نہیں ہوں۔'' وہ اسی طرح رکھائی سے بولے۔ ''نہ مجھے حق ہے تم سے ناراض ہونے کا، بس یہ پوچھنے کے لیے آیا ہوں کہ تم ہم غریبوں سے کب تک مذاق کرتے رہو گے؟''

''یہی تو سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں کہ آخر مجھ سے کیا خطا ہوگئی۔ کیونکہ صاف لگ رہا ہے کہ آپ خفا ہیں مجھ سے۔'' خرم مزید حیران ہوکر بولا۔

''میں کسی سے خفا نہیں ہوں بیٹا، اپنے ہی نصیبوں سے خفا ہوں۔'' اس دفعہ انہوں نے بہت دکھ سے وضاحت کی۔ ''یا تو تم جان بوجھ کر سمجھنا نہیں چارہے ہو یا پھر..... مجھے ہی بے وقوف سمجھتے ہو..... مگر آج میں تمہیں اچھی طرح سمجھانے آیا ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رکے پھر سخت لہجے میں بولے۔ ''میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کہ..... ہمیں کوئی چیز، خواہ کتنی ہی چھوٹی بڑی کیوں نہ ہو، مت بھیجا کرو مگر تم کسی صورت مانتے نہیں ہو، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ دیکھنے والے کس انداز میں باتیں بنائیں گے؟ ہم کیسے، کیسے الزامات کی زد میں آکھڑے ہوں گے۔ برسوں کی جڑی عزت، پل میں داؤ پر لگ سکتی ہے۔ مگر میری بوڑھی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ تمہیں ہمارے ساتھ اپنی عزت کا بھی خیال نہیں۔''

''اوہ..... خدایا!'' خرم نے دیر سے رکی ہوئی سانس خارج کی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔

بابا اپنے دل کا غبار نکالنے کے بعد اب اسے بیٹھے گھور رہے تھے اور اس کے چہرے پر اپنے جملوں کا اثر تلاش کررہے تھے۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور بابا کے دونوں گھٹنے پکڑ کر وہیں ان کے پاس بیٹھ گیا اور بڑے میٹھے انداز میں مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''بابا جان! آپ نے یہ کس طرح جان لیا کہ مجھے آپ کی عزت عزیز نہیں ہے؟ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ..... خود اپنی عزت بھی پیاری نہیں ہے؟ بھلا ایسا ہوسکتا ہے؟ خدا کا لاکھ، لاکھ احسان اور شکر ہے کہ بہت عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اور ان نزاکتوں کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ دیکھیے، آج پوری وضاحت سے سمجھائے دیتا ہوں، آئندہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میں جنگل سے اترنے والا پھل یا میوہ فقط آپ کے گھر ہی بھجواتا ہوں؟ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ بستی کے ہر گھر میں کچھ نہ کچھ بھجواتا ضرور رہوں اگر یقین نہ آئے تو صبح معلوم کرلیجیے گا سب سے۔''

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟'' بابا حیران ہوکر اس کی صورت تکنے لگے۔ ان کے غم و غصے کا پارہ خود بخود نیچے اترنے لگا تبھی نرم لہجے میں پوچھا۔

''نہیں..... بلکہ سراسر جھوٹ کہہ رہا ہوں۔'' خرم نے شرارت سے ہنس کر کہا۔

''میں گورنمنٹ کو اس پھل اور ہر چیز کا جواب وہ بھی ہوں..... حد سے تجاوز کر بھی نہیں سکتا۔ بس سب کے تھوڑا بہت کام آجاتا ہوں.....''

☆☆☆

خرم اس دفعہ اپنی ملازمت سے گھر آیا تو جانے کیوں ثائمہ بیگم کو اس کا طرزِ عمل بہت بدلا، بدلا سا لگتا رہا۔ کبھی وہ ان کو بڑا اداس، اداس سا نظر آتا رہا اور کبھی حد سے زیادہ خاموش اور چپ، چپ سا۔ جب وہ خیر سے چھٹی ختم کرکے واپس چلا گیا تو یہ کئی روز تک گہری سوچوں میں ڈوبی رہیں۔ بالآخر ایک دوپہر اپنی نند شمسہ بیگم سے کہنے لگیں۔

''آپا! مجھے تو خرم کی طرف سے بہت پریشانی لاحق ہوگئی ہے۔''

''ارے بھئی کیا کہہ رہی ہو؟ مجھے تو خاک سمجھ نہیں آیا۔'' انہوں نے گھبرا کر دریافت کیا۔

''کیوں، آپ نے غور نہیں کیا؟ گیا؟ میں تو اسے دیکھ، دیکھ کر ہولتی رہی۔'' نائمہ بیگم نے راز داری سے کہا۔

''ارے ہئے ایسی کیا بات ہوگئی؟'' وہ بھی پریشان ہوگئیں۔ فکرمندی سے پوچھا۔

''کیا اس نے خود تم سے کچھ کہا یا کسی دوسرے نے کوئی بات بتائی ہے؟ ارے بھئی کھل کر بتاؤ۔ پہلیاں اپنے سے بوجھی نہیں جاتیں۔''

''تب تو شاید میں ہی باؤلی ہوگئی ہوں بس پھر اس ذکر کو یہیں چھوڑ دیجیے۔''

''آخر کو ماں ہو..... ضرور تم نے کوئی غیر معمولی بات محسوس کی ہوگی لیکن حل کیا سوچا ہے؟ کم از کم اسے بٹھا کر محبت سے پوچھا ہوتا شاید کچھ بتاتا۔'' اب کی بار شمسہ بیگم نے بھرپور دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''ارے آپا وہ کیا بتاتا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہماری ساری اولاد ہی کتنی گھنی اور کم سخن ہے۔ اپنے دل کی بات بھلا وہ ہمیں بتائے گا؟ قیامت ہی نہ آجائے گی..... بس اب ہم نے تو ایک حل خود ہی سوچ لیا ہے۔''

''وہ کیا بھلا.....؟ ہم بھی تو سنیں.....'' شمسہ بیگم نے بڑے اشتیاق سے دریافت کیا۔ نائمہ بیگم نے ایک لمحہ سکوت اختیار کیا..... پھر فیصلہ کن انداز میں گویا ہوئیں۔

''شادی..... بس شادی..... ہم جلد از جلد خرم کی شادی کر ڈالنے کے حق میں ہیں۔''

''ارے اس سے اچھی کیا بات ہوگی۔'' شمسہ بیگم مارے خوشی کے اچھل پڑیں۔

''اس سے بہتر حل ہمارے پاس دوسرا نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اپنی زندگی کی حقیقی خوشیاں پالیں۔ کئی سال ہوگئے انہیں ملازمت میں آئے ہوئے۔'' وہ کھلا، چونا چاٹ کر اطمینان سے بولیں۔

''شکر ہے اللہ کا کہ تمہیں خود ہی اپنی اولاد کی سچی بہبود کا خیال آگیا۔ وہاں پردیس میں اکیلا جنگلوں میں پڑا رہتا ہے۔ اچھا ہے کوئی ہنسنے بولنے والا تو ساتھ ہوگا۔ مگر تم نے تو ابھی تک کوئی رشتہ بھی ڈھنگ سے نہیں دیکھا ہے۔''

''رشتہ دیکھنے میں کتنی دیر لگتی ہے، ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔'' انہوں نے فی الفور جواب دیا۔

''اچھا! کوئی لڑکی وڑکی دیکھ لی ہے کیا؟ کبھی ذکر نہیں کیا تم نے.....'' شمسہ بیگم نے تجسس کے عالم میں پوچھا۔

''آپا آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ بھلا بغیر آپ کے صلاح مشورے کے ہم نے کوئی کام کیا ہے جو بچوں کے رشتے ناتے جیسے نازک معاملات میں آپ کو بھول جائیں گے۔''

''ہاں..... یہ تو سچ کہا تم نے، ہمیں کب انکار ہے اس حقیقت سے..... مگر اب جو سوچا ہے اس پر عمل بھی کر ڈالو۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔'' شمسہ بیگم نے سکھ کی سانس لے کر کہا۔

''بھئی آپا! سچی بات ہے خرم کے لیے میں ایسی لڑکی چاہتی ہوں جو کم از کم روبی جیسی نہ بھی ہو تو پھر بھی دس لڑکیوں میں نمایاں تو ہو۔''

اپنی بیٹی کا ذکر سن کر شمسہ بیگم تھوڑی دیر کے لیے خاموش سی ہوگئیں۔ لاکھ آپس کی عزیز داری تھی مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ان کی بیٹی اس گھر کی ہونے والی بہو تھی تاہم دھیرے سے بولیں۔

''اللہ تمہاری آرزوئیں پوری کرے مگر یاد رکھنا کہ صورت ہی سب کچھ نہیں ہوتی بلکہ اچھی سیرت اور صاف ستھرا کردار بھی مدِنظر رکھنا چاہیے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' انہوں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ''مجھے ایسی لڑکی کی تلاش ہے جو اعلیٰ

خاندان اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہو...... یہ نہیں کہ کل کلاں لوگ مجھ پر ہنسیں کہ کیسے نیچ اور ٹٹ پونجیے لوگوں میں سے بہو بیاہ کر لے آئی ہیں۔ بس بھئی...... سب کچھ دیکھنا پڑے گا۔''

''ہاں، ویسے کئی لڑکیاں تو تم یہ کہہ کر رد کر چکی ہو کہ ناک نقشہ نہیں اچھا یا پھر رنگت دبتی ہوئی ہے۔ قد بہت ناٹا ہے......'' شمسہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے یاد کر کے کہا۔

''ہاں تو اور کیا آپا...... نگوڑ ماری صورت بندریا جیسی ہو۔ یا اللہ ماری رنگت الٹا توا ہو تو بھلا کیسے پسند کرلوں؟'' نائمہ بیگم نے ان کی بات پر ناگواری کا سا انداز اختیار کیا۔

''توبہ، توبہ!'' شمسہ بیگم اپنے گال پیٹنے لگیں۔

''خدا کا خوف کرو نائمہ...... اللہ کی بنائی صورتوں میں یوں کیڑے نہیں نکالتے۔ صورت شکل کا بنا لینا اپنے اختیار میں تو نہیں ہے ناں......''

''اب ...... آنکھوں دیکھی مکھی بھی نہیں نگل سکتے......'' انہوں نے بے نیازی سے کہا۔

''آئے ہاں نائمہ......!'' شمسہ بیگم کو جیسے اچانک یاد آگیا۔ ''وہ...... شمس الدین صاحب کی لڑکی کیوں نہیں دیکھ لیتیں؟''

''کون شمس الدین......؟'' انہوں نے دماغ پر زور دیا۔

''ارے وہی شمس الدین...... محکمۂ تعلیمات میں کوئی عہدہ ہے ان کا، پتا نہیں شاید ڈائریکٹر ہیں، بھئی وہی ہمارے ابا کے ماموں زاد...... ارے ایک کا ہے کو ان کی تو کئی لڑکیاں ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر خوب صورت اور گوری چٹی...... تمہارا سوال وہاں پورا ہو جائے گا۔''

''نہ بابا نہ......!'' نائمہ بیگم نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''آپ بھی کس گھرانے کی بات کرتی ہیں، وہاں کا تو یہی حال ہے، ایک انار سو بیمار، درجن بھر تو ان کے بچے ہیں کھانے والے...... اس گھر کا تو داماد بھی سکھ کی سانس نہیں لے سکتا۔ سالے سالیوں کی فرمائشیں دم نہ لینے دیں گی۔'' شمسہ بیگم ان کی بات پر ہنسنے لگیں۔ لیکن وہ بولتی رہیں۔ ''ایسی جگہ تو میں اپنے بچوں کی شادیاں کر ہی نہیں سکتی جہاں کل کو ان کی ذات پر بتا لگے یا کسی طرح کی ناخوشی ہو...... کیا فائدہ...... ہم تو مر جائیں گے اور بچے ہمیشہ کے لیے پھنس کر رہ جائیں گے۔ کوئی اونچے خاندان کے اونچے لوگ ہوں گے تو اچھے برے وقت میں کام تو آئیں گے اور بھئی آپا! آپ بھی اب رخصتی کی تیاریاں کریں پہلے میرا خیال تھا کہ بابر کی شادی... اکیلے کروں گی اور خرم اور خاور کی ایک ساتھ...... مگر اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔''

''اچھا......!'' شمسہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔ ''آج تو تم انکشاف پر انکشاف کیے جا رہی ہو، اب کیا ارادہ کرلیا تم نے؟''

''اب...... ارادہ کرلیا ہے کہ بابر اور خرم کی شادیاں ایک ساتھ ہوں گی...... معصومہ کو خاور کے ولیمے میں نمٹایا جائے گا کیونکہ جتنی جلدی یہ فرائض ادا ہوں گے میرے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔'' نائمہ بیگم نے عزم سے بتایا۔

''کیوں؟ اس طرح کیوں کہہ رہی ہو۔ ذرا کھل کر کہو۔'' شمسہ بیگم .... قدرے تعجب سے دیکھنے لگیں۔ پھر پوچھا۔

''بھئی...... پھر حج بیت اللہ کے لیے جاؤں گی...... ابھی مجھ پر بہت بھاری فرائض کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ ہل بھی نہیں سکتی۔'' وہ بے نیازی سے بولیں۔

یہ بات تو آج انہوں نے اپنی نند سے کھل کر کی تھی اور ساتھ بابر کی شادی کا تقاضا بھی کر دیا تھا اور ان کی سرگرمیوں میں اضافہ تو اس دن سے ہو گیا تھا۔ جس روز انہوں نے سیٹھ رستم علی خان کی بیٹی فرخندہ کو دیکھا تھا۔ انہیں یہ لڑکی سر سے پاؤں تک جی جان

سے پسند آچکی تھی اور اس سلسلے میں انہوں نے اصغری جیسی چلتی پرزہ سے معاملات طے بھی کر لیے تھے۔ آج کل ان کو شدت سے اصغری کی واپسی کا انتظار تھا کہ دیکھیں وہ کیا جواب لاتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب بات اندر ہی اندر شروع ہو کر کسی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگی تو وہ شمسہ بیگم کو پوری بات سے آگاہ کردیں گی مگر اصغری ابھی تک کوئی تفصیل لے کر نہیں آئی تھی۔

اس سے پہلے بھی اپنے بچوں کی مرضی اور خواہش سے بے خبر اِدھر اُدھر یہاں وہاں بہوئیں تلاش کرتی رہی تھیں مگر ابھی تک انہیں اپنے مطلب کی ایک بھی لڑکی دکھائی نہیں دی تھی۔ انہیں بیک وقت خوش خلق، خوش شکل، دولت مند، آسودہ حال خاندان اور لڑکیاں درکار تھیں۔ جو چوٹی کے لوگ ہوتے۔ عرصے سے ان کے ساتھ ہو یہ رہا تھا کہ ہر لحاظ سے یکتا اور آسودہ حال خاندان ہوتا تو لڑکی میں کوئی عیب نکل آتا...... لڑکی بے عیب ہوتی تو کوئی نہ کوئی خاندانی کمی یا خامی نکل آتی۔ غرضیکہ جس شدومد کے ساتھ لڑکیاں تلاش کی جارہی تھیں اسی رفتار سے رشتے رد بھی کیے جارہے تھے۔

گو کہ روبی کے مقابلے میں کوئی لڑکی انہیں... ہرگز جچ نہیں رہی تھی مگر یہ چاہتی تھیں کہ باہر سے دونوں بہوئیں ایسی قابلِ فخر اور باکمال ڈھونڈ کر لائیں جو روبی سے دونا جہیز لائیں۔ سسرال والے دولھا کی سلامی میں کم از کم گاڑیاں ضرور دیں تاکہ وہ اپنی نند جو سمدھن بن جانے والی تھیں، ان کے سامنے فخر سے سر بلند کرسکیں۔

اور پھر...... وہ جو کہتے ہیں کہ جیسی نیت ویسی مراد...... ان کا انتظار رنگ لایا۔

اس واقعے کے بعد تیسرے دن اصغری آموجود ہوئی۔ خوشی سے کھلکھلاتی ہوئی، ایک سے ایک لچھے دار باتیں بناتی ہوئی۔

”بیگم صاحبہ سلام......! مولا آپ کو سلامت رکھے خوشی کی خبر لے کر آج تو حاضر ہوئی ہوں، پہلے منہ میٹھا کروں گی، بعد میں بات ہوگی۔“

نائمہ بیگم کھل اٹھیں۔ ان کا چوڑا چکلا سراپا باغ، باغ ہوگیا۔ بذاتِ خود آگے ہو کر موتی چور کا لڈو اس کے منہ میں توڑا، خوب اس کی حوصلہ افزائی کی، تب اس نے بات آگے بڑھائی۔

”بہت بہت مبارک ہو بیگم صاحبہ...... سیٹھ رستم علی خاں کے ہاں جو آپ نے صاحبزادے کا پیغام مجھ ناچیز بندی کے ہاتھ بھجوایا تھا، وہاں سے خوشخبری وصول کر کے لائی ہوں، انہوں نے آپ کو اذنِ شرف باریابی بخشا ہے اور کہلوایا ہے کہ آپ کا اپنا گھر ہے، جب جی چاہے آئیں...... پیشگی خوش آمدید۔“

☆☆☆

گھر سے خرم خاصے خوشگوار موڈ کے ساتھ تازہ دم ہو کر ملازمت پر واپس آیا تھا۔ دل و دماغ کی پہلے جیسی بکھری، بکھری اور منتشر کیفیت پر بڑی حد تک قابو پالیا تھا۔ اعصاب کافی پُرسکون ہوگئے تھے۔ بس اپنے ریڈیو پر جب، جب پسندیدہ نغموں کا کوئی رنگین سا پروگرام سنتا، دل میں ہلچل سی مچ جاتی۔ اندر کہیں ایک نشتر سا ٹوٹ جاتا جیسے کوئی ان کے بہت قریب ہو کر سرگوشی کرتا۔

”آپ کے ریڈیو سے بڑا پیارا گیت آرہا ہے۔“ وہ خوب جانتا تھا کہ بستی بھر کے ایک گھر میں بھی ریڈیو نہیں تھا۔ ریشم بی بی کی معصومانہ انداز میں کہی گئی بات اس کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔

محض ایک ریڈیو، اس کی بے شمار آمدنی کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ وہ اس کے ایک اشارے پر دس ریڈیو اس کے قدموں میں نچھاور کرسکتا تھا مگر...... وہی رحمت بابا کا اکھڑ رویہ اور سخت روش...... ان کے خلاف خرم کا دل شکایات سے لبریز ہوجاتا۔ اسے شدید گلہ تھا کہ اس کی سرتوڑ کوشش کے

باوجود بابا لین دین کے معاملات میں اسے وہی غیر کا غیر ہی سمجھتے ہیں۔

ریڈیو والی بات کے بعد سے یہ بندشیں اسے بہت کھلنے لگی تھیں۔ بعض دفعہ وہ باغی ہونے لگتا اور جی چاہتا چلا، چلا کر کہے۔

''بابا! اتنے سخت اصولوں کے پابند کیوں ہیں آپ! اپنی تو بری بھلی گزار چکے...... اگر اس کی اتنی ذرا سی تمنا پوری نہیں کر سکتے تو...... اسے قیدی بنا کر کیوں رکھ رکھا ہے؟ کیا حق پہنچتا ہے ایک معصوم کے چھوٹے، چھوٹے ارمانوں سے کھیلنے کا...... جنگل کی ان فرسودہ روایات سے باہر نکل کر دیکھیے۔ شہروں کے جدید انداز آپ کی نگاہیں خیرہ کر دیں گے...... آپ کو کیا معلوم زندگی کا حقیقی لطف اور دلکشی کیا ہے......دوسری لڑکیوں کو دیکھیے۔ زندگی کا بھرپور مزہ لوٹتی ہیں...... ایک بیچاری ریشم ہے جس کی زندگی کا حسین ترین حصہ لکڑیاں چنتے اور اُپلے تھاپتے گزرتا چلا جا رہا ہے۔ کاش! آپ اس غریب کے احساسات سمجھنے کی...... قدرت رکھ سکیں۔''

غرض ڈیوٹی پر آنے کے بعد جنگل میں گھومتے، گھر میں لیٹے ہوئے، دن اور رات کے بیشتر حصے میں وہ ایسی ہی الٹی پلٹی سوچوں کا شکار رہنے لگا۔ شب و روز کی اسی کشمکش میں ایک دفعہ پھر ماگھ کا ٹھنڈا ٹھار مہینہ آ گیا۔ اندھیری راتوں میں گیدڑ زور، زور سے بولتے، سرما کے یخ بستہ، ہڈی، ہڈی کو لرزا ڈالنے والے جھونکوں سے بچنے کے لیے جنگلی کتوں کے غول اِدھر اُدھر چھپے، چھپے پھرتے اور آدھی رات کو جب سردی ناقابلِ برداشت ہو جاتی تو آسمانوں کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر زور، زور سے بھونکتے...... ایسے میں کسی رات خرم کی آنکھ کھل جاتی تو اس کا جی بہت برا ہوتا۔

اس کا وہ سارا دن جنگل کے طول و عرض میں گھومتے پھرتے اپنے پر عائد ذمے داریوں کو نبھاتے گزر جاتا مگر ایک تھکا ڈالنے والا دن گزارنے کے باوجود رات کے کسی نہ کسی پہر اس کی آنکھ کھل ہی جاتی اور وہ کروٹیں بدل، بدل کر تھک جاتا۔ رات کے طویل اور بے چین گھنٹوں میں جانے کتنے خیالات اور سوچیں اسے اپنے شکنجے میں کس لیتیں۔

بات یہ تھی کہ رفتہ، رفتہ نامحسوس انداز میں اس کی توجہ کا تمام مرکز...... ریشم کی ذات بنتی جا رہی تھی۔ اگرچہ خود بھی اسے یہ فلمی یا افسانوی...... صورت حال لگی۔ مگر ہزار کوشش کے باوجود وہ اس کی تصورات کی دنیا میں چھم سے آموجود ہوتی اور پھر کسی صورت بھی جانے کا نام نہ لیتی۔ وہ عجیب، عجیب خواب دیکھا کرتا۔

کبھی تصور کی آنکھ سے اسے شہر کے جدید تقاضوں میں ڈھلتا ہوئے دیکھتا تو کبھی وہ اپنے سُبک قدموں کی جھانجریا بجاتی...... زیرلب مسکراتی اس کے قریب سے گزر جاتی...... اور وہ ہاتھ ملتا رہ جاتا۔

کبھی اس کے پاس بیٹھتی تو بیٹھی ہی رہتی...... باتیں کرتی تو کرتی ہی رہتی۔ ہوش و خرد کی دنیا میں لوٹنے کے بعد وہ بڑی بے بسی سے سوچتا۔

''شاید مہذب دنیا سے کٹ کر میں اس جنگل کے ویران، تنہا اور سنسان نگر میں رہتے رہتے دیوانہ ہو گیا ہوں۔ میرا دماغی توازن درست نہیں رہا۔ بھی وہ ایک دیہاتن...... بے وقوف ان پڑھ اور جنگل کی باسی میرے تمام حواسوں پر چھا کر رہ گئی ہے۔ اُف! میرے دن و رات کا کوئی لمحہ میرا اپنا نہیں رہا...... اگر میرے گھر والوں کو میری اس دماغی حالت کا علم ہو جائے تو یقیناً غضب ہو جائے گا۔ خصوصاً اماں تو کبھی پلٹ کر میری صورت بھی دیکھنا گوارا نہ کریں گی مگر افسوس کہ میرے اوسان شاید خطا ہو چکے ہیں۔ میں کسی کام کا نہیں رہ گیا۔ مجھ پر اس لڑکی کا خیال جادو بن کر چھا گیا۔ میں لاکھ کوشش بھی کر دوں تو اس کے خیال سے پیچھا چھڑا نہیں سکتا۔'' اور یہ ایک

ناقابلِ تردید حقیقت تھی۔

جوں جوں وہ ریشم کی بے نیازیوں اور کج ادائیوں پر غور کرتا اس کا جنون اور وحشت جواں تر ہونے لگی تھی۔ اندر ہی اندر اس کا چڑچڑا پن اور دیوانگی کا نشہ بڑھ رہا تھا۔ سب کچھ حسبِ خواہش نہ ملنے کے سبب وہ عجیب سی ڈپریشن کا شکار رہنے لگا۔ بلکہ ایک چھوٹے سے واقعے نے اس کی ضد میں اضافہ کر دیا۔

ایک روز وہ جنگل کے ایک ایسے حصے کی صفائی کروا رہا تھا، جہاں بے شمار جھاڑ جھنکار اگا پڑا تھا۔ دو دن سے مزدوروں کی ایک ٹولی اسی کام پر مامور مصروفِ عمل تھی۔ آفیسرز کی ایک ٹیم دورے پر آنے والی تھی، اس لیے خرم کی پیشہ درانہ ذمے داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مزدور کدالوں کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھے۔ خرم زمین پر گرے ہوئے ایک درخت کے تنے پر بیٹھا کام کا معائنہ کر رہا تھا۔

ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ لیکن سخت سردی کا زمانہ ہونے کی وجہ سے دوپہر میں حدت تھی نہ شدت...... ٹھنڈی ہواؤں کے سرپھرے جھونکے درختوں کی بلند شاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر سائیں، سائیں کی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔

اب اسے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا...... کھانے کا وقت تھا۔ اس کا خانساماں عموماً اس وقت تک کھانا تیار کر کے ان کے انتظار میں رہتا تھا۔ ابھی وہ اٹھنے کا قصد کر ہی رہا تھا کہ ٹھٹک کر تھم گیا۔

دور تلک کھلے میدان کی طرف مڑ جانے والے برساتی نالے کے ساتھ ساتھ بہت سی بھیڑ بکریاں گھاس پتے چرتی پھر رہی تھیں۔ وہیں کچھ فاصلے پر ایک اونچے پتھر پر ریشم بی بی بیٹھی ایک لڑکے سے باتیں کر رہی تھی جو قریبی جھڑبیری سے بیر بھی توڑ، توڑ کر جمع کیے جا رہا تھا۔ گو کہ لڑکا اس بستی کا تھا اور کبھی کبھی خرم کی نظر سے گزر چکا تھا مگر جانے کیوں......

خرم حد درجہ بے چین سا ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی شے سینے میں ٹوٹی ہو۔ حالانکہ ریشم سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ لیکن وہ اپنے احساسات کو کوئی نام نہ دے سکا۔ اِک بے قراری سی تھی جس نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔

اتنی دور سے تو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ دونوں کیا باتیں کر رہے تھے لیکن خرم کے دل و دماغ پر کوئی اندیشہ ہتھوڑے برسانے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی سر توڑ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

اپنی اس نئی اور انوکھی کیفیت سے گھبرا کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور خواہ مخواہ مزدوروں کے گرد گھومنے لگا پھر ایک سگریٹ نکال کر گہرے، گہرے کش لے کر پُرسکون ہونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا مگر دل کا درو مٹانہ سامنے سے منظر غائب ہوا۔

بالآخر آگے بڑھ کر اس نے جلدی، جلدی مزدوروں کو چند ہدایات دیں اور لمبے، لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی طرف چل دیا۔ جاتے، جاتے کسی بے اختیار جذبے سے مجبور ہو کر اس کی گردن خود بخود اسی سمت مڑ گئی۔

اب وہ لڑکا ایک بکری کے تعاقب میں بھاگ رہا تھا...... اور ریشم بی بی زور زور سے ہنس رہی تھی۔ اس کا دل آپ ہی آپ بجھ گیا۔

☆☆☆

رات بھر بارش برستی رہی تھی۔ موسمِ سرما کے مینہ کی ایسی جھڑی لگی کہ اگلے دو دن تک آسمان پر سرمئی، سرمئی بادلوں کی چادر تنی رہی۔ تیسرے روز کالے بادل ذرا چھٹے۔ ان کے بیچ سے شفاف نیلا، نیلا آسمان جھلکتا نظر آنے لگا۔ بارش رک چکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دھوپ نظر آنے لگی۔

شرمین مسلسل بارش کی وجہ سے ٹیوشن پڑھانے نہ جا سکی تھی۔ دھوپ نکلتے دیکھ کر اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ آج شام کو ضرور پڑھانے چلی جائے گی۔

بچوں کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا ویسے اندر ہی اندر نائمہ بیگم سے ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں برا مان کر ٹوک ہی نہ دیں۔ ان کا کچھ بھروسا بھی نہ تھا۔

اس وقت وہ دوپہر کے کھانے کے لیے آٹا گوندھ رہی تھی اور دادی اماں ترکاری کاٹ رہی تھیں کہ پڑوسن ذکیہ خالہ برقع اوڑھے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔

''آؤ، آؤ ذکیہ بیٹھو اور سناؤ سب خیریت ہے ناں؟'' دادی اماں نے محبت سے انہیں قریب بٹھاتے ہوئے حال احوال پوچھا۔

''السلام علیکم خالہ جان۔'' اتنے میں شرمین باورچی خانے سے نکلی اور قریب آکر بولی۔

''ارے جیتی رہو بیٹی خوش رہو۔ کیسی ہے ہماری بیٹی۔'' خالہ ذکیہ نے خوش ہو کر اس کو ڈھیروں دعائیں دیں اور پیار سے پیٹھ تھپتھپا کر بولیں۔ ''کیا کر رہی تھیں اس وقت؟''

''دوپہر کے کھانے کی تیاری ہے، آپ سنایئے خالو ابا کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' شرمین نے ادب سے جواب دیا۔

''اب تو اللہ کا بہت کرم ہے بیٹی۔'' انہوں نے فوراً جواب دیا پھر خاص طور پر اس سے پوچھا۔ ''بیٹی ایک بات تو بتاؤ، تمہارے خالو نے کہا ہے کہ تم سے پوچھوں کہ تمہاری تعلیم کتنی ہے؟ یعنی تم نے کتنا پڑھا ہے؟'' اب دادی اماں بھی ان کی طرف متوجہ ہو کر بغور سننے لگیں۔

''خالہ جان! میں نے بی ایس سی کیا ہے، ایم ایس سی کا ارادہ ہے۔ ویسے کئی سالوں کا پڑھانے کا تجربہ بھی ہے۔'' شرمین نے سادگی سے جواب دیا۔

''بس بیٹی، تم یہ سب کاغذ پر لکھ کر دے دو۔ مجھے کہنا نہ آئے گا۔'' شرمین سمجھ نہ سکنے کے انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیوں ذکیہ! خیریت تو ہے؟ ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'' دادی اماں نے اس کی مشکل آسان کر دی

غزلیں

کسی سے کوئی شکایت نہ کچھ گلہ رکھیے
وراز صرف محبت کا سلسلہ رکھیے
خیال و خواب میں ہی اس سے رابطہ رکھیے
خرد سے کچھ تو جنوں کا معاملہ رکھیے
دلوں کی بات دلوں تک رہے تو بہتر ہے
زبان کھول کے کیوں اپنا مدعا رکھیے
تمہاری راہ پہ آجائے گا کبھی نہ کبھی
ابھی تو باتوں میں کچھ دن اسے لگا رکھیے
جدائی اس کی دل و جاں پہ لاکھ بار سہی
وہ مل ہی جائے گا اِک روز، حوصلہ رکھیے
عطائے دوست ہے جانے نہ دیجیے اس کو
متاعِ غم کو کسی طور سے بچا رکھیے
جو بات ہے، وہ دلوں تک پہنچ ہی جائے گی
چھپا کے شعر میں کچھ حرف آشنا رکھیے
خود اپنے ضبط کا دامن نہ چھوٹ جائے کہیں
قریب جا کے بھی کچھ، اس سے فاصلہ رکھیے

شاعرہ: فریدہ لاکھانی فرح، آسٹریلیا

چلو چل کے دیکھتے ہیں نئی رہ گزر بھی ہم
گردِ سفر بھی ہم ہیں اور ہم سفر بھی ہم
ہم شام و شب کی تاریکیوں کے امین ہیں
اور نورِ بقا زیست کا مطلعِ سحر بھی ہم
ہے پیاس و تشنگی کا مرقع تمام زیست
اور پل بھر میں جو سیراب کرے وہ ابر بھی ہم
ہیں گرد و پیش میں جو وباؤں کی گردشیں
زائل کریں گے ایک دن ان کا اثر بھی ہم
مانا ہے پُر پیچ بہت مسافت کی منزلیں
لیکن بنیں گے زیست کا سایہ شجر بھی ہم
نیندیں ادھارلے کے خوابوں کی کاشت کی
رکھتے ہیں اپنی ذات میں یہ ہنر بھی ہم
کیونکر رہا ہر کوئی خفا ہم سے ہی زمر
نام آشنا بھی ہم رہے اور بے خبر بھی ہم

شاعرہ: زمر نعیم، لاہور

اوران سے پوچھا۔
''آپ کی دعا سے خاں صاحب کی محکمۂ تعلیم میں کئی افسروں سے بہت اچھی واقفیت ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں شرمین بٹی سے اس کی تعلیم کا پوچھوں کتنی ہے اور یہ کہ اگر آپ کی بھی مرضی ہو تو وہ اس کی ٹیچری کے لیے کوشش کریں گے۔'' خالہ نے تفصیل بتائی۔

دادی اماں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آگئے۔ وہ خاموش سی ہو گئیں مگر شرمین نے بلاکسی جھجک جلدی سے کہا۔
''اچھی خالہ جان! یہ تو آپ نے بہت بڑی خوشخبری سنائی ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت خوب ہو جائے۔''
''اور کیا بٹی! یوں بھی تو گھر گھر جا کر ٹیوشن پڑھاتی ہو... یوں اگر اسکول کی ملازمت ہو جائے گی تو سب میں بہتر ہے۔'' خالہ ذکیہ بولیں۔
''خالہ جان! آپ خالو ابا سے کہہ کر یہ کام ضرور کروا دیجیے۔ ٹیچنگ کا مجھے بہت شوق ہے، میں یہ ترکاری بگھار دوں۔ ابھی آپ کو ایک کاغذ پر اپنے تعلیمی کوائف لکھ کر دیتی ہوں۔'' شرمین پُرجوش انداز میں بولی۔ یہ کہہ کر اس نے ترکاری کی ڈلیا اٹھائی اور باورچی خانے میں چلی گئی۔

''آپا! آپ کیوں چپ سی ہو گئیں؟ کیا آپ کو خاں صاحب کی تجویز پسند نہیں آئی؟'' خالہ ذکیہ نے روئے سخن دادی اماں کی طرف موڑ کر پوچھا۔

''میں کیا اور میری اوقات کیا ذکیہ......! جو باریِ تعالیٰ کو منظور ہوگا وہی ہوگا اس کی مصلحت وہی جانے۔''

دادی اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔
''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ اگر آپ کی رائے نہیں ہے تو انکار کر دیجیے۔'' خالہ نے تعجب آمیز لہجے میں کہا۔
''خالی میری رائے سے کیا ہوتا ہے، گھر کے حالات بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔ یوں بھی تو وہ بیچاری ٹیوشن کر کے خرچ اٹھا رہی ہے اور اگر اسکول میں ملازم ہو جائے گی تو کہیں اچھا ہو جائے گا۔ تمہارے میاں نے تو ہماری بھلائی اور خیر خواہی ہی میں کہلوایا ہے۔'' خالہ ذکیہ نے ان کی بات پر اطمینان بھری سانس لی۔
''بس تو پھر خدا کا شکر ادا کیجیے اور دعا مانگیں کہ اللہ خاں صاحب کی کوشش کو کامیاب کرے۔''
''آمین......'' دادی اماں نے کہا پھر دلگیر لہجے میں مزید بولیں۔ ''ذکیہ! اس عمر میں تو لڑکیوں بالیوں کے رشتے ناتے طے ہوتے ہیں۔ نسبتیں ٹھہرائی جاتی ہیں۔ شادی بیاہ کے چرچے ہوتے ہیں۔ ہماری بچی کے نصیب دیکھو کہ وہ ہمارے لیے کمائی کا ایک پرزہ بنی ہوئی ہے، ہمارا دل نہ دُکھے تو اور کیا ہو؟''

''ارے آپا! دل کیوں چھوٹا کرتی ہو، اللہ سب کا وارث ہوتا ہے اور شرمین کون سا ابھی بہت بڑی ہوگئی ہے۔ ماشاء اللہ ایسی دھان پان، نازک سی بچی لگتی ہے۔ چند برس تو بہت آرام سے گزر سکتے ہیں، اللہ اس کے بھائیوں کو سلامت رکھے۔ جلدی جلدی بڑے ہو جائیں گے تو سب مشقت کے دن کٹ جائیں گے۔'' خالہ نے ان کی بات بہت دھیان سے سنی۔ دل ہی دل میں قائل بھی ہوئیں اور ان کی ڈھارس کے لیے مضبوط لہجے میں بولیں۔
''ہاں بی بی شکر ہے رب کا......وہ جس حال میں بھی رکھے۔ نہ ان بچوں کے اماں، باوا یوں آگے پیچھے اللہ کو پیارے ہوتے اور نہ ہم اتنی بڑی آزمائش میں پڑتے۔'' دادی اماں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور آہستہ سے کہا۔
''آپ نے کسی نہ کسی صورت لڑکی کو تعلیم دلوائی

تو چلو آج کام تو آ رہی ہے، خدانخواستہ جاہل رکھتیں تو نہ اپنے کام آتی اور نہ اپنے بھائیوں کے۔ اب بجائے اس کے کہ چھوٹے، چھوٹے سے لڑکوں کو کسی کام پر لگائیں، زیادہ بہتر نہیں ہے کہ اگلے چند سال شرمین ہی بھائیوں کا سہارا بنی رہے۔ آپ کو کسی کا شرمندۂ احسان بھی نہ رہنا پڑے گا اور اخراجات کی پریشانی بھی نہیں ہوگی۔''

''سچ ہی کہہ رہی ہو.....'' دادی اماں نے ذکیہ خالہ کی بات پر قائل ہو کر کہا۔

''مجھ سے کہیں زیادہ تو شرمین فکر کرتی ہے۔ بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی...... بہت محبت کرتی ہے دونوں سے۔ اپنے متعلق تو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتی۔''

''اچھی بہنیں ایسی ہی ہوتی ہیں، ماں کی مثال۔ آپ اس کی فکر مت کیجیے۔ بڑی حوصلے والی بچی ہے، اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ خاں صاحب کہہ رہے تھے کہ گلی سے یوں دبے پاؤں نظریں جھکائے چلتی ہے کہ دل خود بخود اس کا احترام کرتا ہے۔''

☆☆☆

شمسہ بیگم کے میاں متین احمد آج کل گھر پر دکھائی دے رہے تھے، نائمہ بیگم نے انہیں خاص طور پر کسی مشورے کے لیے بلوا رکھا تھا۔ ورنہ اکثر بلکہ زیادہ تر اپنی زمینداری پر رہتے تھے۔ جب سے ان بچوں کے والد باقر علی کا انتقال ہوا تھا، ان کے حصے کی بہت سی ذمے داریاں متین احمد نے اپنے سر لے کر نائمہ بیگم کی پریشانیوں کو کم کرنے کی بڑی بھلی کوشش کی تھی۔

اس زمانے میں بابر، خرم اور خاور تھے بھی چھوٹے۔ سب کے سب زیرِ تعلیم تھے۔ باپ نے زمین جاگیر کا کوئی کام ان کے ذمے نہیں لگایا۔ وہ تینوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے متمنی تھے۔ کسی کو غیب کا علم تھوڑی ہوتا ہے کہ وہ اتنی جلدی اور آناً فاناً اس دارِ فانی سے کوچ کر جائے گا۔ ان کے پیچھے ان کے سارے ہی کام ادھورے اور نامکمل تھے۔

وہ تو اللہ نے بہت محبت کرنے والی اور سمجھدار ہمشیرہ عطا فرمائی تھی کہ بروقت بہت بڑا اور عمدہ فیصلہ کر کے اپنا گھر بار چھوڑ کر بیوہ بھاوج کے قریب آ بسی تھیں تو یتیم بچوں کو ان کی ذات سے بڑا سہارا مل گیا۔

سو باتوں کی ایک بات یہ کہ متین احمد نے بحث و مباحثہ کرنے کے بجائے بے چون و چرا بیوی کے فیصلے پر لبیک کہا اور اس گھر کے دیگر بہت سے مسائل سلجھانے کے علاوہ باقر علی صاحب کی زمینوں کے جھمیلے بھی نہایت خوش اسلوبی اور دیانت داری کے ساتھ سنبھال لیے۔ اتفاق سے دونوں کی زمینداریاں ایک دوسرے کے اریب قریب بھی تھیں لہٰذا انہیں کوئی قابلِ ذکر دشواری کا سامنا بھی نہ کرنا پڑا۔ لیکن ان کی بروقت امداد سے نائمہ بیگم کے لڑکوں کا زبردست فائدہ ہو گیا اور وہ تینوں نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ یکسو ہو کر تعلیمی مراحل جاری و ساری رکھے رہے۔

گھر کے اندرونی معاملات میں سہارا دینے کے لیے شمسہ بیگم سینہ سپر ہو گئیں۔ ورنہ اس زمانے میں نائمہ بیگم تو تقریباً عضوِ معطل ہو کر رہ گئی تھیں۔ میاں کی جدائی کے بعد ان کو دنیا اور دنیا میں رونما ہونے والے انقلاب کا کوئی احساس و شعور باقی نہ رہا تھا۔ بچے کیا کر رہے ہیں اور گھر میں کیا ہو رہا تھا، انہیں پروا نہیں رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی یہی بے حسی، مدہوشی یا بے ہوشی، یہ سب دیکھ دیکھ کر ہی شمسہ بیگم کی سچی اور مخلصانہ محبت نے جوش مارا اور وہ مرحوم بھائی کا پڑوس بسانے آ پہنچی تھیں اور سب بچوں نے سکھ کی سانس لی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی ماں سے زیادہ وہ پھوپی سے قریب تھے۔

گرمیوں کی ایک خوشگوار موسم شام میں شمسہ بیگم والے حصے کے ہرے بھرے لان میں آج کافی رونق

تھی۔ متین احمد ایک آرام کرسی پر نیم دراز شام کا اخبار دیکھ رہے تھے۔ سفید باریک لان کا کڑھا ہوا کرتہ اور ڈھیلی موری کا پاجامہ پہنے آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ لگائے عمر کوئی ساٹھ باسٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ گندمی سی رنگت مگر موٹی موٹی آنکھیں، چہرے پر زندہ دلی اور خوش خلقی کی چھاپ ان کے قریب ہی دوسری کرسی پر شمسہ بیگم بیٹھی لان کے اس حصے کی طرف دیکھ رہی تھیں جہاں بیڈمنٹن کا جال لگا تھا۔

روبی، معصومہ، افشاں، شازی اور کاکی سب وہیں پر جمع تھے، کھیل جو ہو رہا تھا اور ایک خوشگوار سا غل مچ رہا تھا۔ آج اتوار ہونے کی وجہ سے بچے ٹیوشن سے فارغ تھے۔ ماحول میں پھولوں کی بھینی، بھینی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ گرمی کی رُت میں چلنے والے دلنواز جھونکے چنبیلی کے جھاڑوں اور موتیے و ہارسنگھار کی بیلوں میں سرسرا رہے تھے۔

اچانک شمسہ بیگم نے کھیل کی طرف سے دھیان ہٹالیا اور میاں سے جو بہت انہماک سے اخبار بینی میں معروف تھے، مخاطب ہوئیں۔

''نائمہ کے سوال کا کیا جواب سوچا ہے آپ نے؟''

''جواب؟ کس بات کا جواب؟'' متین احمد نے چونک کر پوچھا؟

''ارے وہی شادی کا......اور کاہے کا جواب۔''

''تو اس میں سوچنا وچنا اور سوال وجواب کی کیا تُک یا گنجائش ہے۔ ہماری بیٹی ان کی امانت ہے، جب جی چاہے لے جائیں، منع کس نے کیا ہے؟ کہیں تم خود کوئی جواب دے کر تو نہیں بیٹھ رہیں؟''

''استغفر اللہ!'' وہ بے ساختہ مسکرائیں۔

''اب ہم ایسے غیر ذمے دار ہوگئے کہ اتنے نازک مرحلے پر بغیر آپ کے کوئی جواب دے کر بیٹھ جائیں گے۔ بھئی واہ خوب انصاف کرڈالا آپ نے تو۔''

''بھئی تم سے کچھ بعید بھی نہیں۔'' انہوں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے چوٹ کی۔ ''آخر کو دن رات نائمہ بیگم کی صحبت میں رہتی ہو، کچھ بھی کرسکتی ہو۔''

''وہ غریب اب ایسی بھی خودسر نہیں ہیں جیسا ان کو سمجھا جاتا ہے۔'' شمسہ بیگم برامانے بغیر گویا ہوئیں۔

''معلوم نہیں میری طلبی کیوں ہوئی ہے؟ فصلوں کے اتار چڑھاؤ اور زمین کے دیگر معاملات پر پچھلی مرتبہ تفصیلی بات چیت تو ہوچکی ہے۔'' متین احمد نے یک بیک سنجیدہ ہوکر ان سے براہِ راست پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، بابر اور روبی کا ہی معاملہ درپیش ہے ناں؟''

''ہاں، بظاہر تو یہی لگتا ہے کیونکہ ابھی چند دن پہلے ہی انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ بھئی اب آپ رخصتی کی تیاری کیجیے کیونکہ میں جتنی جلدی ان فرائض سے فارغ ہوں گی میرے لیے اتنا ہی بہتر ہوگا۔'' شمسہ بیگم نے برملا جواب دیا۔

''کیوں......؟'' متین احمد نے قدرے حیرانی سے معلوم کیا۔ ''اس طرح سے کیوں کہا انہوں نے جیسے کہیں جارہی ہوں؟'' شمسہ بیگم ہنس پڑیں۔

''حیرت مجھے بھی ہوئی تھی۔ اس لیے کرید کر پوچھا تھا تو انہوں نے کہا کہ بچوں کی طرف سے فارغ ہوکر حج بیت اللہ پر جانے کا ارادہ ہے۔'' شمسہ بیگم نے اصل بات بتائی۔

''نہایت مناسب اور معقول ارادہ ہے، اللہ ان کی نیت پوری کرے۔ انشاء اللہ ان کے ہمراہ ہم تم بھی چلیں گے حج کرنے۔'' متین احمد نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

''آمین ثم آمین......اور ہم بھی اپنی بیٹی کے فرض سے ادا ہوچکے ہوں گے۔'' وہ خوش ہوکر بولیں۔

''خیر......شریعت میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ اولاد کی شادیوں کے بعد ہی حج کیا جائے۔ یہ تو عام لوگوں کا عام سا مفروضہ ہے۔ ورنہ عمر کے جس حصے میں بھی مالی حالات اجازت دیں، حج کرلینا چاہیے۔''

شمسہ بیگم مزید کچھ بولنا چاہ رہی تھیں مگر خاموش کی

خاموش رہ گئیں۔ برساتی میں پروفیسر شفیق الرحمٰن صاحب کی گاڑی آکر رکی تھی۔ متین احمد جلدی سے کھڑے ہوگئے۔ اپنے دیرینہ دوست کو دیکھ کر کھل اٹھے تھے۔ مارے خوشی کے انہوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھے۔

شمسہ بیگم کوٹھی کے اندرونی حصے میں آگئیں۔ خانساماں کو انہوں نے پُرتکلف چائے اور لوازمات کی ہدایات دیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ آج کی رات وہ کھانے کی فکر سے آزاد تھیں کیونکہ نائمہ بیگم نے ان سب کو اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔

رات نو بجے کے قریب شفیق الرحمٰن صاحب رخصت ہوئے تو متین احمد مسکراتے ہوئے اندر آئے اور آتے ہی بلند آواز میں بولے۔ ''ارے بھئی، بیگم صاحبہ! کب چل رہی ہیں بھابی جان کے ہاں...... اب تو مارے بھوک کے چوہوں نے اودھم مچا رکھا ہے پیٹ میں۔''

''بجے تو کب کے جا چکے...... ہم آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔'' شمسہ بیگم تیار بیٹھی انہی کا انتظار کر رہی تھیں۔

''یہی ایک کام تو تم پر جچتا ہے، خادم حاضر ہے ملکۂ عالیہ...... فرمائیں، کیا سبب ہے انتظار کا؟ بندہ کیا خدمت کرسکتا ہے جنابہ کی!'' متین احمد ان کے قریب آتے ہوئے والہانہ انداز میں بولے۔

''الٰہی! باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ وہاں سب آپ کے انتظار میں کھانے پر بیٹھے ہیں، بار بار بلوایا جارہا ہے، یہ ہیں کہ ان کی باتیں ہی ختم نہیں ہو پارہیں پہلے پروفیسر صاحب سے چپکے ہوئے تھے اور اب......''

''اور اب...... اپنی بیگم صاحبہ سے۔'' انہوں نے بے ساختہ ان کا جملہ پورا کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر انہیں اپنے برابر کھڑا کرلیا اور بے حد رومینٹک انداز میں کہنے لگے۔

''چلیے...... چلیے بیگم صاحبہ...... جہاں آپ لے چلیں گی، ہم چلنے کو تیار ہیں۔'' دونوں ہنستے مسکراتے ہوئے نائمہ بیگم کی طرف چلے آئے۔ یہاں بابر اور خاور بھی آچکے تھے۔ سب لوگ پھوپی جان اور پھوپا صاحب کے منتظر تھے۔ ان کے پہنچتے ہی ایک خوشگوار سا ہنگامہ جاگ پڑا۔ متین احمد کی شخصیت میں ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بیک وقت بڑوں میں بڑے اور چھوٹوں میں چھوٹے بن جایا کرتے تھے۔ اس وقت بچوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور سب باتوں میں مگن ہوگئے۔ ان کے چٹکلوں سے ڈرائنگ روم کشتِ زعفران بن گیا۔

نائمہ بیگم نے فوراً ہی کھانا لگانے کی ہدایت کردی تھی۔ آج عشائیہ میں کافی اہتمام تھا۔ کھانے کے بعد یہ محفل حسبِ دستور کوٹھی کے لان میں جمی۔ جہاں مرکری ٹیوب لائٹس کی جگمگاتی روشنیوں میں دن نکلا لگ رہا تھا۔ ہوائیں موتیے کی مہک اور رات کی رانی سے اٹی ہوئی تھیں۔

بڑے جب سنجیدہ نوعیت کی گفتگو پر آئے تو بابر اور خاور نے پاسِ ادب سے اٹھ جانا چاہا مگر نائمہ بیگم نے دونوں کو روک لیا۔

''تم دونوں ابھی یہیں بیٹھے رہو۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' وہ دونوں ہی دوبارہ کرسیوں پر بیٹھ گئے مگر دونوں کے دل دھڑک کر رہ گئے۔ شمسہ بیگم اور متین احمد بھی حیران ہوئے تھے کیونکہ ایسا پہلی بار ہی ہوا تھا اس گھر کی روایت میں۔

نائمہ بیگم تھوڑی دیر خاموش رہیں جیسے اپنی سوچوں کو جمع کر رہی ہوں پھر متین احمد سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔ ''بھائی صاحب! ہمارے اور آپ کے گھرانے ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ایک ہی ہیں۔ مصیبت کے دنوں میں جتنا آپ نے اور شمسہ آپا نے ساتھ دیا، اس کی مثال

ملنی ممکن نہیں ہے..... لیکن ..... اِدھر کچھ عرصے سے میں جیسے بہت تھکن کا شکار ہو گئی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے شمسہ آپا سے بھی تقاضا کر دیا ہے کہ اب وہ بیٹی کی رخصتی کی تیاریاں کریں۔''

وہ غالباً سانس لینے کے لیے رکی تھیں مگر متین احمد بیچ میں بول پڑے اور مسکرا کر ان کی بات کا جواب دیا۔''ہم ہر وقت تیار ہیں، آپ اپنی فکر و تردد کو..... خیر باد کہہ دیں۔''

لیکن نائمہ بیگم تو اصل مدعا بیان کرنے کی فکر میں تھیں۔ ان کا جواب نظر انداز کر کے اپنی ہی کہتی چلی گئیں۔

''پہلے میں نے سوچ رکھا تھا کہ بابر کی شادی کے دو سال بعد خرم اور خاور کی شادیاں کروں گی مگر اب میں نے ترتیب بدل دی ہے، بابر اور خرم کی شادیاں میں اسی سال ایک ساتھ کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد خاور اور معصومہ کو ایک ساتھ نمٹا دیا جائے گا۔ تب تک اتنی مہلت تو ضرور مل جائے گی کہ خاور کے لیے دیکھ بھال کر اچھی سی لڑکی ڈھونڈ لی جائے۔''

ان کی بات سے خاور کے چہرے کی رنگت بدل کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے کرسی پر بیٹھے، بیٹھے پہلو بدلا تھا مگر کسی نے توجہ نہیں دی۔ انہوں نے دیکھا پوری تفصیل سن کر پھوپا صاحب سنجیدہ ہو گئے تھے۔

''معاف کیجیے گا۔ آپ کی بات سے یوں محسوس ہوا گویا..... خرم کے لیے آپ نے کوئی لڑکی تجویز کر لی ہے؟'' متین احمد اسی سنجیدگی سے بولے۔

''جی ہاں..... یہ درست ہے۔'' انہوں نے۔ فی الفور صاف گوئی سے جواب دے کر سب کو چونکا دیا۔''اسی سلسلے میں، میں نے آپ کو آج تکلیف دی ہے۔'' شمسہ بیگم بھی ہمہ تن گوش ہو گئیں کیونکہ یہ اطلاع ان کے لیے بھی بالکل نئی تھی۔ سب ان کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے مگر اچانک انہوں نے بات گھما دی اور لڑکی کا اتا پتا دینے کے بجائے کہنے لگیں۔

''لڑکیاں وڑکیاں سب ایک سی ہوتی ہیں مگر اب جبکہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمارے دو لڑکوں کی شادیاں ایک ساتھ ہونی ہیں یعنی کہ دو باراتوں کا معاملہ ہے تو ہمیں بہت سے ادھورے کام جلدی، جلدی نمٹانے ہوں گے۔ اسی کی مجھے پریشانی لاحق ہو رہی ہے۔''

''کس بات کی پریشانی؟ آپ کھل کر بتایئے تو سہی اماں جان۔'' بابر نے پہلی دفعہ لب کشائی کی ادب سے پوچھا۔ انہوں نے فوراً وضاحت کی۔

''بیٹا.....! کوٹھی کی حالت تم دیکھ رہے ہو کیسی ہو رہی ہے؟ مجھے تو اندر باہر سے نہایت خستہ نظر آ رہی ہے، چنانچہ مرمت کے علاوہ کچھ اضافے وغیرہ کا کام فوری شروع کروا دینا چاہیے۔ اس کے بعد رنگ و روغن ہو تو شاید کوئی شکل صورت دکھائی دے۔ باغ کا حال بھی عجیب ہو رہا ہے، نئے پودے باہر سے منگوا کر لگاؤ، پرانی بیلیں اور درخت سب کی چھانٹی کروا دو، برساتی کو آج کل کے طور طریقے سے تعمیر کراؤ۔ بالائی منزل بیکار اجاڑ پڑی ہے، وہاں کی تزئین اور آرائش تو اب خاص طور سے کرائے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ تم لوگوں کی دلہنوں کے کمرے تو اوپر ہی ہوں گے ناں.....'' لمحے بھر کے لیے تھم کر انہوں نے سب کا جائزہ لیا جو حیران اور ششدر بیٹھے انہیں سن رہے تھے۔ پھر دوبارہ کہنے لگیں۔

''اللہ رکھے خرم کا تو جلدی، جلدی آنا بھی نہیں ہوتا۔ اب کام کا سارا بار تم دونوں بھائیوں پر ہے، بھائی صاحب کے مشوروں سے اور انہی کی زیرِ نگرانی سب کام کا آغاز کر دو..... تا کہ میری فکر مندی کم ہو۔''

''بھابی! آپ نے ایسا سسپنس پھیلایا کہ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ معلوم نہیں دماغ میں کیا، کیا فتور آ رہے تھے۔ جو بات آپ نے کہی، اس میں تو

چنداں پریشانی کی بات نہیں ہے۔ سب کچھ آپ کے کہنے اور سوچ کے مطابق ہو جائے گا۔ فکر مند مت ہوں۔'' متین احمد نے دیر سے رکی ہوئی سانس لی اور ہنس کر گویا ہوئے۔

''آپ نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب سے میں نے ان دو شادیوں کے متعلق فیصلہ کیا تھا، یہ تمام فکرات میرا دماغ شل کیے دے رہی تھیں۔ اب ذرا جان میں جان آئی ہے۔'' نائمہ بیگم نے واقعی خوش ہو کر کہا۔

''اے بی! تم تو باؤلی ہوئی ہو..... آج کل کے زمانے میں بھلا کیا مشکل ہے؟ وہی مثل ہے کہ پیسہ پھینک تماشا دیکھ..... مستری مزدور کھڑے کر دو۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر کام حسب مرضی ہو جائے گا۔ اللہ اللہ خیر صلا.....'' پھوپی شمسہ بیگم بھی مسکرا کر بولیں۔

''پھوپی جان نے سو باتوں کی ایک بات کہہ دی۔'' ڈاکٹر خاور آہستہ سے بولے۔

''اور..... ڈرائنگ روم کا تمام فرنیچر بھی بدلا جائے گا۔ پردے اور دیگر آرائش کا سامان بھی نیا آئے گا۔'' نائمہ بیگم دوبارہ کچھ سوچتی ہوئی بولیں۔

''کیا ضرورت ہے؟'' متین احمد نے فوراً دخل دیا۔

''دو، دو بہویں جہیز لائیں گی۔ آپ کو ایسے وقت پیسہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے، میں تو اسے فضول خرچی کہوں گا۔''

''فضول خرچی کیوں؟'' نائمہ بیگم نے مصالحانہ انداز میں کہا۔ ''اپنے گھر کے اندر بھی ایسا ساز و سامان ہونا چاہیے جو دیکھنے والوں پر اچھا تاثر پڑے..... بہویں تو جب آئیں گی تب لائیں گی مگر ان سے پہلے اپنی بھی تو کوئی حیثیت ہوتی ہے۔ دیکھنے والے بھی دیکھ بھال کر ہی اپنی بیٹی کو اس گھر کی بہو بنائیں گے ناں..... پہلے تو انہیں مطمئن کرنا ہوگا۔''

''ہاں، یہ تو سو فیصد آپ کی بات درست ہے۔'' متین احمد ان کی تائید میں بولے۔

''مگر ہماری طرف سے آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں..... اپنی سی بات ہے ہاں دوسری کسی جگہ کا ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔''

''میں بھی..... نئے آنے والوں کی ہی بات کر رہی ہوں۔'' نائمہ بیگم مسکرا کر بولیں۔

''تو اب ذرا تعارف ہو جائے نئے آنے والوں کا۔'' اب نائمہ بیگم کو ٹالنا ناممکن ہو گیا۔ آہستہ سے بتایا۔

''وہ..... سیٹھ رستم علی خاں کی دوسرے نمبر والی لڑکی ہے، میری نظر سے گزر چکی ہے۔ بہت پسند آئی ہے مجھے۔'' سب خاموش ہو گئے، کوئی کچھ نہ بولا۔

شمسہ بیگم کو کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ ان کے نقطۂ نظر کو خوب پہچانتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اونچے گھرانے کی تلاش میں وہاں تک پہنچی ہیں۔ اس لیے کوئی تبصرہ کرنا بیکار تھا۔ یوں بھی ان کا رشتہ اس حد میں جا کر نازک ہو جاتا جہاں وہ ان کی سمدھن کہلاتیں۔

ذرا دیر کے بعد نائمہ بیگم نے ایک حکم مزید نافذ کیا جو سب سے بھاری مگر ان کی نظر میں سب سے ضروری تھا۔

''بھائی صاحب! ہمیں کوئی اچھے سے ماڈل کی نئی گاڑی بھی دلوا دیں..... باقر علی صاحب کے وقت کی کار بہت پرانی ہو چکی ہے۔ کسی کے ہاں آنے جانے کی بڑی لاچاری ہے۔''

''یہ تو بہت آسان اور سہل ہے۔'' بابر نے کچھ سوچ کر دخل دیا۔

''وہ کس طرح میاں.....؟'' متین احمد نے ان کی طرف متوجہ ہو کر دریافت کیا۔

''میرا مطلب ہے۔'' بابر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''رستم علی خان صاحب کے کسی بھی شوروم سے نہایت آسانی سے نئی گاڑی لی جا سکتی ہے۔''

(باقی آئندہ)



کوئی دستک کوئی خوشبو

سویرا فلک

''مسکان بیٹا جلدی آؤ، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' فریدہ بیگم نے پلیٹیں میز پر رکھتے ہوئے تیسری بار آواز لگائی تو مسکان کو رپورٹ کارڈز سمیٹ کر اٹھنا ہی پڑا۔

''لیجیے آ گئی......'' جلدی، جلدی سیڑھیاں اتر کر وہ لاؤنج میں پہنچی تو رنگا رنگ لوازمات سے سجی ڈائننگ ٹیبل دیکھ کر اس کے قدموں میں آہستگی آ گئی۔

''آؤ گڑیا......! دیکھو آج میں نے خاص تمہارے لیے چائنیز رائس، چکن منچورین اور رس ملائی بنائی ہے۔ آج ٹی وی پر ریسپی بتا رہے تھے۔ سامان سب گھر میں ہی موجود تھا تو خاص تمہارے لیے بنائی ہیں۔ اب کھا کر بتاؤ کیسی بنی ہیں ساری چیزیں۔'' فریدہ بیگم نے پلیٹ اس کے آگے رکھ کر ڈشز بڑھانا شروع کیں۔

''امی آپ بیٹھ جائیں پلیز...... میں لے لوں گی۔'' شدید کوشش کے باوجود وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں لا پا رہی تھی۔ وہ اس اہتمام کا مقصد اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آج فریدہ بیگم نے اس کے لیے اس کا من پسند اور... پُرتکلف مینیو کیوں ترتیب دیا ہے۔ وہ ان کی اس محنت کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی جو انہوں نے مسکان کا موڈ خوشگوار رکھنے کے لیے کی تھی۔ ورنہ وہ تو خود اسے اکثر سادہ غذا کھانے کی نصیحت کرتی تھیں اور دو لوگوں کے لیے ایک سے زائد ڈش کی موجودگی بھی ان کے نزدیک اسراف تھی۔ پھر ان کا اس طرح اسے ٹریٹ کرنا، پلیٹیں پیش کرنا بھی اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر فریدہ بیگم اپنا مقصد عیاں کرنے میں کوئی کسر چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے ہاتھوں کی حرکت تو روک دی مگر زبان کو متحرک رکھا۔

''ہاں ظاہر ہے، تم کوئی مہمان تھوڑی ہو...... مگر سب کہتے ہیں کہ لڑکیاں مہمان ہی ہوتی ہیں۔ ان کا اصل گھر تو سسرال ہے......'' انہوں نے کئی مرتبہ کی کہی ہوئی باتوں کو دُہرانا شروع کر دیا۔ مسکان خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ اس کی مسلسل خاموشی محسوس کر کے وہ تھوڑی بے چین ہو گئیں۔

''کیا ہوا گڑیا...... کھانا اچھا نہیں بنا کیا......؟''

''نہیں، اچھا ہے...... بلکہ بہت مزے کا بنا ہے۔ ویسے بھی آپ کے ہاتھ میں ذائقہ ہی اتنا ہے

کہ کھانا دیسی ہو یا بدیسی..... سب مزے کا ہی بنتا ہے۔'' مسکان نے لہجے کو خوشگوار اور نارمل بنانے کی کوشش کی۔

''بات یہ نہیں..... بات تو محبت کی ہے بیٹی.....اور پھر ماں، بیٹی کی محبت.....مگر ایک نہ ایک دن ماں کو بیٹی سے جدا ہونا ہی پڑتا ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ شگفتہ آپا بھی یہی کہہ رہی تھیں۔'' فریدہ بیگم نے خود بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔

شگفتہ آپا کا نام سن کر مسکان کے ہاتھ رک گئے۔ وہ تو ویسے ہی خود پر جبر کیے بیٹھی تھی۔

''امی سب کو سب سے جدا ہونا ہے اور یہ معاشرے کا بنایا ہوا دستور نہیں، مالکِ کائنات کا فیصلہ ہے اور ہم کب سے دستور اور رسموں کے قائل ہونے لگے اور کیونکر ہوں..... کیا ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا، یہی اس دنیا کا دستور اور چلن ہے؟ کیا سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے اگر مجھے دنیا میں دنیا والوں کی مرضی کے مطابق ہی چلنا ہے تو پھر میں نہیں رہ سکتی ایسی دنیا میں.....'' وہ اب ڈبڈبائی آنکھیں لیے پلیٹ آگے سے کھسکا چکی تھی۔

''مسکان.....!'' فریدہ بیگم نے زور سے کہا تو وہ..... روتے ہوئے ان کے قدموں میں جا کر بیٹھ گئی۔

''امی میں کیا کروں..... آپ کیوں مجھے بار بار اس امتحان میں ڈالنا چاہتی ہیں.....اور یہ شگفتہ آپا نے کیوں ہماری زندگی اجیرن کی ہوئی ہے۔''

''وہ ہماری خیر خواہ ہیں..... تم کیوں فضول میں انہیں برا بھلا کہہ رہی ہو..... وہ تو ہر بار میرے ہی کہنے پر.....'' امی نے کچھ کہنا چاہا تو وہ پہلے ہی بول پڑی۔

''امی اگر آپ واقعی مجھ سے محبت کرتی ہیں تو پلیز ختم کر دیں اس سارے قصے کو.....''

''تم میری محبت پر شاکی ہو.....؟'' فریدہ بیگم



بہر حال وہ نہیں۔

''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا امی......'' وہ شرمندہ ہوگئی۔

''تمہارے کہنے کا جو بھی مطلب ہو مسکان...... مگر ایک بات اچھی طرح سمجھ لو...... مجھے بھی اپنا فرض ادا کرنا ہے...... انسان ایک چھوٹے سے حادثے پر اپنی زندگی کا اختتام سمجھ لے تو جی ہی نہ پائے...... مجھے دیکھو، میں نے یونہی تمہیں پال پوس کر، پرورش کر کے...... اتنا بڑا نہیں کر دیا...... اگر میں بھی اپنی زندگی میں آنے والے طوفان کے آگے ہار جاتی تو......؟''

''تو آپ مجھ سے اپنی پرورش کا خراج وصول کرنا چاہتی ہیں؟'' اس کی آواز میں بے بسی تھی۔

''مسکان تم کو معلوم ہے، تم کیا بول رہی ہو؟'' فریدہ بیگم کو پھر غصہ آ گیا اس نے دوسری بار بدلحاظی کی تھی۔

''ہاں امی مجھے معلوم ہے...... میں یہ سب نہیں کہنا چاہتی۔ میں آپ کو مزید تکلیف سے بچانا چاہتی ہوں...... کیا مجھے یاد نہیں...... آپ کی آنکھوں سے مسلسل رواں آنسو، آپ کی بے بسی، آپ کی نہ رکنے والی دبی، دبی سسکیاں...... امی میں کوئی بچی نہیں ہوں جو مجھ بوجھ سے عاری ہو، اب میں آپ کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے والا ساتھی ہوں...... کیوں آپ مجھے اور خود کو بار، بار اذیت دینا چاہتی ہیں؟ کیا ہمارے لیے ایک سبق کافی نہیں......؟ آپ اپنا فرض نبھانے کی کوشش بھی کر چکی ہیں اور نتیجہ بھی دیکھ چکی ہیں اس لیے آپ بری الذمہ ہیں، ہر سوال سے اور اگر میں آپ کو بوجھ لگتی ہوں تو پھر......'' وہ بمشکل کہہ پائی۔ ''پھر آپ مجھے مار ڈالیں۔'' مسکان بری طرح سسک پڑی۔

''کیوں فضول باتیں منہ سے نکال رہی ہو۔'' فریدہ بیگم نے اسے گلے لگا لیا۔

''میں سچ میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ مجھے معلوم ہے، آپ کو بھی تو پتا ہے ناں...... کتنا درد ہوتا ہے، کتنی تکلیف ہوتی ہے۔'' مسکان کا رُواں، رُواں گویا کراہ رہا تھا۔ فریدہ بیگم کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں اور ماں بیٹی گلے لگ کر کتنی ہی دیر روتی رہیں۔ دل و دماغ میں ماضی فلم کی طرح چلنا شروع ہو گیا۔

☆☆☆

''السلام علیکم امی......'' مسکان دروازہ کھلتے ہی ماں کے گلے لگ گئی۔

''وعلیکم السلام...... جیتی رہو میری بچی......'' فریدہ بیگم نے نہایت محبت سے اس کا ماتھا چوما۔

''ارے، یہ کیا آج پھر ڈھیر اٹھا لائیں؟'' مسکان کے ہاتھ سے کاپیوں کا شاپر لیتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''ارے امی...... پرائیویٹ اسکولز میں تو یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔ اب تو میں عادی ہوگئی ہوں۔'' مسکان نے اسکارف اور عبایا اتار کر کھونٹی پر ٹانگا۔

''میری بیٹی بڑی ہمت والی ہے مگر تمہیں ماسٹرز کرنے کا کتنا شوق تھا...... کاش میں......'' فریدہ بیگم اس کی تھکن محسوس کر کے اداس ہونے لگتی تھیں۔

''امی پلیز......'' وہ جلدی سے ان کے گلے لگ گئی۔

''میں کوئی اکیلی تھوڑی ہوں...... بہت سی ایسی لڑکیاں ہیں جو اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے جاب کر رہی ہیں...... افسوس تو ان لڑکیوں کو دیکھ کر ہوتا ہے جن کی جاب سے ان کا گھر بھی مشکل سے چلتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے میرے ساتھ ایسا تو نہیں ہے ناں......''

''کتنی سمجھ داری سے بڑی، بڑی باتیں کر لیتی ہو۔'' فریدہ بیگم نے اس کی بلائیں اتاریں۔

''آخر کو ایک قابل ٹیچر ہوں ناں......'' اس

نے فرضی کالر جھاڑے تو فریدہ بیگم مسکرا دیں۔
''اچھا امی میں ذرا چینج کر کے آتی ہوں۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔
''ہاں کھانا بس تیار ہے۔'' فریدہ بیگم کچن کی جانب چل دیں۔
''امی ایک سیکنڈ......'' مسکان کے پکارنے پر وہ پلٹیں۔
''ہاں کیا ہوا بولو!''
''میڈم کہہ رہی تھیں کہ آپ انہیں فون کرلیں۔ شاید ان کی فیملی میں کہیں میلاد ہے۔ اسی سلسلے میں بات کریں گی۔''
''اچھا ٹھیک ہے میں کرلوں گی۔ اب تم جلدی سے کپڑے بدل کر آؤ...... میں کھانا لگا رہی ہوں۔''
''بس میں یوں گئی اور یوں آئی۔'' اس نے چٹکی بجائی اور تیزی سے کمرے کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

''ماشاء اللہ بڑی خوب صورت اور دلسوز آواز ہے آپ کی بیٹی کی اور آپ کا اندازِ دعا اور بیان بھی ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہے۔'' مسز قریشی نے محفلِ میلاد کے اختتام پر فریدہ بیگم کا ہاتھ چوما اور مسکان کے ماتھے پر پیار کیا۔
''میں نے کہا تھا ناں بھابی...... ایسا سماں بندھے گا کہ مدتوں یاد رہے گا۔'' مسکان کے اسکول کی پرنسپل ذکیہ خاتون بھی مسکان اور فریدہ بیگم سے ملنے آگے بڑھیں۔ مسز قریشی، ذکیہ خاتون کی رشتے کی بھاوج تھیں۔ ابھی دو سال پہلے ہی ان کی شادی ہوئی تھی۔
''یہ تو آپ کی محبت ہے میڈم......'' مسکان نے جھینپتے ہوئے کہا۔
''نہیں گڑیا...... یہ دراصل حُبِ رسول ﷺ کا اثر ہے۔'' ذکیہ خاتون نے مسکان کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔
''بلاشبہ یہ اللہ کا ہی کرم ہے۔ ورنہ ہم کس قابل ہیں۔'' فریدہ بیگم نے عاجزی سے کہا تو مسز قریشی نے ان کی بھرپور تائید کی۔
''ٹھیک کہا آپ نے...... اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت ہی اصل محبت ہے اور یہی محبت کرشمے اور معجزے دکھاتی ہے اور اسی محبت کا کمال ہے کہ روحیں سرشار اور معطر ہوجاتی ہیں۔''
''سبحان اللہ......! بہت خوب صورت بات کہی بھابی آپ نے......'' ذکیہ خاتون نے بھی مسز قریشی کی تائید میں سر ہلایا اور اسی دوران میزبان نے کھانے کے لیے کہا اور سب لوگ کھانے کی میزوں کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

''آپ کی مسکان کی موہنی صورت مجھے تو بھا ہی گئی تھی مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ جاذب بھائی جو ابھی شادی کے لیے ہی تیار نہیں تھے، مسکان کی ایک جھلک دیکھتے ہی بے قرار ہوجائیں گے۔ اب آپ بتائیں میں کب آؤں رسم ادا کرنے؟'' مسز قریشی کی آواز جذبات سے بے قابو ہورہی تھی۔
''آپ کا اپنا گھر ہے...... جب آپ چاہیں آجائیں لیکن رسم کا معاملہ اتنی جلدی کیسے طے ہوسکتا ہے۔ رشتہ جوڑنے سے قبل ضروری معاملات طے کیے جاتے ہیں ابھی تو ان کا مرحلہ باقی ہے۔'' فریدہ بیگم نے ریسیور سنبھالتے ہوئے عاجزی سے کہا۔
''ارے آپ ان معاملات کی فکر نہ کیجیے...... ہمارے جاذب بھیا کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ آپ جو کچھ دیں گی اپنی بیٹی کو دیں گی۔ مسکان جیسا انمول ہیرا پاکر ہم ویسے ہی مالا مال ہوجائیں گے۔ آپ اپنی تیاری مکمل رکھیں، ہم بھی پوری تیاری سے آئیں گے۔'' مسز قریشی گویا ہتھیلی پر سرسوں جما رہی تھیں۔
''یہ تو آپ کی محبت ہے...... مگر میں پھر کہوں

گی کہ ان معاملات میں جلد بازی سے کام لینا مناسب نہیں۔'' فریدہ بیگم نے رسانیت سے کہا۔

''اچھا میں سمجھ گئی، آپ جاذب بھائی کے بارے میں چھان بین کروالیں۔ ذکیہ کے پاس ان کے آفس کا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ موجود ہے اور باقی آپ مسکان کی مرضی بھی معلوم کرلیں...... گھر میں مشورہ کرلیں، ٹھیک ہے ناں...... یہی خواہش تھی ناں آپ کی...... میں سمجھ سکتی ہوں۔ آخر کار آپ بیٹی کی ماں ہیں۔'' مسز قریشی نے تفصیل سے کہا تو فریدہ بیگم نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا اور الوداعی جملے اور خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا اور مسکان کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔

☆☆☆

''مسکان ......'' فریدہ بیگم نے پکارا تو قمیص کے دامن پر مہارت سے بیل لگاتی مسکان نے ہاتھ سے سلائی مشین کا پہیا روک دیا۔

''واہ بہت صفائی آگئی ہے میری بیٹی کے ہاتھ میں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اتنی سلیقہ مند بیٹی سے نوازا ہے۔'' انہوں نے مسکان کا ماتھا چوما تو وہ خوشی سے سرشار ہوگئی۔''مسکان میری جان...... تم ہمیشہ یونہی خوش رہو۔'' فریدہ بیگم نے اس بار اس کے رخسار کو چوما اور یک دم ہی ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

''کیا بات ہے امی...... ؟ سب خیریت ہے ناں...... ؟'' وہ بری طرح گھبرا گئی۔

''اللہ کا فضل ہے گڑیا...... ہم اس کی رحمتوں کے سائے میں ہیں۔'' امی نے مسکراتے ہوئے اپنے آنسو صاف کیے تو وہ ان کی یوں پل، پل بدلتی کیفیت کو دیکھ کر مزید حیرت زدہ ہوگئی۔

''مسکان وہ دراصل...... تمہارے لیے ایک رشتہ آیا ہے...... مسز قریشی نے اپنے بھائی جاذب کے لیے تمہیں مانگا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ان کے بھائی نے ہی تمہارا ہاتھ مانگنے کے لیے کہا ہے۔

کیونکہ تمہاری دلکشی اور معصومیت انہیں بہت بھائی ہے۔ کہہ رہی تھیں جاذب وغیرہ یا کسی اور قسم کی معلومات کرنی ہوں تو میڈم ذکیہ سے کرلیں ...... خود جتنا کچھ انہوں نے بتایا ہے اور سب سے بڑھ کر میڈم ذکیہ کی نسبت کے باعث مجھے تو کافی حد تک تسلی ہوگئی ہے مگر ابھی میں نے انہیں ہاں نہیں کی ہے ورنہ وہ تو اسی ہفتے کو آنے کا کہہ رہی تھیں۔ انتظام تو خیر میں کرلیتی مگر سب سے اہم کام تو یہ تھا کہ...'' وہ ذرا جھجکیں پھر گویا ہوئیں۔'' وہ دراصل یہ تھی کہ میں تمہاری رضا جاننا چاہتی تھی گڑیا...... میں تمہاری ماں ہونے کے ساتھ، ساتھ دوست بھی تو ہوں۔ اس لیے تم کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرسکتی ہو۔ ماشاء اللہ پڑھی لکھی، سمجھدار اور باشعور ہو۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ تمہارا شرعی حق بھی ہے۔ ضروری تو نہیں ناں...... کہ اگر رشتہ مجھے پسند ہے تو تم بھی ہاں ہی کرو۔''

مسکان امی کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ وہ خود سوال کررہی تھیں اور خود ہی جواب دے رہی تھیں۔ وہ اس پر اپنا فیصلہ ٹھونسنا نہیں چاہتی تھیں مگر یہ خواہش بھی رکھتی تھیں کہ مسکان کا جواب ہاں میں ہو۔ مسکان کی نظر میں ماں، باپ کی رضا میں ہی اللہ کی رضا تھی اور انکار کی کوئی وجہ بظاہر تو اسے بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی سو اس نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

''امی میں صرف یہ جانتی ہوں کہ آپ سے زیادہ میرا اچھا برا کوئی نہیں جان سکتا ہے۔ اپنے پیروں پر تو میں اللہ کے فضل سے کئی سال پہلے ہی کھڑی ہوگئی تھی مگر ٹھوکر سے بچنے کے لیے آپ کی انگلی میں تاعمر تھامے رہوں گی۔ آپ جو مناسب سمجھیں وہی کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''مجھے تم پر فخر ہے گڑیا...... اللہ ہر گھر میں تمہارے جیسی تابعدار بیٹی دے۔'' امی نے مسرور ہو کر اسے گلے لگالیا اور مسکان کی نظروں میں سیاہ

چمکدار جذبے لٹاتی آنکھیں گھوم گئیں۔

☆☆☆

''آؤ، آؤ گڑیا، شرماؤ نہیں۔'' فریدہ بیگم نے مسکان کو ٹرالی لاتے دیکھا تو ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کا پردہ ہٹا دیا۔

''مسکان بھئی یہ سب تو اضع چھوڑو، ہم کوئی مہمان نہیں...... ہم تو اب تمہارے اپنے ہیں۔ تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔'' مسز قریشی نے آگے بڑھ کر مسکان کو گلے لگاتے ہوئے کہا تو مسکان شرماتی، لجاتی ان کے برابر میں بیٹھ گئی۔

''میرون ریشم کی خوب صورت کڑھائی سے مزین گلابی جارجٹ کے سوٹ میں، سلیقے سے دوپٹا لیے اپنی دمکتی رنگت کے ہمراہ وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ جاذب کی نظریں ہی نہیں ہٹ رہی تھیں اور نظروں کی تپش محسوس کر کے جب مسکان نے اس کی جانب نگاہ کی تو ڈارک براؤن پینٹ اور آف وائٹ شرٹ میں سانولا لیکن پرکشش چہرہ لیے اسمارٹ سا جاذب اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہا تھا۔

''بھئی مسکان تم عمر میں تو مجھ سے چھوٹی ہو مگر رشتے کے لحاظ سے بڑی ہو...... سو میں تمہیں بھابی ہی بلاؤں گی۔ ویسے ذرا سچ سچ...... بتاؤ...... تمہیں جادو آتا ہے کیا......؟'' مسز قریشی نے سرگوشی کے انداز میں مگر بہ آواز بلند پوچھا تو مسکان معصومیت سے ان کا چہرہ تکنے لگی۔ بھوری غزالی آنکھیں حیرت سے پھیل کر اور بڑی لگنے لگیں۔

''ارے تم تو گھبرا گئیں...... بھئی میں ایسا اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ کہاں تو میرے جاذب بھیا شادی کے نام پر بھاگتے تھے اور اب جب سے تمہیں دیکھا ہے ''میرے سر پہ سہرا سجا دو'' کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔'' مسز قریشی نے گنگناتے ہوئے کہا تو مسکان شرم سے گلنار ہو گئی اور جاذب جھینپ گئے تو کمرا قہقہوں سے گونج اٹھا۔

اہمیت دعا ومناجات

☆قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔ ''اور آپ کے رب نے فرمایا کہ مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں۔ وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں جائیں گے۔''

سورۃ الاعراف، آیت 55 میں ارشاد ہے۔ ''اپنے رب سے عاجزی اور چپکے، چپکے دعا مانگو۔'' نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا۔ ''دعا عین عبادت ہے۔'' ایک اور مقام پر حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی چیز قابلِ بزرگی نہیں ہے۔

☆نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا۔ ''دعا عبادت کا مغز ہے۔'' چنانچہ ہر اہلِ ایمان کو اپنی ہر حاجت اللہ رب العالمین سے مانگنی چاہیے اور جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس کا خالق و مالک اسے خالی و ناکام نہیں لوٹاتا۔

صحیح بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ سرور کائنات نے ارشاد فرمایا۔ ''تم میں سے ہر شخص کی دعا قبول ہوتی ہے جب تک کہ وہ جلدی نہیں کرے، یعنی وہ کہے کہ میں نے (بہت) دعا کی لیکن میری دعا قبول ہی نہیں ہوتی۔''

☆رسول عربیؐ نے فرمایا۔ ''بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے جب کہ وہ جلدی نہ کرے اور جب تک وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ مانگے۔'' نبی کریمؐ سے پوچھا گیا۔ ''جلدی کرنے سے کیا مراد ہے؟''

☆آپؐ نے فرمایا۔ ''بندہ یہ کہے کہ میں نے بہت دعائیں مانگیں۔ میں نہیں خیال کرتا کہ میری دعا قبول ہوگی۔ پس وہ تھک ہار کر دعا مانگنا چھوڑ دے۔'' مشکوٰۃ شریف میں آتا ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا۔ ''اللہ رب العزت اپنے فرشتوں کے سامنے بندوں کی عبادت پر فخر فرماتا ہے اور جب بندہ عاجزی و انکساری کے ساتھ رب العالمین کے حضور دعا کرتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ عاجزی و انکساری سے مانگی گئی اس دعا کو جلد قبول کر لیتا ہے۔

مرسلہ: شہلا محمود، واہ کینٹ

''چلو مسکان بیٹا جائے سرو کرو۔'' فریدہ بیگم نے گویا اس کی جان بخشی کروائی۔ وہ ٹرالی سے چیزیں نکال کر میز پر سیٹ کرنے لگی۔

''مسکان کے ابو نظر نہیں آ رہے۔'' مسز قریشی نے مسکان سے سرونگ پلیٹ لیتے ہوئے کہا۔

''جی ...... وہ......'' فریدہ بیگم بس اتنا ہی کہہ سکیں اور کمرے میں آوازوں کی موجودگی کے باوجود مسکان کے اندر سناٹا اتر گیا۔

''ذکیہ میڈم کو سب معلوم ہے۔'' فریدہ بیگم کے حلق سے کچھ اترتے ہوئے مسکان نے صاف محسوس کیا۔

''کیا معلوم ہے......؟'' مسز قریشی ماں، بیٹی کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کو دیکھ کر حیرت زدہ تھیں۔

''خدانخواستہ کیا وہ اس دنیا میں......؟'' اپنے سوال کے جواب میں فریدہ بیگم کی خاموشی پر مسز قریشی نے قیاس لگانا چاہا۔

''نہیں...... اللہ نہ کرے...... آ...... آپ نے کوئی معلومات......'' فریدہ بیگم کی آواز اٹکنے لگی۔

''اللہ!'' مسکان نے دل کی گہرائیوں سے پکارا۔ مسکان گویا جائے پناہ ڈھونڈنے لگی۔

''آپ پلیز صاف، صاف کہیے...... کیا بات ہے آخر......؟'' مسز قریشی کا چہرہ یک دم سپاٹ ہو گیا۔ فریدہ بیگم کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ مذاق کر رہی ہیں یا جان بوجھ کر انجان بن رہی ہیں۔ ان کے خیال میں ذکیہ بیگم نے سب کچھ صاف، صاف بتا دیا ہوگا جبھی ابھی تک انہوں نے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا اب جو انہوں نے یہ بات اٹھائی تو فریدہ بیگم کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دینے لگی۔

''پاپا ہمارے ساتھ نہیں رہتے...... جب میں پانچ سال کی تھی تو وہ ہمیں...... چھوڑ کر چلے گئے تھے۔'' مسکان نے ماں کی جگہ پل صراط طے کرنے کا فیصلہ کر کے جواب دے دیا تھا۔

''اوہو...... تو گویا آپ طلاق شدہ ہیں۔'' مسز قریشی کی مٹھاس بھری زبان ایک دم کڑوی ہو گئی۔

''انسان اتنے بے رحم بھی ہوتے ہیں۔'' مسکان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

''میڈم ذکیہ نے......'' فریدہ بیگم نے جانے کیوں ایک بار پھر وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

''ذکیہ کو آپ بیچ میں مت ڈالیں...... میرے پاس تو آپ کا فون نمبر تھا ہی...... اس لیے میں نے آپ سے براہِ راست بات کر لی تھی۔ میرا اس حوالے سے ذکیہ سے کوئی رابطہ نہیں ہوا لیکن آپ نے یہ بات کیوں چھپائی۔ ایسی باتیں تو پہلے سے ہی بتا دی جاتی ہیں۔'' فریدہ بیگم انہیں دیکھتی رہ گئیں کہ وہ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ مسز قریشی ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ جاذب نے ایک نظر مسکان پر ڈالی۔ جانے اس کی نگاہ میں رحم تھا یا غصہ...... مسکان سمجھ نہ سکی مگر محبت جیسے ہوئی ویسے ہی ختم بھی ہو گئی۔ لمحے میں مسکان پر فدا ہونے والا جاذب بس ایک پل میں بیگانہ ہو گیا۔ فریدہ بیگم نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ مسکان کا دل فریادی بن گیا۔

''اللہ تو، تو گناہ گاروں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔ ہم نے ایسا کیا قصور کر دیا کہ یہ ذلت ہمارے حصے میں لکھ دی۔'' وہ لوگ چلے گئے اور تھوڑی دیر پہلے جو کمرا قہقہوں سے گونج رہا تھا اب اس میں سسکیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

☆☆☆

جاذب والے واقعے نے مسکان کو بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ پہلے ہی اپنی زندگی کے ایک ایسے پر مرد ذات سے شاکی تھی مگر جاذب کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھ کر اس کا رہا سہا اعتبار بھی اٹھ گیا۔ فریدہ بیگم تو گویا بالکل خاموش ہو گئیں۔ انہیں بہت گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ اتنا دکھ تو شاید انہیں اس وقت بھی نہیں ہوا تھا جب مسکان کے پاپا عامر محض اس ضد کی

وجہ سے مسکان اور انہیں بے آسرا کر گئے تھے کہ وہ اپنا ذاتی مکان جو انہیں ان کے والدین نے بطور گفٹ دیا تھا اس لیے کہ فریدہ بیگم اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں اور ان کا اصرار تھا کہ وہ یہ گھر بیچ دیں...... عامر کی ضد تھی کہ وہ اس گھر کو بیچ کر انہیں کاروبار کرنے کے لیے رقم دے دیں۔ جبکہ فریدہ بیگم اپنے والدین کی نشانی اور سر پر چھت سے جدائی کے لیے تیار نہیں تھیں۔ ان کے گریز کی بڑی وجہ عامر کی جلد باز اور لاابالی طبیعت بھی تھی۔ وہ مستقل مزاج آدمی نہیں تھا کبھی ایک جگہ لگ کر نوکری بھی نہیں کی تھی۔ اس لیے فریدہ بیگم کو شک تھا کہ عامر جس نے اب تک لگائی نوکری چھوڑ کر کاروبار کرنے کی رٹ لگائی تھی بہت جلد کاروبار سے بھی اکتا جائے گا بلکہ اپنی تلون مزاجی کے باعث نقصان ہی اٹھائے گا۔ سو عامر انہیں تنہا چھوڑ کر جانے کہاں چلا گیا تھا۔

عامر کے جانے کے بعد فریدہ بیگم نے گھر کا ایک پورشن کرایہ پر دے دیا جس سے ان کی گزر اوقات چلنے لگی۔ فریدہ بیگم بھی سلائی کڑھائی سے کچھ پیسے جوڑ لیتی تھیں، مسکان نے بی اے کیا تو پرائیویٹ اسکول میں اسے جاب مل گئی تھی۔

پورشن خالی کروا کر وہاں ٹیوشن سینٹر کھول لیا۔ جس سے نہ صرف آمدنی میں اضافہ ہوگیا بلکہ بچوں کی آمد سے چہل پہل بھی رہنے لگی۔ مسکان کی جاب اور ٹیوشن کی تھکا دینے والی مصروفیت کے بعد وہ تو تھک ہار کر سو جاتی مگر فریدہ بیگم رات کے پچھلے پہر سے سحر ہونے تک اپنے رب سے اپنی معصوم بیٹی کی خوشیوں کی بھیک مانگتی رہتیں۔

☆☆☆

''کیسے بھول جاؤں میڈم ....! ہزاروں وسوسے اور خدشے ہمہ وقت میرے اطراف گردش کرتے ہیں۔ ان آوازوں کی بازگشت آج بھی مجھے سنائی دیتی ہے۔'' مسکان کی پلکوں پر آنسو لرزنے لگے اب

تین سال بعد ذکیہ خاتون ڈرتے ڈرتے اپنے بھتیجے کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ عابد مسقط میں سیٹل تھا اور والدین کے بعد ذکیہ خاتون ہی اس کا واحد سہارا تھیں۔ وہ گھر بسانے کی خواہش لے کر اس دفعہ پاکستان آیا تھا۔

''مسکان بیٹا..... پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ عابد کو میں نے ساری حقیقت بتادی تھی بلکہ جاذب والے معاملے کو بھی مکمل طور پر بیان کردیا ہے۔ اس لیے تم مکمل طور پر بےفکر ہو جاؤ۔ میں اس کی ایما پر ہی تم سے تمہاری رضامندی لینے آئی ہوں۔''

''یہی اصل میں مخلص اور سچے، کھرے آدمی کی پہچان ہے گڑیا..... وہ واقعات ہماری زندگی میں آنے والی آزمائشوں یا مصائب کا حصہ تھے مگر اب اللہ نے ہماری سن لی ہے اور وہ ہمیں اپنی رحمت کے سائے میں لے رہا ہے۔ اگرچہ اس کی رحمتیں تو سایہ فگن رہتی ہیں مگر ہم ان کا...ادراک نہیں کر پاتے۔ بیٹا ان خوشیوں سے منہ موڑنا کفرانِ نعمت ہے۔ اس کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ گڑیا۔'' فریدہ بیگم نے مسکان کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس نے سر جھکا دیا۔ فریدہ بیگم نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا تھا۔

''میں ایک بات بتانا ضروری سمجھتی ہوں مسکان۔'' ذکیہ خاتون نے کہا تو ماں بیٹی چونک گئے۔

''عابد پہلے نکاح کرے گا تاکہ اسے کاغذات بنوانے میں آسانی ہوجائے اور رخصتی کے فوراً بعد وہ تمہیں ساتھ لے جاسکے اور اپنی زندگی کی شروعات وہ حج وعمرہ کی ادائیگی سے کرے گا۔''

ذکیہ خاتون کی بات سن کر فریدہ بیگم کی آنکھوں سے شکرانے کے آنسو بہہ نکلے اور وہ ایک دم سجدے میں گر گئیں۔ اللہ نے ان کی ریاضتیں ضائع نہیں جانے دیں اور مسکان تو یہ سوچ کر ہی دم بخود رہ گئی کہ صبر کا پھل ایسا میٹھا ہوتا ہے۔



قسط 3

رنگِ خلش

رفعت جاوید

کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری زندگی کے حسین لمحے
بھی خلش کی نذر ہو جاتے ہیں اور ہم جوں جوں اس احساس کو من کے
اندر گہرائیوں میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو خلش کے بے حساب رنگوں
کی پردہ کشائی ہمیں مضطرب کرنے لگتی ہے اور مکافاتِ عمل کا کبھی نہ ختم ہونے والا
سلسلہ شروع ہو جاتا ہے . . . گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا . . . سزا تو لازم و ملزوم ہے۔ اس
کے باوجود امیدِ شجر سے گہرا ربط و تعلق رکھنا دوا بھی ہے اور عبادت
و ریاضت بھی ہے، نشاطِ وصل بھی اور وجدان بھی ہے۔

ممکن ہے ایسا وقت ہو ترتیبِ وقت میں
دستک کو تیرا ہاتھ بڑھے میرا در نہ ہو



''بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کے ناتے اور پھر بن بلائے مہمان کی طرح میری آمد ہونے کے باوجود میں گھر بھر کی آنکھ کا تارا رہی، لاڈ، پیار اور بھرپور توجہ میرے اندر خود اعتمادی کی جڑوں کو مضبوط کرتی گئی اور میری فطری خامیوں پر اچھائیوں کی چھاپ لگتی گئی۔ بچپن کا غرور اور تکبر، لڑکپن کی تصنع و بناوٹ اور جوانی کی انا اور خود پسندی نہ جانے کہاں رفع ہوگئی کہ آج میں اپنی فیملی کی تمام دوشیزاؤں کے لیے اِک رول ماڈل ہوں۔ مامی نے اپنے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے کے لیے میرا انتخاب کیا ہے۔'' وہ اپنا جائزہ خود ہی لے رہی تھی وہ جانتی تھی کہ عادل کی پرسنالٹی میں خلا ہے لیکن پھر بھی وہ انسان لاجواب ہے۔ اس کی آنکھ میں میل نہیں...... اس کے دل میں کھوٹ نہیں...... اس سے باتیں کرنے سے اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ اب بھی ماں کی آغوش کا ہمکتا ہوا بچہ ہے۔ بس یہی کمزوری اس کی شخصیت پر غلبہ پا کر اس کے تمام مردانہ خصائل و وجاہت کو ماند کرگئی تھی۔ ایسے ہی مرد جب پیار کرنے پر آتے ہیں تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے۔ انہیں آگے ہی بڑھنا آتا ہے اور اس کا حصول ان کا مقصدِ حیات بن جاتا ہے۔ چاہے ان کا فیصلہ سراسر غلط ہی کیوں نہ ہو...... اور جہاں پر لچک اور نرمی کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں پل بھر میں پٹری سے اتر جانا بھی ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ اس کی سائیکی سمجھنے میں وردہ کو دیر نہیں لگی۔ عادل کو فقط پیار، توجہ اور دوسروں کی طرف سے قدر افزائی کی ضرورت تھی کیونکہ باپ کی طرف سے محرومی کے احساس نے اسے ہمیشہ اسی کی کھوج میں رکھا۔ ماں کے بعد وہ وردہ کی کمپنی میں بہت کمفرٹیبل رہا۔ شاید بحیثیت ایک میڈیکل اسٹوڈنٹ وہ اس کے نفسیاتی مسائل سمجھ سکتی تھی۔ عادل کی سادہ دلی، شرافت اور معصومیت کا اثر تھا کہ جسے فیملی کی کوئی لڑکی پانچ منٹ سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتی تھی، وردہ نے اپنا تمام جیون اس کے ساتھ بتانے کی ٹھان لی تھی۔

''یا اللہ مجھے حوصلہ و ہمت عطا کرنا کہ میں اس فیصلے کو نبھا پاؤں، کہیں بن مول ہی اپنے جذبات اس پر نچھاور کر کے میں بے دست و پا ہی نہ ہو جاؤں۔'' وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز سوچے جا رہی تھی۔ کبھی کبھار غیر شعوری طور پر خود کلامی بھی کر جاتی۔ کبھی پیشانی پر شکنیں گہری ہوتیں تو کبھی آنکھوں میں چمک دوڑ جاتی۔ اسی عالمِ تذبذب میں گھری وہ نیند سے کوسوں دور تھی کیونکہ یہ معاملہ سائرہ آنٹی نے اسی پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کی طرف سے جواب ملنے کے بعد ہی وہ اگلا قدم اٹھانے کا فیصلہ کریں۔

آج ایک مہینے بعد وردہ اپنے گھر آئی تھی۔ اسے اپنے ہی گھر میں اجنبیت اور غیریت سی محسوس ہوئی تھی۔ قیدِ تنہائی کا احساس ستانے لگا تھا۔ وہاں رات دیر تک عادل سے اسکریبل کھیلنا، مووی دیکھنا اور اس کا نہایت لگاوٹ سے اس کے لیے کافی بنانا سب ذہن کے پردے پر ابھر رہا تھا۔ سارا، سارا دن سائرہ آنٹی سے اَنٹلکچوئل باتیں کرنا، سننا اور ہاٹ ٹاپکس پر ڈسکس کرنا اسے بہت بھلا لگتا تھا۔ اس کے گھر کا ماحول بہت الگ تھا۔ سب بہن، بھائی شادیوں کے بعد دنیا کے مختلف ملکوں میں آباد تھے۔ والدین اپنی صحت کے قضیے اور اپنی مصروفیات میں پھنسے ہوئے تھے۔ اسے کمپنی دینے والا اس گھر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھی اور ٹھنڈے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے عادل کو فون کرنے کا سوچنے لگی۔ رسٹ واچ کی طرف دیکھ کر اس نے خود کلامی کی۔

''رات کے دو بجے مناسب نہیں لگتا کیونکہ اپنی اماں کا بے بی ماں کی بغل میں دبکا سو رہا ہوگا۔ آنٹی سوچیں گی کہ اس بچی کو اس وقت کس بے تابی اور پریشانی نے گھیر لیا ہے کہ ایمرجنسی ڈکلیئر کردی۔ وہ بھی شاید میری طرح سویا نہیں ہوگا۔ مجھے مس کر رہا ہوگا، آخر ایک مہینے کا دن رات کا ساتھ تھا کچھ تو اس گٹھ جوڑ کے

اثرات اس پر بھی ہوئے ہوں گے۔'' وردہ نے بالآخر اس کا نمبر ملا دیا۔ بیل پاس ہونے سے پہلے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ یہی سلسلہ کئی بار جاری رہا اور آخر خود کو کوستی ہوئی وہ ٹیبل لیمپ کی لائٹ بجھا کر اور تکیے پر سر رکھ کر خود کو مطمئن و پُرسکون کرنے کی خاطر سورۂ فاتحہ کا ورد کرنے لگی...... اسے کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب گہری نیند کے ہلکورے لینے لگی۔ صبح اس کی آنکھ موبائل کی رِنگ پر کھل گئی چونک کر اس نے نیم وا آنکھوں سے موبائل کی اسکرین کو دیکھا۔ عادل کا نام دیکھ کر اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ بھی رات بھر اس کے لیے پریشان رہا ہے جو علی الصباح ہی اسے یاد فرمایا گیا ہے۔ وہ خوشی سے اچھل کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''ہیلو، عادل بھائی...... اتنی صبح ہماری یاد نے آپ کی نیند کیسے کھول دی؟ ضرور میری کمی محسوس ہوئی ہوگی۔ کیوں عادل بھائی ایسا ہی ہے ناں......؟'' ایک طویل جمائی لیتے ہوئے اس نے بات مکمل کی۔

''بالکل ایسا ہی ہے، ممی بھی تمہارے سحر میں پوری طرح سے گرفتار ہو چکی ہیں مگر لگتا ہے مجھ پر جادو کے اثرات زیادہ واضح ہیں جو رات بھر نیند نہیں آئی۔'' وہ بھی جمائی لیتے ہوئے گرمجوشی سے بولا۔

''Compliment سمجھوں یا کہ ایک دنیاداری یا محض روایتی شکریے کے الفاظ سمجھوں۔'' وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

''یہ تو تمہاری اپنی سمجھ پر منحصر ہے کیونکہ آئینے میں اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔'' وہ چھیڑتے ہوئے بولا تو وردہ نے پُرسکون سانس لی۔

''تو پھر آج سے ڈیوٹی شروع ہے۔ آئی ایم سوری وردہ...... تمہاری تمام چھٹیاں ممی کی ڈیوٹی نبھاتے ہی گزر گئیں۔'' ایک دم سے اس کا لہجہ مضطرب ہو گیا۔

''عادل بھائی...... ماں جیسی عظیم خاتون کے ساتھ زندگی بیت جانے کی خوشی ہوگی کہ دکھ......؟ کیسی عجیب باتیں کرتے ہیں، آپ کو گلٹی فیلنگ نہیں ہونی چاہیے۔ میری عزت افزائی اور آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ اس ناچیز کو اس قابل سمجھا گیا۔'' وہ مؤدبانہ انداز میں بولی۔

''تو پھر اس خوشی میں واپسی پر چکر لگانا اہم ہو گیا ہے۔ آج ایک اور یونیورسٹی میں بھی انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں، تمہارے آنے تک میں بھی گھر آ جاؤں گا۔ آج شطرنج کی بازی لگائیں گے۔ دیکھتے ہیں جیت کس کی ہوتی ہے؟'' وہ اپنائیت سے بولا۔

''اگر جیت آپ کی ہوگئی تو سمجھیں کہ آج کا دن آپ کے لیے بہت مبارک ہے، جاب کی طرف سے بےفکر ہو جائیں۔'' وہ خوش دلی سے بولی۔

''تو ہم پرستی اور پیش گوئیوں پر میں بھروسا نہیں کرتا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''سیم ہیئر...... یہ پیش گوئی نہیں، عادل بھائی آپ کی دھما کا خیز پرسنالٹی کا کمال ہوگا اور پھر آپ کی ڈگریوں کا کہ آپ کو فوری ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ ماموں وہاں بات ہی کر لیتے۔'' وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

''یعنی عابد دلت کو سفارش کی ضرورت ہے تو پھر ڈگری بھی جعلی ہی ہونی چاہیے تھی۔ چلو یہاں تو سب کچھ چل جاتا ہے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا تو اب دنیا کی دیکھا دیکھی سفارش کو اپنی کامیابیوں کا پُل کیونکر تصور کروں؟'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔

''میں نے تو ویسے ہی آپ کو ایک سرسری سا مشورہ دیا ہے، پلیز عادل بھائی، ڈونٹ مائنڈ...... آج کی

صبح، دوپہر اور شام آپ کے لیے ہزاروں خوشیاں لے کر دارد ہو، میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔'' وہ دعائیہ لہجے میں بولی۔

''تھینکس وردہ......'' اس نے کہہ کر فون رکھ دیا۔

☆☆☆

وردہ نے بیل پر انگلی رکھی ہی تھی کہ مین ڈور کھل گیا۔ جیسے دروازے کے دوسری طرف عادل ہی اس کا منتظر تھا۔ وردہ اسے دیکھ کر خوشی و حیرت کے ملے جلے جذبات سے غیر ارادی طور پر اس سے لپٹ گئی۔ عادل ایک دم سے ایسے اچھلا جیسے کسی دہکتے ہوئے انگارے پر اس نے پاؤں رکھ دیا ہو۔ وردہ مارے ندامت کے پیچھے ہٹ گئی۔ جبھی اسٹڈی سے جھانکتے حسنات کو دیکھ کر وہ مزید متذبذب سی ہو کر خود کو کوستی ہوئی حسنات کو سلام، آداب کیے بغیر ہی سائرہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ عادل بھی کسی گہری سوچ میں اس کے پیچھے ہولیا۔ سائرہ سے بغلگیر ہو کر وردہ نے اپنی آشفتہ ہمت کو بحال کر لیا تھا۔ چہرے پر نارمل تاثرات کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔

''بیٹا کل سے آج تک کا فاصلہ مجھے بہت طویل لگا۔ تم میرے پاس ہی کیوں نہیں آجاتیں۔'' سائرہ نے دل میں ہی سوچا مگر زبان سے اظہار کرنا مناسب نہیں لگا۔ اسے بوسہ دے کر عادل کی طرف متوجہ ہوئی۔ جو اضطرابی کیفیت میں وردہ کو دیکھتے ہوئے انگلیاں مروڑ رہا تھا...... سائرہ فوراً سمجھ گئی، اسے کچھ مسئلہ درپیش ہے۔ اس کی کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ شگفتہ لہجے میں بولی۔

''وردہ...... اللہ تعالیٰ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ عادل کا انٹرویو بہت تسلی بخش رہا۔ مجھے اپنے بچے کی کامیابی کی سو فیصدی امید ہے۔''

''آنٹی! آپ کو ان کی فکر تھی۔ ہو نہیں سکتا...... میں تو خاصی مطمئن تھی۔ آنٹی اب آپ بھی خود کو بزی کریں۔ ورنہ تنہا ہو جائیں گی...... اور اتنی ڈگریوں کے ضائع ہونے کا صدمہ آپ کو سال بھر میں ناکارہ کر دے گا پھر جوائن کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ کسی بھی پبلک سیکٹر میں آجائیں۔ آج کل نئی یونیورسٹیز کو آپ جیسے ذہین و فطین لوگوں کی بہت ضرورت ہے۔ ان کی مدد کیجیے آپ کو بھی دلی تسکین اور ذہنی اطمینان ملے گا۔'' وردہ نے ان کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ کر نہایت ملائمت سے کہا۔

''آئیڈیا برا نہیں...... مگر ایج فیکٹر......'' وہ ایک دم اداس سی ہو گئی۔

''ممی بال سفید ہونے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ آپ کی عمر اب نئے پراجیکٹس شروع کرنے کی نہیں رہی۔ ڈیڈی سے سترہ سال چھوٹی ہیں آپ۔'' عادل نے تڑپ کر سائرہ کی بات کاٹ دی۔

''عادل بھائی...... میں کل واپسی پر انہیں پارلر لے جاؤں گی، ذرا ڈینٹنگ پینٹنگ کی ضرورت ہے۔ دیکھیے گا کہ حسینۂ عالم بن کر ماموں کے ہوش و خرد پر چھا جائیں گی اور یوں چٹکی بجاتے ہوئے جناب بھی ان کی باندی بن کر رہ جائے گی۔'' وردہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! ماموں ہیڈ اسٹرانگ شوہر ہیں، قصور وار میں نہیں کہ میں نے ایک عورت کی طرح بننا سنورنا چھوڑ دیا۔ جو میرا پیدائشی حق بھی تھا۔ بیٹا عورت شوہر کی ہلکی سی پیار و چاہ بھری مسکراہٹ دیکھ کر ہی پھول کے مانند کھل بھی جاتی ہے اور خوشبو کی مہکار سے ہر ساعت شوہر کو سیراب بھی کرتی ہے۔ میں تو اک مرجھائی ہوئی خوشبو اور حسین رنگوں سے عاری ایسا پھول ہوں، جس کی پتیاں بکھر رہی ہیں۔ اینڈ آف دی ڈے ایک ناکارہ، بدصورت سوکھا ہوا بڈ (bud) باقی رہ جائے گا۔ ایک دن وہ بھی ٹوٹ کر مٹی کا حصہ بن جائے گا۔'' سائرہ کے

لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بلا کی اداسی، مایوسی اور پژمردگی سما گئی تھی۔

"اسی بڈ سے افزائشِ نسل ہوتی ہے ممی...... وہی بڈ تو ازلی اور ابدی ہوتا ہے، ممی آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں؟" وہ ماں کو پیار کرنے لگا تو سائرہ نے اپنے آنسو پی لیے۔ وہ وردہ کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ اور عادل کو مزید ٹینشن نہیں دینا چاہتی تھی کیونکہ وہ تو بہت نازک اور کمزور دل انسان تھا جبکہ اس کے برعکس وردہ نے دن میں کتنے ہی مریضوں کو مرتے دیکھا تھا۔ وہ دل کی مضبوط اور ارادوں کی بھی مستحکم تھی۔

"عادل بھائی! آج کا کام کل پر چھوڑ دیا تو وہ کل کبھی نہیں آئے گا۔ میں اسی وقت آنٹی کو لے کر پارلر جانا چاہتی ہوں۔" وردہ نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"نہیں وردہ بیٹے رہنے دو، مجھے یہ درست نہیں لگ رہا۔ تمہارے ماموں مجھے پہلے ہی پاگل اور اناڑی اور نہ جانے کن، کن خطابات سے نواز چکے ہیں۔ مجھے اِک عام عورت کی حالت میں دیکھ کر غصے سے نہ جانے کیا کر بیٹھیں؟" وہ اچنبھے سے بولی۔

"آپ کو دیکھ کر خود ہی پاگل ہو جائیں گے، ممی خدا کے لیے ان سے ڈرنا چھوڑ دیں۔ وہ آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ جسے سنوارنا نہیں آتا ان میں بگاڑنے کے جراثیم بھی موجود نہیں ہوتے۔ ایسا کرنے کے لیے گٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مُردہ، بے حس اور بے دم لوگوں سے آپ کو کس خطرے کا اندیشہ ہے؟" عادل اسے سمجھائے جا رہا تھا اور سائرہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"آنٹی فارائے چینج سہی...... بال گھر کی کھیتی ہے، دو مہینے میں فصل تیار ہے اور ڈائی دو تین دھلائیوں کی مار ہے۔ چلیں اٹھیں، آپ کا میک اپ اوور کرواتے ہیں۔ ماموں دھک رہ جائیں گے۔" وردہ نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس کے پاؤں میں سینڈل پہنا کر اس کے دوپٹے کو درست کیا۔

"وردہ انہیں عینک سے بھی چھٹکارا دلا دو۔" عادل نے خوش دلی سے کہا۔

"سپرب آئیڈیا، آنٹی اگر لینسز سے کام چل سکتا ہے تو پھر ان منحوس گلاسز کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ٹیکنالوجی ہمارے جیسے حاجت مند حضرات کے لیے ایجاد ہوئی ہے۔ فائدہ اٹھانا ہمارا حق بنتا ہے۔" وردہ بھی چہکتے ہوئے بولی تو عادل نے الماری سے سائرہ کا پرس نکالا اور ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولا۔

"وردہ جب ممی فارغ ہو جائیں تو مجھے انفارم کر دینا۔ آج اسی خوشی میں ڈنر ممی کی پسندیدہ جگہ پر کریں گے۔"

"ٹھیک ہے عادل بھائی...... میں امی کو بھی بتا دوں گی کہ آج کی شام مائی کے نام... ورنہ وہ فکر مند ہو جائیں گی۔" وہ رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولی۔

"وردہ میں دیکھ رہا ہوں، محسوس بھی کر رہا ہوں کہ تم روز بروز کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہوتی جا رہی ہو، چالاک اور تیز طرار۔" عادل نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر وردہ کو کمپلیمنٹ دینا ہی چاہتے ہو تو ہوشیار کی جگہ سمجھدار، چالاک کی جگہ عقلمند اور تیز طرار کی جگہ کلیئر تھنکنگ کہو تو بات بھی بنے۔ تم بھولے اور معصوم ہی رہے۔ لفظوں کے چناؤ میں احتیاط نہ برتیں تو دوسرے بہت ہرٹ ہو جاتے ہیں۔" سائرہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں...... ڈاکٹر ہے مرہم پٹی کر لے گی۔" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا تو وردہ ہنستی ہوئی سائرہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''ممی!او مائی گاڈ...... یو آر لکنگ سو ایلی گینٹ...... ممی آئی لو یو...... ڈیڈی بھی دل کا نذرانہ اس ماڈ اسکاڈینگ گرل کے چرنوں میں پیش کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔'' سائرہ پارلر سے نکلی تو عادل اسے پہچان نہ پاتا اگر وردہ ساتھ نہ ہوتی۔ معمولی سی محنت اور توجہ سے اتنی بڑی تبدیلی۔'' آئی کانٹ بی لیواٹ......'' عادل نے ماں کو دیکھا تو فوراً گاڑی سے باہر نکل آیا اور بے اختیاری میں بولتا چلا گیا۔

''میری ایک بات مت بھولنا...... یہ سب کچھ میں نے اپنی نئی زندگی کو خوش آمدید کہنے کے لیے کیا ہے۔ اس لیے کسی قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے کی غلطی مت کرنا۔'' سائرہ نے عادل کو پیار سے دیکھ کر تنبیہا کہا تو سب ہنستے ہوئے ایک ہی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وردہ کی گاڑی ڈرائیور لے گیا اور سب ہیر سوہا وہ چل دیے۔ رستے بھر ان کی گپ شپ، چھیڑ خانیاں جاری رہیں۔ سائرہ نے محسوس کیا کہ چڑچڑے، ضدی اور لاابالی عادل کے مزاج میں زمین، آسمان فرق آگیا ہے، کریڈٹ وردہ کو ہی جاتا تھا۔ کھانے کے بعد وردہ کو اس کے گھر ڈراپ کیا اور ماں بیٹا مسرور سے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔

اسٹڈی کی لائٹ آن تھی۔ ''غالباً حسنات جاگ رہے ہیں۔'' سائرہ نے گھر میں داخل ہوتے ہی خود سے سرگوشی کی...... اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور من سے اِک ننھی سی خواہش کی ہلکی سی چنگاری نے اسے مضطرب سا کردیا۔ وہ سرعت سے اسٹڈی کے پاس سے گزر گئی کہ کہیں اندر جھانک کر اپنا دیدار کرانے کی غلطی ہی نہ کر بیٹھے۔ آخر دل ہی تو تھا...... اس کا بے قابو و بے مہار ہونا اِک فطری امر تھا۔ کوئی انہونی حرکت تو نہیں تھی لیکن اس گھر میں بسنے والا طمانزاد ور ظالم شوہر اس کے فطری نسوانی جذبات واحساسات کو پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ آج معمولی سی تبدیلی سے اسے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔ یہ وہ بھی بخوبی جانتی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے قدِ آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ ''عادل سچ ہی کہتا ہے کہ بالوں کے کلر اور اسٹائل کا انسان کی شخصیت پر بہت اثر پڑتا ہے۔'' وہ آج بھی اپنی عمر سے دس سال چھوٹی لگ رہی تھی۔'' عورت کو اللہ تعالیٰ نے ڈھیٹ اور سخت مٹی سے بنایا ہے۔ ورنہ اپنے شوہر کی دھتکاری ہوئی عورت آج اتنی فریش دکھائی نہ دیتی۔'' وہ اپنا جائزہ لیتے ہوئے سوچے جا رہی تھی۔

☆☆☆

''عادل بھائی آج آپ کا یونیورسٹی فرسٹ ڈے ہے، آج میں آپ کو اپنی گاڑی میں وہاں ڈراپ کروں گی۔'' وردہ نے صبح سات بجے فون کر کے اپنا پروگرام بتایا تو وہ حیرت سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

''وردہ اس کی ضرورت نہیں...... تم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگئی ہو، تم اپنے اسپتال جاؤ، واپسی پر گھر سے ہوتی جانا...... ملاقات بھی ہوجائے گی۔ ممی بھی خوش ہوجائیں گی اور اِک بازی بھی لگالیں گے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

''میری بات کراؤ وردہ سے...... مت توڑو اس کا دل......'' سائرہ نے فون اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ ''وردہ بیٹا تم ڈراپ کرنا چاہتی ہو تو موسٹ ویلکم...... فوراً پہنچو جان......''

''آنٹی آج تو عادل بھائی کو ڈھول باجوں سے یونیورسٹی چھوڑ کر آنا چاہیے۔ فرسٹ جاب فرسٹ چوائس پر مل گئی...اور ہمیں کیا چاہیے۔'' اس کے لہجے میں خوشی تھی۔'' انہیں میں ہی پک بھی کرلوں گی...... پھر آپ کے پاس دیر تک بیٹھوں گی...... کیونکہ یہ رونق بھی تو چند دنوں کے لیے ہے...... پھر آپ بھی ہمارے کام سے گئیں۔''

''یہ تو ہے...... زندگی مصروف رہنے میں ہی حسین ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی اور فون بند ہوگیا۔

''اللہ اسے خوش رکھے، بہت خیال رکھتی ہے۔''

''آپ کا یا میرا......؟'' وہ شریر لہجے میں بولا۔

''ہم دونوں کا......'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ویسے ممی کافی لسوڑا لڑکی ہے، خیر اپنی کزن ہے، برداشت تو کرنا ہی پڑے گا۔ کمپنی کافی اچھی ہے اس کی۔ ڈاکٹرز کو مزاجاً ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پیشنٹ سے بات کرتے ہی اُس کی آدھی بیماری رفو چکر ہو جاتی ہوگی۔'' وہ پُرستائش لہجے میں بولا تو سائرہ دل ہی دل میں جھوم سی گئی۔ ماں بیٹا، ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ وردہ اسے لینے پہنچ گئی۔ اس نے نہایت اپنائیت اور لگاوٹ سے کلون کے ساتھ گلاب کے فریش مسحور کن خوشبو بکھیرتے ہوئے پھولوں کا بوکے عادل کی طرف بڑھایا تو سائرہ مسکرا کر کچن میں ہی ہاتھ دھونے چلی گئی۔ وردہ نے اسے پیار سے گھورا اور کلون کی بوتل کو ڈبے سے نکال کر اس پر ہلکا سا اسپرے کیا۔ اسی سمے حسنات اپنے کمرے سے باہر نکلے اور دونوں کو اس قدر قریب کھڑے دیکھ کر واپس اندر چلے گئے اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ ''کچھ آنکھ مچولی، پکڑن پکڑائی کا سماں لگتا ہے۔ ناٹ بیڈ......'' وہ خود کلامی کرتے ہوئے اسٹڈی میں واپس آگئے اور چیئر پر بیٹھ کر ناشتے کا انتظار کرتے ہوئے وردہ کے بارے میں سوچنے لگے۔

''عادل ڈیڈی سے ملے بغیر یونیورسٹی جانا درست نہیں...... باپ کا دل نہیں دُکھاتے، ہم نہیں جانتے کہ آج وہ کتنے خوش ہوں گے۔ کتنا فخر محسوس کر رہے ہوں گے۔ انہیں اپنے جذبات کا اظہار کرنا نہیں آتا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ہمیں نہیں چاہتے۔'' سائرہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ان کی محبتوں کے پیمانے تو بھر بھر گئے ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہاتھ منہ دھونے کا شرف ضرور حاصل کروں گا۔''

''ضرور، ضرور بہت سادہ طبیعت کے انسان ہیں...... جب میں پارلر سے واپس آئی تھی تو مجھے اس روپ میں پہچان نہ سکے تھے۔ چاچا سے پوچھنے لگے کہ کیا گھر میں کوئی مہمان خاتون آئی ہے۔ یہ تک نہ پوچھا کہ وہ خاتون ہے کون...... ایسا بھی کوا چاہوا بندہ نہ ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے بتا رہی تھی۔

''ممی کوا چاہوا نہیں نابینا کہیے...... قابلِ ترس ہیں بیچارے۔'' وہ مزاحیہ انداز میں بولا اور اسٹڈی کی... طرف چل پڑا۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے مخصوص آواز آئی۔

''کتنی بار کہا ہے کہ چائے، پانی، ناشتے اور کھانے پر دستک مت دیا کرو...... ڈسٹرب کر دیتے ہو، چپکے سے اندر آؤ، ٹرالی رکھو اور غائب ہو جاؤ۔'' لہجے میں رعونت تھی۔

عادل کا دل چاہا واپس پلٹ جائے...... مگر ایسا کرنا ناممکن تھا کیونکہ تھوڑے ہی فاصلے پر ماں اسے گہری اور محبت آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور آداب بجالایا۔

''اچھا تو تم تھے!'' وہ نخوت سے بولے۔ ''آج کل کن چکروں میں ہو صاحبزادے؟''

''آج جاب پر جا رہا ہوں، سوچا آپ کی دعائیں لیتا ہوا جاؤں۔'' وہ بہ مشکل بولا۔

''باپ کی دعا کی اہمیت کا کہیں ذکر نہیں...... ماں کی دعا سمیٹو......'' لہجہ قطعی تھا۔ وہ مزید کچھ کہتا لیکن غصے میں سرعت سے باہر نکل آیا۔

''مجھے بے عزت کرنے کا ٹھیکا اٹھا رکھا ہے آپ نے...... آپ کو نہ جانے ایسا کرنے سے حاصل کیا ہوتا ہے؟'' وہ ماں کے قریب آ کر بولا۔

سائرہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور وردہ کے ساتھ مین ڈور کھول کر پورچ میں آ گئی۔ عادل ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ باہر نکلا اور دونوں سے بات کیے بغیر ہی اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا اور سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ دونوں حق دق ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

''ماموں نے ضرور کچھ الٹی سیدھی ہی ہانکی ہوگی۔ آج کے دن تو بخش دیتے۔ آنٹی آپ نے خود پر بہت ظلم ڈھایا ہے۔ اس انسان میں آپ کو کیا نظر آیا تھا کہ چھوڑنا ناممکن ہو گیا تھا!'' وردہ نے تاسف بھرے لہجے میں کہا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ''آنٹی آپ میری آئیڈیل ہیں..... اس میں شک کی رتی بھر گنجائش نہیں..... لیکن اتنی ذلت، حقارت ونفرت کے ساتھ گزارہ کرنا میرے خیالات کے بالکل برعکس ہے..... نسوانی وقار و کر و فر کو آپ نے معاشرے کے ہاتھ میں دے کر اچھا نہیں کیا..... یہی تو ایک عورت کی دولت ہے جو آپ نے بھرے بازار میں لٹا دی۔'' وہ آنسو صاف کرتی ہوئی گاڑی میں جا بیٹھی اور پل بھر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

''زندگی میں جب بھی خوشی آئی ہے بے تحاشا ذلتوں کے ساتھ ہی اس کی تشریف آوری ہوئی۔ میرا بچہ آج کتنا خوش تھا۔ حسنات نے نہ جانے اسے کیا کہہ دیا کہ وہ اتنا اپ سیٹ ہو کر چلا گیا، اللہ خیر ہی کرے۔'' سائرہ خود کلامی کرتی ہوئی اندر آ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اب جانماز بچھا کر عادل کے لیے خشوع و خضوع سے دعائیں مانگنے لگی۔

☆☆☆

موبائل کی بیپ پر حسنات نے کتاب سے نظریں ہٹائیں اور موبائل کو آن کیا۔

''عصمت آپا نے رات کے ایک بجے مجھے کیسے یاد کر لیا؟'' وہ سوچتے ہوئے حیرت و تجسس سے بولے۔

''آپا خیریت تو ہے، آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....؟''

''میں ٹھیک ہوں..... کل تم سے ملنا چاہتی ہوں، بہت ضروری کام آ پڑا ہے۔'' ان کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

''کل ملنا تو مشکل ہے۔'' انہوں نے سرد مہری سے کہا۔

''پرائم منسٹر صاحب میں جانتی ہوں کہ آپ ایک بڑی انسان ہیں..... سو کروڑ کی آبادی کے کرتا دھرتا ہیں..... سر کھجانے کا ٹائم نہیں..... جناب والا میری عرض ہے، التجا ہے قبول فرمائیں..... آپ کے دربار میں حاضر ہونا چاہتی ہوں..... ایک گھنٹے کے لیے.....'' وہ طنز کے نشتر چلاتے ہوئے بولیں تو حسنات نے فوراً فون بند کر دیا۔

''کیا نان سینس ہے زندگی میں؟ چین سے کوئی سانس ہی نہیں لینے دیتا۔ سب جانتا ہوں، بیٹی کی پریشانی ہوگی..... اس معاملے میں میں کیا کر سکتا ہوں؟ ماں جانے اور بیٹا جانے..... پھر آپا جان جانیں اور آپ کی بیٹی..... یہ اولاد سراسر عذاب الٰہی نہیں تو اور کیا ہے؟ نیندیں اڑا دیتی ہے اور ہر پل اک نیا امتحان اور آزمائش..... نیا تجربہ اور نیا مشاہدہ.....'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے اور اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئے اور پانچ منٹ میں ہی اس بے پروا اور بے فکرے انسان کے خراٹے کمرے کی فضا میں منتشر ہونے لگے۔ سچ تھا کہ حسنات سائیکو تھے۔ پرانے نفسیاتی مریض تھے جن کا دماغی کیڑا ہر وقت دوسروں کو ناکوں چنے چبوا کر خود خوب قوی رہتا تھا۔ اپنی زندگی کے احاطے میں سوائے ماں کے کسی اور کی دخل اندازی کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ جب سے ماں چل بسی تھی..... زندگی اپنے ہی زندان خانے میں پُرسکون تھی۔ کبھی کسی کی قربت کی چاہ نہیں ہوئی تھی۔

علی الصباح عصمت آپا اسٹڈی میں آ دھمکیں..... کسی اجازت نامے کے بغیر..... حسنات ابھی تک سوئے

ہوئے تھے۔ وہیں بیٹھی ان کا انتظار کرنے لگیں۔ عادل اور سائرہ تیار ہو کر اپنی اپنی جاب پر سدھار گئے تھے انہوں نے نہ تو اسٹڈی میں جھانکا نہ ہی انہیں عصمت آپا کے آنے کا علم ہوا۔ نوکر بھی بتانا بھول گیا تھا۔ عصمت آپا بھی پریشانی اور فکر مندی کے عالم میں ایسی بے بس سی ہو کر کاؤچ پر لیٹی ہوئی تھیں جیسے سانس رک گئی ہو اور جسم ساکت و جامد ہو چکا ہو۔

''آپا آپ......؟'' تقریباً گیارہ بجے حسنات کی آنکھ کھلی...... غسل سے فارغ ہونے کے بعد وہ اسٹڈی میں آئے تو عصمت آپا کو دیکھ کر چونک گئے۔

''کیا اپنے میکے، گھر آنے کے لیے پہلے درخواست دوں پھر قبولیت کا انتظار کروں۔ کیا بارونق گھر تھا۔ تم نے اسے کیا بنا ڈالا؟'' وہ تلخی سے بولیں اور کاؤچ پر سے اٹھ کر آنکھیں ملنے لگیں جو شب بیداری کی چغلی کھا رہی تھیں۔

''آپا! ہوا کیا ہے جو اتنا قہر و جلال دکھایا جا رہا ہے۔'' وہ قدرے آہستگی سے بولے اور نوکر کو بیل دی تھوڑے توقف کے بعد وہ چائے لے کر اسٹڈی میں داخل ہوا تھا۔

''آپا جان کے لیے چائے لاؤ اور پھر ہم دونوں کے لیے ناشتا بھی تیار کرو۔'' وہ اپنائیت سے بولے۔

''اب فرمائیں کہ مسئلہ کیا ہے؟''

''تمہیں کھری کھری بات بتانے آئی ہوں کہ دردہ کا بہت اچھا رشتہ آ رہا ہے...... مگر تمہارے بیٹے نے اسے ایسا ورغلایا ہے کہ وہ مان کے نہیں دے رہی۔ ہماری لاکھ کوشش کے باوجود اس کے ذہن سے تمہارے بیٹے کا نشہ نہیں اتر رہا...... میرا تو بھتیجا ہے مجھے تو قطعاً اعتراض نہیں...... لیکن میں اپنے شوہر اور بیٹوں کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی...... مجھے مسئلے کا حل بتاؤ۔'' عصمت آپا فکر مندی سے بولیں۔

''سیدھی سی بات کہوں گا اگر دونوں بچے ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں تو بہت خوب ہے...... زیادہ لمبے چوڑے جھنجٹوں میں کیا پڑنا......؟ ہاتھ اٹھاؤ دعائے خیر پڑھتے ہیں اور جلد نکاح اور رخصتی سے فارغ ہوتے ہیں۔ ہمیں زمانے بھر کی رضامندی نہیں چاہیے۔ میاں، بیوی راضی برضا ہیں تو باقی لوگوں کے اعتراضات کی تُک نہیں بنتی۔'' وہ چائے کا سپ لے کر بے پروائی سے بولے۔

''حسنات بیٹی کے معاملات اتنے آسان اور سہل نہیں ہوتے کہ اپنوں کی شمولیت کے بغیر ہی زندگی کے فیصلے کر دیے جائیں۔ باپ بھائیوں کا اہم رول ہوتا ہے رشتہ طے کرنے میں...... افسوس تم کیا جانو کہ وضع دارانہ طریقے کیا ہوتے ہیں۔ اس دنیا کے ساتھ تمہارا تعلق و ربط ہوتا تو کچھ ضابطے اور قانون جان سکتے ناں۔'' وہ تنک کر بولیں۔

''مجھے تو منظور ہے، اس لیے مجھ سے مزید ڈسکس کرنے کی ضرورت ہی نہیں...... اب آپ اپنے شوہرِ نامدار اور باقی بچوں سے مشورہ کریں...... فیصلہ کرنے میں ان کی مدد کریں اور سائرہ کو انفارم کر دیجیے گا۔ آپ تو جانتی ہیں کہ سائرہ اس کی ماں ہی نہیں۔ باپ بھی ہے۔ دوست اور ہمدرد بھی وہی ہے۔'' وہ طنزیہ لہجہ میں بولے۔

''جس گھر کا مرد عورت بننے میں فخر محسوس کرے اس گھر کا یہی حال ہوتا ہے جو تمہارے گھر کا ہے۔ نہ جانے میری لاڈلی کو اس گھر میں نظر کیا آیا ہے؟ جہاں ایک لمحہ گزارنا محال ہو، ماں کی تیمارداری کرنے آئی تھی۔ اسے ہمیشہ کے لیے ہتھیا لیا تمہارے بیٹے نے۔'' وہ زار و قطار رونے لگیں۔

''آپا رونے کی وجہ تو بتائیں، میں سمجھا نہیں۔'' وہ حیرت سے بولے۔ ''ایک طرف عادل آپ کو پسند ہے، دوسری طرف دردہ کو کوس رہی ہیں۔ تیسری طرف سائرہ کو بھی قصوروار ٹھہرا رہی ہیں اور میں تو ہوں ہی

سسر کا بھرم..... جس کی مجھے نہ تو پروا ہے نہ ہی کوئی پریشانی..... آپ نتے یہ بتائیں کہ آپ چاہتی کیا ہیں؟ یہ گھوم گھماں میں نہیں جاسکا۔''

''دیکھو تم فیصلہ کرو..... میں وردہ کی رخصتی کر دوں گی، تمہیں اور کیا چاہیے نہ تو بارات کی مشکل نہ ہی ولیمے کی اذیت..... تمہارے قیمتی وقت میں سے ایک گھنٹا دو زندگیوں کو یکجا کرنے کے لیے کافی ہے۔'' وہ پھر طنزیہ لہجے میں بولیں۔

''آپا بہتر ہے آپ سائرہ سے بات کریں۔ میرا خیال ہے ہم ایک دوسرے کی بات سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔

''اسے ہی تو کہتے ہیں لیک آف کمیونیکیشن..... تم سچ کہتے ہو، سائرہ سے ہی بات کروں گی جو زمانے کے نشیب و فراز، گرم سرد کا مزہ چکھ رہی ہے ابھی تک۔ اس کا مشورہ سو فیصدی درست ہوگا..... باقی وردہ کے باپ اور بھائیوں کو منانا میرا کام ہے..... میری پہلی کوشش تو یہی ہوگی کہ وردہ پھر سے سوچ سمجھ لے۔ تمہارا گھر وردہ کے قابل نہیں، تم ہنستی کھیلتی سائرہ کو بیاہ کر لائے تھے پر بہت جلد اس سے الرجک ہو گئے تھے پھر بچے سے..... بے پناہ نفرت، مجھے یہی تو خدشہ اور ڈر کھائے جا رہا ہے کہ تم کل وردہ کی ہنسی، زندہ دلی اور خوش مزاجی سے چڑنے لگو گے اور اپنے پوتے، پوتیوں سے نفرت و حقارت کرنے سے باز نہیں آؤ گے۔'' وہ فکرمندی سے بولیں۔

''میں نے اس کا حل سوچ رکھا ہے کیونکہ میں سمجھ گیا ہوں کہ میرا بیٹا جوان ہو گیا ہے۔'' وہ چڑ کر بولے۔

''وردہ اور عادل انیکسی میں شفٹ ہو جائیں گے تاکہ وہ لوگ میرے سلوک و رویے پر کوئی اعتراض نہ کر سکیں۔''

''تین کمروں کی چھوٹی سی انیکسی میں رہے گی میری وردہ.....؟ ناممکن ہے حسنات..... وہ محل میں رہتی ہے، اتنی بے قدری میں وہ ایک پل یہاں نہیں رہ سکے گی۔ وہ سائرہ نہیں..... اچھی خاصی بولڈ... لڑکی ہے... وہ...'' وہ تڑپ کر بے اختیار ہو کر بولیں۔ ''میں سائرہ سے ہی بات کروں گی۔ جسے میری زبان سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔'' وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ حسنات نے انہیں نہ تو روکا، نہ ہی ناشتا کرنے کی آفر کی..... وہ دکھے دل اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ باہر نکل گئیں۔

''اُف میری پگلی کو اس ماحول میں کیا نظر آیا ہے؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئیں۔ راستے بھر وردہ کی آواز ان کے کانوں میں زہر گھولتی رہی..... ''مام مجھے عادل بہت اچھے لگتے ہیں، آئی لو ہم..... میں شادی بھی ان سے ہی کروں گی..... مام وہ بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، سچی اور کھری محبت کرنے والے لوگوں کی کمی ہے، میں تو بہت لکی ہوں گی جسے عادل جیسا پُرخلوص اور الفتیں نچھاور کرنے والا ساتھی مل جائے اور مجھے مامی سے بھی والہانہ لگاؤ ہے..... میں نے ایسی عورت آج تک نہیں دیکھی۔ سچ پوچھیں وہ تو میری آئیڈیل ہیں۔''

''باؤلی کہیں کی..... مامی کی تعریفوں میں زمین، آسمان ایک کر دیتی ہے جیسے شادی عادل سے نہیں اس کی ماں سے کرنی ہے۔ عقل ہی ماری گئی ہے، شاید یہ قصور اس منہ زور جوانی کا ہے کہ شعور پر پردے پڑ گئے ہیں آنکھوں پر صرف محبت کی پٹی بندھ گئی ہے اور دل پر عشق و دیوانگی کی مہر ثبت ہو گئی ہے، وردہ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی، بے شک مجھے سائرہ اور عادل پر بے تحاشا ترس و رحم کے ساتھ پیار بھی آتا ہے لیکن میں نے تو تمہیں ان کے آنگن کی زینت بننے کا خواب ہی نہیں دکھایا تھا۔''

☆☆☆

''میرا خیال ہے عادل کہ اب تم سے فائنل اپروول لینے کا وقت آگیا ہے۔ آج تک تم سے کبھی تمہاری شادی کے بارے میں بات نہیں کی۔'' سائرہ نے کتاب بند کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دی اور بیٹے کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول لے کر ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے کہا تو عادل نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔

''کیا اس کتاب میں میرے بارے میں کچھ لکھا ہے جو ایک دم سے بم بلاسٹ کرنے کی نوبت آگئی۔'' وہ سائرہ کی طرف پیار سے دیکھ کر بولا۔

''کتاب میں نہیں، میرے دل پر یہ خواہش کندہ ہو چکی ہے، شاید میری زندگی کی یہ آخری ہی تمنا ہو تمہارے سر پر سہرا سجانے کی۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سنجیدگی سے بولی۔

''آپ کی ہر خواہش بے دم اور بے بس کر دیتی ہے، اب آپ نے یہ سوچ لیا ہے تو لگتا ہے کہ کچھ نہ کچھ فیصلہ کر ہی چھوڑیں گی۔ مجھ سے مشورہ کیوں لینا چاہتی ہیں جبکہ..... میرے دل و دماغ، روح و جسم کی مالک آپ ہیں، آج تک میں نے خود سے نہ تو کوئی فیصلہ کیا ہے، نہ ہی مستقبل میں ایسا ارادہ ہے، ابھی کون سا فیصلہ سنانے کی ٹھان لی ہے ہ؟'' وہ خوشگوار لہجے میں بولے جا رہا تھا۔

''تمہاری پھپو عصمت میرے پاس آئی تھیں۔ یہ مشورہ دینے کہ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔'' وہ بھی شگفتہ لہجے میں بولی۔

''وہ تو ضرور ہوگی اور بہت جلد ہوگی۔ میں ڈیڈی کی طرح تنہا زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اپنا ایک پارٹنر ہونا چاہیے آپ کے علاوہ بھی..... کیوں ممی غلط تو نہیں کہہ دیا ناں.....'' وہ خوشدلی سے بولا۔

''میرا ساتھ تو عارضی اور وقتی ہے جان..... اس لائف پارٹنر کی تو بہر حال ضرورت ہوتی ہے اور میرا ساتھ نہ جانے کب ٹوٹ جائے، میں اپنی زندگی میں ہی تمہارے لیے ایسی شریکِ حیات لانا چاہتی ہوں جو تمہاری لک آفٹر مجھ سے بھی ہزار درجہ بہتر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔'' وہ سنجیدہ ہوگئی۔

''وہ تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔'' وہ مسکرایا۔

''مجھے نادان اور احمق مت سمجھو..... دو آنکھیں اور دو کان دیکھنے اور سننے میں ابھی تک خوب شارپ ہیں۔ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کرو۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''کیا دیکھا کیا سنا کیا چھپایا؟ ممی میں کچھ نہیں جانتا آپ ہی میری معلومات میں اضافہ کر سکتی ہیں۔ جلدی بولیں، تجسس ہو گیا ہے۔'' وہ حیرت و اشتیاق سے بولا۔

''کیسے معصوم بن رہے ہو؟ بہت چالاکیاں سیکھ لی ہیں میرے بچے نے۔'' وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔ ''مت بتاؤ، میں بھی سرپرائز دینے والی ہوں۔ چور میں نے پکڑ لیا ہے، بس ہتھکڑی لگانا باقی ہے۔''

''ممی..... کون سا چور اور کیسی ہتھکڑی..... میں نہیں سمجھا'' وہ حیران کن نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اور کون سا سرپرائز.....؟ ممی میں سچ مچ فکر مند ہو گیا ہوں۔''

''بھئی یہ جو عشق اور مشک ہوتا ہے ناں..... لاکھ چھپاؤ نہیں چھپتا..... تم خاموش ہو..... مگر خاموشی کی اپنی ہی زبان ہے، راز اگلنے سے باز نہیں آتی اور دوسری طرف خاموشی نہیں اعتراف و اقرار ہے تو اس سے ظاہر ہوا کہ محبت، عشق و دیوانگی میں چاہے جذبات کا اظہار ہو یا نہ ہو..... شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آ جاتے ہیں اور اس کی حدت و تپش تمہاری ممی سائرہ بانو تک پہنچ چکی ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ممی! یہ آپ بے تکی اور بے معنی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟'' وہ حیرت سے بولا۔

تقریبات میں فضول خرچی ہماری پہچان بن چکی ہے
اس کا خاتمہ کیسے ہو؟

شادی لڑکے کی ہو یا لڑکی کی والدین کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں ہوتی۔ ایک طرف آج کل کے دور میں شدید مہنگائی کے باوجود لڑکی کو جہیز دینے کے لیے ناک اونچی رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے تو دوسری طرف تقریبات میں پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ نمود و نمائش نے مقابلے کا رجحان پیدا کر دیا ہے۔ خاندان کے ایک بچے کی شادی میں کوئی کمی رہ جائے تو اسے دوسرے بچے کی شادی میں پورا کرنے کے ہزار جتن کیے جاتے ہیں۔ مہندی یا شادی کی تقریب میں لاکھوں روپے پھولوں کی سجاوٹ صرف احباب اور رشتے داروں کو متاثر کرنے اور دکھاوے کے لیے کی جاتی ہے۔ غیر ملکی بھی پاکستانیوں کی شادی اور سج دھج دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ شاید پاکستانی حکومت غریب ہے لیکن عوام کے پاس پیسہ بہت ہے۔ بڑی، بڑی اور قیمتی گاڑیاں، دولہا، دلہن کے بیش قیمت ملبوسات اور دلہن کے بھاری

''اچھا تو مجھے بتاؤ کہ تمہیں کسی لڑکی سے عشق ہو گیا ہے ناں؟'' وہ مسکرانے لگی تھی۔

''اگلا سوال کریں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''عشق اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اب اس کے بغیر ایک پل گزارنا مشکل لگتا ہے، ایسا ہی ہے ناں......؟'' وہ سوالیہ انداز میں بولی۔

''اگلا سوال......'' وہ آنکھیں کھول کر بولا۔

''آخر کار تم نے چپکے سے شادی کا پروگرام بنا لیا ہے، اس سے پہلے کہ ہمارے لیے انویٹیشن کارڈ خبر رساں ثابت ہو...... ذرا شادی کی ڈیٹ راز داری میں بتا تو دو...... پھر میں جانوں اور میرا کام جانے۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ پر وہ ابھی تک حیرانی سے اسے تکتا جا رہا تھا...... چند لمحوں بعد وہ ماں کی بات سمجھ لینے پر آمادہ ہوا۔

''ممی! پہلی بات تو یہ ہے کہ زندگی کا اتنا اہم اور اتنا بڑا فیصلہ کرنے کا مجھے اختیار ہے نہ ہی اتنی ہمت و جرأت ہے مجھ میں...... فی الحال ایک لڑکی آنکھوں کو بھا گئی ہے۔ شاید دل پر میرا اختیار نہیں رہا۔ مجھ میں یہ تبدیلی نہ جانے کب اور کیسے رونما ہوئی کہ آپ سے مشورہ ہی نہیں لیا۔ میرا خیال ہے کہ باقی کے تمام فیصلوں پر آپ کو...... اختیارات حاصل ہیں۔'' وہ کچھ کھویا ہوا کچھ متذبذب سی کیفیت میں بولا۔

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' سائرہ نے اس کے شانے پر بوسہ دیا اور ٹی وی آف کر کے پُرسکون ہو کر بیڈ پر لیٹ گئی اور آنکھیں موند کر سونے کی کوششیں کرنے لگی۔

''ممی ویک اینڈ سو کر گزارنا کہاں کا انصاف ہے؟ ماں بیٹا مووی کیوں نہ دیکھیں؟'' وہ بالکل چھوٹے معصوم بچے کی طرح اس کی آنکھیں اپنی انگلیوں کی پوروں سے کھولنے کی کوشش کرنے لگا تو سائرہ اس کی اس حرکت پر ہنسنے لگی۔ وہ بچپن میں سائرہ کو سوتا دیکھ کر اسی طرح جگانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

''تم بڑے کب ہو گئے؟ ذرا وقت ملاحظہ فرماؤ، اس وقت مزدوروں کے سونے کا وقت ہے، پانچ دن کی مشقت کے بعد دو دن خوب آرام کرنے کے لیے ملتے ہیں تاکہ اگلے پانچ دن خوب چکی کے دو پاٹوں میں پس کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ تم تو ہو جوان اور تمہاری اماں ہو گئی ہے بوڑھی...... جو تم سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے تو

بھرکم زیورات دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کیونکہ ایسی فضول خرچی تو امریکا جیسے ملک میں بھی نہیں ہوتی۔ وہاں شادی کی تقریب کے لیے ایک دن مختص ہوتا ہے لیکن پاکستان میں ہفتوں سلسلہ جاری رہتا ہے۔ شروع ہو جائے تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ یہاں تو کپڑے کم پڑ جاتے ہیں، کوئی نہ کوئی تقریب رہ جاتی ہے۔ جس میں نیا جوڑا زیب تن نہیں کیا جاتا۔ یہ سب سوائے فضول خرچی کے کچھ نہیں۔ فیشن ڈیزائنرز دولھا، دلہن کے مہندی، بارات اور ولیمے کے ملبوسات تیار کر کے لاکھوں کا منافع کماتے ہیں۔ حالانکہ اگر سادگی کو فروغ دیا جائے تو یہی پیسہ بچا کر کسی غریب کی بیٹی کے ہاتھ پیلے کیے جا سکتے ہیں۔ چند گھنٹوں کے لیے پہنا جانے والا بھاری بھرکم عروسی لباس، مہنگا فرنیچر، زیورات و دیگر تحائف وغیرہ دراصل دوسروں پر دولت کا رعب ڈالنے کے مترادف ہے۔ شادی سادگی سے کرنا سنتِ رسول ﷺ ہے۔ ایک دوسرے کو متاثر کرنے کی دوڑ میں پیسے کا زیاں کیا جا رہا ہے جو کسی طور پر درست نہیں ہے ان رسومات کو سب ہی فضول کہتے ہیں مگر پہل کون کرے گا۔ کون اس کا خاتمہ کرے گا؟

مرسلہ: نغمانہ گل، کراچی

چاہتی ہوں کہ تمہارے مدِمقابل جوان ساتھی کا ہونا بہت ضروری ہے۔'' سائرہ نے ملائمت بھرے لہجے میں کہا اور ٹیبل لیمپ کی لائٹ آف کر دی۔ عادل نے بھی ایک لمبی سانس اندر کھینچی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

☆☆☆

''سائرہ تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں...... مائنڈ مت کرنا۔ تمہاری زندگی کا ایک، ایک لمحہ میرے سامنے ہے پھر اس گھر کا ماحول...... توبہ استغفار...... میں تو پانچ منٹ کے لیے یہاں قیام نہیں کر سکتی...... وردہ کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بس یہی کہہ سکتی ہوں میں۔'' عصمت آپا نے افسردگی سے کہا۔

''جہاں ماں اتنی پوزیسو ہو...... وہاں بہو کا گزارہ بہت مشکل ہے۔'' یہ جملہ عصمت آپا نے صرف دل ہی دل میں کہا۔

''بچے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں...... حسنات کو بھی اعتراض نہیں...... پھر آپ فیصلہ کرتے ہوئے ڈبل مائنڈڈ کیوں ہو رہی ہیں۔ بسم اللہ کریں...... وردہ کے آنے سے اس گھر کا ماحول بھی بدل جائے گا اور میں بھی اپنے آخری فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گی۔ ویسے بھی آپا، اب مجھ میں بھی عادل کے چاؤ چونچلے کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں آرام کروں...... اپنی مرضی سے عبادت کروں...... دو چھٹیاں گھر پر گزاروں...... لیکن عادل مجھ سے پہلے جیسا لاڈ پیار اور توجہ چاہتا ہے، مجھے وردہ اپنے ہی مزاج و طبیعت کی لگی ہے، عادل کو خوب خوش رکھے گی اور خود بھی یہاں راج کرے گی۔'' سائرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''عصمت آپا مجھے ایسی ہی بہو چاہیے۔''

''بھئی دیکھو...... عادل بیٹا تو حسنات کا ہی ہے ناں...... اگر شادی کا شوق چند دنوں میں رخصت ہو گیا تو اس کا انجام تو تم جانتی ہو...... وردہ مزاجاً اور طبعاً تم جیسی ہرگز نہیں کہ صبر و شکر پر اکتفا کر لے گی۔ تم نے اس جہنم میں گزارہ کر لیا ہے، آج کل کی لڑکیوں کے اطوار و خیالات اور خواہشات کا معیار بدل چکا ہے۔'' عصمت آپا نے بھی سنجیدگی سے کہا۔

''جب مجھے حسنات کے لیے حاصل کرنے کی چاہ تھی تو اس وقت ان کی ہر خامی اور برائی کو پردہ داری

میں رکھا گیا اور غلط بیانی سے کام لے کر مجھے عمر بھر کے لیے نذر رسید کر دیا۔ آج اپنی بیٹی کا فیصلہ کرتے ہوئے کس قدر پریشانی اور فکرمندی ہو رہی ہے کہ فیصلہ کرنا دوبھر ہو گیا ہے۔'' سائرہ سر جھکائے سوچے جا رہی تھی۔

''سائرہ کس گمبھیر سوچ میں پڑ گئی ہو...... میں نے غلط تو کچھ نہیں کہا، عادل کی کچھ حرکتیں، باتیں اور ادائیں مجھے پریشان کر دیتی ہیں یہی دیکھ لو کہ اٹھائیس سال کا ہو گیا ہے۔ ابھی تک تمہاری بغل میں منہ چھپا کر سوتا ہے۔ یہ صحت مندرویہ نہیں ہے۔ جبکہ حسنات ماں کے کمرے میں بھی جھانک کر نہ دیکھتا تھا پھر بھی اس کی حالت دیکھو اور ازدواجی زندگی کو پرکھو۔ عادل نے مجھے بہت سے خدشات اور خوف ہیں۔'' عصمت آپا نے کافی حقیقت پسندی سے کہا۔

''عصمت آپا...... کچھ کام اور فیصلے اللہ تعالیٰ پر بھی تو چھوڑے جا سکتے ہیں۔ ہم ناچیز اور حقیر ہونے کے ناتے بچوں کی زندگیوں کے فیصلے کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس لیے زیادہ مین میخ نکالنے کا کیا فائدہ......؟ جبکہ بچوں کا فیصلہ حتمی و آخری ہے۔ اب اگلا قدم ہم دونوں بہنوں نے مل کر اٹھانا ہے۔ آپ اپنا دل مطمئن رکھیں گی تو آپ کے گھر کا ہر فرد اس رشتے پر رضامند ہو جائے گا۔'' سائرہ نے انہیں تسلی و تشفی دیتے ہوئے کہا۔

''عادل پر نہیں اس پالنہار پر بھروسا کریں۔ آپ کا دل پُرسکون ہو جائے گا اور فیصلہ کرنا محال نہیں لگے گا۔ عصمت آپا اگر میں اس ذات کا سہارا نہ لیتی تو سہاگن ہونے کے باوجود......'' سائرہ نے بات نامکمل ہی چھوڑ دی۔ خود کو بیوہ کہنا بھی تو گوارہ نہ تھا۔

''تم درست کہہ رہی ہو، سائرہ بے شک ہر بیٹی کی خوشیوں کا فیصلہ کرتے ہوئے میری راتوں کی نیندیں اور دن کا سکون غارت ہو جایا کرتا تھا مگر وردہ کے لیے میری فکرمندی کا لیول کچھ زیادہ ہی ہائی ہے۔ حالانکہ میں عادل کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ جیسا بھی ہے، اچھا ہے یا برا...... آئینے کی طرح شفاف ہے۔ کوئی ہیر پھیر نہیں اس میں۔ اسے وردہ سے بے پناہ محبت ہو گئی ہے۔ اس کا بھی یقین ہے مجھے۔ تم دل و جان سے وردہ پر فدا ہو۔ مکمل بھروسا ہے، بس ڈر ہے تو حسنات کے عجیب و غریب اور ناقابلِ برداشت جینز کا ظاہر ہے باپ کا اثر تو آئے گا ناں اس میں۔'' عصمت آپا ہر گفتگو کے بعد اسی خدشے کا اظہار کر کے انکار کرتی رہی تھیں اور جب وردہ کو اپنی جگہ سے انچ بھر نہ ہلا سکیں تو پھر سائرہ سے حتمی بات چیت کی ٹھانی...... آج کی گفتگو کا آخری جملہ سن کر سائرہ ان کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''عصمت آپا...... بچے ہرٹ ہو جائیں گے۔ سوچ لیجیے۔ میں عادل کو تو سمجھا ہی دوں گی کیونکہ عادل میری بات غور سے سنتا ہے اور پھر وہی کرتا ہے جیسا میں چاہتی ہوں۔ آپ وردہ کی فکر نہ کریں جو لاتعداد خوبیوں کے ہمراہ ایک اور بہت بڑی خوبی بھی رکھتی ہے...... جو وہ ایک بار سوچ لے تو وہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ اس کی اپنی سوچ ہے، اپنی پسند اور اپنی ہی مرضی کے مطابق اس کی زندگی ہے حالانکہ ایسی لڑکی اس زمانے کے ساتھ چلنے کی تمام صلاحیتیں تو رکھتی ہے مگر شوہر کے ساتھ کبھی ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی۔ عادل باپ کی نفرت انگیزی میں پروان چڑھا ہے، معمولی سی بات پر لرز جانا اس کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ وردہ کی ہاں میں ہاں ملانا اس کے لیے مشکل نہیں ہے، ضد، غصہ اور انا بہت ہے اس میں...... مگر کبھی کبھار اس کے غلبے میں دیکھا گیا ہے، عموماً خود پر کنٹرول رکھنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے تو اس کے ایکشنز میں احتجاج ہے۔ میں ماں ہوں وجہ سمجھ سکتی ہوں۔ باقی دنیا کے لیے تو اس کی حرکتیں مضحکہ خیز ہوں گی ناں......'' سائرہ نے بہ مشکل اپنے آنسو روک کر مستحکم لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے آج کے بعد اس موضوع پر بات نہیں ہو گی۔ یہ چیپٹر کلوز ہو گیا عصمت آپا!''

''سائرہ میں نے انکار تو نہیں کیا...... تم میرے خوف اور وسوسوں کو جانتی ہو۔ سمجھدار ہو۔ اچھا چلو اٹھو حسنات سے پرمیشن لیتے ہیں اور ان بچوں کی خوشی میں سب ساتھ شرکت کرتے ہیں۔'' عصمت آپا کے دل کو سائرہ کی باتیں بھا گئی تھیں ان کے دل نے ان تمام باتوں کی تائید کی اور جب دیکھا کہ رشتہ ہاتھ سے نکلنے لگا ہے تو نہایت لگاوٹ سے بولی تھیں۔

''عادل کی خوشی ان کے لیے اہم نہیں...... وہ وردہ کی محبت کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے یہ رشتہ جوڑنے کا حتمی فیصلہ سنا چکے ہیں۔ جو ٹلنے والا نہیں۔ اب آپ انہیں اپنا فیصلہ سنا دیجیے۔ اگلا پروگرام بھی انہی سے پوچھ لیجیے گا کہ شادی کب، کیسے اور کہاں ہونی چاہیے۔ گھر کے مرد اور حاکم وہ ہیں جیسے کہیں گے ویسا ہی کرلوں گی۔ باقی سب کچھ غیر ضروری ہے۔ بس دل کی خوشی ہی اصل خوشی ہے۔''

''وہ تو کہے گا...... بیٹی کو ادھر ہی مع مولوی کے لے آؤ۔ نکاح پڑھوا دیتے ہیں اور معاملہ ہوا ختم...... سب اپنے اپنے گھر جائیں کیونکہ اس کے پاس وقت کی جو کمی ہے۔'' عصمت آپا نے تمسخرانہ انداز میں کہا تو سائرہ کو دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ مگر لب مسکرائے نہیں کیونکہ وہ مذاق نہیں سچ کہہ رہی تھیں۔ کچھ انہی خیالات سے ملتے جلتے الفاظ وہ ان کے منہ سے سن چکی تھی۔ عصمت آپا اس کی کیفیات سے نابلد ہنس رہی تھیں۔ جیسے انہوں نے بہت چٹ پٹا لطیفہ سنا دیا ہو۔

☆☆☆

''بیٹا! آج تم ایسے کرو کہ وردہ کو ڈنر کے لیے جاؤ۔ اب تم اس کے ساتھ چھٹی گزارنے کے پروگرام بھی بنایا کرو۔'' سائرہ نے عادل کے لیے وارڈ روب سے کپڑے نکالتے ہوئے کہا تو عادل نے ماں کی طرف متجسس ہو کر دیکھا۔

''میں قطعاً مائنڈ نہیں کروں گی۔ اب تم پر اس کے بے حساب حقوق کی شروعات ہو چکی ہے۔ ایک تو تم مجھے نادان اور بے خبر دوست سمجھتے ہو۔ بھئی میں تمہارے دل کی بات پکڑنے والی بہت چاق و چوبند شکاری ہوں۔ یہ تو مانتے ہو ناں......'' وہ مسرت آگین لہجے میں بولی۔

''ممی میں کچھ نہیں سمجھا...... ذومعنی باتیں میرے سر سے گزر جاتی ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے ان معاملوں میں کافی ڈفر واقع ہوا ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''تمہیں وردہ نے کچھ نہیں بتایا؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''اسے جب بھی فون کرتا ہوں ہوں نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے کہ آپ جناب یس سر، ایگریڈ، رائٹ کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں کرتی اور آپ نے بھی نوٹ کیا ہوگا کہ اس نے آپ کے پاس آنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ میں دس بار اسے یہاں آنے کی دعوت دے چکا ہوں۔ ہر بار نخرے، بہانے اور انکار...... نہ جانے اس کا دماغ خراب کیوں ہو گیا ہے؟ اچھی بھلی میرے ساتھ دوستی تھی۔'' وہ حیران کن لہجے میں بولا تھا۔

''بیٹا بات یہ ہے کہ خاندانی لوگ اپنی روایات کے دم قدم چلتے ہیں۔ چاہے زمانہ کتنا ہی ایڈوانس و ماڈرن کیوں نہ ہو جائے۔ جب سے رشتے کی ہاں ہوئی ہے اس کے رویے اور لب و لہجے کی تبدیلی فطری ہے۔ اس لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اس تھوڑے سے وقت کو انجوائے کرو...... اور اسے بھی مووی پر پھر ڈنر پر لے جاؤ...... کم از کم میں تو بہت خوش ہو جاؤں گی۔ واپس آؤ گے تو ماں کو میٹھی اور پُرسکون نیند میں پاؤ گے۔'' وہ اسے گلے لگا کر بولی۔ ''آج کپڑے بھی وردہ کی پسند کے پہنو، جو وہ تمہاری برتھ ڈے پر لائی تھی۔ تمہیں پہنا ہوا

دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔'' سائرہ اپنی ہی لے میں بولے جا رہی تھی۔

''اب سمجھا کہ معاملہ کیا ہے؟ ممی اٹ از امپاسبل...... آپ نے کیسے سوچ لیا کہ وردہ مجھے پسند ہے اور میرا مشورہ لیے بغیر آپ نے فیصلہ کیسے کرلیا؟ بے شک میری زندگی کا ہر فیصلہ آپ نے مجھ سے مشورہ لیے بغیر ہی کیا ہے۔ مجھے کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ کبھی انکار کرنے کی گستاخی نہیں کی...... لیکن ویری سوری...... آپ کے اس فیصلے پر مجھے اعتراض ہی نہیں بلکہ انکار بھی ہے۔'' وہ تلملا کر بولا اور ماں سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم تو اسے بے حد پسند کرتے تھے۔ تمہاری ہر بات اور ہر حرکت سے پسندیدگی جھلکتی تھی۔'' وہ چونک کر نہایت حیرت سے بولی۔

''کیا پسندیدگی کا صرف ایک ہی مطلب ہے۔ کیا پیار، محبت کا فقط ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔ ممی دوستی کے اس مضبوط اور تناور درخت کی بے شمار شاخیں ہیں۔ ہر شاخ کی قسم، نسل اور صورت مختلف ہے انہی شاخوں میں سے ایک نیا دوستانہ شاخ کا سرا میرے ہاتھ میں ہے۔ جسے آپ نے رنگ ہی غلط دے ڈالا۔ ممی خود ساختہ اختراع کا میرے پاس کوئی علاج نہیں...... کیونکہ میرا کوئی قصور نہیں۔'' وہ سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''یعنی تم نے اس معصوم کے ساتھ فلرٹ کیا ہے۔ تم اتنا گر جاؤ گے میں نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔'' سائرہ چکرا سی گئی۔ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

''فلرٹ...... دھوکا، فریب، اور دغا بازی میں کروں گا وردہ سے؟ جو میری ایسی دوست ہے، جس کا کوئی بدل ہو ہی نہیں سکتا۔'' وہ بھی اضطراری کیفیت میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''مخالف جنس سے اس حد تک دوستی کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلاتی ہے۔ چاہے وہ خوشبو سے عاری جنگلی گلاب ہی کیوں نہ ہو اور اس حد تک مانوسیت، اپنائیت اور لگاوٹ اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے۔ چاہے وہ رنگ کالا سیاہ اور بھیانک ہی کیوں نہ ہو۔'' وہ سر کو ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولی تو عادل اپنی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے چہرے کے کتنے ہی زاویے بنانے لگا جو اس کی اندرونی مضطرب و بے قرار کیفیت کی غمازی کرنے کے لیے کافی تھے۔ ایک کے بعد دوسرا شاک...... ''میرے مالک مجھ سے انجانے میں لاشعوری طور پر کوئی گناہ ضرور سرزد ہوا ہے۔ جس کی پاداش میں میری زندگی کا ہر لمحہ اِک کٹھن آزمائش بن گیا ہے۔'' وہ خود کلامی کرنے لگی اور آنسو گالوں پر پھسلنے لگے۔

''آئی ایم سوری ممی...... !'' وہ ماں کے گھٹنوں پر سر رکھ کر چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

کافی دیر تک دونوں روتے رہے۔ جیسے سوائے رونے کے کوئی اور کام نہ ہو۔ نڈھال ہو کر دونوں وہاں سے اٹھے اور کھانا کھائے بغیر ہی بیڈ پر آ کر لیٹ گئے...... دونوں نے خاموشی سے اپنی، اپنی سائیڈ کے ٹیبل لیمپ آف کیے اور بظاہر دونوں سونے کی کوشش کرنے لگے۔

نیند تو جانے کہاں روٹھ کر چلی گئی تھی۔ ان گنت سوچیں، بے حساب خدشے اور بے شمار وسوسے سائرہ کو ہلکان کر رہے تھے۔ عادل اگر مضطرب تھا تو ماں کی پریشانی اور اس کے زار و قطار رونے پر...... وہ اپنے آپ کو بے بس تصور کر رہا تھا کہ وہ اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا...... معاملہ دل کا تھا...... اور آج دل نے پہلی بار ماں کے فیصلے کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ وہ خود حیران تھا کہ آج اس کے نرم و نازک دل میں اتنی مضبوطی اور سختی کیسے آگئی۔

☆☆☆

''ممی پلیز اس بات پر ناراض نہ ہوں۔ وردہ کو اپنی زندگی کا ساتھی مان لینا میرے اختیار میں نہیں۔ میری

آپ سے التجا ہے، میری پسند پر میرا حق ہونا چاہیے۔ میں نے ایک بار مینشن بھی کیا تھا کہ مجھے ایک لڑکی پسند آگئی ہے۔ لیکن آپ نے غلط سمجھ لیا کہ میں وردہ کے بارے میں انکشاف کر رہا ہوں۔'' عادل نے اگلی صبح ماں سے تفصیلاً بات کی۔

''بیٹا...... جو کمزور انسان ہوتے ہیں ناں وہ اپنے اختیارات سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور اپنے نفس کے مطیع ہو کر زندگی کو بے سکون اور ناکام بنا ڈالتے ہیں۔ میں نے تمہاری تربیت میں لچک، نرمی اور عاجزی کے ساتھ، ساتھ قوت اور ہمت اور حوصلے کی بھی آمیزش کی تھی۔ تم بہت دور اندیش انسان ہو۔ آگے کی سوچو کہ تمہارے انکار کے اثرات ہم دونوں پر کیا ہوں گے؟ ڈیڈی کی ضد اور ہٹ دھرمی سے تم بخوبی واقف ہو۔ ان گنت مثالیں تمہارے سامنے موجود ہیں۔ دوسرے وردہ تم سے بے پناہ محبت کرتی ہے اگر تمہاری شکل صورت اور مردانہ وجاہت سے امپریس ہو کر پیار کرتی تو وہ اس جذبے کی کب کا شکار ہو چکی ہوتی کیونکہ وقتاً فوقتاً تم دونوں کا آمنا سامنا تو ہو ہی جایا کرتا تھا۔ تم اس کی عقلمندی کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس نے تمہارے ظاہر کو اہمیت نہیں دی بلکہ تمہیں باطن کی نظر سے اس نے دیکھا اور پرکھا...... وہ تمہاری شیدائی ہے عادل...... وہ تم سے بے پناہ پیار کرتی ہے اگر تم نے انکار کر دیا تو وہ بدل جائے گی۔ ہنسنا، کھلکھلانا بھول جائے گی۔'' سائرہ خوشامدی لہجے میں بولی۔

''ممی...... ! آپ کی خوشی کی خاطر قربانی دینے میں مجھے کوئی عار نہیں لیکن یہ یاد رکھیے گا کہ آپ کا بیٹا زندگی بھر اس کے ساتھ خوش نہیں رہے گا کیونکہ میں نے اسے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں۔'' عادل نے سر جھکا کر مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''تم اتنے ضدی تو کبھی نہیں تھے۔ آج تو تم میں باپ جیسی ضد اور ہٹ دھرمی عود کر آئی ہے۔ جس کا میں ابھی تک خمیازہ بھگت رہی ہوں۔ اب رہی سہی کسر تم نکال لو، یہی ہے میرا نصیب...... کسی کا کوئی قصور نہیں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''یہی وجہ ہے ممی کہ میں وردہ سے مجبوراً آپ کی خواہش کو مدِنظر رکھ کر شادی نہیں کرنا چاہتا...... میری مرضی شاملِ حال ہونی ضروری ہے۔ ورنہ انجام آپ کے سامنے ہے۔ کیا آپ تاریخ کو پھر سے دُہرائے جانے پر رضامند ہیں؟'' وہ ماں کے ساتھ ہمیشہ نرم لہجے میں بات کیا کرتا تھا۔ آج بھی ملائمت اور نرماہٹ سے اسی مؤدبانہ لہجے میں بول رہا تھا۔

''بیٹے میں یہ بھی نہیں چاہتی...... لیکن وردہ کو بھی ہرٹ نہیں کرنا چاہتی۔ عصمت آپا نے ہمیشہ ہر مشکل میں میرا ساتھ دیا۔ انہیں دوسروں کے سامنے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی کیونکہ اس انکار کا ملبہ مجھ پر ڈال دیا جائے گا۔ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گی۔ بلکہ پوری سسرال ہی مجھ سے منہ پھیر لے گی اور حسنات کا کیا...... ری ایکشن ہوگا۔ میں یہ سوچ کر کانپ جاتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں خوف دوڑ عود کر آیا تھا۔

''ڈیڈی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے...... جتنے ظلم انہوں نے مجھ پر ڈھا دیے ہیں۔ اب اس سے بڑھ کر اور کون سا ظلم کریں گے۔ ایسی کون سی سزا سنا دیں گے کہ آپ خوف سے لرز اٹھی ہیں۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں ماں کو تسلی دے رہا تھا۔ ''ممی! جب بچے جوان ہو جاتے ہیں تو بزدل سے بزدل ماں بھی دلیر بن جاتی ہے۔ بکری سے شیر بننے میں دیر نہیں لگاتی۔ میں آپ کا دوست، ساتھی اور ہمدرد ضرور ہوں مگر افسوس کہ آپ کا محافظ اور مضبوط سہارا نہ بن سکا۔ مجھے آج یہ حقیقت معلوم ہوئی ہے۔ اپنی کم مائیگی کا احساس، مجھے ہمیشہ تڑپاتا رہا...... لیکن آج کا جان لیوا احساس تو مجھے مار ڈالے گا۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''ایسی فضولیات ذہن سے نکال دو بیٹا..... تم میرے محافظ نہ ہوتے تو آج میں اس مقام پر کھڑی نہ ہوتی۔ تم میرا سہارا نہ ہوتے تو آج تمہاری ممی اتنی باہمت اور حوصلہ مند نہ ہوتی۔ تم میری زندگی ہو..... میرا فخر اور میرا غرور تم ہی ہو۔ میری آن بان اور شان تم ہو۔ آج کے بعد ایسی غلط فہمیاں ہمارے درمیان حائل نہیں ہونی چاہئیں۔'' وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔

''تو پھر وردہ کا چیپٹر بند ہو جانا چاہیے۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔

''تم ٹھنڈے دل و دماغ سے وردہ کو اس نظر سے دیکھ کر سوچو تو ہو سکتا ہے، دل مان جائے۔'' وہ نرمی سے بولی۔ ماں کی بات پر حامی بھرنے کے بجائے وہ جز بز سا ہو گیا۔ سائرہ اس کی ایک، ایک حرکت و کیفیت نوٹ کیے جا رہی تھی۔

''ممی اس کی بے شمار خوبیاں اور ظاہری شخصیت ایک طرف مگر..... مگر ایک بہت بڑی خامی ہے اس میں جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا بلکہ وہ خامی درگزر کرنے کے قابل بھی نہیں۔'' وہ بہ مشکل بولا۔

''ایک خامی؟ جس کی وجہ سے اس کی تمام خوبیاں ہی خامیاں بن گئیں۔ بیٹا انسان خوبیوں اور خامیوں کی آمیزش سے ہی بنایا گیا ہے اگر اس کی خوبیوں کا پلڑا بھاری ہے تو فیصلہ تم پر چھوڑ دیتی ہوں..... لیکن یہ یاد رکھنا عدل کا دامن نہ چھوڑنا.....'' سائرہ نے اس سے خامی کے بارے میں معلوم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ بات تو درست تھی کہ ایک خامی کی اہمیت ہی کیا ہے جبکہ عادل کی خامیاں گنوانے لگتی تو وہ بہت سی خامیوں کا مرکب تھا۔

''فیصلہ عدل و انصاف کے مطابق میں نے سنا دیا ہے ممی..... اب بار، بار مجھے گناہ گار مت کریں۔ میں آپ کے ساتھ لمبی چوڑی قیل وقال نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہوا۔

''اوکے..... اب میں اس کی خامی جاننا چاہوں گی۔ شاید کونفس ہو جاؤں۔'' وہ سنجیدہ ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

''ممی! بہت بڑا پرسنالٹی کلیش ہونے کا اندیشہ ہے۔ آپ نے نوٹ ضرور کیا ہوگا..کہ وردہ طبعاً bossy باسی اور اپنی مرضی دوسروں پر مسلط کرنے والی لڑکی ہے۔ اس میں لیڈر شپ کوالٹیز بے تحاشا ہیں۔ جو عام طور پر شوہروں کے مزاج پر گراں گزرتی ہیں۔ وہ اب تک مجھے ایک چھوٹے، احمق بچے کی طرح ٹریٹ کرتی ہے۔ چھوٹی، چھوٹی بات پر مجھے محتاط رہنے کے طویل لیکچر دینا اس کی فطرت ہے۔ یوں نہ کرو، ایسے نہ چلو، یہ نہ پہنو، اب سو جاؤ، اب اٹھ جاؤ، اب پڑھ لو، یہ کھانا صحت کے لیے مضر ہے، مت کھاؤ وغیرہ وغیرہ..... ایسا گمان ہوتا تھا جیسے اس میں آپ کی روح سرائیت کر گئی ہو۔ اپنی ذات میں اس کی اتنی انٹرفیرنس کو میں ہنس کر اس لیے سہہ گیا اور اس کے سامنے روبوٹ بنا رہا کیونکہ خاندان میں سے پہلے فرد نے مجھ سے اس قدر اپنائیت اور انسیت کا اظہار کیا تھا۔ میں احتجاج کر کے اسے خفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو ہے کہ میں اس کی pleasant personality (خوشگوار شخصیت) سے امپریس ضرور ہوں۔ اس کی کمپنی بھی بے مثال ہے مگر عمر بھر کے لیے ہرگز نہیں۔'' وہ دل کے خدشات بتانے کے بعد ایک دم سے مطمئن ہو گیا۔ سائرہ اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی کہ وہ اسے اتنا سمجھدار تو کہیں سے نہیں سمجھتی تھی۔ جو خامی خود اس نے شدت سے محسوس کی تھی وہی خامی عادل کے انکار کا سبب بنی۔ وہ خاموش نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔

''ممی! وہ خود کو بہت افلاطون سمجھتی ہے۔ اتنے بڑے پن اور پھولے ہوئے سر کی لڑکی کے ساتھ عمر بھر رہنے سے بہتر ہے کہ کنوارا ہی رہ جاؤں۔ پتا چلے دو افلاطونوں یعنی ماموں، بھانجی نے مل کر ہم دونوں کو اس

دنیا سے ہی کوچ کر جانے پر مجبور کر دیا۔ ممی میری ددھیال کا سب سے بڑا مسئلہ ہی یہ ہے کہ ان کا دو سال کا بچہ بھی عقلِ کل ہے، آئی ہیٹ دیم۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

''بیٹے کاش میں پہلے جانتی۔ بس خوش فہمی میں ہی دھوکا کھا گئی۔ اب میں مجبور ہوں۔ کچھ بھی نہیں کر سکوں گی کیونکہ مشورہ میرا تھا۔ فیصلہ تمہارے ڈیڈی اور عصمت آپا کا ہے جو بدلا نہیں جائے گا۔'' وہ اب کافی فکر مند تھی۔ ''اُف میں اس عمر میں لاتعداد تجربات کے بعد بھی اس قدر بے وقوف نکلی۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔ تم کل کے بچے مجھ سے بدر جہا عقلمند اور دور اندیش نکلے...... اس پر مجھے فخر بھی ہے اور بے پناہ مسرت بھی...... مگر خود پر افسوس اور ندامت ہے۔'' وہ تڑپ کر بولی۔ وہ خوف زدہ کیفیت سے باہر نکل کر نارمل نظر آنے لگی تھی۔

''ممی اگر آپ یوں افسردہ اور اداس ہو کر خاموش بیٹھ جائیں گی تو پھر جو مرضی ہے کیجیے۔'' وہ پژمردگی سے بولا۔

''بیٹا! والدین نے زمانہ دیکھا ہوتا ہے۔ بھانت، بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کا برا کبھی نہیں سوچتے۔ واحد یہی تو ایسا رشتہ ہے جو اپنی اولاد کو خود سے برتر، باعزت، معتبر اور ہر لحاظ سے بہتر دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم وردہ کو اچھی طرح سمجھ چکے ہو۔ ویسے تمہیں اس کو ہینڈل کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ تمہارے انکار پر مجھے اعتراض نہیں...... دراصل وردہ bossy ہونے کے باوجود آج کل کی لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ ایک انجانی اور ناشناسا لڑکی تمہاری زندگی میں آ کر تمہیں مزید ہراساں و پریشان کر دے کیونکہ آج کل کی لڑکی کو اپنا اصل رول پہچاننے اور اسے نبھانے میں سبکی محسوس ہونے لگی ہے۔ تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ شوہر سے مقابلہ کرنے کی ٹریننگ بھی ماؤں کی طرف سے دی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج شادی کا کارڈ وصول کرتے ہیں تو چند دنوں بعد ہی اس کپل کے لڑائی جھگڑے کی خبر سننے میں آ جاتی ہے اور پھر چند مہینوں بعد طلاق کا بدنما داغ پیشانی پر چسپاں کیے بڑی نخوت و غرور سے اپنے گھر واپس آ جاتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ تکیہ کلام ہمارے معاشرے کی ہر تعلیم یافتہ لڑکی کی زبان سے عام سننے میں آتا ہے کہ ہم خود برسرِ روزگار ہیں، خود کفیل ہیں اس لیے نان سینس نہیں سنیں گے۔ برداشت کرنا تو کجا...... مگر بیٹا وردہ ایسی لڑکی نہیں...... وہ جانتی ہے کہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کا مقصد صنفِ قوی سے برابری کرنا ہرگز نہیں...... بیوی کا رول بھی قابلِ فخر اور قابلِ ستائش ہے اور مرد کا رول اس سے الگ ہونے کے باوجود قابلِ آفرین ہے، کوئی چھوٹا بڑا نہیں...... دونوں کے رولز الگ ہیں۔ وہ بہت اچھے خیالات رکھتی ہے اس رشتے کے متعلق...... تمہارا گزارہ ایسی ہی بیوی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ کاش بیٹا تم میں آج کے لڑکوں جیسی تیزی اور چالاکی ہوتی پھر سب ٹھیک رہتا۔'' وہ اسے پیار سے رام کرنے کی تگ و دو میں تھی۔

''ممی! میں ایسا بھی بدھو اور الو نہیں...... دراصل یہ مسئلہ آپ کا نہیں تمام ماؤں کا ہے۔ بچے بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر مائیں تسلیم نہیں کرتیں۔ اسے دودھ پیتا بچہ تصور کرتے ہوئے ہر وقت اس کے لیے فکر مند رہنا، نصیحتیں کرنا ان کی فطرت ہوتی ہے۔ آپ ذرا غور تو کریں کہ ہر موقع پر آپ نے بلا تامل میری زندگی کا ہر فیصلہ خود ہی کیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلا فیصلہ لندن جاب کرنے کا کیا تھا۔ آپ کی طبیعت دیکھ کر میں نے اپنے فیصلے کو اہمیت ہی نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا بھرپور ایوارڈ دیا۔ آج بہترین جاب پر آپ کی دعاؤں سے کھڑا ہوں۔ میں مطمئن اور بہت خوش ہوں کیونکہ یہاں رکنے کا فیصلہ بھی میرا ہی تھا۔ مطلب واضح ہے کہ مجھ میں بھی فیصلے کرنے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ I am totally satisf ied (میں بالکل مطمئن ہوں) اب میری

زندگی کے ساتھی کا فیصلہ بھی میرا اپنا ہی ہوگا۔ اگر مجھے محسوس ہوا کہ غلطی کر گیا ہوں تو وہاں سے ہٹنے میں پل بھی نہیں لگاؤں گا لیکن اگلا فیصلہ کرنے کی آپ کو یا کسی اور کو اجازت نہیں دوں گا۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا تو سائرہ نے بالکل مائنڈ نہ کیا۔ دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا کہ اس کے بیٹے میں ایک مثبت تبدیلی رونما ہو رہی ہے جس کی وہ متلاشی تھی اور فکر مند رہا کرتی تھی۔ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ممی! میری نافرمانی آپ سے ہضم نہیں ہو رہی؟'' وہ ماحول کو خوشگوار بنانے کی خاطر مسکرا کر بولا۔

''ایسی بات نہیں ہے، تمہارے ڈیڈی نے ایسی ٹیبلٹ کھلائی ہے کہ ہاضمہ لکڑ ہضم پتھر ہضم کے قابل ہو گیا ہے۔'' وہ بھی مسکرا کر بولی۔

''تو پھر آپ کی طرف سے اقرار سمجھوں۔'' وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔ ''ممی آپ تو جانتی ہیں میری کمزوری کہ ماں راضی تو سارا جگ راضی......''

''میرے بچے میں اتنی ظالم بھی نہیں ہوں کہ تم پر زور آزمائی اور زبردستی کرتی رہوں۔ دراصل یہ مسئلہ تمہارے ڈیڈی کی ایگو کا ہے، ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات تیر کے مانند ہے جو آگے ہی بڑھے گی پیچھے نہیں پلٹے گی۔ بہت سی مثالیں تمہارے سامنے موجود ہیں۔ تم خود بھی بخوبی آگاہ ہو کہ ان کے سامنے آج تک کوئی بندہ بشر آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ وہ بس چند الفاظ میں حتمی فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ لمبی چوڑی تمہید باندھنا ان کی نظر میں ویسٹ آف ٹائم ہے۔ اب عصمت آپا سے جو انہوں نے چند سیکنڈز میں منصوبہ بنایا ہے۔ وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ کر ہی رہے گا اس لیے بیٹا دل برامت کرو...... یا پھر اپنے ڈیڈی سے argue کرنے کی خود میں ہمت پیدا کرو۔ میں ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس نے بیٹے کو بھرپور تسلی دی۔ وہ ماں کے منہ سے باپ کے فیصلے کو صحیح ماننے پر بھڑک اٹھا۔ تیز لہجے میں بولا۔

''اب زمانہ بدل گیا ہے ممی...... ڈیڈی اپنے خول سے باہر نکل کر حالات کا جائزہ تو لیں۔ مجھ سے کیا سلوک روا رکھا اس پر غور و خوص تو کریں...... میں ان کے کسی فیصلے کی تائید نہیں کروں گا۔ چاہے مجھے یہ گھر ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑ جائے۔ بس میں ان کی بالکل نہیں سنوں گا۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔''

''بدتمیزی کی اجازت نہیں...... آواز آہستہ رکھو...... ہمیں اپنی خاندانی روایات کی پاسداری کی ٹریننگ دی گئی ہے عادل۔ یہ انہونا فیصلہ نہیں...... ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ میں نے تمہیں دنیاوی تعلیم کے ساتھ، ساتھ اعلیٰ اخلاق اور مضبوط کردار کا درس بھی دیا ہے۔ کیا میری تربیت کے اصول اتنے ہی کمزور اور بے دم تھے اور تمہارے ڈیڈی کے تمام قانون اتنے ہی بے وقعت اور بے قیمت کہ تم میں لحاظ و احترام نام کی کوئی شے نہیں ہے'' ایک دم سے، دیر تک خاموشی طاری رہی پھر وہی دھیمے لہجے میں گویا ہوئی۔

''میں تمہاری تابعداری کی قدردان ہوں کیونکہ تم نے ہمیشہ میری ہر بات پر سرِ تسلیم خم کر لیا اور میں بھی دھڑلے سے ہر فیصلہ کرتی چلی گئی۔ پہلی مرتبہ حسنات نے تمہارے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے۔ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ میں تو بہت مطمئن ہوں کہ انہوں نے تم میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ مجھے اب محسوس ہونے لگا ہے کہ میری محنت اور صبر و تحمل اکارت نہیں گیا۔ آخر کار حسنات نے ایک باپ کے رول کو نبھا کر ہم دونوں پر اولاد کی قبولیت کا اظہار کر دیا ہے۔ عادل میں اسی مبارک دن کے انتظار میں تو زندہ تھی پھر بھی میری جان میں تمہارے انکار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے فیصلے کو جھٹلا سکتی ہوں۔ اپنی زبان سے پھر سکتی ہوں کیونکہ میرے لیے تم اہم ہو۔'' وہ اسے مطمئن و پُرسکون کرنے کے لیے پیار سے بولی تو وہ ماں کے چہرے کی طرف

غور سے دیکھنے لگا۔ ماں کی دوغلی باتیں جنہیں سمجھنا اور ردِعمل کا اظہار کرنا اس کی سادہ فطرت نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ تو سنگل اور صاف ٹریک پر چلنے والا مسافر تھا۔ ماں کی سختی اور نرمی کو سمجھ ہی نہیں سکا۔ خاموشی سے سوچنے لگا کہ وہ کیا جواب دے؟ دیر تک سر نیچے کیے سوچتا رہا پھر اپنے اندر قوتِ گویائی پیدا کی اور خود اعتمادی کو یکجا کر کے نرم لہجے میں بولا۔

''ممی! ڈیڈی اور پھپھو تک میرا پیغام پہنچا دیجیے کہ مجھ پر اپنے رسم و رواج مسلط کرنے کی کوشش مت کریں۔''

''بیٹے زندگی اور دنیا کے انہی اصولوں پر ہمیں طوعاً و کرہاً چلنا تو پڑتا ہے۔'' وہ ٹھنائی تھی۔

''میں مزید چلنے سے لاغر ہوں ممی...... مجھے معاف کر دیجیے گا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''یعنی تم اپنی ممی سے ناراض ہو گئے ہو؟'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''ممی معاف کیجیے۔ مجھے تو اب آپ کے ذہن پر بھی شک ہونے لگا ہے۔ ممی مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئیں تو اب میں یہاں کیوں پڑا رہوں؟ آپ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں۔ آپ کو تو اپنی زندگی کی قدر نہیں تھی۔ مجھے تو ہے، یہ محل نما گھر اینٹ اور بجری سے بنا ہوا قید خانہ اور اس کا جان لیوا ماحول آپ کو ہی مبارک ہو۔'' اس کے لہجے میں دکھ اور کرب تھا۔

''بیٹا اس میں اتنا دکھی اور غمزدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ رشتے طے ہوتے بھی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی مرضی سے...... اس میں کسی کا کوئی کمال نہیں۔'' وہ پیار بھرے لہجے میں بولی۔

''اگر ایسا ہوتا تو آپ اور ڈیڈی ندی کے دو کنارے نہ ہوتے۔ مل کر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ندی کے پانی کی طرح...... یکجا ہوتے، ایک ہوتے۔'' وہ آہ بھر کر بولا۔

''بیٹا! اس میں قصور وار انسان بذاتِ خود ہے۔ اسی لیے تو غصہ حرام قرار دیا گیا ہے۔ جس رشتے میں حرام کی ملاوٹ ہو اس میں برکت کیسے ممکن ہے؟ ہم اس کے بارے میں گہرائی سے کیوں نہیں سوچتے؟ آپ کے ڈیڈی نے اپنی زندگی میں ویسے تو حرام کو ممنوع قرار دیا لیکن اپنی رگ و ریشہ میں بسنے والے حرام (غصے) کو ختم نہ کر سکے۔ اگر آئن اسٹائن نے اس بارے میں بھی کوئی بیان فرما دیا ہوتا...... طور طریقے، قانون اور اصول سمجھا دیے ہوتے تو شاید آج ہماری زندگی مختلف ہوتی۔'' وہ المناک لہجے میں بولی۔ ''کہیں تو میں بھی قصور وار ہوں۔ شاید میرے اندر بھی حرام بے تحاشا موجود ہے۔ ڈیڈی کو اشتعال دلانے والی بھی تو میں ہی تھی۔'' وہ بڑی بے رحمی سے اپنا جائزہ لے رہی تھی۔

''تو ٹھیک ہے ممی...... مجھ پر اب کرم کر دیجیے کہ مجھے اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے شادی کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ایسا کرنے سے میں ڈیڈی کے دل میں جگہ نہیں بنا سکتا۔ آپ نے اسی خوش خیالی کے پیش نظر مجھ نالائق پر بہت محنت و مشقت کر ڈالی ہے۔ بے شک میری زندگی تو سنور گئی مگر آپ کی خوش فہمی ناکام ہو گئی۔ میں آج بھی ان کی نظر میں بے حیثیت اور بے وقعت ہی ہوں۔ اب میری ایک التجا بھی سن لیجیے کہ مجھے نہ تو کسی گولڈ میڈلسٹ کی تلاش ہے نہ ہی اعلیٰ و ارفع خاندان کی حسینہ سے غرض ہے۔ میں ایک نارمل انسان ہوں، آسمان سے اترا ہوا فرشتہ نہیں...... مجھے اِک عام گھرانے کی اِک عام سی لڑکی چاہیے۔ جس کی خوبیوں کے ساتھ ایک خامی اتنی وزن دار نہ ہو کہ گھٹن ہونے لگے۔'' وہ مستحکم لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ یہ مستقل مزاجی اور خود اعتمادی دراصل تمہیں دردہ کی کمپنی نے ہی بخشی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ وہ تمہارا ایسا ہم سفر ثابت ہوئی کہ تمہاری نامکمل شخصیت اور کردار کے ادھورے پن کا حجاب بن جاتی۔

''ٹھیک ہے بیٹا...... میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ اپنے باپ سے خود ہی بات کرو، مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں ہے۔'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''کیا ڈیڈی سے بات کرنے کا ڈھنگ اور سلیقہ مجھے سکھایا تھا آپ نے کہ آج کھل کر بات کرنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ ایک کمزور شخصیت بیٹے سے ایسی توقع وابستہ کرنا درست نہیں۔'' وہ تلخی سے بولا تو وہ اور بھی مرجھا گئی پھر بولی کچھ نہیں۔

''ممی...... صبر و تحمل سے کام لینا بہت ضروری ہے مگر قابلِ فخر ہرگز نہیں۔ دوسروں کے ظالمانہ رویے پر ہمیشہ خاموشی اختیار کر لینا گناہ کے زمرے میں آتا ہے اور دوسروں کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر لینا گویا اپنی ذات سے بے انصافی ہے۔ میں ہر بات پر قناعت اور صبر کرنے والوں میں شمولیت اختیار کرنے کو کم ہمتی اور بزدلی کا نام دیتا ہوں۔ میں وردہ پر ہی قناعت کیوں کروں؟ کیا دنیا وردہ کے اوپر ختم ہو گئی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں...... میں بہت جلد آپ کو اپنی پسند کے بارے میں مطلع کر دوں گا۔'' اس نے خود اعتمادی سے کہا۔ اس کے لہجے کی مضبوطی پر وہ اسے حق دق دیکھنے لگی۔ دھیمی تو پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ اب بجھ سی گئی۔

''ٹھیک ہے بیٹا...... مجھے اس دن کا انتظار رہے گا۔'' مُردنی آواز میں بولی۔

''تھینک گاڈ کہ آپ کو میرے خیالات سے کچھ تو اتفاق ہوا۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''مجھے وردہ کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ عصمت آپا کو کس منہ سے انکار کروں گی اور پھر حسنات کی لعن طعن کیسے برداشت کروں گی۔ تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' وہ تڑپ کر بے بسی سے بولی۔

''میں آپ کو قصوروار نہیں ٹھہرا رہا۔ اس جھگڑے کی جڑ غلط فہمی ہے، کسی کا کوئی گناہ یا غلطی نہیں...... اسے رفع دفع بھی آپ ہی کر سکتی ہیں۔'' وہ تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''مانا کہ بہت مشکل ہے لیکن آپ کے سوا اور کوئی اس مشکل سے مقابلہ بھی تو نہیں کر سکتا ممی یو آر آ گریٹ لیڈی...... اچھا میرا فیصلہ ڈیڈی کو سنانے کے بعد ذرا انہیں دوسرا اور تیسرا شاک دینا مت بھول جائیے گا۔'' وہ ماں کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں مزید بولا۔ ''میری بیوی میری پسند کی ہوگی اور شادی کے بعد میں اپنی شریکِ حیات کے ساتھ اس گھر سے بہت دور ایک نیا گھر بساؤں گا۔ ایسا گھر جس میں اونچا بولنے پر پابندی نہیں ہوگی...... مووی دیکھنے پر اعتراض نہیں ہوگا...... ہم ایک جن بھوت کے سائے سے دور رہ کر اپنی زندگی جئیں گے۔ کیوں ممی......؟ اس گھر کا ماحول بالکل ویسا ہوگا جیسا حماد کے گھر کا تھا۔'' وہ یہ کہتے ہوئے رک گیا...... کسی فسوں میں کھو سا گیا تھا۔ سائرہ اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھتے ہوئے زبردستی مسکرا دی۔

''تمام شرائط منظور ہیں پر ایک نامنظور ہے۔ تم اسی گھر کو جنت کا گہوارہ بناؤ گے کیونکہ یہ ڈیڈی کا اور میرا گھر نہیں رہا۔ اب تم اس کے وارث ہو۔ اس لیے یہاں ہی رہنا تمہاری مجبوری ہے۔'' وہ لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے بولی۔

''ممی......! آپ بھی ڈیڈی کی چند لمحوں کی قربت میں رہ کر بہت ضدی اور جابر ہو گئی ہیں۔ اپنی بات منوانے کے کیا، کیا گُر آتے ہیں آپ کو...... آخر خربوزے نے اپنا رنگ خربوزی پر چڑھا ہی دیا ہے۔'' وہ ماں کو پیار کرتے ہوئے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

''تمہارے تمام تجزیے غلط ہیں، میں آج تک کسی سے اپنی بات نہیں منوا سکی۔ کاش ایسا ہوتا عادل...... یہ تو حسرت ہی رہی۔'' وہ سنجیدگی سے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ ''اگر ایسا ہوتا تو آج میری زندگی ہی مختلف ہوتی۔''

''اس لیے تو اس گھر کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ یہی بہترین اور فٹ سا بدلہ ہے۔ ڈیڈی کی بے حسی

اور لاتعلقی کا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ایسا جابرانہ اور جارحانہ فیصلہ جوانی میں نہ کر سکی۔ اب تو ڈیڈی کو اکیلا چھوڑنا ظلم ہے بیٹا اس لیے تو کہتی ہوں کہ وردہ پر تمہارا رنگ چڑھنے میں دیر نہیں لگے گی اور وہ بیچاری افلاطون کہاں سے ہوگئی۔ خواہ مخواہ ہی چوہے کی طرح تم بل میں جا گھسے ہو...... تمام عورتیں فطرتاً اور مزاجاً ایک دوسرے سے 99 پرسنٹ مشابہت رکھتی ہیں۔ آزما کر دیکھ لو...... اور پھر اللہ تعالیٰ نے جسے ہم پر فوقیت بخشی ہے جسے ہم پر برتر ہونے کا اعلان کیا ہے تو پھر وردہ تمہیں اپنے رنگ میں رنگنے میں کامیاب کیسے ہوسکتی ہے۔ علیحدگی ہو جاتی ہے گھر ٹوٹ جاتے ہیں۔ رشتے اور تعلق برباد ہو جاتے ہیں لیکن شوہر نامی مخلوق اپنے درجے اپنے مقام و رنگ کو الوداع نہیں کہتی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''بیوی پر اپنا رنگ چھوڑ کر ہی چین لیتا ہے۔''

''ممی...... دس از ناٹ فیئر...... اب آپ وردہ کا درود نہیں پڑھیں گی ورنہ مجھے ڈیڈی کے دو بدو ہونا پڑے گا۔ اور پھر بے تحاشا حساب و کتاب، جمع و تفریق کے گوشوارے کھل جائیں گے جو آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ بہتر ہے میری زبان بند ہی رہنے دیں۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''جاؤ بیٹا...... اپنے ڈیڈی سے بات کرنے کی ہمت کسی شاپ سے خرید لاؤ۔ تمہاری تمام تڑیاں اور دھمکیاں صرف میرے لیے ہیں۔ انہیں تو دیکھتے ہی تمہارا رنگ فق ہو جاتا ہے اور بولتی گھٹنوں کے لیے بند ہو جاتی ہے۔ وہ خونخوار درندہ نہیں ہیں۔ نرم و ملائم انسان ہیں۔ تمہارے مسئلے پر غور ضرور کریں گے۔ اٹھو میرا بیٹا جاؤ۔'' وہ مذاقاً بولے جا رہی تھی تو وہ بھی نادم سا مسکرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ اسے مزید مطمئن کرنے کی خاطر خود پر جبر کر کے بولی۔

''تم جانو اور باقی جانیں تمہارے ڈیڈی اور پھپھو...... میں دور ہی بھلی...... تماشائی بننا سب سے آسان مشغلہ ہے۔ یہ رول مجھ کمزور پر خوب فٹ بیٹھتا ہے...... کیوں جی...... ٹھیک کہا ناں......؟'' وہ شگفتہ لہجے میں اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

''سوچ لیں میرا ساتھ چھوڑنے کا انجام۔'' وہ پھر دھمکی دینے کے انداز میں بولا۔

''سوچ لیا...... مجھے بخش دو......'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''تمہارے ڈیڈی اسٹڈی میں بیٹھے ڈارون کی کتابوں کو چاٹنے کی کوشش میں ہیں۔ بہتر ہے کہ اس وقت تم بھی ان کا نوالہ بن جاؤ۔''

''چلتا ہوں...... دیکھتا ہوں کہ اس بار کون کس کا نوالہ بنتا ہے۔'' وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

''مگر ایک بات یاد رکھنا اگر گستاخی کی تو تم سے خفا ہو جاؤں گی۔'' وہ نہایت سنجیدگی سے بولی تو وہ ماں کی بات سنتا رہا۔

☆☆☆

نمراد جیسے مزاج کی بے حد سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ حسن کا بھی جواب نہ تھا۔ کلاس روم میں کبھی آگے بڑھ کر سر عادل سے سوال نہ کرتی تھی حالانکہ پڑھائی کے معاملے میں وہ بے حد سنجیدہ تھی...... مگر جب ضرورت کے تحت اس کے لب جنبش کرتے تو یوں گمان ہوتا جیسے کسی نغمے کی مدھر دھن کانوں میں رس گھولنے لگی ہو۔ مرد ایسی خوبیوں والی عورت پر ہی تو جان چھڑکتا ہے۔ عادل بھی اس کی نرم روی اور متانت سے متاثر ہوا تھا۔

نمرا نے جب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا تو مڈل کلاس کے اس خاندان میں چہ مگوئیاں سر ابھارنے لگیں کیونکہ خاندان کی پہلی لڑکی نے کو ایجوکیشن سسٹم کو جوائن کیا تھا۔ اس نے خاندان کی پروا نہ کی تھی ہر ایک کے

اعتراض اور نصیحت کو ان سنی کر کے اپنی بات پر ڈٹی رہی۔ والدین اس کی فطرت کے پیش نظر تھوڑا بہت سمجھانے کے بعد رضا مند ہو گئے، اس میں کمال نمرا کا تھا کہ وہ ماں کی گہری دوست اور سچی ہمدرد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نہایت حساس اور کم سنی میں ہی بردبار ہو گئی تھی۔ وہ ماں جو بیٹے کی پیدائش پر خاندان بھر میں باعزت ہوگئی تھی مگر چند سال بعد ہی نمرا کی پیدائش پر گویا کسی گناہ کی مرتکب بنی تھی کیونکہ یہ وہ گھرانا تھا جہاں بیٹی کی ماں ہونا ناقابلِ معافی تھا۔ وہ اسی نفرت آمیز رد نے کے ساتھ پروان چڑھی تھی مگر ماں، باپ ہر آن اپنا سایہ کیے ہوئے تھے۔ باپ کے مالی حالات کے مطابق چلنا اسے مشکل نہ لگتا تھا۔

والدین سے شرم و حیا کے دائرے میں رہ کر نہایت مہذبانہ طریقے سے بات کرنا اس کا وتیرہ تھا۔ بڑے بھائی سے اس کی دوستی نہ ہونے کی وجہ واضح تھی کیونکہ وہ اس سے فطرتاً بہت مختلف تھا۔ دادا، دادی کے لاڈلے نے اکلوتا بیٹا ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ ویسے بھی وہ چھوٹی ہونے کے باوجود اسے سمجھانے سے باز نہ آتی تھی اور وہ بڑا ہونے کے ناتے اسے شٹ اپ کال دیے بغیر نہ رہتا تھا۔

نمرا ہمیشہ سے ہی نہایت کم گو تھی۔ حسن کے ساتھ وضع داری اور رکھ رکھاؤ اور بڑوں کے لحاظ و تحریم کی پاسداری اور چھوٹوں کے ساتھ مشفقانہ سلوک اسے گھٹی میں ملا تھا۔ کچھ مہینے گزرنے کے بعد ہی لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود خاندان بھر میں اس کے بلند اخلاق اور پاکیزہ کردار کی مثالیں دی جانے لگیں۔ والدین کا سر فخر و غرور سے اونچا ہو گیا جبکہ سعود کی حرکتوں پر ان کے سر جھک جاتے اور چہرے لٹک جاتے پھر بھی نہ جانے کیوں معاشرہ ایسے لڑکوں کو بھی اہمیت دیے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی ہر غلطی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور نیک اور سیدھی لڑکی کی معمولی سی بھول صدیوں پر محیط ہو جاتی ہے جو اس کی زندگی کو داغدار تو کر سکتی ہے۔ اسے بے گناہ ثابت نہیں کر سکتی۔ سعود اسی کا فائدہ اٹھانے میں باکمال تھا۔

☆☆☆

''امی میں اب بڑا ہو گیا ہوں...... آپ مجھے کب تلک اپنے قبضے میں رکھیں گی۔ میرے دوست یو کے جا رہے ہیں...... میں بھی ان کے ساتھ ہی جانا چاہتا ہوں...... وہاں میرا ایڈمیشن ہو گیا ہے۔ اب آپ کے انکار کا جواز نہیں بنتا......'' سعود نے ناشتا کرتے ہوئے تنک کر کہا۔

''بیٹا! یہ ضد چھوڑ دو......'' ماں التجائیہ لہجے میں بولی۔ ''ہماری یہ حیثیت نہیں۔''

''مگر ایڈمیشن تو کروا لیا ہے اب پیسوں کا کیا مسئلہ ہے؟'' وہ پھر تنک کر بولا۔

''نہیں بیٹا...... اس کا انتظام تو چلو ہو ہی جائے گا۔ تم اصل وجہ جاننے کے باوجود انجان کیوں بن رہے ہو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ابو کا بھی یہی کہنا ہے۔ بہتر ہے میری جان کہ نمرا کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لو۔ ہمیں بھی بے فکری رہے گی۔ نمرا ابھی بہت ناسمجھ ہے، وہ بہت معصوم اور بھولی ہے۔'' عالیہ (ماں) نے اسے پیار سے ہر ممکن سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔

''اب میں نمرا کی خاطر اپنا فیوچر تو قربان کرنے سے رہا۔ امی مجھے مت روکیے ورنہ میں آگے پڑھوں گا ہی نہیں۔ ایسے ہی آوارہ گلیوں میں پھر کر زندگی گزار دوں گا۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ مجھے کیا بنانا چاہتی ہیں؟'' وہ سختی سے بولا تھا اور عالیہ کمزور دل ماں دہل گئی۔ اس کی دھمکی نے نیندیں ہی اڑا دیں۔ آخر کار اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

''بیٹا پیسے کا انتظام تو بہر حال کہیں نہ کہیں سے کر دیں گے بس مجھے اپنے ابو اور دنیا والوں کے سامنے

شرمندہ نہ کرنا۔ خوب جی لگا کر محنت کرنا...... اگر کچھ انتظام نہ بھی ہوا تو اپنا زیور جو میں نے ثمرااور اپنی اکلوتی بہو کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے وہ نکال دوں گی۔ بھلے اور سستے وقتوں میں بنوالیا تھا۔ اب تو ایک انگوٹھی بھی بنوانے کی ہماری حیثیت نہیں رہی۔'' وہ بیٹے کی محبت سے مغلوب ہو کر بولی۔

''امی...... دیکھیے گا آپ کا بیٹا آپ کو سونا انٹرسٹ کے ساتھ واپس کرے گا۔ آپ قطعاً فکر مند مت ہوں نہ ہی ابو سے اس کا ذکر کیجیے گا۔ یہ معاملہ بس ماں بیٹے کے درمیان ہی رہے تو بہتر ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تو

''اس کے باوجود تمہارے ابو کی مدد کے بغیر تو کچھ ہو نہیں سکے گا ناں......'' وہ سوچتے ہوئے پریشان کن لہجے میں بولی۔ ''بیٹا دوسروں کے سرخ چہرے دیکھ کر اپنے چہرے کو تھپڑوں سے لال کرنے والے لوگ ہمیشہ کرب واذیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے لختِ جگر پر ایسا وقت آئے اور پچھتاوا میرا پیچھا نہ چھوڑے۔ ایک بار پھر سے اپنے فیصلے کو اچھی طرح کھنگال کر سوچ لو...... ابو کو تو میں منا ہی لوں گی۔''

''امی! میں دنیا کی اس دوڑ میں پیچھے رہ کر زندگی حسرتوں اور آہوں کے سنگ گزارنا نہیں چاہتا۔ یہ حقیقت ہے ہمیں اپنی زندگی کو قابلِ عزت بنانے کے لیے دولت کی ضرورت ہے۔ میں وہ دولت حاصل کر کے رہوں گا۔ آپ کو علم تو ہے کہ گھی نکالنے کے لیے ہاتھ کی انگلیوں کو خم دینا پڑتا۔'' اس کے لہجے میں کچھ عجیب تھا کہ عالیہ چونکے بنا نہ رہ سکی۔

''بیٹا ایک بات یاد رکھنا، رزقِ حلال کا اپنا ہی نشہ اور سرور ہے۔ تھوڑے میں بھی برکتیں شامل ہو جاتی ہیں اور ذہنی سکون ایسا کہ انتہا سے زیادہ تھکا ہوا انسان بھی بستر پر لیٹتے ہی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے اور پُرسکون نیند کی وادی میں چلا جاتا ہے جس سے یہ محلوں والے بھی محروم ہوتے ہیں۔ کسی بھی ایمان دار مرد کو حرام کی طرف مائل کرنا بیوی کے لیے قطعاً ناممکن نہیں ہوتا۔ وہ بچوں کی ضروریات کا سہارا لے کر یہ کام کرتی ہے لیکن اگر مرد خود بھی مضبوط قوتِ ارادی کا ہو تو کبھی اس جال میں نہیں آتا...... اللہ کا شکر ہے کہ میں اور تمہارے ابو اس لعنت سے دور ہی رہے اور یہی تعلیم و تربیت ہم تمہیں دینا چاہتے ہیں۔'' وہ بیٹے کو سمجھاتے، سمجھاتے آبدیدہ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

یو کے پہنچ کر سعود نے پہلی مرتبہ آزاد فضاؤں میں کھل کر سانس لی۔ والدین کی محبت کی زنجیر سے رہائی ملنے پر اسے عجیب طرح کی طمانیت محسوس ہوئی تھی۔ خود مختاری و آزادی اور دوستوں کی پرانی یاری کا نشہ پہلے ہی کم نہیں تھا۔ اب تو سر چڑھ کر بولنے لگا تھا نہ کسی کی روک ٹوک کا خدشہ تھا نہ ہی خاندان والوں کی باتوں سے شرمندگی کا احساس......

اُدھر خاندان کے پہلے بچے کا حصولِ تعلیم کی خاطر لندن جانا ان کے عزیز رشتے داروں کو ہضم کرنا مشکل ہو گیا جو اس کے والدین کی اذیت و تکلیف کو بتدریج بڑھائے جا رہا تھا۔ اپنی دلی تسلی کے لیے کسی نے ان کی ایمانداری پر ضرب لگائی تو کسی نے سعود کے بڑے گھرانوں کے بچوں سے گہری دوستی سے فائدہ اٹھانے پر من گھڑت دلائل پیش کیے۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں بحوگردش تھیں۔ مگر ان کا دل تسلی میں تھا انہیں نہ تو صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی نہ ہی کسی قسم کی ندامت اور سبکی کا ان کے ذہن میں گزر ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ سب کو شاداں و فرحاں اور مطمئن ہی نظر آیا کرتے۔ عالیہ جیسی عورت کا بھرپور ساتھ اور مینٹلی سپورٹ اس کے شوہر رحمان کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھی۔ عالیہ نے اپنی کفایت شعاری سے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

☆☆☆

''ایسے ڈیسنٹ اور مہذب انسان کو دیکھ کر اعتبار کر لینے کو دل چاہے...... لیکن کچھ دنوں سے میں ان کی نظروں میں پڑھ رہی ہوں یا اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا ہے شاید میرا کوئی وہم ہو۔ ویسے میری کلاس میں کھاتے پیتے گھرانے کی خوش شکل لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں...... تو پھر میرا ہی انتخاب کیوں......؟'' نمرا اپنے کمرے میں بیٹھی سوچ جا رہی تھی۔ کمپیوٹر سامنے کھلا ہوا تھا مگر اسائنمنٹ میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ عجب مخمصے میں مقید تمام الٹی سیدھی سوچیں اس پر حاوی ہو چکی تھیں۔ چھٹی حس خطرے کی گھنٹیاں بجا کر اسے مزید مضطرب کر رہی تھی۔ ماں کو بتانا مناسب نہ لگا کیونکہ اس کے پاس کوئی ٹھوس دلیل تو تھی نہیں...... یہ اس کا وہمہ بھی تو ہوسکتا تھا۔ اپنی پریشانی اور شکوک کو دور کرنے کے لیے اس نے حمیرا کو فون کیا جو اس کی کلوز فرینڈ تھی۔ اس سے پہلے کہ نمرا بات شروع کرتی...... حمیرا نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔

''نمرا...... کیا تم نے سر عادل کی نگاہوں میں کچھ محسوس کیا ہے یا یہ صرف میرا ہی وہم ہے......'' یہ سنتے ہی نمرا کا شک اور وہم مستحکم ہو گیا۔

''یعنی میری چھٹی حس کی چیخ و پکار سو فیصدی درست ہے۔'' اس نے دل میں ہی سوچا۔

''ہاں حمیرا...... ان کا اس طریقے سے دیکھنا نارمل نہیں ہے اور مجھے بلاوجہ اہمیت دینا کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ حمیرا مجھے سچ سچ بتاؤ کہ میں چہرے مہرے یا اپنی باتوں اور حرکتوں سے ایک لوز کیریکٹر لڑکی لگتی ہوں......؟ سر نے پوری کلاس میں صرف مجھے ہی کیوں اپنی نگاہوں کا مرکز بنالیا ہے۔'' وہ بہت الجھن میں تھی۔

''فار گاڈ سیک نمرا...... کیسی عجیب باتیں کرتی ہو۔ ہوسکتا ہے ان کا مقصد فلرٹ کرنے کا نہ ہو۔'' وہ پیچھے سے بولی۔

''تو اور کیا مقصد ہوسکتا ہے۔ مجھے بلاوجہ تنگ کرنا، رسوا اور ذلیل کرنا...... حمیرا وہ خواہ مخواہ ہی میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟ میں تو انہیں نظر بھر کر دیکھتی بھی نہیں...... اپنی پڑھائی سے ہی مطلب رکھتی ہوں۔ نہ کبھی بے معنی سوال کرتی ہوں...... پھر انہیں میرے بارے میں کون سی خوش فہمی لاحق ہوگئی ہے۔'' وہ سردیوں میں بھی پسینے سے بھیگ گئی تھی۔ وجود میں خوف کی لہروں کے ساتھ حدت کا احساس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

''انہیں شاید بہت بڑی خوش فہمی ہوگئی ہے...... سمجھا کرو...... ہوسکتا ہے...... تمہیں پسند کرنے لگے ہوں...... شادی کرنا چاہتے ہوں...... آخر ہیں تو وہ جوان، خوبرو اور مردانہ وجاہت کا جیتا جاگتا شاہکار...... اب کسی کے سینے میں دل کے دھڑکنے پر تم پابندی تو نہیں لگا سکتی ناں...... بس...... اگلے مرحلے کا انتظار کرو۔'' وہ بہت شریر لہجے میں کہہ رہی تھی جو نمرا کو بہت برا لگ رہا تھا۔ اس نے حمیرا کی بات کا جواب دیے بغیر ہی فون بند کر دیا تھا۔ اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''ضرور کوئی نئی مصیبت کھڑی ہونے والی ہے۔ خدا خیر ہی کرے...... ایگزامز سر پر منڈلا رہے ہیں اوپر سے یہ پریشانی کچھ پڑھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ ہائے میں کیا کروں......؟'' وہ بے بسی سے سر پکڑ کر بیٹھی رہی۔

''نمرا وقت ضائع مت کرو...... اپنے ذہن کو ہر طرح کے اندیشوں سے آزاد کر کے اپنی اسائنمنٹ تیار کرو...... اور کل سے تم سر عادل کی طرف نظر اٹھا کر بھی انہیں دیکھو گی۔ انہیں discourage کرو...... جب ان کے یوں دیکھنے کا جواب تم اپنی خوفزدہ اور حیران کن نظروں سے دیتی ہو تو ان کا مقصد تو پورا کر دیا ناں تم نے۔'' وہ خود کلامی کرتی ہوئی اٹھی اور تھوڑی دیر کے لیے ماں کے پاس لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

''عالیہ تم ہزار بار مجھے ٹھوس دلائل دے کر رام کرنے کی کوشش کرو۔ پھر بھی مجھے تسلی نہیں...... سعود ایک رات میں سرتاپا کیسے بدل سکتا ہے؟ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ میرے خون پسینے کی کمائی شراب اور دوسری علتوں

پر صرف کر رہا ہوگا۔'' رحمان نے بستر پر لیٹنے سے پہلے دن بھر کی تھکی ماندی عالیہ سے اضطرابی کیفیت میں کہا۔

''رحمان جی...... ! میں آج بہت تھک گئی ہوں۔ اس وقت آپ کی تسلی و تشفی کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آپ بھی سو جائیں۔ صبح ناشتے پر بات کریں گے۔'' عالیہ نے نقاہت سے کہا۔

''اب تو تم سے معمولی سی بات کرنے کے لیے بھی وقت لینا پڑے گا۔ خواہ مخواہ تم نے اپنی زندگی عذاب میں دھکیل دی۔ کیا یہاں کی یونیورسٹیز بند ہوگئی تھیں جو اسے باہر جانے کی ضرورت پڑ گئی اور کون سا یہاں فرسٹ ڈویژن لے رہا تھا۔'' وہ آنکھیں نکالتے ہوئے بولے۔

''رحمان جی! آپ نے اپنی آج کی نیند تو داؤ پر لگا ہی دی ہے۔ خدا کے لیے میری جان بخشی فرما دیں، ورنہ میں کل گھر کے کام کرنے کے قابل بھی نہیں رہوں گی...... گھر کا درہم برہم نظام مجھے مزید بیمار اور لاغر کر دے گا۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ رحمان بستر سے اٹھے، ٹیبل لیمپ کی لائٹ آف کر کے بڑبڑاتے ہوئے لاؤنج میں کاؤچ پر آ کر لیٹ گئے۔ عالیہ جو نیند کے آس پاس ہی تھی میاں کے باہر جانے سے مکمل طور پر الرٹ ہوگئی اور جمائی لیتے ہوئے اٹھ کر لاؤنج میں آ کر ان سے...... نہایت ملائمت سے بولی۔

''رحمان جی...... ! آپ فکر مت کریں...... میں نے سعود کو باہر بھیجنے سے پہلے اپنے رب سے استخارے کی صورت میں مشورہ کیا تھا۔ ورنہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ہرگز نہ بھیجتی۔ میرا دل، ذہن اور روح تسلی میں ہے۔ آپ کو ہی ہر دوسرے دن نائٹ میئر ستانے لگتے ہیں۔''

''عالیہ تم خود سوچو کہ اس کا دوسرا سمسٹر ختم ہونے والا ہے۔ پیسوں کی فرمائش کیے جا رہا ہے۔ رزلٹ کی ہلکی سی جھلک تک تو دکھائی نہیں...... میں اس کی زبانی کلامی باتوں پر اب بھروسا نہیں کر سکتا۔'' وہ افسردگی سے بولے۔

''آپ کو ہمیشہ ہی میرے بیٹے سے شکایت رہی ہے۔ اب بھی وہ مجھے ایک، ایک پائی کا حساب دیتا ہے۔ کیا مجال کہ فضول خرچی کر جائے۔ اس پر اعتماد کریں اور خود کو اور مجھے بھی مطمئن رہنے دیں۔ میں نے اس کے مستقبل کے جو سپنے دیکھے ہیں۔ مجھے ان پر پورا بھروسا ہے۔ میرا رب ضرور پورے کرے گا۔'' وہ تسلی دینے کے انداز میں بولی۔

''اللہ کرے کہ تمہیں اپنے خوابوں سے بڑھ کر اولاد کی خوشی دیکھنا نصیب ہو، ہوسکتا ہے کہ میں ہی بے صبرا اور ناشکرا ہوں۔'' وہ معمولی سے مطمئن نظر آنے لگے تھے۔ اسی اثنا نمرا کمرے سے باہر نکل آئی۔

''ابو جان اس وقت آرام کرنے کا ٹائم ہے۔ آپ دونوں نہ جانے کس ڈسکشن میں مصروف ہیں۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''کیا تمہارا آرام کا ٹائم نہیں ہے...... کیسی پیلی پڑ گئی ہو۔'' عالیہ نے محبت سے کہا۔ ''بیٹا تم بھی سونے کی تیاری پکڑو...... نیند پوری نہ ہو تو ذہن ویسے ہی ڈل سا ہو جاتا ہے۔ تمہاری پڑھائی کون سی آسان ہے۔''

''امی آپ ہماری فکر کرنا چھوڑ دیں...... ہماری محنت و مشقت کے دن ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ آپ نے اپنی ذمے داریاں نبھا لیں بس اب اپنی صحت کی طرف توجہ دیں۔'' وہ نہایت پیار و احترام بھرے لہجے میں ماں سے بولی۔

''میاں جی سن رہے ہیں ناں، کل کی بچی ہم کو سبق سکھا رہی ہے۔ چلیں اب تو اٹھیں...... بے وجہ شک کی بنا پر اپنی اور میری نیند خراب کرنے پر تلے ہیں۔ سعود بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو رحمان

عالیہ کی خوش خیالی پر حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے کی طرف چل دیے۔

''اسے ہی تو کہتے ہیں بڑھاپا...... سٹھیا گئے ہیں۔ عمر کا تقاضا ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' عالیہ نے نمرا سے سرگوشی کے انداز میں کہا اور وہ بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

سردیوں کی شام گہری ہو رہی تھی۔ نمرا اپنے کمرے میں اسائنمنٹ میں مگن تھی اور عالیہ حسب معمول ڈنر کی تیاری میں... کچن میں مصروف تھی کہ رحمان نے موبائل عالیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تمہارے بیٹے کا فون ہے...... بہت خوش لگ رہا ہے ہمیشہ کی طرح...... آج بھی تمام رپورٹ اچھے، اچھے کی ہی ہوگی۔''

''ضرور اس سمسٹر میں ٹاپ کیا ہوگا۔'' وہ خوش آگین لہجے میں بولی اور فون لے لیا۔

''ہاں بیٹا کیا حال ہیں۔ لگتا ہے میرے بچے کی پڑھائی نے خوب درگت بنا رکھی ہے۔'' عالیہ پُرجوش لہجے میں بول رہی تھی۔ دوسری طرف سے بھی شگفتہ قہقہہ اس کے کانوں میں شیرینی گھولتا چلا گیا اور وہ جھوم سی گئی۔

''ابو کو انفارم کرنے سے پہلے اپنی پیاری امی کو بتانا چاہتا ہوں کہ میرا تیسرا سمسٹر شروع ہونے والا ہے۔ ایک مہینے کی چھٹیاں آپ کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔'' وہ نہایت ملائمت سے بول رہا تھا۔

''میں تجھ پر صدقے جاؤں...... بس کل ہی پہنچو...... تمہاری ماں تو خود سے بیگانہ ہو گئی ہے۔ تمہارے ابو بھی تنہائی اور اکیلے پن کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ تمہارے روشن مستقبل کی خاطر یہ دوری برداشت کر رہے ہیں بس تم جلدی سے آجاؤ۔'' عالیہ نے دکھ اور سکھ کی کیفیت میں کہا۔

''اور سنو بیٹا، نمرا کو تم۔ خود ہی انفارم کرنا وہ تو خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔''

''ہاں امی ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں اپنائیت رچی ہوئی تھی...... ''امی آپ خود کو تیاریوں میں تھکا نہ لیجیے گا۔ ایسا نہ ہو کہ میں آؤں اور آپ بستر پر پڑی ہوں۔''

عالیہ اس کی پیار بھری باتوں پر کتنی دیر فون کو دیکھتی رہی۔ آخر شوہر کی آواز پر چونکی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''رحمان جی کچھ سنا آپ نے...... میرا بیٹا آرہا ہے۔ بس اب مجھ سے کوئی کام نہیں ہوگا۔ ہاتھ پاؤں خوشی کے مارے پھول سے گئے ہیں۔'' وہ کچن سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

''ہم اس خوشی میں بیگم صاحبہ کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟'' وہ بھی خوش ہوتے ہوئے بولے۔ سال کا عرصہ ایک صدی ہی معلوم ہو رہا تھا۔

''یہ اولاد چیز ہی ایسی ہے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اطلاعاً عرض ہے کہ سعود صاحب اپنے انگریز دوست آئزک کے ساتھ تشریف فرما ہونے کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔'' نمرا نے گویا کچھ انوکھا کہہ دیا تھا جبھی دونوں چونک گئے۔

''یہ کیسے ممکن ہے اس چھوٹے سے گھر میں...... کیا وہ بھول گیا ہے کہ گھر میں اس کی جوان بہن بھی موجود ہے۔ میں اس کے ابھی آزادانہ خیالات پر ہی تو بے حد پریشان رہنے لگا ہوں۔ لیکن تمہاری ماں تو نہ جانے کن خوش فہمیوں میں مبتلا خود تو بے وقوف بن ہی گئی ہے۔ مجھے بھی الو بنا چھوڑا ہے۔''

جاری ہے



نیلی چھتری

غزالہ عزیز

اسے پہاڑی علاقوں کی گہری سرد شامیں اچھی لگتی تھیں۔ سرما کی ٹھنڈی سنہری نرم دوپہروں میں وہ کالونی کی لمبی سڑک جس کے دونوں اطراف بلند و بالا درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں سڑک پر سایہ فگن رہتی تھی وہ لانگ ڈرائیو پر نکل جاتی تھی۔ وہ ہر سال چھٹیوں میں ایبٹ آباد شاداب نگر آتی تھی۔ کار میں چلتے دھیمے انداز میں جگجیت سنگھ کی آواز کانوں میں رس گھولتی مدھر آواز سے اسے عشق تھا اور ڈرائیونگ

کے دوران وہ اسی سے لطف اندوز ہوتی مگر اس وقت موسم کی خوب صورتی دیکھ کر پیدل ہی اکیلے نکل آئی تھی۔ کالونی کے باہر ایک قدرتی جھیل تھی۔ جہاں پہروں بیٹھ کر سنہری شام کے زرد سورج کو افق کے اس پار ڈوبتے دیکھنا اسے بہت پسند تھا۔ اس وقت بھی وہ بی بی جان اور شانزے کی نصیحتوں کی پروا کیے بغیر کالونی سے کچھ دور نہایت سرسبز علاقے میں بہتی جھیل کنارے پتھر پر بیٹھی سرمئی گہری شام کی فسوں خیزی میں ڈوبی اپنی سوچوں میں گم تھی۔

انسان نیچر سے قریب ہو کر کتنا پُرسکون اور مطمئن ہوتا ہے یہ کوئی ماورا شمیلہ کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ فطرت کے حسن کی دیوانی تھی۔ سامنے سُبک روی سے بہتا جھیل کا ٹھنڈا پانی اور دور پہاڑوں کے دامن میں لحہ لحہ زرد نارنجی گولا اترتا ایک نہایت فسوں خیز منظر پیش کر رہا تھا۔ ماورا اس منظر کی دلکشی میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اسے تیزی سے شام کے گہرے ہوتے سائے اور موسم کے تغیر کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ان پہاڑی علاقوں میں موسم اسی طرح اچانک ہی بدل جاتا ہے۔ اس وقت بھی موسم نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا رنگ بدل لیا تھا۔ سنہری شام کے اجالے کی جگہ سرمئی بادلوں نے لے لی اور لمحوں میں سنہری شام سرمئی رنگ میں تبدیل ہو گئی۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ پر ماورا نے چونک کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سرمئی گھٹائیں چار سو برسنے کو تیار کھڑی تھیں۔ وہ گھبرا کے تیزی سے واپسی کے لیے اٹھی۔ اگر راستے میں ہی بارش ہو گئی تو اس کا گھر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ آج وہ شانزے کے بغیر اکیلے ہی چلی آئی تھی۔ شانزے کو فلو ہو رہا تھا۔ وہ گھر پر آرام کر رہی تھی۔ شانزے نے کہا تھا کہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے گھر آ جانا مگر اسے دیر ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ بارش شروع ہو جاتی۔ وہ کالونی کی طرف جانے والے راستے کی جانب تیز قدموں سے بڑھنے لگی۔ اب جیسے جیسے بادلوں کی وقفے، وقفے سے گڑگڑاہٹ اور اطراف میں پھیلتے سرمئی اندھیرے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ماورا کے قدم اتنی تیزی سے کالونی کو جاتی سڑک پر بڑھ رہے تھے۔ وہ اندھیرے یا بادلوں کے شور سے ڈرنے والی لڑکی نہیں تھی لیکن ماحول کی گمبھیرتا نے اسے تھوڑا سا ہراساں ضرور کیا تھا۔ تب ہی اچانک اپنے پیچھے سے مردانہ آواز پر اس کے تیزی سے بڑھتے قدم خود بخود رک گئے۔

”ماحول چاہے جتنا ہی خوفناک کیوں نہ ہو۔ باہر کی کوئی بھی شے ہمیں ہراساں نہیں کر سکتی۔ جب تک ڈر ہمارے اندر موجود نہ ہو...... مگر آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آرمی والوں کا علاقہ ہے یہاں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“ اپنے پیچھے آتے شخص کی آواز پر وہ میکانکی انداز میں مڑی تھی۔ جاگنگ سوٹ میں سر پر پی کیپ لگائے انتہائی خوشنما نقوش کے حامل شخص کو دیکھ کر وہ اس ویرانے میں تھوڑا سا کانشس ضرور ہوئی تھی لیکن ظاہر نہ ہونے دیا۔

”میں اندھیرے اور بادلوں کے گرجنے سے ڈرنے والی نہیں۔“ اس نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ اس کے ایک دم سے کہنے پر سامنے کھڑے شخص کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ وہ متاثر ہوئے بنا نہیں رہا۔ وہ جلدی میں گھر سے نکلتے وقت اپنی شال بھول آئی تھی مگر لینن کے میرون سوٹ میں جس کے گلے اور آستینوں پر بلیک ریشمی دھاگے کی کڑھائی تھی، شال نما دوپٹے کو اس نے اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ سامنے کھڑا اجنبی شخص ماورا شمیلہ خان کے دلکش چہرے سے نظر نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ بعض چہرے ایسے ہی طلسم ربا ہوتے ہیں۔ کسی اسم کی طرح باندھ لیتے ہیں مقابل کو...... اجنبی شخص کو اس وقت ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کسی طلسم کے زیر اثر کھڑا تھا۔ اس لیے ماورا کی بات پر لاجواب ہو کر کہے بنا نہیں رہا۔

”اچھی بات ہے، ڈرنا بھی نہیں چاہیے۔

خواتین کو اتنا تو بہادر ہونا ہی چاہیے۔ مگر اس سے پہلے کے موسم کے تیور بگڑ جائیں اور بارش شروع ہوجائے۔ ہمیں اپنی منزل کی جانب بڑھنا چاہیے کیونکہ ان پہاڑی علاقوں کی بارش بہت خطرناک ہوتی ہے۔''

اور لفظ ''ہمیں'' کا صیغہ استعمال کرنے پر ماورا نے کچھ فاصلے پر مقابل کھڑے شخص کو گھور کر دیکھا تھا۔

''واٹ ڈو یو مین بائی ''ہمیں اپنی منزل'' جناب میں اجنبی لوگوں سے کسی بھی قسم کی مدد نہیں لیتی۔ اس لیے آپ اپنے راستے جائیں اور میں اپنے......''

''جی بالکل ...... میں اپنے راستے ہی جارہا ہوں۔ آپ کو اگر ڈر لگ رہا ہو تو آپ میرے ساتھ آسکتی ہیں۔ یہ مدد نہیں دوستانہ مشورہ ہے۔ ورنہ ایز یو وش......!'' اس نے کندھے اچکائے تھے اور ماورا کچھ کہے بغیر پلٹ کر تیز قدموں سے آگے بڑھی تھی۔

اور تب ہی آسمان سے موٹی موٹی بوندوں نے پلک جھپکتے میں تیز بارش کا روپ دھارا۔ وہ تیزی سے سڑک کے کنارے لگے گھنے درخت کی جانب بھاگی تھی اور اجنبی شخص بھی تیزی سے سڑک کنارے بارش سے بچنے کے لیے ماورا کے پیچھے ہی آیا تھا اور کچھ فاصلے پر کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں نیلے رنگ کی چھتری تھی۔

''دیکھیں...... میرے پاس چھتری ہے۔ ابھی اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگے گا۔ اس لیے اگر آپ چاہیں تو اس چھتری کے سہارے بارش سے بچا کر میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ سکتا ہوں۔ آپ اکیلی ہیں، آپ کے گھر والے بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''تاکہ آپ گھر دیکھ سکیں اس بہانے...... بڑا اچھا طریقہ ہے خواتین کی مدد کرنے کا...... لیکن میں نے کہا نا، میں اجنبیوں سے کسی قسم کی مدد لیا نہیں کرتی سو آپ کی آفر کا شکریہ...... میں خود چلی جاؤں گی۔''

ماورا نے برجستہ کہا تھا۔ وہ بارش سے بچنے کے لیے سڑک کے کنارے درخت کے نیچے کھڑی تو ہوگئی تھی مگر صورتِ حال نازک ہو رہی تھی۔ بارش میں بھیگنے سے اس کے سرخ پڑتے ہونٹ سردی سے کپکپانے لگے۔ وہ کب تک یہاں کھڑی رہ سکتی تھی۔ اطراف میں تیزی سے پھیلتے اندھیرے کا خیال آتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی برستی بارش میں سڑک پر چل پڑی تھی۔ تب ہی بے اختیار اجنبی شخص نے اسے روکا تھا۔

''ارے...... کہاں جارہی ہیں آپ...... یہ سرما کی بارش ہے، آپ چاہیں جتنی بھی بہادر ہوں لیکن بارش میں بھیگنے کے بعد شدید نمونیا کے اٹیک سے نہیں بچ سکیں گی...... پلیز یہ چھتری ہی لیتی جائیں۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آرہا ہوں آپ کے ساتھ۔''

ماورا نے پلٹ کر ایک بار پھر سڑک کنارے کھڑے چھتری کھولے اجنبی شخص کو گھور کے دیکھا اور بغیر جواب دیے تیزی سے سڑک پر آگے بڑھتی چلی گئی اور اس بار اس شخص کو بھی وہاں رکنے کے بجائے ضرورت سے زیادہ اس پُراعتماد اور محتاط لڑکی کے پیچھے برستی بارش میں قدم بڑھانے پڑے۔ کیا ہوا جو وہ ایک اجنبی لڑکی تھی۔ کیا ہوا جو سرما کی اس بارش میں بھیگنے کے بعد خود اسے نمونیا کا اٹیک ہو جاتا مگر وہ اپنی صحت کی فکر کے بجائے اس خودسر لڑکی کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔ ''ویران سنسان راستے پر اگر وہ کسی مصیبت کا شکار ہوگئی تو......؟'' اس خیال کے آتے ہی وہ تیز قدموں سے اس کے پیچھے جارہا تھا۔ اور سڑک پر تیزی سے آگے جاتی ماورا شمیل خان یہ دیکھے بغیر کہ وہ شخص اس کے پیچھے چلا آرہا ہے یا کسی اور سمت میں اپنی منزل کی جانب بڑھ گیا ہے۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ جانتی تھی گھر پہنچ کر اسے بی بی جان اور شانزے سے زبردست ڈانٹ پڑنی تھی...... اور جلد ہی اسے اپنے پیچھے بہت قریب ہی قدموں کی آواز محسوس ہونے لگی تو اس نے اپنے قدموں کو مزید تیز کر دیا مگر وہ مردانہ قدموں کی تیزی کا مقابلہ زیادہ دیر تک نہیں کرسکی تھی۔ اس کے پیچھے آتے شخص نے ہاتھ میں موجود نیلی چھتری کو دو قدم اپنے سے آگے چلتی لڑکی پر تان دیا جو بارش میں بری طرح بھیگ کر کانپ رہی تھی۔ اب وہ اجنبی لڑکی کے ساتھ چل رہا تھا۔ ماورا نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

''دیکھیں مس...... میں واقعی شریف انسان ہوں اگر آپ بنا کسی پرابلم کے اپنی منزل پر پہنچنا چاہتی ہیں تو مجھے اپنے ساتھ آنے دیں، مجھے اندازہ ہے آپ اس علاقے میں نو وارد ہیں۔''

اور واقعی وہ اس جگہ اکیلے پہلی بار آئی تھی۔ اجنبی شخص کا اندازہ درست تھا مگر وہ کچھ نہیں بولی۔

''اس علاقے کے سارے راستے مجھے ازبر ہیں مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم عام طور پر اجنبی لوگوں کے بارے میں جیسا سوچتے ہیں ویسا ہی ہو۔ میں جانتا ہوں انسان کی شرافت اس کے ماتھے پر لکھی نہیں ہوتی۔ آپ چاہیں تو مجھ پر اعتماد اور بھروسا نہ کریں مگر مجھے اپنی منزل تک ساتھ جانے سے مت روکیں۔ ایک ذمے دار شہری کی حیثیت سے میں نہیں چاہتا کہ آپ کو کوئی نقصان اٹھانا پڑے۔ اس علاقے میں آپ مہمان ہیں اور ہم پہاڑی لوگ مہمانوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔''

ماورا نے اب بھی کچھ نہیں کہا مگر دونوں کے چلتے قدموں کی تیزی میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ دانستہ اس کے قدموں سے قدم ملاتے ہوئے آہستہ چل رہا تھا۔ البتہ ماورا کے لیے اس کا ساتھ تسلی سے زیادہ سکون کا باعث بن رہا تھا کیونکہ اپنے اوپر تنی نیلی چھتری سے وہ کافی حد تک بارش میں بھیگنے سے بچ گئی تھی۔ البتہ جاڑے کی ٹھنڈ اس کی رگوں میں اتر کے اپنا کام دکھا رہی تھی۔ وہ مزید بحث کرنے کے

بجائے خاموشی سے چلتی رہی۔ اب اتنا تو اسے بھی لوگوں کی پہچان تھی کہ ساتھ چلتا اجنبی شخص واقعی اسے کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ مقامی بندہ ہے جسے یہاں کے راستوں کا بھی بخوبی علم ہوگا۔ شکل اور لہجے سے پڑھا لکھا اور مہذب لگ رہا ہے۔ اب وہ کالونی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہے تھے۔ اسے سفید جگمگاتا شاداب کا نیج نظر آ گیا تھا۔ کمپاؤنڈ کے احاطے میں قدم رکھتے ہی وہ رک کر مڑی۔ ساتھ چلتے اجنبی شخص کے قدم بھی رک گئے تھے۔

''میری منزل بس قریب ہی ہے..... میں یہاں سے اکیلے ہی آگے کا سفر کر سکتی ہوں۔ آپ بخوشی اپنے راستے پر جا سکتے ہیں۔'' اور وہ جو سوچ رہا تھا کہ وہ اس کا شکریہ رسماً ہی ادا کرے گی اس کے نہایت سنجیدہ انداز میں اس طرح کہنے پر ایک لمحے کے لیے اس کی سرمئی آنکھوں میں ہلکی سی حیرت ابھری تھی۔ کیا واقعی وہ اب بھی اس کے خلوص پر شاکی تھی۔ اسی لیے آگے گھر تک ساتھ لے جانا نہیں چاہتی تھی۔

''مگر میری منزل تو خود چل کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ اب مجھے کسی اور راستے پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے دل میں سوچا تھا۔ ماورا نے اس کا شکریہ تک ادا نہیں کیا تھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ اور جانے اس لڑکی کی منزل اور کتنی دور تھی۔ احتیاطاً اس نے اپنی نیلی چھتری ماورا کے ہاتھ میں دے دی تھی۔

''او کے..... ایز یو وش..... میرے لیے یہ کافی ہے کہ آپ بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ گئی ہیں، خدا حافظ۔'' وہ مڑا اور بارش میں بھیگتے ہوئے اپنے سر پر پی کیپ کو مزید آگے کرتے ہوئے کالونی کمپاؤنڈ کے احاطے سے باہر کی جانب بڑھتا چلا گیا..... یہ عمل اتنے میکانکی انداز میں ہوا تھا کہ ماورا کو اس کی نیلی چھتری اسے واپس دینے کا خیال ہی نہیں رہا۔ اس نے..

بھیگنے سے بچنے کے لیے اپنی چھتری ماورا کو دے دی تھی اور خود برستی بارش میں چلا گیا۔ وہ چھتری پکڑے برستی بارش میں بھیگتے اجنبی شخص کو دور کالونی کی سڑک پر جاتا دیکھ رہی تھی۔ یکایک اسے اپنے لہجے اور رویے کی بے مروتی کا احساس ہوا۔ وہ کم از کم ..... اس شخص کا شکریہ تو ادا کر ہی سکتی تھی۔ جس نے واقعی بنا مانگے اس کی مدد کی تھی...... حقیقت میں اسے برستی بارش کی گہری شام کے سناٹے سے خوف محسوس ہوا تھا۔ جسے اس نے سارے راستے اس اجنبی شخص پر ظاہر ہونے نہیں دیا، یہ الگ بات کہ اس شخص کے ساتھ نے لمحوں میں اس کا خوف زائل کر دیا تھا مگر وہ کون تھا......؟ وہ چھتری پکڑے کھڑی دور جاتے شخص کے مدھم پڑتے ہیولے کو دیکھ رہی تھی۔

مانا کہ اجنبی لوگوں سے فرینک ہونا اس کی عادت نہیں تھی لیکن اسے اتنی روڈنیس کا مظاہرہ بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ماورا نے دل میں سوچتے ہوئے خود کو سرزنش کی تھی۔

''کوئی بات نہیں...... اگر کل وہ اپنی جگہ اپنی چھتری واپس لینے آیا تو شکریہ ادا کر دوں گی۔ آخر یہ چھتری بھی تو واپس کرنی ہوگی۔'' اگلے لمحے ماورا نے خود کلامی کی اور گھر کی جانب چل دی۔ دور سے ہی اسے گھر کے پورچ میں گرم شال اوڑھے شانزے ٹہلتی ہوئی نظر آ گئی تھی۔ وہ آگے بڑھی گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی تو آہٹ پر شانزے نے پلٹ کر دیکھا اور سامنے سے آتی ماورا کو دیکھ کر وہیں رک گئی تھی۔ ماورا تیزی سے چھتری کو فولڈ کرتی پورچ میں داخل ہوئی تھی۔ شانزے بے اختیار اس کے گلے آ لگی۔

''کہاں رہ گئی تھیں تم...... میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تھینک گاڈ...... کہ تم صحیح سلامت گھر آ گئی ہو۔ ورنہ تم نے تو آج میری جان ہی نکال دی تھی ماورا...... پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں مارچ کرتے ہوئے میری ٹانگیں شل ہو چکی ہیں۔ اوپر

سے یہ ہڈیوں میں اترنے والی ٹھنڈ نے تو اب ٹانگوں پر کھڑا رہنا مشکل کر دیا ہے۔ اگر تم تھوڑی دیر اور نہ آتیں تو میں اپنی جان سے ہی گزر جاتی۔'' شانزے نے بیچارگی سے کہا تو ماورا نے بے اختیار اپنا یخ سرد ہاتھ شانزے کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

''خدا نہ کرے..... کیا اول فول منہ سے نکال رہی ہو، کچھ نہیں ہوا مجھے۔ ٹھیک ٹھاک..... صحیح سلامت ہوں تمہارے سامنے۔'' ماورا نے بے ساختہ دہل کر کہا تھا۔

''اسی کا تو شکر ادا کر رہی ہوں۔ تم صحیح سلامت گھر پہنچ گئی ہو۔ اب کم از کم امی جان سے ڈانٹ تو نہیں پڑے گی۔ ورنہ بی بی جان سے تو آج خوب ڈانٹ پڑی ہے مجھے..... صرف تمہاری وجہ سے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ میں تمہارے ساتھ کیوں نہیں گئی۔ تمہیں اکیلے جانے سے روکا کیوں نہیں۔ یہاں کا موسم اس طرح اچانک خراب ہو جاتا ہے اگر تم راستہ بھٹک جاتی تو.....؟ یا پھر خدانخواستہ.....''

''پلیز شانزے..... اب اتنی بھی ٹینشن لینے کی بات نہیں تھی۔ میں کون سا زیادہ دور تک گئی تھی۔ بچپن سے یہاں آتی رہی ہوں۔ مجھے یہاں کے راستے ازبر ہیں اور ویسے بھی تمہارے اس خوب صورت شہر کے لوگ بہت مہمان نواز اور ہمدرد ہیں، کوئی نہ کوئی تو مجھے راستہ سمجھا ہی دیتا اگر میں بھٹک جاتی تو.....'' ماورا نے اس اجنبی شخص کا ذکر گول کر دیا تھا وہ ہاتھ میں پکڑی نیلی چھتری کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ جس پر شانزے کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

''کیا مطلب.....'' شانزے نے ناسمجھی سے برجستہ کہا۔

''کچھ نہیں..... اب اندر چلو..... ورنہ کچھ دیر اور یہاں کھڑے رہے تو واقعی تمہارے ساتھ میری ٹانگیں بھی ٹھنڈ سے اکڑ جائیں گی۔'' ماورا نے مسکراتے ہوئے کہا تو شانزے بھی مسکرا دی تھی۔ دونوں مسکراتی ہوئی گھر کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔

☆☆☆

ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ شانزے سے ہر بات شیئر کرنے والی ماورا نے سرمئی شام کی برستی بارش میں راستہ دکھانے والے اجنبی شخص کی بابت سرے سے ذکر ہی نہیں کیا..... اور شانزے کو بھی اس کے ہاتھ میں نیلی چھتری دیکھ کر پوچھنے کا خیال تک نہیں آیا۔ گھر سے تو وہ خالی ہاتھ گئی تھی بلکہ اپنا موبائل تک گھر چھوڑ گئی تھی۔

اور کچھ دیر بعد جب وہ فریش ہو کر گرم کپڑوں میں شال اپنے گرد لپیٹے آتش دان کے قریب رکھے دیوان پر آ کر بیٹھی تو کاؤچ پر بیٹھی بی بی جان پیار بھری سرزنش کیے بغیر نہیں رہ سکیں۔

''ماوی بیٹا..... مجھے تم سے اس بچپنے کی امید نہیں تھی۔ تم تو یہاں کے پل میں بدلتے موسموں کی فطرت سے واقف ہو پھر اکیلے سرِ شام گھر سے باہر جانے کی کیا ضرورت تھی یہ سرما کی بارش تو شہر سے آنے والے گرم علاقوں کے باسیوں کو اور زیادہ نقصان پہنچاتی ہے، مجھے ڈر ہے، کہیں بارش میں بھیگنے کی وجہ سے تمہیں بخار نہ ہو جائے۔'' بی بی جان نے فکرمندی سے کہا تو ماورا اپنی ذات سے منسلک پیار کرنے والے رشتوں کے خلوص و محبت پر شرمندہ سی ہو گئی۔ اس نے واقعی انہیں پریشان کر دیا تھا۔

''خدا نہ کرے بی بی جان..... ویسے بھی ہماری ماورا بہت بہادر ہے۔ وہ کم از کم بارش سے گھبرانے یا ڈرنے والوں میں سے نہیں..... لیکن بیٹا، بی بی جان بھی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔'' امی جان نے بھی ان کی تائید کی۔

''آئی ایم سوری بی بی جان..... آپ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں امی جان..... بس وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ مگر میں گھر سے زیادہ دور نہیں گئی

تھی اور مجھے یہاں کے راستوں کا بھی پتا ہے لیکن میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ سوری ابی جان...... میری وجہ سے آپ لوگوں کو پریشانی ہوئی۔'' وہ اب خاصی شرمندہ تھی۔

''کوئی بات نہیں بچے...... ویسے بھی تم یہاں چند دن کی تو مہمان ہو۔ ہم خواہ مخواہ تم پر پابندیاں لگا کے تمہارے ٹرپ کو بے مزہ کرنا نہیں چاہتے...... لیکن بیٹا...... اب جب بھی باہر جاؤ تو گل خان کو ساتھ لے لیا کرو تا کہ راستے میں کسی پریشانی میں مبتلا ہونے سے بچ جاؤ اور ہمیں بھی تسلی رہے گی۔''

''جی بی بی جان......'' ماورا نے مؤدب لہجے میں کہا۔ تب ہی شانزے ٹرالی دھکیلتے ہوئے سٹنگ روم میں داخل ہوئی۔ گرما گرم بھاپ اڑاتی کافی، چکن سینڈوچز اور گرم گرم پکوڑے مع کیچپ اور ہری چٹنی ٹرالی میں موجود تھے۔ بی بی جان اور ابی جان نے تو صرف کافی ہی لی تھی۔ اور وہ دونوں کافی کے ساتھ دیگر لوازمات سے بھی انصاف کرنے لگیں۔

''جیتی رہو بیٹا...... تم نے تو واقعی موسم کی مناسبت سے ماحول کا لطف دوبالا کر دیا۔ لگتا ہے آج ڈنر کی چھٹی کا پروگرام ہے۔'' کافی کا مگ تھامتے ہوئے ایمل خان نے بیٹی کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھا۔

''ڈنر کی تو آپ فکر ہی نہیں کریں ابی جان...... آج مینیو میں شامل ڈشز دیکھ کر آپ سب کی بھوک پھر سے چمک اٹھے گی۔'' شانزے نے خوشگوار لہجے میں کہا تھا۔

''اچھا...... تو اس کا مطلب ہے ہماری بیٹی نے آج خاصا اہتمام کر رکھا ہے۔''

''جی ہاں اور پہلے گرما گرم سوپ بھی سرو ہوگا۔'' شانزے نے پُرجوش لہجے میں کہا تو بی بی جان بھی سب کے ساتھ مسکرانے لگیں۔

''ویسے ماوی بیٹا...... تم نے اپنی پیکنگ تو کر لی ہے۔ تمہاری روانگی میں صرف دو دن رہ گئے ہیں۔'' اس کی دو دن بعد... کراچی کے لیے فلائٹ تھی۔

''جی ابی جان...... بس کل صبح تک کر لوں گی۔'' ماورا اپنے چچا ایمل خان کو شانزے کی طرح ابی جان کہتی تھی اور ایمل خان کی یاددہانی پر شانزے اداس ہو گئی۔

''یہ پندرہ دن کتنی جلدی گزر گئے ناں بی بی جان...... کاش ماورا ہمیشہ کے لیے یہاں ہمارے ساتھ رہ سکتی...... میرا تو دل چاہتا ہے کہ یہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ کتنا انجوائے کرتے ہیں ہم دونوں چھٹیوں میں۔'' ساتھ بیٹھی ماورا نے اس کے ہاتھ پر محبت سے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

''ہاں تو اب تمہاری باری ہے۔ اب تم کراچی آؤ گی ہمارے پاس۔'' اور اس کی بات پر شانزے مسکرانے لگی۔

''ہاں بیٹا...... اچھے دن اور اچھا وقت بہت جلد گزر جاتا ہے مگر ماوی کو جانا تو ہے۔ شمیل لالہ جان کا بار بار فون آ رہا ہے۔ ماوی کی سیٹ کنفرمیشن کے لیے...... میں نے انہیں بتا دیا ہے۔ پرسوں صبح کی فلائٹ ہے۔''

''ارے بیٹا...... اپنی ماورا تو پکی شہرن بن چکی ہے۔ پیدا بھی کراچی میں ہوئی تھی۔ اب یہ شہر کے ہنگاموں اور شوروغل کی عادی ہو چکی ہے اب اس کا دل یہاں نہیں لگے گا۔''

ماورا اٹھ کر کاؤچ پر بیٹھی بی بی جان کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور ان کی گردن میں لاڈ سے بانہیں ڈال دیں۔ بی بی جان نے بھی ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی نرم آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے بی بی جان...... یہ میرے آباؤاجداد کا آبائی گاؤں ہے۔ بھلا یہاں میرا دل کیوں نہیں لگے گا۔ میں تو یہاں آ کر بہت سکون اور خوشی محسوس کرتی ہوں۔ آپ لوگوں کی محبت و خلوص بھرے ماحول میں تو واقعی وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ لیکن

مجھے واپس تو جانا پڑے گا اور میں ہر سال چھٹیوں میں آتی تو ہوں..... اور ہمیشہ ہی آتی رہوں گی۔ میں آپ لوگوں کی محبت کو بھلا کبھی بُھلا سکتی ہوں۔"

"وہ تو ہے..... مگر کاش تم شادی ہو کر ہمارے شہر ایبٹ آباد ہی آجاؤ۔ پھر تو تم ہمیشہ ہمارے پاس رہ سکوگی ناں....."

شانزے کی بات پر جہاں ماورا جھینپ کر مسکرائی تھی وہیں بی بی جان اور ایمل خان سنجیدہ ہوگئے تھے..... کیونکہ وہ جانتے تھے۔ اب ایسا ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے انہوں نے بات کو بدلا تھا۔

"بیٹا..... انسان چاہے جتنا بھی سوشل ہو مگر وہ فطرتاً سکون پسند ہوتا ہے۔ شوروغل، ہنگامے اور رونقوں سے اکتا کر سکون کی تلاش میں بالآخر گھر کی طرف لوٹتا ہے۔ جہاں مکمل سکون ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان چاہے دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے۔ ایک دن وہ اپنے اصل کی طرف، نیچر کی طرف ضرور لوٹتا ہے..... اور وہ پُرسکون اور فطری ماحول میں ہی خوش رہتا ہے۔ اور یہی اس کی پہچان ہوتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابی جان..... بابا جان بھی تو آپ سب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ یہاں گزرے اپنے بچپن اور جوانی کی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بھی یہاں آپ سب کے پاس واپس آجائیں گے۔"

"انشاء اللہ، اللہ ہم سب کے حق میں بہتر کرے۔" ماورا کی بات پر بی بی جان نے برجستہ کہا۔

☆☆☆

شمیل خان اور ایمل خان، بی بی جان کے بس دو ہی بیٹے تھے۔ آغا جان کی اپنی زمینیں تھیں۔ آغا جان کے انتقال کے بعد بی بی جان نے دونوں بچوں کو سنبھالا تھا۔ شمیل خان اس وقت سی ایس ایس کا امتحان دے رہے تھے اور ایمل خان یونی ورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ لہٰذا آغا جان کے انتقال کے بعد خود انہیں ہی زمینوں کی دیکھ بھال کا کام سنبھالنا پڑا، ایمل خان کا رجحان شروع سے زمینوں کی دیکھ بھال کی طرف تھا۔ وہ آغا جان کا ہاتھ بھی بٹاتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایگری کلچر میں ڈگری لی تھی اور اپنی آبائی زمینیں سنبھال لیں۔ جبکہ شمیل خان سول سروس میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے سی ایس ایس کر کے پولیس فورس جوائن کرلی۔ ان کے تبادلے ہوتے رہے اور بالآخر کراچی میں سیٹل ہوگئے۔ ماورا اور سمیر وہیں کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ شانزے، ایمل خان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ابھی چند سال قبل جب شانزے انٹر میں پڑھ رہی تھی تو اس کی ماں کا اچانک انتقال ہوگیا۔ یہ صدمہ ایمل خان کے لیے بہت بڑا تھا۔ صدمے سے نڈھال ایمل خان نے ماں کے ساتھ مل کر خود اپنے کو اور بیٹی کو سنبھال لیا تھا۔ بی بی جان بھی بیٹی جیسی بہو کی اچانک موت پر غم سے نڈھال تھیں مگر بیٹے کا دکھ اور نقصان بہت بڑا تھا۔ انہوں نے اپنے غم کو چھپا کر بیٹے اور پوتی کو بچوں کی طرح اپنی مہربان آغوش میں سمیٹ لیا اور پھر رفتہ رفتہ بی بی جان اور شانزے کی دلجوئی اور زمینوں کے معاملات کی مصروفیت نے ایمل خان کو سہارا دے دیا تھا۔ ماورا اسکول کی چھٹیوں میں ہمیشہ ایبٹ آباد ہی آتی تھی اور شانزے کے ساتھ مل کر خوب انجوائے کرتی تھی۔ بی بی جان اور ایمل خان انہیں دیکھ کر خوش ہوتے۔ شانزے کا کوئی بہن، بھائی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے ماورا کو ہی بہن اور دوست بنالیا تھا۔

ماورا نے انڈس ویلی سے گریجویشن کیا تھا۔ جبکہ شانزے کمپیوٹر سائنس میں بیچلر تھی۔ دونوں چھٹیوں میں فارغ ہو کر اکٹھا ہوتی تھیں۔ شانزے آگے اپنی اسٹڈیز جاری رکھنا چاہتی جبکہ ماورا کا فیشن

ڈیزائننگ میں ماسٹرز کرنے کا پلان تھا مگر دونوں کے بڑے ان کی شادی کرنے کا سوچ رہے تھے۔ کمیل خان نے تو اپنے دوست راحیل خان کے بیٹے موحد کو ماورا کے لیے پسند بھی کرلیا تھا۔ راحیل خان کا اپنا بزنس تھا اور موحد ان کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ وہ عنقریب موحد کے پرپوزل کو ماورا کے لیے فائنل کرنے والے تھے۔ بی بی جان اور ایمل خان سے انہوں نے پہلے ہی بات کرلی تھی۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ جبکہ سمیر abroad سے ایم بی اے کررہا تھا۔

☆☆☆

''دو دن بعد تم چلی جاؤ گی..... اب پتا نہیں کب تمہارا آنا ہوگا..... شاید شادی کے بعد.....! شادی کے بعد تم اپنے husband کے ساتھ ہی آؤ گی ناں۔'' وہ دونوں بیڈ پر کمبل میں لیٹی کوئی انگلش مووی دیکھ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ڈرائی فروٹ سے بھی انصاف ہو رہا تھا۔ جبھی شانزے نے اداسی سے کہا۔ اس کی سوئی اب تک وہیں اٹکی تھی اور ماورا شادی کے ذکر پر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا..... ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ تمہارے پرپوزل کی بات کررہی ہوں۔ کیا ہوا تمہارے اُس پرپوزل کا.....؟''

''کون سا پرپوزل..... کس کی بات کررہی ہو تم؟'' ماورا نے حیران ہوکر پوچھا۔

''کم آن ماوی..... میں بابا جان کے دوست راحیل انکل کے بیٹے موحد کے پرپوزل کی بات کررہی ہوں۔ بابا جان نے فون پر بی بی جان کو خود بتایا تھا۔ تمہارے لیے ان کے دوست کے بیٹے کا پرپوزل آیا ہوا ہے۔ جسے وہ جلد ہی فائنل کرنے والے ہیں۔'' شانزے نے تفصیل سے ساری بات بتائی تھی۔ ابھی بی بی جان نے کچھ دن پہلے ہی تو اسے سرسری سا موحد کے پرپوزل کے بارے میں بتایا تھا

پاور آف وائف

شوہر بیوی سے۔ ''یہ کیا تم ایک اور سوٹ لے آئی ابھی پرسوں ہی تو.....''

بیوی چلّا کر بولی۔ ''کیا پرسوں.....؟ ہاں..... پرسوں کیا؟ بتاؤ کیا پرسوں..... جلدی بتاؤ؟''

شوہر۔ ''کچھ نہیں..... میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ پرسوں بھی ایک ہی سوٹ لائی تھیں بیگم آج تو دو لے آتیں۔''

از: شانزیہ رباب، کاموکی

اور جسے وہ ایگزامز کی ٹینشن میں بھول بھال گئی تھی۔

''او..... تو تم موحد کی بات کررہی ہو، ہاں..... اس کے پرپوزل کی بات کی تھی اماں جان نے..... مگر مجھے ابھی اپنا ماسٹرز کرنا ہے۔ اپنا خود کا بوتیک کھولنا ہے۔ ابھی شادی میری پلاننگ میں نہیں ہے اور ویسے بھی یہ تو بابا جان اور اماں جان کا ہیڈک ہے۔ وہی میرے لیے فیصلہ کریں گے۔''

''اور تمہاری پسند..... موحد کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہیں وہ کیسا لگتا ہے؟ تمہاری تو اس سے اچھی خاصی دوستی بھی ہے۔'' شانزے نے سنجیدگی سے اس کی رائے جاننی چاہی۔

راحیل انکل، بابا جان کے بہت اچھے اور پرانے دوست ہیں۔ کافی سالوں سے گھر میں آنا جانا بھی ہے۔ اچھے فیملی ٹرمز ہیں ہمارے..... اور موحد سے میری اچھی دوستی بھی ہے۔ مگر میں نے موحد کے بارے میں کبھی اس طرح نہیں سوچا۔''

''تو اب سوچنا پڑے گا..... کیونکہ ابی جان بی بی جان بتارہے تھے کہ تمہارے بابا جان سنجیدگی سے موحد کے پرپوزل کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ لیکن اگر یہاں سے تمہارے لیے کوئی بہت اچھا پرپوزل آجائے تو تمہارے ایبٹ آباد میں مستقل

رہنے کا چانس بن سکتا ہے۔'' شانزے نے بے اختیار خوشگوار لہجے میں کہا۔

''کم آن شانزے...... میرے لیے یہاں کون پرپوزل بھیجے گا۔''

''کیوں نہیں...... اس میں ناممکن کیا ہے، تم اتنی پیاری ہو، کوئی بھی تمہیں پہلی بار دیکھ کر اپنا دل ہار سکتا ہے۔ تم نے اس دن شاپنگ کرتے ہوئے ان آنٹی کو نہیں دیکھا تھا کس طرح تمہارے بارے میں مجھ سے معلومات اکھٹی کر رہی تھیں۔ یقیناً ان کا ایک عدد ہینڈسم سا بیٹا ہوگا یا پھر کسی بندے کو تم ہی پسند آ جاؤ...... اور وہ اپنی فیملی کو تمہارے پرپوزل کے لیے بھیج دے۔''

اور اگلے لمحے جانے کس خیال کے تحت ماورا چند لمحوں کے لیے بالکل چپ رہ گئی۔ اسے یک دم ہی برستی بارش کی سرمئی شام کا وہ منظر یاد آ گیا تھا مگر پھر اگلے لمحے وہ سر جھٹک کر شانزے کی طرف متوجہ تھی۔

''تم بابا جان کو نہیں جانتیں شانزے...... وہ مجھے کبھی کراچی سے اتنی دور بیاہ کر نہیں بھیجیں گے۔ اماں جان بھی ایسا ہی چاہتی ہیں کہ میری شادی وہیں کراچی میں ہی ہو۔''

''تو کیا تم موحد کا پرپوزل قبول کر لوگی...... میرا مطلب ہے، تمہیں اپنے بابا جان کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں؟'' شانزے نے برجستہ سوالیہ لہجے میں کہا۔

''اعتراض کروں گی بھی تو کس بات پر...... میرے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے، نہ ہی کوئی دوسری چوائس...... اور پھر موحد میں کیا برائی ہے۔ وہ اچھا لڑکا ہے، پڑھا لکھا، ویل سیٹلڈ ہے۔'' ماورا کے جواب پر شانزے کا منہ لٹک گیا۔

''کاش...... میرا کوئی بڑا بھائی ہوتا تو میں تمہیں کہیں جانے نہ دیتی۔'' شانزے نے اداسی سے اس کے ہاتھوں کو تھام کر کہا تھا۔ اور شانزے کی پُر خلوص محبت پر اس نے بے اختیار ہی اسے گلے لگا لیا تھا۔

''کم آن شانزے...... اب اتنا بھی مت چڑھاؤ مجھے کہ میرا یہاں سے جانے کو دل ہی نہ چاہے اور میں ہمیشہ کے لیے یہاں مستقل ڈیرے ڈال لوں۔'' ماورا نے مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا۔

''یو آر موسٹ ویلکم ڈیئر...... میں بھی تو یہی چاہتی ہوں۔''

''گرو اَپ شانزے...... اب میں کوئی سات سمندر پار تو نہیں رہتی جو تم اتنی اداس ہو رہی ہو۔ کراچی یہاں سے دور ہی کتنا ہے۔ تم جب چاہو، میرے پاس آ سکتی ہو، ہم سیل فون اور اسکائپ پر بھی بات کر سکتے ہیں۔'' شانزے جھینپ کر کھسیاتے ہوئے اس سے الگ ہوئی تھی۔

''میں تو یوں ہی تمہیں تنگ کرنے کے لیے کہہ رہی تھی ماوی...... جانتی ہوں بابا جان سیریسلی موحد کے پرپوزل کو فائنل کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ابی جان اور بی بی جان کے پاس مشورے کے لیے ان کا فون آیا تھا اور موحد واقعی اچھا لڑکا ہے۔ تم دونوں کا اچھا میچ رہے گا اور پھر تم دونوں دوست بھی تو ہو۔ میں نے سنا ہے اچھے دوست اچھے لائف پارٹنر بھی ثابت ہوتے ہیں۔'' شانزے نے مسکراتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دی۔ پرسوں اس کی کراچی کے لیے فلائٹ تھی۔ اس نے اجنبی شخص کی وہ نیلی چھتری سنبھال کر رکھ دی تھی تاکہ کل یا پرسوں وہ واپس لینے آئے تو وہ اس کا شکریہ بھی ادا کر دے گی۔

''اچھا...... اب کیا سونا نہیں ہے...... مووی بھی ختم ہو گئی ہے۔'' ماورا نے چھتری کے بابت سوچتے ہوئے اسکرین کی جانب اشارہ کیا تو شانزے نے فوراً اٹھ کر ٹی وی آف کیا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم...... صبح جلدی اٹھنا بھی ہے۔ فجر کی نماز قضا کر دی تو بی بی جان بہت ناراض

ہوں گی اس لیے اب سو جاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ڈرائی فروٹ ٹرے کو اپنی جگہ پر رکھنے اٹھ گئی۔

☆☆☆

اگلا سارا دن اس کا مصروف ہی گزرا مگر اس کا دھیان مستقل اس اجنبی شخص اور چھتری پر جاتا رہا۔ وہ غیر محسوس طور پر اس اجنبی شخص کی منتظر رہی جو اس پر صرف چند لمحوں کی ملاقات میں اپنی ذات کے طلسم کا اسم پھونک کر جانے کہاں غائب ہو گیا...... اور پھر اس کا انتظار، انتظار ہی رہا تھا۔ اس کے جانے کا وقت قریب آچکا تھا۔ اس کی فلائٹ صبح دس بجے کی تھی۔ بی بی جان اور شانزے سے مل کر وہ ابی جان کے ساتھ ائرپورٹ روانہ ہو گئی۔ شانزے کو اس نے نیلی چھتری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

کراچی پہنچ کر اسے پتا چلا کہ بابا جان نے سچ مچ اس کے لیے موحد کا پروپوزل فائنل کر دیا ہے۔ شادی سے پہلے وہ اپنا ماسٹرز کرنا چاہتی تھی اور موحد نے وعدہ کیا تھا کہ فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹرز کرنے کے ساتھ، ساتھ وہ ماورا کو اس کا اپنا بوتیک کھولنے میں بھی ہر طرح سے سپورٹ کرے گا اور اتنے عرصے کی دوستی میں ماورا کو اتنا تو یقین تھا کہ موحد اپنے وعدے سے پھرنے والوں میں سے نہیں...... اس لیے اس نے بھی بابا جان کے فیصلے پر اپنی رضامندی دے دی تھی۔ یوں دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں مگر وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کے ایبٹ آباد سے کراچی آنے کے ایک ہفتے بعد ہی ایمل خان کا فون بھائی کے پاس آیا تھا۔ شانزے کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ ایبٹ آباد کی بہت اچھی فیملی سے ماورا کے لیے پروپوزل آیا تھا۔ لڑکا آرمی میں کیپٹن تھا، اسی لیے شانزے کے اصرار پر ایمل خان نے بڑے بھائی شمیل خان کو فون پر کنونس کرنے کی کوشش کی کہ اگر انہوں نے موحد کے پیرنٹس کو حتمی جواب نہ دیا ہو تو ایک بار شاہ زین اور اس کی فیملی سے مل لیں۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ موحد کے پروپوزل کے لیے ہاں کہہ چکے ہیں اور ایمل خان اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے خاندان میں زبان سے کیے عہد کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ ایک بار کسی سے عہد کر لیا جائے تو اس کی پاسداری کرنا ان پر لازم ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایمل خان بھی بڑے بھائی کے جواب پر زیادہ اصرار نہیں کر سکے۔ حالانکہ لڑکے والوں کی طرف سے خاصا اصرار کیا گیا تھا کہ ایک بار ان سے ملنے کے بعد فیصلے پر نظرِ ثانی کی جاسکتی تھی لیکن ایمل خان نے افسوس کے ساتھ معذرت کر لی تھی۔ حالانکہ انہیں بھی بڑے بھائی کی طرف سے انکار پر کافی افسوس ہوا تھا کیونکہ شاہ زین اور اس کی فیملی انہیں بہت پسند آئی تھی۔ اچھے مہذب اور خاندانی لوگ تھے جبکہ شانزے تو کافی رنجیدہ تھی...... اتنی دعاؤں کے بعد تو اس کی خواہش پوری ہونے جا رہی تھی۔ ماورا کے لیے سچ مچ ایبٹ آباد سے بہت اچھا پروپوزل آگیا تھا۔ اس کی شادی یہاں ہو جاتی تو وہ کراچی سے بیاہ کر ایبٹ آباد آجاتی۔ لیکن ابی جان نے جس طرح اسے ساری بات سمجھائی تو وہ اپنی ناراضی بھول کر مان تو گئی تھی مگر شمیل خان کے انکار کا ملال دنوں بلکہ کافی عرصے تک اسے رہا۔ ملال تو کسی اور کے دل کو بھی بہت ہوا تھا...... وہ منزل پر پہنچ کر بھی نامراد ٹھہرا تھا۔ شاید اس نے پہنچنے میں دیر کر دی تھی۔

شانزے یہی سوچتی رہ گئی کہ کاش شمیل خان اپنے دوست کو ماورا کی قسمت کا فیصلہ سنانے میں اتنی جلدی نہ کرتے۔ شاہ زین کی اماں جان اور بابا بڑی محبت سے ملے تھے۔ شانزے کو تو زرینہ بی بی بہت نفیس اور شفیق خاتون لگی تھیں۔ شاہ زین ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ انجانی فیملی ہونے کے باوجود زرینہ بی بی، ان لوگوں کے خلوص اور مہمان نوازی سے خاصی

متاثر ہوئی تھیں۔ انہیں بھی ماورا کی فیملی بہت پسند آئی تھی لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔

''بیٹا...... اب تم ماورا کے سامنے اس بات کا ذکر مت کرنا۔ شمیل لالہ نے راحیل بھائی کو شادی کی ڈیٹ دے دی ہے۔ اگلے ماہ ہم سب کو کراچی جانا ہے، تم اپنی تیاری کرلو۔ شمیل لالہ نے شادی سے ایک ہفتے پہلے تمہیں کراچی بھیجنے کو کہا ہے۔ ماورا کی بھی یہی خواہش ہے۔'' ابی جان اسے سمجھا رہے تھے۔

''جی ابی جان...... مجھے تو بہت ساری تیاریاں کرنی ہے اور مجھے تو ایک ہفتہ پہلے ہی جانا ہوگا۔ آپ فکر مت کریں، میں اپنی تیاری کرلوں گی۔''

ایمل خان اس کے روم سے باہر نکلے تو شانزے فوراً ماورا کو فون کرنے لگی۔ ابھی اسے ماورا کو شادی کی ڈیٹ فکس ہونے کی مبارک باد دینا تھی۔

☆☆☆

وہ شادی سے ایک ہفتے پہلے پہنچ گئی تھی۔ شانزے کے بغیر واقعی ماورا کی تیاریاں نامکمل تھیں...... سو وہ دونوں مایوں کے دن تک شاپنگ سینٹرز میں گھومتی رہی تھیں اور اس مصروفیت میں اسے ماورا کو شاہ زین کے پرپوزل کے بارے میں بتانا یاد ہی نہیں رہا تھا۔ دوسرے ابی جان نے بھی اسے ماورا کے سامنے تذکرہ کرنے سے منع کیا ہوا تھا کہ جس گلی جانا نہیں اس کا سفر بھی اختیار کرنے کا کیا فائدہ...... اور ماورا بے خبری میں بتلا بڑی دھوم دھام کے ساتھ بیاہ کر خان ولا سے رخصت ہو کر موحد پیلس چلی گئی۔ شانزے بہت اداس تھی، وہ ان دونوں کے ہنی مون روانہ ہونے تک کراچی میں ہی رکی رہی۔

بی بی جان ضعیفی کی وجہ سے نہ آسکی تھیں۔ وہ ابی جان کے ساتھ واپس ایبٹ آباد آ گئی۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ ان کی غیر موجودگی میں شاہ زین کی فیملی ایک بار پھر ان کے گھر آئی تھی۔ ان لوگوں نے ماورا کے پرپوزل سے معذرت کے بعد شانزے کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ماورا کے پرپوزل سے انکار کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ انہیں یہ فیملی بھا گئی تھی جبھی انہوں نے بڑے خلوص اور عاجزی سے شاہ زین کے لیے شانزے کا رشتہ مانگا تھا۔ زرینہ خان کو شانزے بھی اچھی لگی تھی اور وہ لوگ شاہ زین کی جلد شادی کرنا چاہتے تھے کیونکہ دو ماہ بعد انہوں نے حج کے لیے حرم شریف روانہ ہونا تھا۔ اس لیے وہ بیٹے کی شادی کے فرض کو ادا کر کے ہی حج کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے چونکہ ان لوگوں کو بھی شاہ زین کی فیملی بہت پسند آئی تھی۔ اس لیے انہوں نے کچھ دن کی سوچ بچار کے بعد یہ پرپوزل قبول کرلیا تھا اور کراچی میں بھی بڑے بھائی اور بھابی کو بھی خبر کردی تھی۔ وہاں سے بھی خوشی کا اظہار کیا گیا تھا۔ لہٰذا دونوں گھرانوں میں جلد ہی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ شانزے تو اس آنا فاناً چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق اپنے پرپوزل کے اوکے ہونے اور پھر شادی کی ڈیٹ فکس ہونے پر خاصی اپ سیٹ تھی۔ ماورا ان دنوں آسٹریلیا میں تھی۔ آسٹریلیا میں موحد کے بہن، بہنوئی سیٹلڈ تھے سو ان کا مہینے بھر کا پروگرام بنا تھا یوں اس کی شادی میں ماورا شریک نہیں ہوسکی تھی۔ اس نے شادی کی ڈیٹ آگے بڑھوانے کو کہا بھی مگر شاہ زین کے والدین کی مجبوری دیکھ کر اسے بھی خاموش ہونا پڑا تھا۔ یوں اپنی عزیز از جان سہیلی کی غیر موجودگی میں وہ بیاہ کر شاہ زین کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ یہاں آ کر اسے اندازہ ہوا کہ صرف شاہ زین ہی نہیں اس کی پوری فیملی بہت اچھی، ملنسار اور محبت کرنے والی ہے۔ وہ خدا کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔ اسے اتنی اچھی سسرال ملی تھی۔ وہ شاہ زین کو پا کر خود کو خوش قسمت تصور کررہی تھی کہ اسے شاہ زین جیسا مہذب، کیئرنگ اور ریسپیکٹ دینے والا فرینڈلی لائف پارٹنر ملا تھا اور شاید اسی وجہ سے اسے وہاں ایڈجسٹ

ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔
''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی شانزے ...... تم اتنی بے وفا نکلوگی ...... تم میرے بغیر شادی کرلوگی ...... یہ افسوس ساری زندگی میرے دل میں ملال بن کر رہے گا کہ میں تمہاری زندگی کے اتنے اہم اور یادگار موقع پر تمہارے ساتھ نہیں تھی۔''
ماورا کو شانزے کی شادی ہوجانے کے بعد جب یہ خبر ملی تو وہ شاکڈ ہی رہ گئی۔
''پلیز ماوئی ...... میرا یقین کرو، میں نے تو ابی جان اور بی بی جان سے بہت کہا تھا کہ شادی کی ڈیٹ آگے تمہاری واپسی تک بڑھادیں مگر شاہ زین کے پیرنٹس کی بھی مجبوری تھی۔ اتنی بڑی سعادت نصیب ہونے جارہی ہے انہیں۔ پھر ہم میں سے کوئی کیسے انہیں مجبور کرسکتا تھا۔ ورنہ تم تو جانتی ہو میں بھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تم تو میری سب سے اچھی دوست اور بہن ہو۔ آئی ایم سوری ماوئی ......'' آخر میں شانزے کا لہجہ گلوگیر ہوگیا تو ماورا بھی نرم پڑ گئی تھی۔ اب مزید گلے، شکوے کا جواز بھی کیا رہ گیا تھا۔ شاہ زین کے پیرنٹس حج کی سعادت کے لیے حرم شریف روانہ ہوچکے تھے۔
''اٹس او کے شانزے ...... تمہیں گلٹی فیل کرنے کی ضرورت نہیں، میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری مجبوری کو ...... مگر تم نے اپنی شادی کی تصویریں کیوں نہیں بھیجیں اب تک ...... مجھے تو پورا یقین ہے ...... شاہ زین نے تمہیں دیکھنے کے بعد ہی شادی کی جلدی مچائی ہوگی ...... کہیں اتنی پیاری لڑکی کے جملہ حقوق کسی اور کے نام محفوظ نہ ہوجائیں۔ ہے ناں ...... یہی بات ہے ناں ......'' اور شانزے بے ساختہ جھینپ کر مسکرانے لگی۔
''ارے نہیں ماوئی، شاہ زین نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں تھا۔ شادی سے پہلے ان کی اماں جان نے ہی پسند کیا تھا مجھے بلکہ ہماری فیملی انہیں بہت پسند آئی تھی۔ تم گھر آؤ گی تو ساری تفصیل بتاؤں گی اور شاید قسمت میں بھی یہی درج تھا۔ اب قدرت کے فیصلوں میں بھلا کون حائل ہوسکتا ہے اور شادی کی تصویریں اس لیے نہیں بھیجیں کہ تصویریں بنی ہی نہیں۔ شاہ زین کی فیملی میں تصویروں کا رواج نہیں ہے۔''
شانزے نے درمیان کی اصل بات گول کرکے مختصراً بتایا تھا۔ اب وہ فون پر ماورا کو کیا بتاتی کہ ماورا کے لیے آنے والا شاہ زین کا پروپوزل اس کا نصیب بن گیا۔ کیونکہ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ قدرت نے شاہ زین کو شانزے کے نصیب کا روشن ستارہ بنادیا تھا اور وہ اپنی اس خوش نصیبی پر بہت خوش تھی۔
''اچھا ٹھیک ہے، میں اور موحد اگلے ہفتے کراچی واپس آرہے ہیں۔ وہاں سے ایک ہفتے کے لیے ایبٹ آباد آنے کا پروگرام ہے۔ موحد بھی بی بی جان سے ملنا چاہتا ہے۔ تم لوگوں سے تو ان کی ملاقات ہوگئی تھی۔ تمہارے شاہ زین صاحب سے جبھی ملاقات ہوگی ہماری ...... ہم بھی تو دیکھیں کون ہماری پیاری بہن اور دوست کا ہم سفر بنا ہے۔'' ماورا نے محبت سے چور لہجے میں کہا تو شانزے جھینپ کر مسکرانے لگی۔
''ریئلی ماوئی یہ تو بہت اچھی خبر سنائی ہے تم نے۔ میں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ ابی جان تم دونوں کو انوائٹ کریں۔ بی بی جان نے کہا ہے وہ خود موحد اور اس کی فیملی کو ایبٹ آباد آنے کی دعوت دیں گی۔ اچھا ہے، شادی کے بعد موحد بھی ایبٹ آباد تمہارے ساتھ گھوم لے گا کیونکہ ہمارا ایبٹ آباد، آسٹریلیا سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔'' تب ماورا کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔
''وہ تو ہے، اپنے پیارے وطن کا تو مقابلہ ہی نہیں۔ اچھا ...... میں فون رکھتی ہوں ...... تم سے پھر بات کروں گی۔ مومنہ آپی نے ہمارے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام بنایا ہے آج ...... اس کے بعد تو ہماری روانگی قریب ہے چلو اب پاکستان آکر ہی تفصیلی بات ہوگی۔

بی بی جان اور رابی جان کو میرا سلام دینا۔ خدا حافظ......''
شانزے نے خوشگوار لہجے میں خدا حافظ کہہ کے فون رکھ دیا تھا۔ اسے تو ابھی سے ان دونوں کے آنے کی خوشی میں شاداب کا میچ پہنچ کر تیاریاں کرنی تھیں۔ شام کو شاہ زین کے گھر آنے پر وہ ایک دو دن کے لیے بی بی جان کی طرف جانے کی بات کرنے کا سوچ رہی تھی۔ وہ فون رکھ کر بی بی جان کا نمبر ملانے لگی۔

☆☆☆

موحد اور ماورا پاکستان آنے کے ایک ہفتے بعد سیدھے ایبٹ آباد پہنچے تھے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد شام کی چائے پر موحد ابی جان اور بی بی جان کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا جبکہ شانزے کچن میں گھسی ڈنر کی تیاریوں کو فائنل ٹچ دینے کے لیے ان سے معذرت کر کے کچن میں چلی آئی تھی۔ اس نے خاص طور پر ان دونوں کی پسند کی ڈشز بنوائی تھیں۔ اب بس شاہ زین کے آنے کا انتظار تھا۔ اس نے شام تک پہنچنے کا کہا تھا۔ تب ہی ماورا بھی اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔

''کم آن شانزے...... ہم تم سے ملنے آئے ہیں اور تم کچن میں گھسی ہوئی ہو، ابھی تو تم نئی نویلی دلہن ہو...... تمہارا کچن میں داخلہ منع ہے۔'' ماورا نے پیچھے سے آکر شرارت سے کہتے ہوئے بازو سے تھام کر شانزے کو چولھے کے سامنے سے ہٹایا تھا اور وہ نئی نویلی دلہن کے نام پر سچ مچ شرمانے لگی تھی۔

''ارے ماوی...... تم موحد بھائی کو وہاں اکیلے چھوڑ کے کیوں آ گئی ہو، میں بس تم لوگوں کے پاس ہی آ رہی تھی۔ سب کچھ ریڈی ہے، بیچارے موحد بھائی کیا سوچ رہے ہوں گے۔ مہمانوں کو چھوڑ کر میزبان خود غائب ہو گئی۔''

''کچھ نہیں سوچ رہے ہوں گے تمہارے موحد بھائی...... وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں کہ ہم دونوں کتنی باتونی ہیں۔ اور مجھے تو تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ تم موحد کی فکر مت کرو...... وہ ابی جان اور بی بی جان کے ساتھ بیٹھا مزے میں باتیں کر رہا ہے۔'' ماورا نے مسکراتے ہوئے کچن میں رکھی ڈائننگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا اور ہاتھ پکڑ کے شانزے کو بھی دوسری چیئر پر بٹھا لیا۔

''ٹھیک ہے، مجھے بھی تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں شاہ زین بھی آتے ہوں گے۔'' شانزے نے کہا تھا پھر سنجیدگی سے ماورا کی طرف دیکھنے لگی۔

''پتا نہیں مجھے تم سے یہ بات شیئر کرنی چاہیے یا نہیں...... مگر تم جانتی ہو، میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتی...... دراصل بات یہ ہے کہ تمہاری کراچی کے لیے فلائٹ کے بعد یہاں شاہ زین کے پیرنٹس تمہارے لیے اس کا پروپوزل لے کر آئے تھے۔'' ماورا حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''مجھے نہیں پتا کہ شاہ زین کی فیملی نے تمہیں کہاں دیکھ کر پسند کیا مگر انہوں نے بڑے اصرار اور محبت سے اس کے لیے تمہارا پروپوزل دیا تھا۔ ابی جان نے فون پر بابا جان سے اس بارے میں بات بھی کی تھی۔ انہیں یہ فیملی بہت پسند آئی تھی۔ اس لیے انہوں نے بابا جان کو فون کیا کہ وہ ایک بار شاہ زین اور اس کی فیملی سے مل تو لیں پھر فیصلہ کریں۔ مگر بابا جان نے فون پر ابی جان سے معذرت کر لی۔ انہوں نے تمہیں بھی بتانے سے منع کیا تھا۔ کیونکہ وہ تمہارا اور موحد کا رشتے طے کر چکے تھے۔'' ماورا گم صم بیٹھی شانزے کی بات سن رہی تھی۔

''یہ کب کی بات ہے شانزے؟'' ماورا نے اگلے لمحے برجستہ پوچھا وہ حیران تھی کہ شاہ زین یا اس کے گھر والوں نے اسے کب اور کہاں دیکھ کر پسند کیا۔

''تمہارے کراچی واپس جانے کے ایک ہفتے بعد وہ لوگ آئے تھے مگر پھر بابا جان کے انکار کے

بعد ابی جان نے افسوس کے ساتھ ان لوگوں سے معذرت کرلی۔ اور جب ہم کراچی سے تمہاری شادی اٹینڈ کرکے واپس آئے تو پتا چلا وہ بی بی جان کے پاس دو دفعہ آچکی تھیں اور ہمارے آنے پر ایک بار پھر سوالی بن کر ہمارے گھر موجود تھیں۔ وہ شاہ زین کے لیے مجھے مانگ رہی تھیں۔ انہیں ابی جان اور بی بی جان سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی اور ابی جان نے یہ سوچ کر کہ ان لوگوں نے تمہارے لیے انکار کو انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے کشادہ دلی کا ثبوت دیا۔ تب بی بی جان اور ابی جان نے بابا جان کے ہی مشورے سے یہ پروپوزل قبول کرلیا۔ اس کے بعد سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں اس بارے میں پتا ہونا چاہیے۔ حالانکہ میں جانتی ہوں...... تمہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' اور ماورا سوچ رہی تھی کہ اس کے ماں، باپ نے اس سے یہ بات کیوں چھپائی۔ صرف اس لیے کہ وہ اسے اپنے سے دور ایبٹ آباد بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ اور اب وہ شاہ زین کا سامنا کس طرح کرے گی کیونکہ بابا نے تو اس کے پروپوزل سے انکار کردیا تھا۔ کتنا عجیب سا لگے گا اس سے مل کر اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں ایبٹ آباد میں شاہ زین کی فیملی نے اسے کہاں دیکھ کر پسند کرلیا تھا۔ وہ تو کسی ایسی فیملی سے کبھی نہیں ملی تھی۔ یہ اور اس طرح کے کئی سوال اس کے ذہن میں مچل رہے تھے۔ اور وہ یک دم ہی کنفیوژڈ ہوگئی تھی۔

''کیا ہوا ماوی...... تم کیا سوچنے لگی ہو...... تمہیں برا تو نہیں لگا؟'' شانزے نے اسے گم صم دیکھ کر فکر مند لہجے میں کہا۔

''ارے نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے کیوں برا لگے گا۔ میں تو شاہ زین کی فیملی کو جانتی بھی نہیں ہوں اور پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ ایسا اماں جان کہتی ہیں...... اور

حیرت

ساجد صاحب کی بیگم چند دن میکے میں گزار کر آئیں تو ساجد صاحب انہیں گزرے دنوں کا احوال سناتے ہوئے بولے۔ ''ارے ہاں بیگم...... ایک رات گھر میں چور گھس آیا تھا۔ تم یہاں ہوتیں تو دیکھتیں کہ میں کس طرح ایک ساتھ تین، تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آیا۔'' وہ سینہ تان کر بولے۔

''سنیے کیا چور چھت پر تھا؟'' ان کی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

مرسلہ: سنبل ملک، شاہدرہ

ٹھیک ہی کہتی ہیں جو تمہارے نصیب میں لکھا تھا، اسے اسی طرح تم تک پہنچنا تھا' ڈونٹ وری...... میں بالکل کنفیوژڈ نہیں ہوں۔'' ماورا اپنے اندر کی کیفیات چھپاتے ہوئے فوراً چیئر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو...... سٹنگ روم میں چلتے ہیں...... بی بی جان کے پاس۔'' ماورا نے خود کو کمپوزڈ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں، چلو...... سب کچھ ریڈی ہے...... میں تو اپنی تسلی کرنے آئی تھی۔ کچھ رہ نہ گیا ہو۔'' شانزے نے بھی تائید کی اور دونوں کچن سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

موحد بڑی دلچسپی سے بی بی جان اور ابی جان کے پاس بیٹھا ابی جان کے بچپن کا کوئی قصہ سن رہا تھا۔ شانزے اور ماورا سٹنگ روم میں داخل ہوئیں تو باتوں کا رخ شاہ زین کی آمد کی طرف مڑ گیا۔ وہ اب تک نہیں آیا تھا۔

''شانزے بیٹا...... تم نے شاہ زین کو فون کیا...... وہ کب تک آئے گا؟'' بی بی جان نے اس سے پوچھا تھا۔

''بس بی بی جان...... وہ آتے ہی ہوں گے،

کہہ رہے تھے کہ شام تک پہنچ جائیں گے۔''

اور اسی وقت شاہ زین نے سٹنگ روم میں قدم رکھا تھا۔ ماورا اور موحد دیوان پر بیٹھے تھے۔ بی بی جان اور شانزے کاؤچ پر بیٹھی تھیں۔ ابی جان آتش وان کے پاس رکھی اپنی مخصوص چیئر پر بیٹھے تھے۔ شانزے، شاہ زین کو دیکھ کر بے اختیار خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کاؤچ سے اٹھی تھی۔

''یہ لیں بی بی جان...... شاہ زین بھی آگئے۔''

سب کی نظریں باہر سے سٹنگ روم میں داخل ہوتے اسمارٹ سے گڈلکنگ شاہ زین کی طرف اٹھی تھیں مگر ماورا کی نظر تو جیسے سامنے کھڑے شخص پر جم کے رہ گئی تھی۔ وہ وہی تو تھا...... جو اس روز گہری شام کی برستی بارش میں کالونی کی سنسان سڑک پر اسے ملا تھا اور اسے بحفاظت منزل تک پہنچانے آیا تھا...... اور نیلی چھتری اسی کے ہاتھ میں تھما گیا تھا۔ اسے بارش میں بھیگنے سے بچانے کے لیے اور وہ غیر ارادی طور پر اس کی منتظر رہی تھی کہ وہ اپنی چھتری واپس لینے ضرور آئے گا۔ تب اچانک ہی اس کے دماغ میں اپنے ہی کہے لفظوں کی بازگشت گونجی تھی۔

''کم آن شانزے...... میرے لیے یہاں کون پروپوزل بھیجے گا۔'' ماورا کے اپنے لفظوں کی بازگشت اس کے اردگرد گونجی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اجنبی شخص شاہ زین ہی تھا جس نے اس کے کراچی جانے کے ایک ہفتے بعد اپنا پروپوزل ماورا کے لیے بھجوایا تھا۔ اس وقت شاہ زین بھی ماورا کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ تب ہی بی بی جان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''آؤ شاہ زین بیٹا...... وہاں کیوں رک گئے......'' اور تب ماورا کو بھی ایک وم سچویشن کا احساس ہوا تھا۔ وہ نظروں کا زاویہ بدل کر بی بی جان کی طرف دیکھنے لگی۔

''السلام علیکم...... آئی ایم سوری...... میں کچھ لیٹ ہوگیا۔'' اس نے شرمندہ لہجے میں کہا تھا۔

''وعلیکم السلام...... جیتے رہو بیٹا کوئی بات نہیں...... ہم ابھی تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔ ماشاءاللہ ...... بڑی لمبی عمر ہو تمہاری۔'' بی بی جان نے شاہ زین کو دیکھ کر فوراً کہا تھا۔ وہ باری، باری موحد اور ابی جان سے ملا تھا اور کاؤچ پر ہی بی بی جان کے پاس بیٹھ گیا۔

''یہ موحد ہے، اپنی ماورا کا شوہر...... اور ماورا کے بارے میں تو تم جانتے ہو، میری لاڈلی پوتی ہے، شانزے کی بیسٹ فرینڈ اور بہن سب کچھ ہے اور یہ دونوں میری آنکھوں کا نور ہیں۔'' شاہ زین کے پاس کھڑی شانزے جھینپ کر مسکرانے لگی۔ بی بی جان کی بات سن کر شاہ زین کے ساتھ موحد بھی مسکرانے لگا تھا۔ اور یوں ماورا کو خود کو کمپوزڈ کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

''میرے خیال میں، میں اور ماورا ڈائننگ ٹیبل سیٹ کرتے ہیں تب تک آپ لوگ باتیں کریں، ٹھیک ہے ناں ماورا۔'' شانزے نے ماورا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شانزے نے بروقت اس کی مشکل آسان کردی تھی۔ وہ خود بھی اس وقت یہاں بیٹھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ کی کیفیت عجیب ہی ہو رہی تھی۔

''ہاں ٹھیک ہے بیٹا......'' بی بی جان بولی تھیں۔ وہ دونوں باہر چلی گئیں اور موحد اور شاہ زین آپس میں بات کرنے لگے۔

☆☆☆

موحد میں کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ ایک اچھا دوست اور اچھا لائف پارٹنر تھا مگر سچائی جاننے کے بعد ایک کسک سی ماورا کے دل میں صلیب بن کر گڑ گئی۔ کاش کہ وہ بے خبر ہی رہتی۔ ہلکا سا ملال اس کے اندر کہیں گہرائی میں ٹھہر گیا تھا۔ اس نے اجنبی شخص کی امانت اس کی نیلی

چھتری سنبھال کر رکھی تھی مگر وہ انتظار، انتظار ہی رہا تھا یا پھر شاہ زین نے ہی لوٹنے میں دیر کردی تھی۔ شاید وہ لمحوں کی فسوں خیزی کا اثر تھا یا پھر وقتی موسم و ماحول کی اثر انگیزی..... اس شخص کی ذات کے طلسم نے ماورا شمیل خان کو مسمرائزڈ کر دیا تھا۔ محبت یوں نہیں ہوتی۔ نہ ہی عشق لمحوں میں وقوع پزیر ہوتا ہے پھر اس کیفیت کو کیا کہا جاسکتا تھا۔ جس نے انجانے میں نہ چاہتے ہوئے بھی ماورا کی آنکھوں کو انتظار سونپ دیا تھا۔ وہ کراچی جانے سے پہلے اس اجنبی شخص کی منتظر رہی تھی۔ اس نے اجنبی شخص کی امانت کو سنبھال ... کر رکھا تھا۔ وہ اسے واپس کرنا چاہتی تھی۔ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر شاید اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ڈنر کے بعد وہ چاروں لان میں بیٹھے شانزے کے ہاتھ کی بنی مزیدار کافی پی رہے تھے۔ موحد اور شاہ زین آپس میں جانے کون سی باتیں کر رہے تھے۔ ماورا اپنی سوچوں میں گم تھی۔ تبھی شانزے ہاتھ میں نیلی چھتری لیے لان میں چلی آئی تھی۔ جسے دیکھ کر موحد کے ساتھ بیٹھا شاہ زین بھی چونک کر دیکھنے لگا تھا اور ماورا حیران تھی کہ شانزے کو یہ کہاں سے مل گئی۔ اس نے تو اپنی الماری کی نچلی دراز میں رکھی تھی۔

''ماوی......تم پچھلی بار یہ چھتری یہیں پر بھول گئی تھی۔ جاتے ہوئے اسے اپنے سامان میں رکھ لینا۔'' شانزے نے نیلی چھتری کو سینٹرل ٹیبل پر ماورا کے سامنے رکھا اس وقت شاہ زین اور ماورا نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور ماورا نے فوراً نگاہیں چرائی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے اندر چھپی کسک اور ملال کی ہلکی سی جھلک بھی شاہ زین کو اس کی آنکھوں میں دکھائی دے سکے۔ کاش..... شانزے نے اسے شاہ زین کے پروپوزل کے بارے میں نہ بتایا ہوتا..... یا پھر شاہ زین وہ اجنبی شخص نہ ہوتا جس نے نیلی چھتری اس کے پاس چھوڑی تھی۔ ماحول کی گمبھیر خاموشی میں اس نے لمحوں میں خود کو کمپوز کرتے ہوئے پر سکون لہجے میں کہا۔

''اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ اب یہ تمہاری ہے کیونکہ اب میں نے برستی بارش میں گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ کبھی کبھی ہم راستے میں ہوتے ہیں، منزل ہمارے سامنے ہوتی ہے مگر ہم راستہ بھٹک جاتے ہیں۔'' وہ بھول گئی تھی کہ اسے اس اجنبی شخص کو یہ نیلی چھتری واپس کرنی تھی۔ اس کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ جس نے اندھیری شام کی برستی بارش میں نہ صرف اسے رستہ دکھایا تھا بلکہ اسے بحفاظت اس کی منزل تک بھی پہنچایا تھا مگر وہ اجنبی شخص واپس لوٹا تو وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

''ہاں شانزے..... اسے اپنے پاس ہی رہنے دو، جب تمہیں اپنی دوست کی یاد آئے تو اسے نکال کر دیکھ لینا۔''

شاہ زین نے پہلی بار اُن کی گفتگو میں حصہ لیا تھا مگر ماورا نے اس کی آنکھوں میں بے اختیار کچھ تلاشنے کی کوشش کی تھی۔ ملال اور ہلکی سی کسک کا احساس تو اس شخص کی گہری آنکھوں میں بھی چند لمحوں کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ وہ نیلی چھتری کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ قسمت نے انہیں دوبارہ کس مقام پر ملایا تھا جہاں وہ آشنا ہو کر بھی اجنبی بننے پر مجبور ہو گئے تھے۔ کیونکہ ہم قسمت کے فیصلوں سے نہیں لڑ سکتے اور شانزے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکرا کر ماورا کی طرف دیکھنے لگی جو کافی کا مگ تھامے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں بیک وقت ہلکے سے مسکرا دی تھیں۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہ قسمت کے ستارے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ انجانے میں اس سے ٹکرا جاتے ہیں جس سے نصیب کے تار جڑے نہیں ہوتے۔ ہم انسانوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے مگر کہیں نہ کہیں ذات کے کسی حصے میں بہت گہرائی میں ایک ملال رہ جاتا ہے اور ایک کسک عمر بھر کے لیے صلیب بن کر دل میں گڑی رہ جاتی ہے۔

مکمل ناول



کس کی شادی

شیریں حیدر

میں کمرے سے نکلی تو تولیا میرے ہاتھ میں تھا، بال کھلے ہوئے اور دوپٹا ندارد...... میں کام پر جانے سے پہلے نہانے کے لیے کمرے سے نکلی تھی، باہر اماں کے قریب ہی کوئی نوجوان کھڑا تھا، میں ٹھٹک گئی، واپس مڑی اور کمرے سے دوپٹا لے کر دوبارہ باہر آئی تو اماں اکیلی تھیں۔

''کون تھا اماں یہ...... اور یہاں کیوں آیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بلال ہے......'' اماں نے یوں کہا جیسے بلال میرا بچھڑا ہوا بھائی تھا، میری نظروں میں استفسار قائم رہا۔''کوٹھی والوں کا لڑکا ہے......'' اماں نے معلومات کا دائرہ بڑھایا، گویا ہم جس کوٹھی کی ایک سرونٹ کوارٹر نما انیکسی میں رہ رہے تھے، اس کے وسیع وعریض خاندان کا وہ ایک فرد تھا۔

''یہاں کیوں آیا تھا؟'' میں نے ابرو اچکائے۔

''بیٹا...... پانی نہیں آ رہا تھا نل میں، مجھے تو اس شہر کا ابھی کچھ پتا نہیں تو میں نے باہر نکل کر دیکھا، بلال میاں سے ہی ملاقات ہوگئی اور میں نے انہیں بتایا تو انہوں نے کہا کہ وہ خود ہی دیکھ لیتے ہیں کیونکہ اس طرح کا مسئلہ اکثر گھر میں ہو جاتا ہے...... انہوں نے پانچ منٹ میں ہی مسئلہ حل کر دیا، اچھا ہوا ورنہ تم ڈیوٹی سے لیٹ ہو جاتیں۔'' اماں نے اب پوری وضاحت کی۔ میں نے کچھ کہے بنا غسل خانے کا رخ کیا، نہا کر نکلی تو اماں چائے تیار کر کے بیٹھی تھیں، میں نے چائے اور بسکٹ کھا کر اپنی تیاری کی، اماں کو خدا حافظ کہا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی ڈیوٹی کے پہلے دن کے لیے روانہ ہوئی۔ سفر چند قدموں کا تھا۔

ابا کی وفات ہوئی تو ہم پر مصیبتوں اور آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ زمین پر اگلا قدم بھی کہاں دھرنا ہے۔ ابا کا چلتا کاروبار تھا اس لیے ہمیں کسی چیز کی کمی نہ تھی، راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ چند دن قبل ابا کے چہرے سے پریشانی مترشح رہنے لگی تھی...... میں تو ان کی اکلوتی اور نازوں پلی اولاد تھی، میں بھی بھانپ گئی۔ اماں تو ان کی سانس، سانس کی ساتھی تھیں انہوں نے بھی ابا سے پوچھا مگر ابا کے پاس ہمارے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اگر تھا بھی تو شاید وہ بتانا نہیں چاہتے تھے...... پھر ابا گھر پر بیٹھ گئے، کچھ کھاتے نہ پیتے اور ہر وقت غم میں ڈوبے رہتے۔ کیسا برا دن تھا جب میں سویرے اٹھی تو اماں نے بتایا کہ ابا نے خود کو زندگی کی قید سے آزاد کر لیا تھا۔ ہاہ! میری اور اماں کی دنیا ہی لٹ گئی، ہم پر جتنی قیامت گزری تھی اس کا بیان مشکل ہے۔

ابا کے ایک ہی دوست تھے...... جو جانے کہاں سے ابا کی وفات کی خبر سن کر پہنچ گئے، ابا نے اتنی پیاری زندگی کو کیوں ختم کیا، اس سوال کا جواب نہ مل پاتا جو وہ رشتے دار نہ آتے۔ انہوں نے بتایا کہ ابا کے بزنس پارٹنر نے ان کے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا تھا، بظاہر عام کاغذوں کی آڑ میں ابا سے کوئی ایسے کاغذات دستخط کروا لیے تھے جن کی رو سے ابا نے اپنا سارا حصہ انہیں بیچ دیا تھا...... اس لالچی کا لالچ میرے ابا کو لے گیا، میرے دل کی گہرائیوں سے نفرت کی لہر اٹھی، میرا دل چاہا کہ میں دنیا کو تہس نہس کر دوں، ہمارا سب کچھ لٹ گیا تھا، ہم نے اپنا آسرا ہی نہیں کھویا تھا بلکہ ہم کنگال ہو گئے تھے...... بس جیسے تیسے عزت سے باپ کو دفنانے کے بعد کچھ نہ بچا تھا، انکل فیض کا جس قدر احسان مانتے کم تھا، انہوں نے ہمارے سروں پر اس وقت دست شفقت رکھا جب ہم مایوسیوں کی تاریکی میں تھے۔ جس گھر میں ہم رہتے تھے وہ گھر بھی ہمارا نہ رہا تھا، مجبوری سی مجبوری تھی......

انکل کو واپس جانا تھا، وہ ہم سے وعدہ کر گئے کہ چند ہی دنوں میں واپس لوٹیں گے اور کچھ سوچ کر آئیں گے۔ چند دن گزارنا بھی مشکل لگ رہا تھا، ہم ایک، ایک پل اور پائی گن...... گن کر اور ترس، ترس کر گزار رہے تھے، اماں کی عدت ختم ہوئی تو تب تک ہم گھر کے سامان میں سے کافی غیر ضروری سامان بیچ باچ چکے تھے، انکل کے آنے کی امید دم توڑ چکی تھی جب وہ لوٹے۔ واپس آئے تو ان کا چہرہ بھی تاریک تھا۔

''میں نے اپنی بیوی کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ میں تم لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاتا......'' انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔ ''مگر اس بھلی مانس کو عقل نام کی چیز ہی کم ملی ہے، کہنے لگی کہ جوان بیٹوں کا گھر

ہے، وہ کسی کی جوان بیٹی کو وہاں نہیں رکھ سکتی..... میں نے تو یہ بھی تجویز کیا کہ ہم نگاہ کو اپنی بہو بنا لیتے ہیں مگر وہ ذرا اور طرح کے دماغ کی ہے، کہنے لگی، جانے کیسی لڑکی ہو اور پھر اس کے باپ نے خودکشی جانے کیوں کی۔'' انکل کی بات پر میرے دل کو گھونسا لگا۔

''میں یہ سب باتیں تم لوگوں سے چھپا بھی سکتا تھا بیٹا.....'' انکل رسان سے گویا ہوئے۔ ''مگر فقط اس لیے تمہارے دل کو تکلیف پہنچائی ہے کہ تم جان سکو کہ اس کے بعد اس دنیا کے کن کن کس طرح کے سوالوں کا تم لوگوں کو سامنا کرنا ہوگا، میری بیوی جب میرے جان سے پیارے دوست کی خودکشی پر سوال اٹھا سکتی ہے تو باقی لوگ کیا کچھ نہیں کہیں گے...... میں لڑ جھگڑ کر بھی تم لوگوں کو ساتھ لے جاتا اور میری بیوی چوں چرا نہ کر سکتی مگر وہ جگہ جگہ بیٹھ کر تم لوگوں کے بارے میں باتیں کرتی اور تمہارا ناطقہ بند کر دیتی، عورتوں کو گھروں میں بند کیا جا سکتا ہے مگر ان کی زبانوں کو بند نہیں کیا جا سکتا......''

ہم ماں بیٹی بغور ان کی باتیں سن رہے تھے، دل سے ان کی فراست کے قائل ہو رہے تھے، جب انہوں نے اپنے بیٹے کے ساتھ میری شادی کی بات کا اشارہ دیا تو میرا دل عجیب انداز سے دھڑکا، ابا کی زندگی میں تو اماں میری شادی کا نام لیتیں تو ابا بھڑک اٹھتے جیسے انہوں نے مجھے ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھنا تھا..... اماں کو میری گزرتی عمر کی فکر تھی، پڑھائی بھی میں نے چھوڑ دی تھی کہ ابا کو میرا یونیورسٹی جانا پسند نہ تھا کہ وہاں لڑکے بھی ہوتے تھے۔ میری بھی یہی سوچ تھی، مجھے بھی ابا کو چھوڑ کر جانا گوارا نہ تھا، میری شادی کر کے میرے شوہر کو ابا گھر پر بھی تو رکھ سکتے تھے، کہاں لکھا ہے کہ لڑکی بیاہ کر لڑکے کے گھر جائے؟ لڑکا بھی تو بیاہ کر لڑکی کے گھر پر آ سکتا ہے..... میں اپنے معصوم ذہن سے سوچتی مگر جانتی بھی نہ تھی کہ کچھ رسوم بے لکھے ہی طے ہوتی ہیں۔

''میں اپنے شہر لے جاتا تم لوگوں کو مگر وہاں میں تم لوگوں سے رابطہ رکھوں گا تو میری بیوی جان جائے گی اور تم لوگوں کے خلاف محاذ آرائی شروع ہو جائے گی، اس لیے میں تم لوگوں کے سامنے دو صورتیں رکھتا ہوں، پہلی یہ کہ تم لوگ یہیں رہو، میں جس طرح ہو سکے گا دیکھ بھال کرتا رہوں گا اور جب بھی بن پڑا نگاہ بیٹی کو دیکھنے آتا رہوں گا، اس کے فرض سے بھی جلد از جلد سبکدوش ہونے کی کوشش کروں گا.....'' انکل رکے تو ہم دونوں کی نگاہیں اٹھیں جو ابھی تک ان سے بات کرنے کے لیے جھکی ہوئی تھیں۔

''دوسری صورت......'' وہ پھر گویا ہوئے۔ ''یہ شہر چھوڑ دو تم لوگ کیونکہ کم از کم اس شہر کے لوگ اور تمہارے جاننے والے اکرام کی خودکشی کو بھولنے والے نہیں، اس کا یہ عمل تم لوگوں کی زندگیوں کو پیچیدہ بنا دے گا، کسی نئے شہر میں جا کر اپنی زندگیوں کا آغاز کرو، تھوڑا بہت جھوٹ بول کر۔''

''کیا جھوٹ بول کر انکل؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''صرف اکرام کی وفات کے بارے میں......'' انکل نے کہا۔ ''یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سال پہلے اس کی کسی بیماری کے باعث وفات ہو گئی تھی...... اس میں کچھ غلط بھی نہیں، خودکشی کرنے والا انسان ذہنی طور پر بیمار ہی تو ہوتا ہے!'' انکل نے بات مکمل کی۔

''ہم بھلا کہاں جائیں گے......؟'' اماں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ساری عمر اسی شہر میں گزر گئی ہمیں تو اپنے گھر سے باہر کی دنیا کا بھی علم نہیں، اب کیا ہجرت کریں گے اور نئی جگہ نئے لوگوں میں کیونکر گھلیں ملیں گے؟''

''پرانے لوگ تو آپ لوگوں کے وجود پر لگے اس داغ کو کبھی مدھم نہ پڑنے دیں گے بھابی جی! آپ کو علم بھی نہیں کہ باہر لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہوں گے..... کیا، کیا قیافے لگاتے ہوں گے، ہم

سب کی فطرت ایسی ہی ہے..... کئی لوگ سوچتے ہوں گے کہ باپ نے بیٹی کی وجہ سے خودکشی کی ہوگی اور کئی کہتے ہوں گے کہ بیوی نے شوہر کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا.....''

''ایسے کیوں کہیں گے لوگ.....؟'' میں نے فوراً انکل کو ٹوکا۔ ''ہم تو کسی کے بارے میں اس طرح نہیں سوچتے.....''

''بیٹا دنیا میں ہر کوئی تم جیسا اچھا نہیں ہوتا.....'' انکل نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''میرے ذہن میں دو ایک شہر اور حالات ہیں، تم سن کر خود فیصلہ کرلو، مجھے آج واپس جانا ہوگا، جو فیصلہ کرلو اس کے مطابق اپنا سامان تیار کرلینا، میں ہفتے بھر میں آ جاؤں گا اور تم لوگوں کو نئی جگہ منتقل کردوں گا۔'' انکل نے اس کے بعد ہم دونوں کو پوری تفصیل سے بتایا اور ہم ہمہ تن گوش انہیں سنتے رہے..... ان کے جانے کے بعد ہم ماں، بیٹی اٹھتے بیٹھتے آپس میں اسی موضوع پر بات کرتے اور بالآخر ہم نے فیصلہ کرلیا، اس کے بعد انکل کے آنے کا انتظار کرنے لگے کیونکہ اس کے علاوہ ہمارا ان سے کوئی رابطہ نہ تھا۔

☆☆☆

سکندر صاحب ساٹھ کی دہائی میں سفر کررہے تھے..... ان کے پانچ بیٹے اور ان کی اولادوں کا وسیع و عریض کنبہ بھی اسی محل نما گھر میں ان کے ساتھ رہتا تھا مگر پھر بھی وہ تنہائی اور ڈپریشن کے مرض کو دوست بنا بیٹھے۔ ڈاکٹر نے تجویز کیا تھا کہ ان کے لیے کوئی کل وقتی ملازم کی ضرورت تھی جو مرد یا خاتون کوئی بھی ہو سکتا تھا جو انہیں دواؤں اور ورزش کے ساتھ ساتھ توجہ اور وقت دے سکے کیونکہ یہی دو چیزیں ان کے بچوں کے پاس کم تھیں۔ انکل نے بتایا تھا کہ سکندر صاحب ان کے ایک دوست کے والد تھے اور ایک جدی پشتی رئیس ہونے کے باعث اس قدر مالدار تھے کہ انہیں خود بھی اپنی دولت کا اندازہ نہ تھا..... جہاں دولت کا ذکر آیا، میں ذرا ہدک گئی مگر مجھے انکل نے سمجھایا کہ تمہیں ان کی دولت سے کیا لینا دینا تھا، کون سا تم ان کے ساتھ کاروبار کرنے جارہی ہو۔ انہیں لگا کہ ہم ماں بیٹی کو اس گھر اور اس ملازمت سے زیادہ تحفظ اور کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ میں اس گھر کے انیکسی نما کوارٹر میں پہنچ کر جب اپنے کمرے کے پلنگ پر فارغ ہوکر بیٹھی تو میری آنکھوں سے جھڑی لگ گئی۔

انکل کے ساتھ سیدھا ہمیں انٹرویو کے لیے سکندر صاحب کے پاس ہی لے جایا گیا، سوالات اور جوابات کے طویل سلسلے کے بعد سکندر صاحب نے رضامندی دے دی تو میں نے گہری سانس لی۔ نفیس سے بزرگ تھے، مجھے دل میں خوف تھا کہ کہیں کوئی فرعون صفت بڈھا نہ ہو، غصیلا اور بدزبان نہ ہو۔ ان کی شخصیت میں دبدبہ تھا مگر ان کے ہونٹوں پر مستقل مسکان اس دبدبے کے ساتھ مل کر ان کے چہرے پر نرمی کا تاثر پیدا کررہی تھی۔ سکندر صاحب کے بیٹے تو نہیں مگر ان کی بہوؤں نے بھی کسی نہ کسی موقع پر ''انٹری'' دے کر ہمارا تنقیدی جائزہ لیا، انکل کے کہنے کے مطابق ابا کی وفات کے بارے میں جھوٹ بولنا پڑا اور پہلی ہی بار میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ ابا کی وفات کے بارے میں اس بے ضرر سے جھوٹ نے ایک سے زائد سوالوں کے جوابات دینے کی زحمت سے محفوظ رکھا تھا۔ ان کی خودکشی کا بتاتے تو سوالات کا ایک پنڈورا باکس کھل جاتا، سکندر صاحب زیادہ بولنے اور کم سننے کے شوقین لگ رہے تھے۔

انٹرویو کے دوران ہی ایک اور آدمی کے آنے پر انکل اٹھ کھڑے ہوئے، اس سے گلے ملے، اس کے کندھے تھپتھپا کر پوچھا۔

''کیسے ہو اینگری ینگ مین؟'' جواباً وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

میں نے اور اماں نے بیٹھے بیٹھے سلام کیا، اس کی استفہامیہ نظریں ہماری طرف اٹھیں، انکل نے

مختصراً اسے بتایا اور پھر چونکے۔

"سوری بیٹا! اس کا تعارف تو کروایا ہی نہیں تم سے..... یہ محسن ہے، سکندر صاحب کا بیٹا اور میرا کلاس فیلو، میرا کاروباری ساجھے دار بھی اور اسی نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ اس کے والد صاحب کے لیے کسی اچھی نرس کی ضرورت ہے....."

"اچھا....." محسن صاحب نے لمبی سی اچھا کہی۔ "کیا تم نے نرسنگ کا کوئی کورس کر رکھا ہے؟" انہوں نے پوچھا تو میں ہکلا گئی۔

"نہیں انکل....." میں نے فوراً کہا۔ "اصل میں انکل کا خیال تھا کہ....."

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے....." انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "مجھے بھی کسی سند یافتہ نرس کی ضرورت نہیں تھی..... میرے خیال میں آپ کو پاپا کی اس طرح دیکھ بھال کرنی ہے کہ جس طرح بیٹیاں کرتی ہیں..... کیونکہ پاپا کی اپنی کوئی بیٹی ہے نہیں اور کسی بہو کے دل میں بیٹیوں جیسے جذبات پیدا نہیں کیے جا سکتے، مجھے امید ہے کہ آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی مس.....؟"

"نگاہ..... نگاہ ناز....." میں نے فوراً کہا۔

دل تو چاہا کہ اتنی طویل تقریر کے جواب میں ان سے یہ تو پوچھوں کہ کیا ان میں بھی ہمت نہیں کہ اپنی بیوی سے کہہ سکیں کہ ان کے پاپا کا خیال رکھے۔ مگر خاموش رہی۔ "میں پوری کوشش کروں گی کہ سر کو خوش رکھ سکوں۔" میں نے محض اتنا کہا۔

"بھئی مجھے سر تو نہ کہو..... اگر بیٹیوں کی طرح میرا خیال رکھنا ہے تو کوئی بیٹیوں جیسا طرز تخاطب ہونا چاہیے....." سکندر صاحب نے فوراً ٹوکا۔

"میں اس کی بھی کوشش کروں گی سر....."

میرے دوبارہ سر کہنے پر وہ تینوں ہنسے تو میں کھسیا گئی۔

"محسن..... اس سے پہلے کہ تم دونوں دوست اپنی گپ شپ میں مصروف ہو جاؤ، بیٹا انہیں ان کی انیکسی میں پہنچا دو اور ہاں دیکھ لینا کہ وہاں پر سب کچھ ٹھیک تو ہے ناں!" سکندر صاحب نے اپنے بیٹے سے کہا تو ہم انکل اور محسن صاحب کی معیت میں وہاں سے نکلے اور اس انیکسی میں آ گئے جو اسی محل کے احاطے میں تھی، سرونٹ کوارٹروں کی ایک قطار تھی اور اس کے آخر پر یہ تین انیکسی نما سوئیٹ بنے ہوئے تھے، ہمیں اس طرف والا سوئیٹ ملا تھا جس طرف سکندر صاحب کا کمرا تھا۔ انکل اور محسن صاحب نے اندر تک ہماری راہنمائی کی اور چکر لگا کر باقی انتظامات کا جائزہ بھی لیا، ہم ماں بیٹی اپنے کپڑے اور چند ضروری اشیا کے سوا سب کچھ بیچ باچ آئے تھے یا یونہی کسی کو دے دلا دیا تھا۔

وہ دونوں چلے گئے تو ہم دونوں اس نئے ٹھکانے میں تنہا رہ گئیں..... زندگی کیا، کیا دکھاتی ہے' دو کمروں، ایک غسل خانہ، باورچی خانہ، ایک برآمدے اور ایک چھوٹے سے صحن کے اس گھر میں رہنے کا کب سوچا تھا! مگر اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ کوئی برا خیال دل میں نہ آیا تھا، ابا کے حادثے نے بتا دیا تھا کہ انسان کی حیثیت تنکے سے بھی کمتر ہے۔ دولت نے ہمارا سب کچھ چھین لیا تھا، کبھی کبھی تنہائی میں دل میں خیال آتا کہ ساری دنیا کی دولت چھین کر اسے ایک جگہ رکھ کر آگ لگا دوں۔ کبھی سوچتی کہ کہیں سے اتنی دولت حاصل کرلوں اور اس لالچی شخص کو دکھاؤں کہ دیکھو جس دولت کے لالچ میں تم نے میرے باپ کو موت کے منہ تک پہنچا دیا میرے پاس اس سے کہیں زیادہ ہے..... اب حالات نے ہمیں کہاں لا پٹخا تھا، مجھے کام کرنا پڑ رہا تھا، اپنی زندگی میں تو ابا مجھے پانی کا گلاس تک نہ اٹھانے دیتے تھے اور ہر، ہر کام کے لیے ملازم تھے جو اب تھوڑا عرصہ قبل ہی ایک، ایک کر کے کم ہونے لگے تھے مگر ابا نے کبھی نہ بتایا کہ انہیں کیوں کم کیا جا رہا تھا۔

مگر یہ سب میرے وہ خیالات تھے جو غصے میں میرے دل میں در آتے تھے۔ ابا کی موت نے مجھے

اندر سے تبدیل کر دیا تھا، کبھی کبھار ابا کو بھی موردِ الزام ٹھہراتی کہ اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے یہ تک نہ سوچا کہ ہم دونوں کا کیا ہوگا...... کس طرح ہم اس دنیا میں تنہا رہیں گی، انہیں تو شاید اس پولیس تفتیش کا بھی اندازہ نہیں تھا جو ہم ماں بیٹی ... کی ہوئی کہ ہم میں سے کسی نے انہیں نہ مار دیا ہو، بدنامی الگ...... منہ چھپانے کی خاطر ہم یہاں آن بیٹھے تھے، دل دکھ سے بھر گیا اور میں تنہا آنسو بہانے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ اماں بھی اسی طرح چھپ چھپ کر آنسو بہاتی ہوں گی مگر ہم ماں بیٹی... ایک دوسرے کو دکھی نہیں کرنا چاہتی تھیں...... اپنی، اپنی تکلیفوں پر اکیلے ہی روتیں اور سامنے آتیں تو معلوم بھی نہ ہوتا کہ تنہائی میں آنسوؤں کی کتنی تسبیحات رولی ہیں۔

☆☆☆

نئی جگہ اور نئی ملازمت سے وابستہ کئی خوف تھے مگر میں نے ان پر قابو پانے کی کوشش کی...... اور سلام کر کے سکندر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''وعلیکم السلام بیٹا...... آؤ آؤ کیسی ہو، نیند ٹھیک سے آئی تمہیں اپنے نئے گھر میں؟'' میں نے ان کا چہرہ دیکھا۔ شاید وہ طنز کر رہے ہوں مگر وہاں سادگی تھی اور انہیں کون سا معلوم تھا کہ ہمارا گھر اس سے پہلے کیسا تھا۔

''جی سر......'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''سب ٹھیک ہے، نیند کی عادت بھی ہو جائے گی۔''

''تم مجھے سر کے علاوہ کیا کہہ سکتی ہو نگاہ بیٹا......'' ان کے کہنے پر میں نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا، وہ مسکرا کر مجھے دیکھ رہے تھے۔

''جی انکل......'' میں نے تھوک نگل کر کہا۔

''میں تو تمہارے باپ کے بھی باپ کی عمر کا ہوں، تم مجھے دادا کہہ لیا کرو۔''

''جی کوشش کروں گی سر۔'' میرے منہ سے پھر پھسل گیا اور ان کی مسکراہٹ قہقہے میں بدل گئی۔

''سویرے سویرے اتنا اچھا لطیفہ کیا سنا دیا آپ نے پاپا کو مس نگاہ......'' محسن صاحب اچانک ہی بغیر دستک کے کمرے میں داخل ہو گئے، دروازہ بھی بند نہ تھا مگر پھر بھی میں نے سوچا کہ میری موجودگی میں انہیں دستک دے کر آنا چاہیے تھا، ممکن ہے کہ انہیں علم ہی نہ ہو کہ میں ''ڈیوٹی'' پر آ چکی ہوں، میں نے دل ہی دل میں انہیں شک کا فائدہ دیا۔

''ارے کوئی لطیفہ نہیں تھا، بس یہ نگاہ بیٹی کو مجھے مخاطب کرنے کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا، جس طرح تم بھی اسے ابھی تک مس نگاہ کہہ رہے ہو جب کہ میں نے نگاہ سے کہہ رکھا ہے کہ وہ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھے۔'' سکندر صاحب نے کہا۔

''تو میں اسے اور کیا کہہ سکتا ہوں جب کہ یہ ہیں ہی مس نگاہ!'' محسن صاحب کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''بیٹی کہو ناں بیٹا......'' سکندر صاحب نے فراخ دلی سے کہا۔

''بیٹی؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔ ''مگر میں نے تو آج تک کسی کو بیٹی نہیں کہا......''

''اپنی بیٹی کو بھی نہیں؟'' میں دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئی...... ''یا پھر ہو سکتا ہے کہ ان کی کوئی بیٹی نہ ہو۔''

''انیکسی کو خود دیکھا ہے ناں تم نے ٹھیک ہے نگاہ بیٹی کے لیے، کوئی کمی یا کسر نہیں ہونی چاہیے اس میں۔''

''جی پاپا...... میں نے خود ہی دیکھا ہے اور چند ایک چیزیں ہیں جو میں نے بلال کو بتائی ہیں، وہ ٹھیک کروا دے گا......'' محسن صاحب نے کہا۔

''وہ تو انجینئر کی اولاد ہے خود ہی ٹھیک کر دے گا......'' سکندر صاحب نے طنزیہ کہا۔ ''اتنی دلچسپی کاروبار میں لیتا تو اسے کہاں کا کہاں پہنچا دیتا۔''

''کاروبار کو اور کہاں تک پہنچانا چاہتے ہیں آپ پاپا؟'' محسن صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''وہاں تک کہ تم لوگوں کی سات نسلیں بیٹھ کر کھا

سکیں......'' سکندر صاحب نے کہا۔ دونوں باپ بیٹا یوں باتیں کر رہے تھے جیسے میں وہاں موجود ہی نہیں۔
''ہوں......'' محسن صاحب نے کندھے اچکائے۔ ''ان کی سات نسلوں کو فقیر بنا دیں...... میری تو سات چھوڑ ایک بھی نسل نہ ہوگی، ہڈحرامی کی عادت ڈال دیں ان سب کے بچوں کو۔'' کہتے ہوئے محسن صاحب باہر نکل گئے۔
''محسن صاحب کی کوئی اولاد نہیں؟'' میں نے سوال کیا تو سکندر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں ٹھیک ہی سمجھی تھی، محسن صاحب کی اولاد نہ تھی اسی لیے انہوں نے کسی کو بیٹی نہیں کہا تھا۔
''تم اسے انکل کہہ سکتی ہو...... میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہے مگر......'' انہوں نے بات شروع کی۔
''اچھا چھوڑو، مجھے بتاؤ کہ تمہیں دورِ حاضر کے لکھاریوں میں کون پسند ہے؟'' میں نے دو ایک نام بتائے تو انہوں نے کہا کہ میں کچھ کتابوں کے نام لکھ کر ڈرائیور کو دوں اور وہ کتابیں منگوا کر انہیں پڑھ کر سناؤں۔
مجھے خود بھی کتابیں پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا، اسی لیے میں نے خوشی خوشی کتابیں منگوائیں، کچھ کتابیں میرے سامان میں بھی تھیں جو...... میں نے سوچا کہ انہیں سناؤں گی۔ میں ان کے بیڈ کے قریب کرسی ڈال کر یوں کتاب پڑھتی کہ ان کے کانوں میں بھی آواز جائے مگر میرے لہجے کا اتار چڑھاؤ ایسے ہوتا جیسے...... میں انہیں کوئی کہانی زبانی سنا رہی ہوں۔ ان کے آرام کے وقت پر میں انیکسی میں آ جاتی جہاں اماں نے کچھ نہ کچھ پکا رکھا ہوتا تھا، وہ اپنے فارغ اوقات میں اپنے مشاغل جاری رکھتیں حالانکہ ان کے جوڑوں کے درد کی تکلیف اتنی بڑھ جاتی کہ میں انہیں کھڑے ہونے سے بھی منع کرتی...... کہیں وہ گر کر ہڈی پسلی تڑوا کر بستر پر نہ پڑ جائیں...... اس طرح حالات ہمارے لیے اور بھی مشکل ہو جاتے۔

☆☆☆

پہلے مہینے کی تنخواہ ایک لفافے میں ڈال کر دادا جی نے میرے حوالے کی۔ ''یہ تمہارا جیب خرچ ہے بیٹا جس طرح میں باقی پوتیوں کو دیتا ہوں''...... ہاں تب تک میں انہیں دادا جی کہنا شروع کر چکی تھی، میں نے تنخواہ کا بند لفافہ ہی اپنے پاس رکھا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ ''کھول کر نہیں دیکھو گی؟''
''نہیں دادا جی، جو کچھ آپ نے اپنی خوشی سے دیا ہے ٹھیک ہی ہوگا۔'' میں نے دل سے کہا۔ ''میں خود کو آپ کی تنخواہ دار ملازمہ تو سمجھتی ہی نہیں، آپ نے اتنی عزت اور اتنا پیار دیا ہے۔''
''تم ہو ہی اتنی پیاری بیٹا۔'' انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تو میری آنکھیں لبریز ہو گئیں، اتنے عرصے کے بعد کسی نے یوں میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا ابا کی طرح...... میری آنکھیں نم ہو گئیں۔
''آپ نے کس بات پر رُلا دیا ہے نگاہ کو بابا؟'' ایسے ہر موقع پر جانے وہ کس طرح ٹپک پڑتے تھے، میں نے انہیں بھی انکل کہنا شروع کر دیا تھا جس پر انہیں نہ کوئی اعتراض تھا نہ کوئی خوشی۔ وہ ایسے ہی تھے، بے پروا سے مگر میں نے انہیں اپنے باپ کو سب سے زیادہ وقت دیتے ہوئے دیکھا تھا، دن میں کئی بار جب بھی وہ گھر پر ہوتے اس کمرے کے چکر لگاتے، ان سے بات چیت کرتے، ان کی دواؤں کی بابت مجھ سے پوچھتے، باہر جاتے وقت بتا کر جاتے اور واپس آ کر بھی سب سے پہلے بتاتے کہ وہ واپس آ گئے ہیں۔
باقی سب بیٹے اور بہوئیں بھی کبھی کبھار سرسری سی ملاقات کو آتے کیونکہ سب ایک ہی چھت تلے رہ رہے تھے اس لیے میں ان سب لوگوں کو کافی جان گئی تھی، اگر وہ اس گھر میں نہ ہوتے تو شاید مہینوں ان سے ملاقات کو نہ آتے اور اسی بات نے دادا جی کو سب کے ہوتے ہوئے بھی تنہا کر دیا تھا۔

انکل محسن کے بعد ان کی اگلی نسل میں سے بلال کا سب سے زیادہ دادا سے رابطہ تھا حالانکہ وہ کم، کم ہی آتا تھا مگر اس کی آمد دادا جی کو اچھی لگتی، بلال وہی لڑکا تھا جو پہلے روز ہمارے گھر میں پانی کا نل خود ٹھیک کرنے آیا تھا، دادا جی کا سب سے بڑا پوتا...... انجینئر بن رہا تھا، میں سمجھی کہ اس کے والد انجینئر تھے کیونکہ دادا جی نے اسے ایک دن انجینئر کی اولاد کہا تھا، وہ انہوں نے غصے میں کہا تھا۔ اس کے والد سمیت دادا جی کے سب بیٹے انہی کے مختلف النوع کاروباروں کو چلا رہے تھے اور دادا جی ان کے بلاشرکتِ غیرے مالک تھے، ہر بیٹے کو اس کے کام کے مطابق تنخواہ ملتی تھی اور اس کے علاوہ ان سب کے ان کاروباروں میں حصص بھی تھے۔

بلال سے دادا جی کو بڑی امیدیں تھیں کیونکہ وہ ایک مختلف نوعیت کا نوجوان تھا، اس میں آج کل کے نوجوانوں والی بے پروائی نہ تھی، وہ حساس، ذمے دار اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ یہ سب باتیں دادا جی مجھے خود بتاتے تھے۔ بلال جب آ کر دادا جی کے پاس بیٹھتا تو وہ بہت دھیمے بات کرتا اور بسا اوقات سرگوشیوں میں، شاید وہ مجھ سے چھپانا چاہتا تھا، عموماً میں ایسے میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ جاتی اور کوئی نہ کوئی رکا ہوا کام کر لیتی تھی۔ میرے زبانی معاہدے کے تحت مجھے روزانہ آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینا ہوتی تھی مگر کبھی وقت کا حساب کیا نہ رقم کا شمار، ہماری ضرورت سے کہیں بڑھ کر مجھے تنخواہ ملتی تھی کیونکہ نہ بجلی، گیس، ٹیلی فون اور پانی کے بل تھے نہ ہی ہماری کوئی اور لمبی چوڑی ضرورتیں۔

''بلال تم فارغ ہو آج؟'' دادا جی نے بلال سے پوچھا۔

''جی دادا جی حکم فرمائیں...... آپ کی ضرورت اور حکم میری ہر مصروفیت سے بڑھ کر ہے۔'' بالکل ویسا ہی جواب جیسا کوئی سب سے فرمانبردار پوتا دے سکتا ہے۔

''ممکن ہو تو نگاہ کو بینک لے جا کر اس کا اکاؤنٹ کھلوا دو......''

''میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی دادا جی!'' میرے کہنے پر بلال نے چونک کر مجھے دیکھا، شاید اسے میرا دادا جی کہنا عجیب لگا تھا۔ ''اماں بھی جائیں گی، انہیں کچھ خریداری کرنا ہے......'' میں نے ٹالنے کی کوشش کی، میں نہیں چاہتی تھی کہ دادا جی کی شفقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے کسی پیارے پر بوجھ بنوں۔

''مجھے بحث کرنے والی بچیاں اچھی نہیں لگتیں......'' دادا جی نے حتمی انداز میں کہا۔

''آپ بلال کو زحمت نہ دیں دادا جی!'' میں روانی میں کہہ گئی، دادا جی سے باتوں کے دوران میں اسے اسی طرح مخاطب کرتی تھی۔ ''میرا مطلب ہے بلال صاحب کو۔'' میں نے فوراً تصحیح کی۔

''اٹس او کے......'' بلال نے کہا، جانے کس بات کے جواب میں۔ ''آپ تیار ہو جائیں میں لے چلتا ہوں، اپنی امی کو بھی ساتھ لے لیں، بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے شخصی ضمانت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ڈرائیور نہیں دے سکتا۔''

''مگر اکاؤنٹ کھلوانے کی ضرورت کیا ہے دادا جی!'' میں جھجک رہی تھی۔

''نگاہ بیٹا......'' دادا جی پیار سے بولے۔ ''گھر میں اتنی رقم یوں رکھ چھوڑنا ٹھیک نہیں اور پھر تمہارے پاس کچھ زیور بھی ہے۔'' میں اس وقت کو پچھتا رہی تھی جب میں نے دادا جی کو بتایا تھا کہ میں نے کتنی رقم گھر پر رکھی ہوئی تھی۔ میں بادلِ ناخواستہ اٹھی اور تیار ہونے کو گھر کو چلی تو اماں تیار کھڑی تھیں۔

''ارے آپ کو کیسے علم ہوا کہ ہمیں بینک جانا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تو پڑوس میں میلاد پر جا رہی ہوں اور

ہاں میں نے میلاد کے لیے ہی کچھ حلیم بنایا تھا، تمہارا حصہ رکھ دیا ہے، میں تو وہاں ہی کھالوں گی...... ایک پیالے میں علیحدہ سے بھی رکھا ہے اگر تمہارے دادا جی کھانا چاہیں تو۔'' وہ چادر لے کر روانہ ہوگئیں تو میں نے دادا جی والا حلیم کا پیالہ اٹھایا اور ان کی طرف چلی، بلال وہاں نہ تھا، دادا جی کو ایسی چیزیں منع تھیں مگر کبھی کبھار ان کا دل چاہتا تو وہ فرمائش کر کے ایسی چیزیں اماں سے بنوا کر شوق سے کھاتے۔

''دادا جی، اماں تو آج میلاد پر چلی گئی ہیں، کل کا پروگرام رکھ لیتے ہیں......''

''آج ہی جانا ہوگا......'' دادا جی نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔''بلال ہر روز ایسا فارغ نہیں ہوتا، وہ تیار ہونے گیا ہے، تم تیار ہو کر فوراً آجاؤ......''

''مگر دادا جی!''

''فکر نہ کرو، میرا پوتا میری طرح چٹورا ضرور ہے مگر اسے بندے کھانے کا کوئی شوق نہیں......'' دادا جی کی بات پر میری بھی ہنسی نکل گئی۔''اور حلیم ہے تو تھوڑی سی اسے بھی کھلا دو، وہ بھی خوش ہو جائے گا۔''

''بینک جانے کے لیے مجھے اسے خوش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے بگڑ کر کہا۔

''اور کام بھی پڑ جاتے ہیں انسان کو دوسرے انسانوں سے بیٹا!'' دادا جی نے شفقت سے کہا۔ ''اس لیے لوگوں کو خوش کرتے رہنا چاہیے۔'' میں ناچار جا کر بلال کے لیے حلیم کا دوسرا پیالہ بھی لے آئی جو اماں نے میرے لیے رکھا ہوا تھا، بلال حلیم کھاتے ہوئے جس طرح تعریف کر رہا تھا اس سے مجھے دلی خوشی محسوس ہوئی، مجھے لگا کہ اس کا دل ٹھیک کرنے کا احسان اتر گیا تھا۔

''آپ کی اماں دوبارہ کب حلیم بنائیں گی مس نگاہ؟'' میں اس کے مرچوں سے لال ہوتے چہرے کو دیکھ کر ہنس دی......''اور کیا، کیا اتنے مزے کا پکا لیتی ہیں وہ؟''

''جو اور جب آپ کھانا چاہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا، وہ ریزرو سا رہنے والا لڑکا بھی اس وقت ہنس رہا تھا۔

''آپ تیار ہیں تو چلیں، اماں کو بلالیں!''

''اماں تو گھر پر نہیں ہیں، میں چل رہی ہوں۔'' میں نے تھوک نگل کر کہا۔''کیونکہ دادا جی کا خیال ہے کہ آپ کے پاس ہر وقت فرصت نہیں ہوتی۔''

''سو تو ہے......'' وہ دادا جی کو اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل گیا، میں کھڑی رہ گئی۔

''جاؤ ناں بیٹا...'' دادا جی کے کہنے پر میں گویا خواب سے جاگ کر چلنے لگی۔

بینک کا کام ختم کر کے باہر نکلی تو دماغ بھی چکرا رہا تھا، جو بلال نہ ہوتا تو میں تو پاگل ہو جاتی، دائیں جائیں، بائیں جائیں، یہ کاؤنٹر اور وہ کاؤنٹر...... فوٹو کاپی اور ریجنل اور اتنے گھماؤ پھیراؤ۔ مجھے تو ابا کی زندگی میں اور نہ اس کے بعد بھی ایسے کاموں سے واسطہ پڑا تھا، یہ سب کچھ میرے لیے نیا بھی تھا اور مشکل بھی۔ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ بلال کے نہ ہونے سے میں اکاؤنٹ نہ کھلوا پاتی اور نہ ہی لاکر کا حصول ممکن ہوتا۔

''پانی مل سکتا ہے کہیں سے؟'' میں پیاس سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اس نے گاڑی روکی اور ایک اسٹور سے پانی کی چھوٹی بوتل کے ساتھ دو جوس بھی لے آیا، میں نے پانی کی بوتل لے لی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔

''آئس کریم کھائیں گی آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں شکریہ......'' میں نے فوراً کہا۔

''میرا احسان نہیں لینا چاہتیں یا......'' اس کا یہ کہنا اس کی عادت کے خلاف تھا کیونکہ وہ کم کم ہی مجھ سے بات کرتا تھا۔''دادا جی نے کہا تھا کہ آپ کو آئس کریم کھلا کر لاؤں۔''

''بہت شکریہ......'' میں اس کے اصرار کی وجہ

سمجھ گئی تھی۔ ''میں آئس کریم نہیں کھاتی۔''

''اسی لیے آپ تھکتی بھی نہیں......'' اس نے فوراً کہا۔

''آئس کریم کا تھکنے سے کیا تعلق؟'' میں حیرت سے بولی۔

''وہ وسیم اکرم کہتا ہے وہ تھکتا نہیں کیونکہ وہ سگریٹ نہیں پیتا!'' وہ ہنسا، وہ ہنس بھی سکتا تھا؟ میں اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''سگریٹ بری چیز ہے، آئس کریم نہیں...... سگریٹ پینے والا تو تھک جاتا ہے کہ سگریٹ پھیپھڑوں کو متاثر کرتی ہے......'' میں نے وضاحت کی۔

''اس کا مطلب ہے کہ آئس کریم کھانے کا کوئی نقصان نہیں......'' وہ گاڑی آئس کریم پارلر کے باہر روک چکا تھا، میں نے ناچار اسے بتایا کہ میں کیا کھانا چاہتی تھی مگر میں نے یہ بھی کہا کہ گاڑی میں بیٹھ کر ہی آئس کریم کھاؤں گی، وہاں جانے کا مطلب تھا ایک میز پر اس کے ساتھ تنہا بیٹھنا، وہ تو گاڑی میں بھی تھی مگر میں پچھلی سیٹ پر تھی اور ہم میں تکلف اور فاصلے کی حد قائم تھی۔

گھر پہنچ کر سب سے پہلا سوال دادا جی نے بینک اکاؤنٹ کا نہیں بلکہ یہ کیا کہ آیا بلال نے مجھے آئس کریم کھلائی تھی کہ نہیں...... میں نے دادا جی کا شکریہ ادا کیا۔ ''حالانکہ میں آئس کریم کھاتی بھی نہیں دادا جی مگر آپ کے اصرار پر کھانا پڑی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ بلال میں قائل کر لینے کی صلاحیت بھی ہے۔'' دادا جی ہنسے۔

''بلال صاحب، بہت شکریہ، آپ نہ جاتے تو میں واقعی اکاؤنٹ نہ کھلوا پاتی، میرا بالکل پہلا تجربہ تھا یہ......'' میں نے کہا۔

''میرا بھی یہ پہلا ہی تجربہ تھا......'' اس کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

''واقعی...... کیا اس سے پہلے آپ بھی بینک نہیں گئے؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا تو دادا جی کا قہقہہ بلند ہوا۔

''ویسے آپ مجھے بلال بھی کہہ سکتی ہیں......'' وہ مڑتے ہوئے رکا۔ ''اور اپنی اماں سے کہیے گا کہ مجھے اور دادا جی کو نہاری اور بریانی بھی بہت پسند ہے......'' میرا منہ کھلے کا کھلا رہا اور وہ چلا گیا۔

''بہت شرارتی ہے......'' دادا جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پہلے تو اتنا شرارتی نہیں تھا دادا جی!'' میں نے دادا جی کو مصنوعی گھوری ماری۔

''کہہ رہا تھا ناں کہ اس کا بھی پہلا تجربہ ہے......'' ان کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

''میں چلتی ہوں دادا جی، اماں آ گئی ہوں گی!'' میں نے بات ہی بدل دی۔

''اتنی اچھی باتیں ہو رہی تھیں......'' دادا جی دنیا بھر کی معصومیت لہجے میں سمو کر بولے۔

☆☆☆

''اماں کسی دن بریانی اور پھر نہاری بھی بنانا ہو گی آپ کو......'' میں نے اماں کے پاس لیٹتے ہوئے کہا۔ ''دادا جی کو بہت پسند آیا حلیم اور بلال کو بھی۔''

''تیرے دادا جی بیمار ہی نہ ہو جائیں یوں مسالے دار کھانے کھا کھا کر......'' اماں نے کہا۔ ''جانے ان کو کوئی ایسی بیماری ہو......''

''نہیں اماں، دادا جی کو کوئی ایسی بیماری نہیں، صرف ڈیپریشن کی دوائیں کھاتے ہیں وہ اور طاقت کی، آپ ذرا مسالے ہلکے رکھ کر بنا دیں، ویسے وہ کھاتے تو خوب مسالے دار ہیں۔''

''زیور لاکر میں رکھ آئی ہو ناں دھیان سے......؟''

''جی اماں...... اور چابی آپ کی دراز میں رکھ دی ہے، کسی دن آپ کو بھی ساتھ لے جا کر آپ کے دستخط کروا دوں گی تاکہ آپ بھی لا کر کھول سکیں، لاکر میرے اور آپ کے نام پر ہے!''

''ٹھیک ہے......'' اماں کے لہجے میں سکون تھا۔ ''آج میلاد پر بہت مزہ آیا، بہت اچھی نعت خواں لڑکیاں تھیں......'' اماں ہولے سُروں میں ایک نعت گنگنانے لگیں، میری آنکھوں میں نیند اترنے لگی، اماں میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں، میری آنکھوں سے آنسو ٹپک، ٹپک کر تکیہ بھگونے لگے۔

''یہ بلال کون ہے؟'' اماں نے یک لخت پوچھا۔

''دادا جی کا سب سے بڑا پوتا اماں......'' دل ہی دل میں مجھے اماں کے یوں یاد کر کے نعت کے بیچ میں اچانک پوچھ لینے پر ہنسی بھی آئی۔

''جو اُس دن ہمارے گھر نل ٹھیک کرنے بھی آیا تھا؟''

''جی اماں......'' میں نے ان کی تائید کی۔

''اچھا لڑکا ہے......'' اماں نے کہا۔ ''قسمت نے ہمیں کیسے حالات میں اتنے اچھے لڑکے سے ملوایا ہے!'' ان کے لہجے میں حسرت تھی۔

''اماں!'' میں اٹھ بیٹھی۔ ''کس طرح کی باتیں کرنے لگی ہیں آپ، اسے آپ کے ہاتھ کا حلیم پسند آ گیا اور آپ اس کے حوالے سے سپنے دیکھنے لگیں!''

''لیکن اس نے تم سے بریانی اور نہاری کی فرمائش بھی تو کی ہے۔''

''یا اللہ......'' میں نے سر ہلا کر کہا۔ ''دادا جی نے فرمائش کی ہے اماں!'' میں نے فوراً کہا، حالانکہ فرمائش بلال نے ہی کی تھی۔

''میرے دل میں تو یونہی اسے دیکھ کر خیال آیا تھا۔'' اماں نے کہا۔

''اماں آپ ذرا ڈائجسٹ کم پڑھا کریں۔'' میں نے مسکرا کر بانہیں اماں کے گلے میں ہار کی طرح ڈالیں۔

''کیوں؟'' انہوں نے چتون چڑھائے۔

''کیونکہ ان میں ایسی اوٹ پٹانگ محبت کی کہانیاں ہوتی ہیں کہ بندے کا دماغ کام کرنا چھوڑ جاتا ہے۔''

''ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے......'' اماں نے فوراً کہا۔ ''انہی میں تو زندگی کی اصل کہانیاں ہوتی ہیں اور اس وقت ملک میں مایہ ناز ترین لکھاری وہی ہیں جنہوں نے آغاز ڈائجسٹوں سے کیا یا ابھی تک ڈائجسٹوں میں ہی لکھ رہے ہیں......''

''ارے اماں یاد آیا......'' میں نے ان کی ناراضی سے ڈر کر کہا۔ ''آپ بھی تو لکھتی تھیں محبت کی کہانیاں ڈائجسٹوں میں؟''

''ہاں لکھتی تھی......'' اماں نے خلا میں گھور کر کہا۔

''تو لکھا کریں ناں اب بھی...... کہاں ہیں آپ کی پرانی کہانیاں؟ میں دادا جی کو بھی سناؤں گی اور کوئی ایسی کہانیاں جو چھپی نہ ہوں؟''

''مر گئیں میری ساری کہانیاں......'' اماں کی آواز بھرا گئی۔ ''میری ادھ لکھی درجنوں یا شاید سیکڑوں کہانیاں پڑی ہیں جو میں نے چوری چھپے لکھ رکھی تھیں، تمہارے ابا کو میرا لکھنا پسند نہ تھا تو میں نے لکھنا چھوڑ دیا......''

''تو اب لکھیں اماں......'' میں نے ان کا ہاتھ تھاما۔ ''اپنے اندر کے تخلیق کار کو مرنے نہ دیں۔''

''تمہارے ابا کو پسند نہ تھا، اب ان کے جانے کے بعد وہ کام کروں جو انہیں پسند نہ تھا؟'' انہوں نے میری طرف غصے سے دیکھا۔

''ابا نے جو کچھ کیا......'' میں نے گہری سانس لی۔ ''وہ تھا جو آپ کو پسند تھا یا جو آپ چاہتی تھیں؟''

''پھر بھی!'' ان کے لہجے میں تذبذب تھا۔

''آپ معاشرے کی اصلاح کی کہانیاں لکھا کریں......'' میں نے ان کی آنکھوں میں آ جانے والے آنسو صاف کیے۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا، وقت گزر رہا تھا، مجھے سوچ کر تلخی محسوس ہوئی کہ ابا نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا، ہمیں آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا۔ زندگی کا رخ ہی بدل گیا تھا، ہم کسی کو بتانے کے قابل بھی نہ تھے کہ ابا کی موت کیسے واقع ہوئی تھی۔ انہوں نے خود تو گویا زندگی کے

ہر غم سے نجات پالی تھی مگر ہمیں جس کرب مسلسل میں مبتلا کر گئے تھے، اس سے مفر نہ تھا۔ میں کبھی کبھار یہ سوچ، سوچ کر بھی متفکر ہوتی کہ جب میری شادی کا معاملہ اٹھے گا تو یہ سوال بھی سر اٹھائے گا، جھوٹ بول کر زندگی کا آغاز کیا تو عمر بھر اس راز کے آشکار ہونے کا خوف ستاتا رہے گا۔

''اماں...... ابا نے خودکشی کیوں کی، کیا آپ کو کبھی شک ہوا کہ وہ ایسا انتہائی قدم اٹھائیں گے، انہیں ہم سے پیار نہ تھا، انہوں نے ہمارے بارے میں سوچا تک نہیں؟'' میں نے ایک بار اماں سے پوچھا تھا۔

''پیار تو تھا...... مجھے کبھی شک نہ ہوا کہ وہ اس قدر زندگی سے بیزار ہو چکے تھے، انہوں نے اپنے مسائل میرے ساتھ شیئر ہی نہیں کیے...... راز داری کے وہ ہمیشہ سے قائل تھے مگر ایسی موت......'' اماں رکیں۔ ''ان کے جینز میں تھا یہ سب......''

''کیا؟'' میں تقریباً چیخ ہی تو پڑی...... ''جینز میں تھا کا کیا مطلب اماں؟''

''ان کے والد نے بھی خودکشی کی تھی۔''

''ہیں...... وہ کیوں اماں؟'' میں نے فوراً سوال کیا۔

''انہیں شک تھا کہ جو بچہ اُن کے ہاں پیدا ہونے والا تھا...... وہ ان کا نہ تھا۔''

''کیوں، انہیں کیوں شک تھا اماں؟''

''دماغ کا کوئی خلل ہی ہو سکتا ہے...... میں نے تو ان کی امی کو دیکھا تھا وہ بہت نفیس خاتون تھیں۔''

''مگر دادا نے خودکشی کیسے کی اور آپ ابا کی امی سے کہاں ملیں؟''

''وہ تشدد کرتے تھے اکرام (ابا) کی امی پر اور کہتے تھے کہ ان سے سچ اگلوانے کی کوشش کرتے تھے، سچ تو وہی تھا جو انہوں نے تمہارے دادا کو بتایا تھا مگر انہیں یقین نہ آیا...... اکرام کے نانا کو جب علم ہوا کہ اکرام کے ابا نے ان کی بیٹی کے ساتھ کیا، کیا تھا تو وہ آ کر اپنی بیٹی کو لے گئے اور پھر کبھی واپس نہ بھیجا......''

''اوہو......''

''انہوں نے تنہائی سے گھبرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا، انہوں نے کبھی کوشش نہ کی کہ اپنا مسئلہ کسی سے شیئر کرتے...... اپنی بیوی کو منانے کی کوشش کرتے......''

''بالکل یہی ابا نے کیا اماں......'' میں نے سینے کی گہرائی سے سانس کھینچی۔ ''ہمیں اس قابل ہی نہ سمجھا کہ کچھ بتاتے، شاید کوئی حل نکل آتا اس مسئلے کا۔'' میرے دل پر منوں بوجھ پڑ گیا تھا، کاش مجھے ابا...کی زندگی میں علم ہوتا اس المیے کا تو میں ابا کی خاموشی اور تنہائی سے کچھ اخذ کر لیتی...... سائنس پڑھنے کے باوجود مجھے نفسیات کی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

☆☆☆

''آپ فارغ ہیں تو میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں؟'' میں نے سر اٹھا کر محسن انکل کو دیکھا، میں اس وقت لان میں ایک بنچ پر بیٹھی بڑی محویت سے پھولوں کے گرد منڈلاتی تتلیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''جی!'' میں نے حسب عادت مختصراً کہا یقیناً وہ اپنے پاپا کے بارے میں ہی کچھ کہنا چاہتے ہوں گے۔

''تم خوش ہو یہاں پر؟'' میں نے حیرت سے انہیں دیکھا، کیوں پوچھ رہے تھے وہ ایسا؟

''جی؟''

''میرا مطلب ہے کہ......'' وہ ہکلا گئے۔

''تمہیں یہاں پر کوئی تکلیف تو نہیں؟''

''اگر ہو تو؟'' میں نے ان ریزرو سے رہنے والے انکل کو تنگ کرنے کا سوچا۔

''وہ......'' وہ تھوڑے پریشان ہو گئے...... ''پاپا کا خیال تھا کہ باقی سب لوگ تو مصروف ہوتے ہیں، میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس لڑکی سے پوچھوں، جو

میرے پاپا کی دیکھ بھال کرتی ہے کہ اسے کوئی مسئلہ تو نہیں کیونکہ وہ میرے دوست کی بیٹی ہے......'' ان کی بوکھلاہٹ پر میری ہنسی نکلنا قدرتی تھا۔ وہ فوراً مڑ کر چلے گئے۔ میں بھی اٹھ کر اندر کی طرف چلی کہ دادا نہا کر تیار ہو چکے ہوں گے اور اس کے علاوہ ان کا کمرا بھی صاف ہو چکا ہوگا، اس روز ہمیں لیپ ٹاپ پر ایک انتہائی دلچسپ فلم دیکھنا تھی، خلا میں انسان کے پہلے سفر کے بارے میں......

دادا کو تو کمپیوٹر استعمال کرنا نہیں آتا تھا مگر ایک بار یونہی جب برسبیلِ تذکرہ میں نے کہا کہ انٹرنیٹ پر ہم ہر چیز کے بارے میں جان سکتے ہیں، کتابیں بھی پڑھ سکتے ہیں تو تب انہوں نے بلال سے کہہ کر ایک انتہائی جدید اور قیمتی لیپ ٹاپ منگوا لیا تھا جو دن کو میں وہاں استعمال کرتی اور ڈیوٹی کے بعد وہ میرے پاس ہوتا تھا۔ اس کے استعمال کا موقع کم کم ہی آتا کہ گھر آ کر مجھے اور اماں کو بہت کم وقت اکٹھے ملتا، اماں کے سو جانے کے بعد کبھی کبھار میں اسے استعمال کر لیتی تھی اور وہ بھی اگلے دن دادا کو دکھانے کے لیے کچھ نہ کچھ نئی اور دلچسپ چیز ڈھونڈ کر رکھتی۔

اس رات اماں کے سو جانے کے بعد جب میں سوچ رہی تھی کہ کمپیوٹر پر کچھ دیکھ لوں، چھم سے میرے ذہن میں دن کا واقعہ آ گیا، کیسے میں نے محسن انکل کو ستایا تھا اور وہ بیچارے بوکھلا کر چلے گئے تھے۔ جانے ایسا کیوں تھا کہ محسن انکل اور بلال دونوں ہی ایسے لوگ تھے جو دادا کو ہر روز اور بلاناغہ ملنے آتے تھے، وہ باقی سب سے مختلف تھے، باقی لوگوں کی تو شکلیں بھی ہفتوں.... دیکھنے کو نہ ملتیں۔ دونوں کے مزاج مجھے ایک جیسے لگتے، دھیمے سے، کم بولنے والے......

☆☆☆

وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے، ابا کی وفات کے زخموں پر کھرنڈ بن گئے تھے، مالی بے فکری بھی ہو

اِک خواہش

اِک لمبا سا سفر ہو
بہت طویل
کبھی نہ ختم ہونے والا
اِک لمبی سی سڑک ہو
بہت لمبا ہو جس کا راستہ
اور اس سڑک کے دونوں طرف
بہت سے درخت ہوں
خزاں کا موسم ہو
ڈھیروں سوکھے پتے
اس راستے پر بچھے ہوں
اِک دوجے کا ہاتھ تھامے ہم
ان خزاں رسیدہ پتوں کو
اپنے قدموں تلے روندتے جائیں
پتوں کی آواز کو سنتے
بس ہم چلتے جائیں
چلتے جائیں......

شاعرہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

گئی تھی تو میرے اندر پہلے والی نگاہ ناز جاگنے لگتی.... لبا اوقات ہنسنے والی، مسکرانے والی اور خوش مزاج بلال آتا تو میں اس سے بھی تھوڑی بات چیت دادا کے سامنے کر لیتی تھی، ان کے سامنے میں ذرا بہادر ہوتی تھی کیونکہ اگر میں انہیں اپنی موجودگی سے زندگی کی خوشیوں کی طرف لوٹا رہی تھی تو مجھے بھی ان کی مثبت گفتگو بہت کچھ سکھاتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی جدوجہد کی کہانی سناتے تو میں گھنٹوں اسے کسی انوکھی داستان کی طرح سنتی رہتی۔ انہیں اس عمر میں کسی سامع کی ضرورت تھی، ان کی مرحومہ بیوی ہوتیں تو انہیں اس

تنہائی کا مرض لاحق نہ ہوتا..... میرے ساتھ گزرنے والے وقت نے انہیں معجزانہ طور پر ایک صحت مند زندگی کی طرف لوٹا دیا تھا..... جانے کیسے میں نے انہیں ابا کے بارے میں بھی بتا دیا تھا..... میں اپنی اس غلطی پر افسوس کر رہی تھی۔

''میں جانتا تھا.....'' انہوں نے کہا تو میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ''میں تمہارے یہاں آنے سے پہلے جانتا تھا، فیض نے تمہیں نہیں بتایا مگر اس نے مجھے بتا دیا تھا، اسے علم ہے کہ میرے پیٹ میں ایک کنواں ہے جس میں کوئی راز گر جائے تو کبھی نکل نہیں سکتا۔''

''اور کون، کون جانتا ہے یہاں؟'' میں کسی کنویں کی گہرائی سے بولی۔

''کوئی اور نہیں بیٹا.....'' انہوں نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ ''کہا ہے ناں تمہیں کہ میرے پیٹ میں ایک کنواں ہے.....''

''کون سا کنواں دادا جی؟'' بلال اندر آ گیا تھا، میں سٹپٹا گئی۔

''ہے ایک کنواں.....'' دادا جی ہنسے۔ ''میں نگاہ کو بتا رہا تھا کہ اس کنویں میں بہت گنجائش ہے اور یہ مجھے اپنی ماں کے ہاتھ کی بریانی کھلائے تو کنواں کچھ تو بھرے۔''

''یہ فاؤل ہے دادا جی، آپ اکیلے، اکیلے بریانی کی فرمائشیں کرتے اور کھاتے ہیں، جانے کتنی بار کھا چکے ہیں آپ؟''

''یار کبھی اکیلے نہیں کھائی!'' دادا جی مسکرائے۔ ''نگاہ بیٹا..... اس ندیدے کو بھی شامل کر لینا فرمائش میں۔''

☆☆☆

''اماں، میں اکیلی کیوں ہوں؟'' میں نے اماں کے پاس لیٹے ہوئے اچانک وہ سوال پوچھ لیا جو ہمیشہ سے میرے دماغ میں اٹھتا تھا مگر جھجک کے باعث پوچھ نہ پاتی تھی۔ ''میرا کوئی اور بہن بھائی؟''

''ہوں.....'' اماں نے گہری سانس لی اور میری طرف دیکھا۔ ''تم نے میری زندگی کو مکمل کر دیا میری جان تو مجھے کسی اور بچے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی.....''

''مگر ابا کا جی تو چاہتا ہوگا ناں اماں..... ان کا کاروبار تھا اور یوں بھی مردوں کو تو وارث کی خواہش ہوتی ہے ناں؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''ہوتی ہوگی اور مردوں کو مگر تمہارے ابا کو نہ تھی۔'' اماں نے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے اماں.....'' میں نے بحث کی۔ ''ابا بھی تو عام مرد تھے ناں..... انہیں کیسے خواہش نہ تھی؟''

''تمہارے ابا عام مرد نہیں تھے.....'' اماں تقریباً چیخیں۔ ''وہ ایک مریض تھے، انہیں یقین نہیں تھا کہ تم ان کی اولاد ہو.....'' اماں نے میرے سر کے عین اوپر اس جملے کا بم پھوڑا۔ ''وہ پوچھا کرتے تھے مجھ سے کہ انہیں کیسے علم ہو کہ یہ انہی کی بیٹی ہے..... اس وقت تو ڈی این اے ٹیسٹ بھی نہ تھا، جو ہوتا تو وہ اپنا شک رفع کرنے کو وہ بھی کروا لیتے۔''

''کیا کہہ رہی ہیں اماں؟'' میں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔ مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا تھا کہ ابا کبھی کبھار اماں سے اس طرح بات کرتے جیسے وہ ان کی زندگی میں ناپسندیدہ ہوں مگر اگلے ہی لمحے مجھے ان کی کسی بات سے اندازہ ہو جاتا کہ میری سوچ غلط تھی، وہ اسی طرح اتار چڑھاؤ والی شخصیت کے مالک تھے، میری ہر بات البتہ میرے منہ سے نکلنے سے پہلے پوری ہو جاتی تھی۔ اماں سچ کہتی تھیں کہ ابا کے جسم میں وہ بیماری تھی جو ہمارے معاشرے کے مردوں میں عام ہے، اسے بیماری بھی نہیں سمجھا جاتا، ماں پر کوئی شک نہیں کرتا، بیٹی پر شک کرے تو ماں اسے منہ توڑ جواب دیتی ہے کہ اس کی جرأت کیسے ہوئی..... اگر اپنی بیوی پر مرد شک کرے تو ماں، بہنیں

سب مل کر اس کی تائید کرتی ہیں...... ذہنی مریض ہی تو رہے ہوں گے ابا جو اپنی زندگی کا خاتمہ مالی مسائل کی بنا پر کر لیا مگر اپنی بیوی اور بیٹی کو علم تک نہ ہونے دیا۔

''میں نے زندگی کس طرح کڑھ کڑھ کر خوف کے تحت گزاری ہے، اسی نے مجھے مختلف وردوں میں مبتلا کر دیا ہے......'' اماں نے کہا تو میں ان کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔

''کل تم دوپہر کے کھانے پر گھر آؤ تو پھر کام پر واپس نہ جانا......'' اماں نے پیار سے کہا۔

''کیوں اماں؟'' میں نے فوراً سوال کیا۔ ''اور ہاں آپ دادا کے لیے بریانی کب بنا رہی ہیں؟''

''کل ہی بنا دوں گی......'' اماں نے کہا۔ ''میں نے پڑوسنوں سے کہہ رکھا ہے، انہی میں سے ایک کے حوالے سے رشتہ آیا ہے، لڑکے والے لڑکے سمیت تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں...... اب تو میری ایک ہی خواہش ہے کہ اپنی زندگی میں تمہیں اپنے گھر کا کر دوں۔''

''اچھا اماں......'' میں نے بے دلی سے کہا، کروٹ بدل کر لیٹی اور صبح تک سوتی رہی، میں نے جاگتے میں بھی اس حوالے سے کوئی اچھا خیال نہ سوچا تھا نہ ہی خواب میں ایسا کچھ ہوا کہ میں اس رشتے کے حوالے سے دل میں کوئی میٹھے، میٹھے ارمان جاگتے محسوس کرتی۔

☆☆☆

اس روز تو بریانی پر دادا نے محسن انکل اور بلال دونوں کو بلا لیا تھا، میں نے جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے خاموشی سے مجھے بیٹھے رہنے کو کہا، محسن انکل اور بلال، دادا کے ساتھ بریانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ساتھ ساتھ تبصرہ بھی کر رہے تھے۔

''ہم نگاہ کی ماما سے اپنے خانساماں کو اتنی اچھی بریانی بنانے کے لیے ٹرینڈ نہیں کر سکتے؟'' بلال نے سوال کیا۔

کھانا کھا چکنے کے بعد میں...... انیکسی کی طرف آ گئی۔ اماں نے جلدی سے ہدایات جاری کیں اور میرا تیار شدہ ایک ریشمی جوڑا میری طرف بڑھایا۔

''اس طرح کے کپڑے پہن کر کیا کروں گی اماں، کون سا کوئی شادی ہو رہی ہے جس میں ہم جا رہے ہیں، گھر پر ایسا جوڑا پہنوں؟''

''بحث نہ کرو نگاہ ناز......'' اماں جب غصے میں ہوتیں تو اسی طرح مخاطب کرتیں، میں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی اور کپڑے اٹھا کر غسل خانے میں گھس گئی، نہا کر تیار ہوئی، خود کو آئینے میں دیکھ کر ہنس دی، کیسے اہتمام سے تیار ہوئی تھی میں کہ اچھی خاصی لگنے لگی تھی۔ میں نے اماں سے چائے پانی کے اہتمام کا پوچھا، وہ سب کچھ تیار کیے بیٹھی تھیں، مجھے سمجھا کر وہ اپنے کپڑے بدلنے چلی گئیں تو میں نے برتن ٹرالی میں لگائے...... ابا ہوتے تو شاید حالات اس طرح نہ ہوتے کہ مجھے ٹرے سجا کر مہمانوں کے سامنے جانا پڑتا، اس طرح کے مناظر تو ڈراموں اور فلموں میں دیکھ کر میں خوب ہنسا کرتی تھی۔

لڑکے والے آئے...... لڑکے کے والدین کے علاوہ اس کی تین غیر شادی شدہ بہنیں اور وہ خود بھی تھا، وہ سب مجھے یوں دیکھ رہے تھے جس طرح قربانی کا جانور خریدنے آئے ہوں۔ میں چائے بنانے کے لیے باورچی خانے میں آئی تو اس کی تینوں بہنیں وہیں آ گئیں، آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ ''بھابی کتنی پیاری ہیں ناں؟'' ایک نے میرے منہ پر تعریف کر کے واہ واہی، ان تینوں کے حلیے عجیب سے تھے جیسے مانگے تانگے کی چیزیں پہن رکھی ہوں۔

''چھوٹا سا گھر ہے مگر دیکھو کیسا صاف رکھا ہوا ہے، بھابی سلیقے والی بھی ہیں......'' دوسری نے کہا تو مجھے سمجھ میں آیا کہ وہ مجھے ہی بھابی کہہ رہی تھیں ورنہ میں سمجھی تھی کہ وہ اپنی کسی اور بھابی کا ذکر کر رہی تھیں۔

''میرے پاس تو وقت ہی نہیں ہوتا ملازمت

کی وجہ سے......'' میں نے فوراً کہا۔ ''سلیقہ وغیرہ میری اماں کا ہی ہے، مجھے کچھ کرنا نہیں آتا!'' میں نے جھٹ سے کہا۔ ''اور یہ میں تمہاری بھابی کہاں سے ہوگئی؟'' دل ہی دل میں، میں نے سوچا۔

''اچھا ملازمت کرتی ہیں آپ......'' تیسری نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کیا۔ ''کتنی تنخواہ ہے آپ کی؟''

''ملازمت کرنے والی لڑکیوں کو کام کرنے کی ضرورت بھی بھلا کیا ہوتی ہے...... ایک چھوڑ چار چار ملازم رکھ لے بندہ......'' ان میں سے ایک نے کہا، میں نے ان کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور فالتو برتنوں کی ٹرے اٹھاتے چل دی۔

''بھائی صاحب بیچارے......'' لڑکے کی اماں کہہ رہی تھیں۔ ''آج زندہ ہوتے تو اپنی بیٹی کی خوشیوں کا یہ دن تو ضرور دیکھتے......'' جانے وہ کس طرح منٹوں میں ابا کو بھائی صاحب بنا بیٹھی تھیں۔ اپنی جائیداد کی وارث، اکلوتی بیٹی...... اس کی خوشی دیکھنا ان کے نصیب میں نہ تھا۔''

''جائیداد وغیرہ تو کوئی نہیں چھوڑی میرے شوہر نے......'' اماں نے رسان سے کہا۔ ''ان کی وفات کے بعد بہ مشکل گزارہ ہوتا ہے، یہ ملازمت کرتی ہے تو ہمارے دن رات بسر ہوتے ہیں۔'' اماں ذرا رکیں۔ ''آپ کی توقعات غالباً زیادہ ہیں، اسی لیے آپ کو ابھی سے بتا دیتی ہوں!''

''ارے نہیں بہن......'' لڑکے کے باپ نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے، کوئی توقع نہیں ہے ہمیں، مجھے تو اچھا لگا کہ آپ نے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی، بیٹی بنا کر لے کر جائیں گے تو میری تینوں بیٹیوں سے بڑھ کر ہوگی......''

''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں......'' لڑکے کی ماں نے تائید کی۔

''وہ، وہ......'' لڑکا ہکلا کر بولا پھر گھبرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ ''جی، جی...... ابا جان ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''منظر میرا بڑا پیارا اور سمجھدار بیٹا ہے...... کم کم بولتا ہے۔'' منظر کی اماں نے وضاحت کی۔

''اچھا ہے کہ بیٹی ملازمت کرتی ہے، شادی کے بعد بھی ملازمت جاری رکھ سکتی ہے، میری پنشن اور منظر کی تنخواہ ملا کر بھی گھر مشکل سے چلتا ہے...... ایک سے دو جنوں کی تنخواہ ہوگی تو منظر بھی اپنے سر سے بہنوں کے بوجھ اتار سکے گا۔'' والد صاحب نے مستقبل کا بھیانک نقشہ کھینچا۔ ''یوں بھی میاں بیوی کے مسائل کون سا الگ ہوتے ہیں۔''

''نگاہ غالباً شادی کے بعد ملازمت نہیں کرے گی۔'' اماں نے کہا تو میری نظر سے ان کی مایوسی چھپی نہ رہ سکی۔ ''یوں بھی اسی کوٹھی میں کام کرتی ہے وہ، نرسنگ کا ایک چھوٹا سا کورس کر رکھا ہے اس نے اور یہاں ایک بوڑھے بیمار کی دیکھ بھال کرتی ہے......''

''بوڑھا بیمار مرد ہے یا عورت؟'' اب منظر نے سوال کرتے وقت اپنی ماں کی طرف نہ دیکھا تھا۔

''کافی عمر کے بوڑھے مرد ہیں، دادا جی کہتی ہے نگاہ انہیں۔'' اماں نے فوراً وضاحت دی، مجھے برا لگا مگر میں اپنی زبان دانتوں تلے داب کر رہ گئی۔

''اوہو...... اپنے بال بچے کہاں ہیں ان کے؟'' منظر کی اماں نے سوال کیا۔

''پانچ بیٹے، بہویں اور پوتے پوتیاں...... سب رہتے ہیں اس گھر میں مگر کسی کے پاس ان بزرگوار کے لیے وقت نہیں ہے......'' اماں نے پھر غیر ضروری طویل وضاحت دی، میرے اندر غصے سے ابال اٹھ رہے تھے۔

''اچھا......'' منظر فوراً بولا تھا، اس نے اس بار اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھ کر اجازت بھی طلب نہ کی تھی۔ ''پھر تو اس گھر میں بہت سے مرد ہوں گے، بابا جی کے بیٹے اور پوتے وغیرہ؟''

''نگاہ'' نے ''منظر'' کو دیکھا، دماغ تپ چکا تھا، میں کھڑی ہوگئی۔

"آپ چائے پی چکے ہیں اب آپ جائیں...... آپ سب کا اللہ ہی حافظ ہے۔" میں نے باہر کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "کوئی اور شکار تاڑیں جو آپ کے اس شکی مزاج بیٹے کو بھی برداشت کرے اور آپ کو یہ ضمانت بھی دے سکے کہ وہ آپ کی بیٹیاں بیاہیں گے۔"

"ارے نگاہ بیٹا......" اس کے والد ہکلائے۔

"بے وقوف ہے یہ!"

"بس بات ختم......" میں نے ان کی طرف انگلی اٹھائی۔ "مجھے کسی بے وقوف سے شادی نہیں کرنی، آپ نے خود کہا ہے کہ یہ بے وقوف ہے...... ...... اور مجھے گدھے پالنے کا کوئی شوق نہیں، کوئی اسی جیسی بے وقوف ڈھونڈ لیں آپ......" اس کی ماں اور بہنیں خاموش تھیں۔

باہر کی طرف جاتے ہوئے اس کی ماں نے بیٹے کے کندھے پر دو ہتڑ مارا اور کہا۔ "جب میں نے کہہ دیا تھا کہ لڑکا کم، کم بولتا ہے تو، تو اپنی بولتی بند رکھتا کم بخت!" میں اتنی جلی ہوئی تھی کہ اس لطیفے پر ہنسی بھی نہ آئی۔

"سوری اماں......" ان کے جانے کے بعد میں نے ان کی طرف دیکھا، سوچ رہی تھی کہ اب وہ غصے سے پھٹ پڑیں گی۔

"ارے نہیں بیٹا......" انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ "سوری تو مجھے کہنا چاہیے...... مجھے اپنی بیٹی کو اس طرح کے لالچیوں سے ملوانے سے پہلے اکیلے خود مل کر دیکھ لینا چاہیے تھا۔"

"لالچی بھی چل جائیں گے اماں کہ ہر کسی کے کوئی نہ کوئی مفادات ہوتے ہیں، ہمارے پاس ہے ہی کیا کسی کو دینے کے لیے، صرف ایک ملازمت کرنے والی لڑکی... پر شکی مزاج مرد نہیں برداشت کر سکوں گی اماں!" میں سسکی۔

"میری بچی!" انہوں نے میری کمر سہلائی۔

غزل

اپنا بنا کر اس طرح چھوڑ دیا مجھے
پھر جی بھر کے خوب رسوا کیا مجھے
جیسے میں اک آوارہ ہوں راستے کا پتھر
زمانے کی ٹھوکروں پر یوں رکھ دیا مجھے
میری وفا مجروح ہوئی تمہاری نگاہ میں
اور اس کے بعد اپنی نگاہ سے گرا دیا مجھے
فرح نے تو صدقِ دل سے چاہا تھا تمہیں
اور تم نے میری وفا کا یہ صلہ دیا مجھے

کاوش: مسز فرح امجد، لاہور

"تم فکر نہ کرو، اس کے بعد اچھی طرح جانچ پڑتال کروں گی، مجھے کوئی بوجھ تو نہیں ہے تمہارا بیٹی، تم نے تو میرا بوجھ اٹھا رکھا ہے......"

"یہ سوچتی ہوں اماں تو جی چاہتا ہے کہ شادی ہی نہ کروں، آپ کا کیا بنے گا؟"

"سب کا اللہ مالک ہے......"

"کوئی گھر داماد ڈھونڈ لیں اماں...... اگر ہر صورت آپ کو میری شادی کرنی ہی ہے۔"

"میری بیٹی کو کس طرح کے لڑکے پسند ہیں؟" اماں نے پیار سے پوچھا۔ "آج تک تم سے یہ تو پوچھا ہی نہیں، خود ہی بھانت بھانت کے لوگوں کو بلانے لگی ہوں!" میرے ذہن میں چھم سے بلال کا چہرہ آ گیا۔ 'چاند کو چھونے کی تمنا ہر لڑکی کے دل میں اس عمر میں بیدار ہوتی ہے اماں۔' دل میں سوچ کر رہ گئی۔

"میری زندگی میں مرد ہیں ہی کون سے اماں جو مجھے علم ہو کہ ان کی کیا، کیا قسمیں ہوتی ہیں...... نہ باپ نہ بھائی، نہ چاچا نہ تایا...... ماموں سے بھی کبھار ملنا ہوتا تھا جب وہ سالوں کے بعد باہر سے آتے تھے تو ایک آدھا دن ہمارے ہاں بھی آتے تھے۔"

"ہاں...... وہ تو ہے!"

"اب یہاں چار پانچ لوگوں سے ہر روز کا

رابطہ رہتا ہے...... شفیق اور خوش مزاج سے دادا جی، کم گو سے محسن انکل، سنجیدہ اور لیے دیئے رہنے والا بلال، اپنے کام میں مگن دادا کا ملازم اظہر اور ان کے گھر کے خانساماں علی خان...... ''میں نے اپنی حالیہ زندگی میں ہر وقت پالا پڑنے والے مردوں کا مختصر تجزیہ پیش کیا۔ اماں نے مجھے پیار سے لپٹا لیا۔

''اللہ تعالیٰ نے میری بیٹی کے لیے کچھ بہت بہترین رکھا ہوا ہوگا، انشاء اللہ!''

☆☆☆

''کل کیوں جلد چلی گئی تھیں بیٹا؟'' دادا نے شفقت سے پوچھا۔ ''میں اداس ہو گیا تھا اور پریشان بھی کہ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!''

''جی دادا، طبیعت تو ٹھیک تھی......'' میں نے ذرا جھجک کر ان سے کہا۔ ''کچھ لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آرہے تھے......''

''اچھا؟'' دادا نے حیرت سے کہا۔ ''اتنی بڑی ہو گئی ہو تم اور ہمیں علم بھی نہیں ہوا!'' انہوں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''آج تو پھر نگاہ ناز...... شادی کا دعوت نامہ لائی ہوں گی؟'' دادا کے الفاظ میں جانے کیا تھا کہ میں رو دی۔

''نہیں دادا......''

''ارے کیا ہوا نگاہ بیٹا؟'' وہ بوکھلا گئے۔

''ان کے ساتھ بات نہیں بنی!'' میں نے... بہ مشکل کہا۔

''تو کیا لڑکا بہت اچھا تھا، بہت خوب صورت...... اتنا اسمارٹ کہ تم اس رشتے کے کھو جانے سے پریشان ہو؟''

''میں نے تو اس لڑکے کو ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں دادا......'' میں نے اپنی آنکھ سے آنسو صاف کیے۔ ''اور انکار بھی میں نے خود کیا تھا......''

''پھر تو رونے کی کوئی تک ہی نہیں بنتی......'' انہوں نے میرے ہاتھ سے کتاب پکڑی۔ ''چھوڑو اس کتاب کو، مجھے یہ کہانی سناؤ جس نے تمہیں رلا دیا ہے......'' ان کے اس طرح کہنے پر میں مسکرا دی۔ میں نے انہیں حرف بہ حرف ساری بات کہہ سنائی، وہ سنتے رہے، کہیں ہنس پڑتے اور کہیں سنجیدہ ہو جاتے۔ ''زبردست......'' انہوں نے تالی بجا کر کہا۔

''مجھے تو تمہاری کہانی کا انجام بہت پسند آیا ہے......'' میں ہنس دی، عرصے کے بعد یوں ہنسی تھی، اس ہنسی کو بریک محسن انکل کی آمد سے لگے۔

''یار تم کیوں آ گئے بیچ میں...... اتنی اچھی بارش ہو رہی تھی!'' انہوں نے میری ہنسی کو بارش کہا تو میں شرما گئی۔

''دادا آپ بھی ناں!''

☆☆☆

''سر شام ہی اماں دروازے بند کر لیتی ہیں آپ......'' دروازے پر دستک سن کر میں نے بیزاری سے کہا، خود تو باورچی خانے میں مصروف جانے کیا کر رہی تھیں، میں نے پاؤں میں چپل اڑس کر بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا...... حیرت کا سامنا...... بلال...... ''اماں!'' میں وہیں سے چیخی۔

''کوئی نل خراب ہے کیا؟''

''میں پلمبر نہیں ہوں نگاہ!'' اس نے مجھے شرمندہ کر دیا۔

''سوری......'' میں نے فوراً کہا۔ ''تو پھر کیوں آئے ہیں، میں سمجھی کہ دادا نے بھیجا ہوگا کچھ خراب ہو گا تو اسے ٹھیک کرنے کے لیے......''

''ہوں!'' اس نے ہولے سے کہا۔ ''بھیجا تو دادا نے ہی ہے اور بھیجا بھی اسی مقصد کے لیے ہے...... خرابی ٹھیک کرنے کے لیے!''

''اماں......'' میں نے اماں کو پکارا۔

''کیا بات ہے بیٹا، چلا کیوں رہی ہو، کون آیا ہے......''

''بلال ہے اماں......'' میں نے روانی میں کہا اور فوراً خیال آیا کہ کس بے تکلفی سے اس کا نام لے

دیا اور وہ کیا سمجھے گا کہ اس کا تعارف میں نے اماں سے کردار کھا ہے۔ ''دادا جی کا سب سے بڑا پوتا، وہ جو ایک بار نل ٹھیک کرنے آیا تھا اماں!''

''تو بلاؤ ناں اسے اندر بیٹا......'' اماں نے کہا اور اگلے ہی لمحے ان کا چہرہ نظر آ گیا، میں نے ہٹ کر بلال کو راستہ دیا۔ ''یہ ہے وہ جسے میرے ہاتھ کی بریانی بہت پسند آئی تھی اور جو اپنے خانساماں کی ٹریننگ مجھ سے کروانا چاہتا ہے......'' میں کھسیا گئی، اماں سارے بھید کھولنے پر تلی ہوئی تھیں۔

''چلتا ہوں آنٹی!'' اماں کے ہاتھ کے بنے تازہ فالسے کے شربت کے تین گلاس چڑھا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ آیا کیوں تھا، اس کے جانے کے بعد اماں نے بتایا کہ دادا اماں سے ملنے کے لیے آ رہے تھے۔

''آپ وہاں چلی جاتیں اماں!'' میں نے اپنے ''گھر'' کو دیکھا، دادا کے شایانِ شان کہاں تھا وہ گھر۔

''وہ یہی بتانے آیا تھا کہ دادا اس گھر کے معائنے کے لیے آ رہے تھے کہ آیا یہ گھر ٹھیک ہے کہ نہیں!'' اماں سادگی سے کہہ رہی تھیں۔

ممکن ہے کہ میری رشتے والی بات بتانے پر دادا نے سوچا ہو کہ ایک بار دیکھ لیں کہ یہ گھر اس قابل ہے کہ یہاں کسی اچھے رشتے والے کو بلایا جا سکے...... میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''اماں...... میں نے دادا کو کل آنے والے لوگوں کا بھی بتا دیا تھا!''

''کوئی بات دل میں بھی رکھ لیا کرو تم......''

اماں نے جانے کیوں گھُرکا مجھے، وہ جلدی، جلدی ہاتھ پاؤں چلا رہی تھیں اور جو تھوڑی بہت چیزیں بکھری ہوئی تھیں انہیں سمیٹ رہی تھیں، گملوں میں سے تازہ دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ توڑ کر اماں نے تازہ چٹنی بنائی، فریزر میں سے انہوں نے شامی کباب نکال کر رکھ دیے تھے اور ساتھ سوجی کا تازہ حلوا بنا رہی تھیں۔

''حلوے میں میٹھا کم رکھیے گا اماں...... دادا میٹھا ہلکا لیتے ہیں!'' میں نے ان سے کہا۔ ''جانے کیسے میں ان سے کچھ بھی چھپا نہیں پاتی اماں...... ان سے دوستوں کی طرح ہر بات شیئر کر لیتی ہوں، وہ بولتے ہی اتنا ہیں اور اتنے سوال کرتے ہیں کہ کوئی راز نہیں رہ پاتا دل میں۔'' میں ہنسی۔

''برتن تیار کر لو تم......''

''کون، کون آ رہا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ تو پوچھا ہی نہیں بلال سے میں نے......'' اماں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''چلو چار لوگوں کے برتن لگا لو......'' اماں نے کہا۔ ''دو تو ہم ہیں، ایک کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ ہو گا۔'' میں برتن تیار کر چکی تھی، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال سنوارے، اسی اثنا میں دستک ہوئی، میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

''السلام علیکم......'' میں نے دادا اور محسن انکل کو سلام کیا، دادا محسن انکل کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، میں نے راستہ چھوڑا تو وہ دونوں اندر آ گئے، دادا نے برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ کر محسن انکل سے کہا کہ وہ جائیں...... ایک گھنٹے کے بعد بلال کو بھی ساتھ لے کر آ جائیں۔

''مجھے اچھی، اچھی سی خوشبوئیں آ رہی ہیں، چائے ہم سب ساتھ ہی پئیں گے، ایک گھنٹے کے بعد!'' ان کے جانے کے بعد دادا کو سادہ پانی دیا میں نے، انہوں نے اٹھ کر گھر کا جائزہ لیا اور کچھ ایسی چیزوں کی نشان دہی کی جو اُن کے خیال میں مرمت کی طالب تھیں۔ ''میں ایک بہت خاص بات کے لیے تمہارے گھر آیا ہوں آج!''

''آپ اماں کو بلا لیتے دادا جی!'' میں نے شرمندگی سے کہا۔

''نہیں...... میرا آنا ضروری تھا بیٹا! پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے ناں!'' انہوں نے میری

بات کے جواب میں کہا۔ ''کیا تمہیں میرا یہاں آنا برا لگا ہے؟''

''ارے نہیں دادا!'' میں نے فوراً کہا۔

''برا کیوں لگے گا جی!'' اماں نے تائید کی۔

''یہ تو دیوانی ہے آپ کی، گھر آ کر بھی تمام وقت آپ ہی کے بارے میں باتیں کرتی رہتی ہے......''

''میرے خلاف یا؟'' دادا جی نے چتون چڑھا کر مصنوعی غصے سے سوال کیا۔

''آپ کے خلاف تو یہ ایک لفظ کسی اور سے بھی نہ سنے جی!''

''آپ مجھے ماموں کہہ سکتی ہیں!'' دادا جی نے کہا۔ ''یہی رشتہ بنتا ہے میرا اور آپ کا!'' میں نے دادا جی کو دیکھا، واقعی اماں انہیں بھائی صاحب تو کہہ نہیں سکتی تھیں۔ ''میرے پاس ایک گھنٹے کا وقت ہے صرف......'' انہوں نے بات شروع کی۔ ''میں تم دونوں سے ایک اہم بات کرنے آیا ہوں، بیچ میں مجھے ٹوکنا نہیں، تمہیں علم ہے ناں نگاہ کہ مجھے کہانی کے بیچ میں مداخلت بالکل پسند نہیں اسی لیے میں نے بلال اور محسن کو بھی ایک گھنٹے کے بعد بلایا ہے۔'' کہہ کر وہ رکے اور پھر کہانی شروع کی۔

''سکینہ میری چچا زاد تھی، ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے، اس کی شادی ہوئی تو میں اس وقت سولہ برس کا ہوں گا...... چند ماہ کے عرصے میں ہی چچا، سکینہ کو اس کی سسرال سے واپس لے آئے، سکینہ کے ہاں ہمارے گھر پر ہی بیٹا پیدا ہوا، تایا کو دل کو دورہ پڑا تو انہوں نے سکینہ کا ہاتھ میرے ابا کے ہاتھ میں تھمایا اور خود آنکھیں موندلیں۔ سکینہ ابا کی اکلوتی اور لاڈلی بھتیجی تھی، اسے تو وہ ابا کو باہر بیاہنے ہی نہ دیتے جو اُن کا بڑا بیٹا ہوتا۔ مگر سکینہ کے ہاں بیٹے کی ولادت کے بعد ابا نے کوشش کی کہ اس کا اپنے شوہر سے راضی نامہ ہو جائے مگر جب وہاں رابطہ کیا گیا تو علم ہوا کہ اس نے خودکشی کر لی تھی، یہ ابا کے لیے ایک بڑا صدمہ تھا، ابا نے چند ماہ کے بعد مجھے مجبور کیا کہ میرا نکاح سکینہ سے پڑھا دیا جائے، میں ابھی بارھویں جماعت کا طالب علم تھا، احتجاج کیا مگر ابا کے مزاج کے خلاف ہمارے گھر میں کچھ بھی نہ ہوتا تھا...... اسی خوف سے کہ وہ میرا نکاح سکینہ سے نہ کر دیں، ایک رات میں نے چپکے سے گھر چھوڑا اور اس بڑے شہر میں آ گیا۔

یہاں ٹھنڈے دھکے کھاتے چند ماہ میں چودہ طبق روشن ہو گئے، یہ سوچ کر کہ جا کر ابا سے معافی مانگ کر سکینہ سے نکاح بھی کر لیتا ہوں، گھر گیا تو علم ہوا کہ سکینہ کا نکاح ابا کسی اور کے ساتھ پڑھا چکے تھے جو کہ عمر میں سکینہ سے بیس سال بڑا بھی تھا اور بے اولاد بھی، بیوی کا انتقال ہو چکا تھا، اسے سہارے کی ضرورت تھی اور سکینہ کو اپنا بیٹا پالنے کے لیے بھی کوئی نہ کوئی آسرا چاہیے تھا۔ سال بھر میں ہی سکینہ پھر بیوہ ہو کر واپس آ گئی مگر تب تک میں ابا کی بات مان کر ان کی ایک بھانجی ہاجرہ سے نکاح کر چکا تھا۔ سکینہ کو ابا نے ایک چھوٹا سا گھر بنا کر شہر میں منتقل کر دیا تا کہ وہ اپنے بیٹے کی اچھی تعلیم اور تربیت کر سکے، اس کے ہمراہ ابا نے اپنا ایک خاندانی ملازم بھی بھجوایا تا کہ اس کا خیال رکھ سکے۔

ابا نے مجھے اور ہاجرہ کو بھی شہر بھجوا دیا تا کہ نہ صرف میں پڑھ سکوں اور اپنے لیے کوئی مستقبل بنا سکوں بلکہ ایک شہر میں رہتے ہوئے ہم سکینہ کا خیال بھی رکھ سکیں۔ ہاجرہ کے ہاں سال بھر میں ہمارے پہلے بیٹے کی ولادت ہوئی اس وقت میں ابھی بیس برس کا تھا، اپنی ذمے داریوں، پڑھائی اور ساتھ ساتھ شہر میں اپنا کام سیٹ کرنے میں ایسا مصروف ہوا کہ مہینوں سکینہ کی طرف نہ جا پاتا، وقت گزرنے کے ساتھ یہ وقفہ بڑھتے بڑھتے اتنا ہو گیا کہ بالکل خبر نہ رہی کہ سکینہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ فیض...... میرے بیٹے محسن کا دوست ہے، اس کے والد کاروباری آدمی تھے، ان کا واسطہ کئی کاروباری

لوگوں سے رہتا تھا، انہی کے ذریعے فیض کا رابطہ سکینہ کے بیٹے اکرام سے ہوا اور چند ملاقاتوں میں دونوں اچھے دوست بن گئے۔ پھر فیض کے دوست اکرام نے کاروباری نقصانات سے گھبرا کر خودکشی کر لی، اپنی بیوی اور بیٹی کو اس ظالم دنیا میں رُلنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ فیض نے بھنوں کی طرح اکرام کی بیوہ کی دیکھ بھال کی، اسے اور اس کی بیٹی سے ملنے باقاعدگی سے جاتا تھا اور ان کے مسائل کے حل کے لیے کوشاں رہتا، اسی پریشانی میں ایک بار وہ محسن کے پاس آیا تو محسن نے اسے کہا کہ ان دونوں کو یہاں لے آئے...... محسن نے مجھے بتایا تو میں نے فیض سے علیحدگی میں بات کی، تب مجھے تفصیلی تمام حالات کا علم ہوا، مزید کریدنے پر......"

"فیض انکل نے آپ کو سب کچھ پہلے ہی بتا دیا تھا دادا؟" میں مداخلت کیے بنا نہ رہ سکی۔

"نہیں رہ سکی ناں مداخلت کیے بغیر......" وہ ہنسے۔ "اسے بتانا ہی تھا...... کیونکہ اس کی باتوں سے مجھے علم ہو گیا تھا کہ تم دونوں کا کچھ نہ کچھ تعلق مجھ سے تھا، تم سکینہ کی پوتی ہو اور یہ اس کی بہو ہے...... مگر تم فکر نہ کرو، اس بات کا علم صرف مجھے اور فیض کو ہے، اور فیض کسی سے بات نہیں کرے گا، محسن سے بھی نہیں۔"

"اچھا!" میں نے بے دلی سے سر جھکایا، گویا دادا...... میری دادی کے کزن تھے۔

"میں نے خود کو ملامت کی کہ میں نے سکینہ سے رابطہ نہ رکھا...... ورنہ شاید حالات مختلف ہوتے، تمہارے باپ نے وہی کیا جو اس کے باپ نے کیا تھا، تمہارا دادا ایک شکی آدمی تھا اس نے سکینہ پر بہت بے ہودہ الزامات لگائے تھے جو میرے تایا یعنی تمہارے نانا سے برداشت نہ ہوئے اور وہ بیٹی کو حالات کی چکی سے نکال لائے، میں شرمندگی کے باعث تم لوگوں کو بتا بھی نہ سکا کہ میں تمہارا وہ بے حس رشتے دار ہوں جسے میرے ابا نے اپنی بیٹیوں جیسی بھتیجی کی

ذمّے داری تفویض کی تھی۔

ستائیس برس کی عمر میں، میں اوپر تلے پانچ بچوں کا باپ بن چکا تھا، بلال کی دادی اور میں دونوں ہی جذباتی سے تھے، بچوں کی ذمّے داریوں میں الجھ کر ہمہ وقت آپس میں الجھا کرتے اور لڑتے جھگڑتے۔ پھر وہ بھلی مانس مجھے اس وقت چھوڑ گئی جب میرا کاروبار اتنا پھیل چکا تھا کہ میرے پاس بچوں کو دینے کے لیے وقت نہ تھا...... محسن سب سے چھوٹا تھا، ماں کے بغیر سب سے زیادہ وہی متاثر ہوا، میں نے گھر کی ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جلدی، جلدی حسن اور احسن کی شادیاں کر دیں..... چند سالوں میں دونوں بہویں آئیں، اپنی چھوٹی بہنوں کو حامد اور شاہد کے ساتھ بیاہ کر لے آئیں، گھر پر بہوؤں کی اجارہ داری ایسی قائم ہوئی کہ بیٹے بھی بیٹے نہ رہے، شوہر اور باپ بن گئے۔ لیکن اس میں قصور ان کا کم اور میرا زیادہ ہے، میں کمانے کی مہم میں ایسا جُتا کہ بچوں کو وہ وقت اور توجہ نہ دے سکا جس کی انہیں ضرورت تھی۔

وقت کی طنابیں کون تھام سکا ہے..... سرپٹ بھاگتے وقت نے محسن کو اس عمر تک پہنچا دیا کہ اس کی شادی کی فکر ستانے لگی مجھے..... مگر اسے کوئی لڑکی بھاتی ہی نہ تھی، دو ایک جگہ بات چلی مگر بہوؤں نے دال نہ گلنے دی..... اب تو محسن سے اگلی نسل بھی جوان ہوگئی ہے..... بلال میرا بڑا پوتا اب تیئس برس کا ہوگیا ہے، میں پینسٹھ برس کی عمر میں اتنے جوان پوتوں کا دادا بن گیا ہوں ماشاءاللہ..... لیکن اس ظالم وقت نے سب سے بڑا نقصان محسن کا کیا ہے، وہ مختلف سا ہوگیا ہے، عورتوں کے بارے میں اس کی سوچ بھی منفی ہوگئی ہے۔ میں اس وقت سوالی بن کر آیا ہوں.....“ دادا نے کہانی کے اختتام پر کہا۔ ”تم چائے بنا لو بیٹا، مجھے اس کے بعد نگاہ سے بات کرنی ہے۔“ اماں کو انہوں نے اٹھا دیا۔

”محسن میرا بیٹا ہے مگر تم سے پندرہ برس بڑا ہے بیٹا، وہ چالیس کا ہوگیا ہے..... بلال تم سے دو برس چھوٹا ہے..... میں نے دونوں سے الگ، الگ بات کی ہے، بلال کو تم اچھی لگتی ہو، میں نے اس کی نظر میں دیکھ لیا تھا، اس سے پوچھا تو اس نے تصدیق کر دی تھی۔ وہ اور طرح کی فطرت کا بچہ ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ اس نے چھچھوری نگاہ بھی نہ ڈالی ہو گی تم پر..... اس کی ماں اور اس کے باپ کو اس پر شدید اعتراض ہوگا مگر میں انہیں عاق کرنے کی دھمکی دوں گا تو ان کے سارے کس بل نکل جائیں گے۔ میری کروڑوں کی جائداد ہے بیٹا جو میرے بعد ان سب کو ملے گی، پانچ بیٹوں اور پھر اس کے بعد ہر ایک کے ہاں چار، چار بچے ہیں، بٹ بٹا کر بھی اتنا مل جائے گا کہ تم جو زندگی اب جی رہی ہو اس سے بہتر زندگی گزار دو گی.....

مجھے علم ہے کہ اس گھر کے اسٹیٹس کے بارے میں فکرمند خواتین کو یہ بات پسند نہیں آئے گی کہ جسے انہوں نے میری دیکھ بھال کے لیے رکھا ہے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بیٹا نہ ہی میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت..... تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو بیٹا..... پھر بہت ہی محبتوں کا قرض بھی چکانا ہے..... دوسری صورت بھی ہے ایک .... تم میری غرض نہ سمجھنا صرف، میں نے محسن سے بھی پوچھا تھا کہ اگر یہ میری خواہش ہو تو..... اس نے میری خواہش پر سر جھکا دیا تھا، وہ کہتا ہے کہ اسے شادی سے کوئی غرض نہیں ہے مگر بیٹا میں باپ ہوں ناں..... سوچے بنا نہیں رہ سکتا اس کے بارے میں، اس کی فکر میں گھلتا ہوں کہ وہ میرا اس قدر خیال رکھتا ہے اور میں اس کی شادی تک نہیں کر سکا ابھی تک۔ میں جانتا ہوں کہ اگر تمہاری اس سے شادی ہوگی تو بھی میری بہوؤں کی ناک اونچی رہے گی کہ ان کے خاندان اونچے ہیں مگر تمہیں یہ سب فکر کرنے کی ضرورت نہیں

بیٹا..... میں ہوں ناں، میرے ہوتے ہوئے کسی کی جرأت نہیں کہ تمہارے خلاف بات کرے، بس تم بہادر بنا، تمہاری ماں سے بعد میں بات کروں گا، پہلے تم سوچ کر اپنا جواب دو.....'' دستک کی آواز سے ہم دونوں چونکے۔

چائے ہم سب نے مل کر پی، محسن انکل اور بلال کی موجودگی میں، میں کچھ جھجک سی رہی تھی، اماں ان دونوں کی خوب تواضع کر رہی تھیں خصوصاً بلال کی کہ انہوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ دادا نے بلال کے لیے سوال کیا ہے۔ چائے پی کر وہ روانہ ہوئے تو ہم دونوں ماں بیٹی اکیلے کافی دیر تک خاموش رہیں، ہمارے درمیان خاموشی کا وقفہ اتنا طویل پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

''کتنا پیارا لڑکا ہے ناں بلال؟'' اماں نے خاموشی کی جھیل میں پتھر پھینکا۔

''محسن بھی اچھا ہے.....'' اماں پھر گویا ہوئیں۔

''اچھے سبھی ہیں اماں.....'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''دادا جی اچھے ہیں تو ان کے بیٹے اور پوتے سب اچھے ہیں..... اور آپ سب کچھ سن رہی تھیں گویا؟'' اماں نے یقیناً تجسس سے مجبور ہو کر سب کچھ چھپ کر سنا تھا۔ دادا نے بھی کچھ آہستہ آواز میں نہ کہا تھا، اگر اماں نے سن لیا تھا تو ان کا مقصد بھی چھپانا نہ تھا بلکہ مجھ سے اس طرح بات کرنا تھا کہ میں کھل کر ان سے بات کر سکوں۔

اس رات..... پہلی بار میری نیند میری آنکھوں سے روٹھی تھی، میں نے تمام رات کروٹیں بدل، بدل کر گزاری تھی۔ نہا دھو کر تیار ہو کر ڈیوٹی پر پہنچی تو میری آنکھیں تمام داستان کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری بیٹا؟'' دادا نے تشویش سے پوچھا۔

''جی دادا.....'' میں نے مختصراً کہا۔

''سوئی نہیں ہو؟''

''ہوں.....'' میں نے کہا۔

''میری طرف دیکھو ذرا!'' میں نے نظر اور بھی جھکا لی۔ ''میں نے کچھ غلط بات کہہ دی تھی رات، کسی نتیجے پر پہنچ گئی ہو یا پھر کشمکش نے نیند اڑا دی ہے؟''

''ابھی تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے دادا جی!'' میں نے کہا۔ ''کہانی شروع کی جائے یا باہر چلنا ہے دادا؟''

''کچھ بھی نہیں.....'' دادا نے آنکھیں موند لیں۔

''ناراض ہو گئے ہیں آپ کیا؟'' میں نے شرمندگی سے پوچھا۔

''میں خود سے ناراض ہو گیا ہوں بیٹا، میں نے تمہیں پریشان جو کیا۔''

''ارے نہیں دادا، ایسی کوئی بات نہیں ہے.....'' میں نے ان کی دل جوئی کو کہا ورنہ حقیقت میں انہوں نے جس منجدھار میں........ مجھے پھینک دیا تھا وہی میرے رت جگوں کا باعث تھا۔ ''وقت لگے گا ناں، اس لیے ذرا الجھن میں ہوں..... آپ کا کم احسان ہے کیا کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا ہے.....'' میں نے دل کی پوری سچائی سے کہا۔ ''ورنہ کون کسی کے لیے ایسا سوچتا ہے.....''

''یوں تو نہ کہو بیٹا..... تم رشتے میں ایک طرح سے میری پوتی ہی لگتی ہو، سکینہ کی پوتی جو ہو تم!'' دادا نے کہا۔

''مجھے کچھ وقت دیں دادا.....'' میں نے درخواست کی۔ ''یہ سب کچھ سوچنا بہت مشکل ہے، حالات نے بہت محتاط بنا دیا ہے، اس گھر کے مکینوں کو دیکھ رہی ہوں کافی عرصے سے، جانتی ہوں کہ کسی کا آپ سے دلی ربط نہیں ہے بلکہ آپ کے حوالے سے شاید ان کے دلوں میں میرے لیے نفرت بھی ہے..... کیا میں اتنی نفرتوں کا سامنا کر پاؤں گی؟'' میں دادا سے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ گھر کے سارے مکین جو دادا کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے، ان کے لیے تو یہ بات ہضم کرنا مشکل تھا کہ گھر ے ڈیپریشن میں

چلے جانے والے دادا زندگی کی طرف نہ صرف لوٹ آئے تھے بلکہ بھرپور قہقہے لگاتے تھے اور ان کی دلچسپی عصرِ حاضر کی ایجاد کمپیوٹر سے کتنی بڑھ گئی تھی، وہ کتابیں پڑھتے اور سنتے تھے، انہیں اب اندازہ ہوا تھا کہ زندگی سے کس کس ڈھب سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔ ان کی رفیقۂ حیات انہیں بھری جوانی میں تنہا چھوڑ گئی تھیں، تب سے وہ اپنی ذات میں کس قدر تنہا ہوگئے تھے۔

''میں جلد سوچ کر کچھ بتاؤں گی آپ کو دادا!''

''بیٹا...... مجھے یہ بتاؤ کہ کیا میں اپنے اثاثوں کی تفصیل کو کمپیوٹر پر ڈال کر محفوظ کرسکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں دادا......''

''اپنی وصیت بھی اس پر لکھ سکتا ہوں؟''

''لکھ تو سکتے ہیں مگر اس کی قانونی حیثیت مستند نہ ہوگی کہ کمپیوٹر پر تو کوئی بھی لکھ سکتا ہے......'' میں نے انہیں بتایا۔ ''آپ کمپیوٹر پر لکھ کر اس کی ایک کاپی نکال کر اپنے وکیل کے پاس رکھوا دیں اپنے دستخط کرکے...... مگر آپ نے وصیت کی باتیں کیوں شروع کردیں؟''

''یوں ہی سوال پوچھا ہے کہ کمپیوٹر پر کیا کیا کیا جاسکتا ہے......'' وہ ہنسے۔ ''ذرا میری وہ پیلی فائل تو لانا میری الماری سے۔'' میں نے اٹھ کر ان کو فائل پکڑائی۔ ''میری وصیت تو سیدھی سادی ہے بیٹا، ساری جائداد پانچوں بیٹوں میں برابر بٹے گی، محسن زیادہ فائدے میں رہے گا کہ اسے ابھی دیر تک تنہا اپنی جائداد سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے گا اگر اس کی شادی نہیں ہوتی، اگر ہو بھی جائے تو بھی...... باقیوں کے بچے جوان ہیں ان کا حصہ تو ان کی ذمے داریاں نبھانے میں ہی صرف ہو جائے گا......'' وہ مجھے بتارہے تھے۔ ''میں نے یہ وصیت سالوں پہلے لکھوائی تھی، اس وقت میں نے اپنی بیوہ کو اس کے نصف کا حقدار ٹھہرایا تھا، شرعاً تو وہ آٹھویں حصے کی حقدار ہے مگر ہبہ تو میں اسے کچھ بھی کرسکتا تھا اب...... میرا یہ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا گھر بھی میری بیوہ کے نام ہے...... اب مجھے وصیت تبدیل کرنا ہوگی، سوچ رہا ہوں کہ اگر تم بلال کے حق میں فیصلہ دو تو میں کچھ نہ کچھ علیحدہ سے اسے ہبہ کردوں، شاید اپنے باپ کی طرف سے تفویض کی گئی ذمے داری کو سکینہ کی پوتی پر نبھا سکوں......''

''اچھا آپ اس طرح کی باتیں بند کریں اور اٹھ کر باہر چلیں......'' میں نے فائل ان کے ہاتھ سے لے کر لیپ ٹاپ کے بیگ کی اوپری جیب میں رکھ کر زپ بند کردی اور انہیں ساتھ لے کر باہر کو چلی۔

رات کو لیپ ٹاپ کھولا تو وہ فائل باہر نکل کر نظر آئی۔ ''اوہو، میں تو یہ فائل نکالنا ہی بھول گئی تھی۔'' میں نے دل میں سوچا کہ ابھی انہیں واپس کردوں مگر پھر سوچا کہ اسے لیپ ٹاپ پر منتقل کرکے دیکھتی ہوں...... میں نے فائل کھولی اور حسبِ عادت اسے پڑھنا شروع کردیا، اس میں دادا کی وہ پرانی وصیت تھی جس کے بارے میں تو وہ بتا ہی چکے تھے، اس کے علاوہ ایک حالیہ اثاثوں کا مختصر سا حساب کتاب تھا...... اتنے زیرو کہ میں گن ہی نہ سکی کہ ان کی جائداد کا حساب تھا کیا، میں نے گھبرا کر فائل بند کی اور لیپ ٹاپ بند کرکے رکھ دیا۔

☆☆☆

''چلیے......'' میں ڈیوٹی کے لیے پہنچی تھی، وہاں تک سک سے تیار بلال کھڑا تھا، مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''کہاں جانا ہے......'' میں گھبرا گئی۔ ''دادا ٹھیک تو ہیں، کہاں ہیں وہ؟'' میں سمجھی کہ دادا کو کچھ ہو گیا تھا اور وہ کہیں اسپتال وغیرہ میں تھے۔

''یہیں ہیں دادا......'' اس نے فوراً کہا۔ ''مجھے تمہاری دادا کے بارے میں فکر اچھی لگی نگاہ!''

''تو پھر کہاں جانا ہے؟'' میں نے ابرو اچکائے۔

''جہاں دادا کا حکم ہے......'' اس نے کہا۔

''میں پوچھتی ہوں دادا سے......'' میں نے دادا

کے کمرے کے اندر کی طرف قدم بڑھائے۔ ''السلام علیکم دادا، کہاں جانا ہے مجھے بلال کے ساتھ؟''

''تم جاؤ بیٹا، میں نے اسے کوئی کام بتایا ہے وہ راستے میں تمہیں بتا دے گا!'' دادا نے کہا۔ ''محسن کو میں نے دوسرے شہر بھیجا ہوا ہے اس لیے کہ اسے میری فکر نہ ہو، تم بے فکر ہو کر جاؤ بیٹا، میں ٹھیک ہوں!'' میں الجھے دماغ کے ساتھ بلال کے ساتھ اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں ناں نگاہ؟'' اس نے گاڑی چلاتے ہوئے سوال کیا۔

''جی...... بہت شکریہ!'' میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا، گاڑی میں اس کے پرفیوم کی انتہائی مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں باہر دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کہاں جانا ہوگا، گاڑی ایک تفریحی مقام پر رکی تو میں نے سوالیہ نظروں سے بلال کو دیکھا، اسی لمحے اس نے مڑ کر دیکھا اور ہماری نظریں چار ہوئیں، میں گھبرا گئی۔

''یہاں کیا کام ہے دادا کا؟''

''دادا نے کسی کام کے سلسلے میں بات کی تھی آپ سے...... ان کا خیال ہے کہ ہمیں کم از کم ایک دن ساتھ گزار کر ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ آپ کے لیے فیصلہ آسان ہو جائے......'' میں نے خاموشی سے اس کی معیت میں گاڑی سے قدم باہر نکالے، مجھے پُراعتماد رہنا تھا، دادا نے شاید میری سہولت کے لیے اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا بندوبست کیا تھا، ہم طویل راستوں پر چلتے اور باتیں کرتے جا رہے تھے...... اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا، اس کے خواب، اس کی سوچیں، اس کے ارادے...... اور یہ کہ میں اسے پہلی نظر میں اچھی لگی تھی مگر اسے ڈر تھا کہ اس کی ماں اور بہنیں اس بات کا مذاق بنائیں گی کہ میں نے دادا کی نرس کو کس نظر سے دیکھا تھا......'' ویسے تو ہمارے گھر میں کسی کے پاس کسی دوسرے کے لیے وقت نہیں ہے مگر دوسروں کی زندگیوں میں مداخلت کرنے کو بہت وقت ہے۔''

''آپ کی ای میری حیثیت کے باوجود مجھے اپنے گھر میں بڑی بہو کی حیثیت سے قبول کر لیں گی؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''نیور......'' ایک حرفی جواب تھا۔ ''میں آپ کو کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا، آپ مجھے اچھی لگتی ہیں اور دادا ہمارے ساتھ ہوں گے تو مجھے کسی چیز کی پروا نہیں ہے...... میں تمہیں دنیا کی ہر آسائش دوں گا نگاہ...... سسرال میں اپنی عزت اور مقام تمہیں خود بنانا ہوگا......'' وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا، اس نے ایک وعدے کی ڈور مجھے پکڑائی۔

مجھے وہ اچھا لگا تھا، اس کی سوچ، خواب، عزائم اور باتیں۔ دل نے جیسے کسی حد تک فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ مگر مجھے کوئی جلد بازی نہیں کرنا تھی، بلال کی ماں اور بہنیں اہم تھیں، اس وقت نہ بھی لگ رہی ہوں مگر شادی کے بعد حالات پر اختیار نہیں رہتا۔ مجھے دادا سے اس بات کی گارنٹی چاہیے تھی کہ کوئی مجھے کم تر نہ سمجھے، میں عمر بھر اپنے لیے اس گھر میں مقام بنانے کی جدوجہد میں ہی نہ لگی رہوں اور ایک مقام پر لگے کہ سب تپسیا بیکار گئی۔

☆☆☆

دادا نے بلال کو میرے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں بتا رکھی تھی اور بالخصوص ابا کے حوالے سے اور میں نے بھی اپنے اس راز کو راز ہی رکھا، چند دن کے بعد دادا نے محسن انکل کے ساتھ مجھے کچھ وقت گزارنے کا کہا، اس روز بلال کو دادا نے کہیں بھیج رکھا تھا...... اتنے بڑے گھر میں مکین ایک دوسرے سے اس قدر فاصلے پر تھے کہ کسی کو علم ہی نہ تھا کہ دادا کیا کھچڑی تیار کر رہے تھے۔ میں نے محسن انکل کی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تو وہ اپنی سیٹ سے اُتر

کر آگے کا دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے......'' میں شوفر نہیں ہوں آپ کا!''

''شوہر بھی نہیں ہیں!'' میں زیرِ لب بڑبڑائی۔

''بن تو سکتا ہوں ناں!'' انہوں نے کہا۔

''جی......!'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔ ''کیا کہا آپ نے، کیا بن سکتے ہیں؟''

''وہی جو آپ زیرِ لب بڑبڑا رہی تھیں...... اسی طرح کا جواب دیتی ہیں لڑکیاں...... شوہر بھی تو نہیں ہیں!'' انہوں نے کہا تو میں ان کے انداز پر ہنس پڑی۔

''بڑا آئیڈیا ہے آپ کو لڑکیوں کی باتوں کا؟'' میں نے ابرو چڑھائے۔

''ہاں ہے......'' انہوں نے فوراً کہا ''دوستی کی حد تک بہت لڑکیوں سے!''

''لڑکے لڑکی کے بیچ دوستی کیا ہوتی ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا، شکل سے تو یہ بڑے زاہد لگتے تھے۔

''شادی تو کرنا تھی ناں...... پاپا کا اصرار تھا اور کسی کے پاس میرے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا تو یہ مشکل کام بھی مجھے خود ہی کرنا پڑتا تھا...... جو کوئی لڑکی بتاتا تھا اسے ٹھوک بجا کر دیکھتا اور......''

''کوئی پسند نہیں آئی کیا...... یا کسی کو آپ ہی پسند نہیں آئے؟'' میں نے طنز سے کہا، اچھے اسمارٹ ہیں تو اس کا یہ مقصد تھوڑا ہی ہے کہ خود کو راجا اندر سمجھ بیٹھیں۔

''آج سے پہلے نہیں......'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مگر آج اپنی تلاش ختم ہوتی نظر آتی ہے...... اصل میں آپ کو دیکھ کر بھی ذہن میں خیال نہیں آیا مگر پاپا کے کہنے پر جب میں نے غور کیا تو......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ''یوں بھی مجھے علم نہیں تھا کہ آپ کا بیک گراؤنڈ کیا ہے مگر پاپا نے بتایا کہ ہمارا اور آپ کا دور پار سے کوئی رشتہ بھی ہے اور یہ کہ آپ کے حالات ہمیشہ سے ایسے نہ تھے بلکہ آپ کے والد کے کاروبار میں نقصان اور پھر ان کی اچانک وفات سے آپ لوگوں پر یہ برا وقت آ گیا۔''

''کسی لڑکی میں آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں جو کہ آپ کو کسی اور میں نظر نہیں آیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''سادگی! خلوص، ہمدردی اور بے لوث خدمت کا جذبہ...... جیسا کہ آپ میں ہے...... مجھے بہت اچھا لگتا ہے جس طرح آپ پاپا کا خیال رکھتی ہیں، پاپا کے بارے میں میری فکر ختم ہو جائے گی، پاپا تو کہتے ہیں کہ میں ان کی فکر نہ کروں مگر میں کس طرح باقیوں کے طرح پاپا کے معاملے میں بے پروائی کر سکتا ہوں؟'' ان کے اندر ایک بیٹے کا پیار بول رہا تھا، گاڑی ایک انتہائی عالی شان ریسٹورنٹ کے سامنے پارک کر کے انہوں نے آ کر میری طرف کا دروازہ کھولا۔ ''آئیں لنچ کرتے ہیں!''

''ضرورت نہیں ہے......'' میں نے جھجک کر کہا، اماں کو معلوم تھا کہ میں محسن انکل کے ساتھ تھی مگر پھر بھی مجھے دیکھ لیے جانے کا خوف تھا، ان کے اپنے ہی خاندان کے کسی فرد کی طرف سے...... ان کی نظروں کا سامنا نہ کر پاتی میں۔

''ضرورت نہیں تو میری خواہش کے لیے ہی آ جاؤ!'' انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، میں نے اسے نظر انداز کیا اور سمٹ کر باہر نکل آئی۔ گاڑی لاک کر کے وہ چند قدم تیز چل کر میرے ساتھ آ گئے...... ''اس گریز کی وجہ پوچھ سکتا ہوں میں؟''

''میرے اور آپ کے بیچ کوئی ایسا رشتہ ابھی قائم نہیں ہوا انکل......'' میں فوراً رکی۔ وہ بھی جھنجلا گئے۔ ''سوری محسن صاحب......''

''صرف محسن کہو مجھے نگاہ......'' ان کے انداز میں کتنا مان تھا۔ ''مجھے اچھا لگے گا!''

''ابھی تو مشکل ہے......'' میرا چہرہ لال ہو گیا، مجھ سے اتنے بڑے آدمی نے میرے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔

''رشتہ قائم ہونے کے بیچ میں تو صرف تمہاری طرف سے ہاں کی دیر ہے......'' انہوں نے میز پر

میرے سامنے کی کرسی سنبھالی، دو کرسیوں کی اس میز پر ہم دونوں بہت قریب تھے، ویٹر پانی رکھ کر مینیو کارڈ دے گیا تھا۔ ''کیا کھاؤ گی؟'' وہ اتنے استحقاق سے پوچھ رہے تھے جیسے ہم کئی برسوں سے بیاہے ہوئے میاں بیوی ہوں۔

''کچھ بھی....'' میں نے کہا۔ ''مجھے یہاں کا کچھ اندازہ نہیں کہ کیا اچھا ملتا ہے۔'' اصل میں تو مجھے کہیں بھی باہر کھانے کے بارے میں معلوم ہی نہ تھا اس شہر میں۔ ابا کے بعد پہلی دفعہ میں کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے آئی تھی۔

''یہاں مچھلی بہت اچھی ملتی ہے.... چلو میری پسند پر کھا کر دیکھو، اس کے بعد تو تمہیں وہی کرنا ہے جو میری پسند ہوگی.... مجھے زیادہ تر لڑکیاں اس لیے پسند نہیں آتی تھیں کہ ان میں مرد کی پسند کے مطابق ڈھلنے کا گر نہیں ہوتا۔''

''میرے بارے میں بھی تو یہ بات ہو سکتی ہے....'' میں نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''میرے پاپا کا اندازہ تمہارے بارے میں غلط نہیں ہو سکتا، وہ کہتے ہیں کہ تم ایک مکمل لڑکی ہو، تم میں ہر سانچے میں ڈھلنے کی صلاحیت ہے اور وہ کہتے ہیں کہ تم کسی کے لیے بھی بہترین شریکِ حیات ہو سکتی ہو.... اگر وہ تم سے اتنے خوش ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تم مجھے بھی خوش رکھ سکو گی؟''

''وہ تو کتابیں سن کر.... لیپ ٹاپ سیکھ کر، باتیں کر کے، مزیدار کھانے کھا کر خوش ہو جاتے ہیں، وہ تو بزرگ ہیں جنہیں اپنوں کی بے توجہی نے بیمار کر دیا تھا، بہوئیں اور پوتے، پوتیاں تو ایک طرف.... انہیں تو ان کے بیٹوں نے نظر انداز کر دیا ہے....''

''میں نے تو نہیں کیا ناں!''

''کیونکہ آپ کی شادی نہیں ہوئی ابھی تک.... اور ویسے بھی آپ کے پاس اور مصروفیت ہی کیا ہے!''

''مصروفیات تو ہیں میری مگر میں پھر بھی پاپا کے لیے وقت نکال لیتا ہوں۔''

''ہائے....'' ایک چست لباس والی لڑکی ہماری میز کی طرف آ رہی تھی، محسن انکل نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا، اس کے قریب آتے ہی اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، اس نے بھی تپاک سے انہیں جواب دیا۔

''یہ پنکی ہے میری دوست....'' انہوں نے تعارف کروایا، پنکی کی سوالیہ نظروں نے مجھے دیکھا۔

''یہ کون ہے ڈارلنگ؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ میری دوست ہے نگاہ ناز....'' محسن انکل نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ اس سے شادی ہو جائے میری!'' میرے کان تک لال ہو گئے۔

''تو ٹرائل پیریڈ چل رہا ہے؟'' اس کی ہنسی میں کھنک تھی۔ ''تم اسے بھی ریجیکٹ کر دو گے میری طرح؟'' اس نے ابرو اچکائے.... ''بہت بڑے.... ہو تم!'' اس نے آنکھ مار کر کہا تو میں ششدر رہ گئی۔

''اور سناؤ تمہارا شوہر کیسا ہے؟'' محسن انکل نے غالباً مجھے خاص طور پر سنانے کے لیے کہا تھا کہ وہ شادی شدہ تھی اب۔

''تم نہیں تو جو بھی اور جیسا بھی ہو پنکی کو فرق نہیں پڑتا۔'' اس نے بے باکی سے انکل کے گال پر جھٹ سے بوسہ لیا اور مجھے ہاتھ ہلا کر ''بائے'' کہہ کر چلی گئی۔

''ایسی لڑکیوں پر توجہ نہ دینا....'' انہوں نے واپس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ایسی کئی آئیں اور گئیں، تم سے شادی ہوتے ہی یہ سب ماضی ہو جائے گا۔'' بظاہر مردم بیزار نظر آنے والے انکل.... عورت بیزار ہرگز نہ تھے۔

''مجھے خوشی ہوگی اگر تم پاپا کی درخواست قبول کر لوگی!'' گھر پر گاڑی سے نکلتے ہوئے انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ میں نے ہولے سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ کی گرفت سے نکالا اور باہر

نکل کر دادا کے بجائے اپنے گھر... چلی آئی۔

''اتنی جلدی کیوں آ گئیں بیٹا؟'' اماں نے سوال کیا۔ ''دادا کی طرف نہیں جانا کیا کچھ کھاؤ گی؟''

''نہیں اماں، کھانا کھا کر آئی ہوں محسن انکل کے ساتھ اور طبیعت کچھ بوجھل ہو رہی ہے...... تھوڑی دیر آرام کر دوں گی، شام کو تھوڑی دیر کے لیے دادا کی طرف جاؤں گی۔'' میں نے کپڑے تبدیل کیے اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔

''کیا ہو گیا بیٹا؟'' اماں کے لہجے میں ماؤں کی مخصوص پریشانی جھلک رہی تھی۔ ''کہاں کھانا کھانے گئے تھے تم لوگ...... کہیں کچھ ایسا ویسا تو نہیں......'' اماں کچھ کہتے، کہتے رک گئیں۔ ''شکل سے تو ایسے نہیں لگتے۔''

''نہیں اماں!'' میں نے فوراً اماں کا ہاتھ پکڑا...... ''ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں، کوئی شکل سے کیا لگے، اس پر یقین یوں بھی نہ کیا کریں مگر مجھے ایسا کچھ مسئلہ نہیں ہے اماں بس ذرا دماغ الجھ گیا ہے......''

''مجھے بتاؤ بیٹا کیا الجھن ہے؟'' اماں نے فوراً پوچھا۔

''بس ذرا تھوڑا غور مجھے خود کر لینے دیں، سمجھ آنے دیں ان دونوں کی تو پھر ہی کچھ بتاتی ہوں!'' میں نے کہہ کر کروٹ بدل لی، اماں سمجھ گئیں کہ اب انہیں مجھے اکیلا چھوڑ دینا چاہیے، میں سوچوں میں ڈوبی جانے کب نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☆☆☆

''کیسا رہا بھئی تم لوگوں کا لنچ؟'' دادا پوچھ رہے تھے۔

''جی اچھا تھا دادا......'' میں نے مختصراً کہا۔

''تم چاہو تو میں ان دونوں سے دوبارہ بھی تمہیں ملوا سکتا ہوں، دل میں کئی سوالات ہوتے ہیں بیٹا......'' دادا نے کہا۔ ''میں تمہیں فیصلے کا کلی اختیار دینا چاہتا ہوں۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ میرا دل دونوں میں سے کس کی طرف زیادہ جھکتا ہے...... مجھے دونوں ہی پیارے ہیں اور دونوں سے ہی محبت اتنی ہے کہ خود فیصلہ ہی نہیں کر پایا، جب بلال کا سوچتا ہوں تو کہتا ہوں کہ اگر تم اس کے حق میں فیصلہ دو تو میری ایک نسل سنور جائے گی، ساتھ ہی محسن کا خیال آ جاتا ہے کہ بلال کو تو اور ہزاروں مل جائیں گی مگر محسن کے لیے یہ میرے خیال میں آخری چانس ہوگا......''

میں خاموشی سے ان کا تبصرہ سن رہی تھی۔

''محسن کے حق میں دل سوچتا ہے تو اس کی اور تمہاری عمر کا تفاوت...... سب سے بڑی رکاوٹ نظر آتا ہے حالانکہ ہمارے پاس تو مثال موجود ہے کہ حضرت محمد ﷺ اور حضرت عائشہؓ کی عمروں میں تفاوت کا... پھر مرد کا کیا ہے، اچھی خوراک اور مال و دولت مرد کو کبھی بوڑھا نہیں ہونے دیتے۔ مجھے علم ہے کہ اس کے پیچھے بھی درجنوں پھرتی ہوں گی اب تک...... مگر وہ سب موسمی پرندوں جیسی ہوتی ہیں بیٹا، محسن کو تو ایک بہت وفادار اور صاف ستھرے ذہن والی لڑکی چاہیے...... جس کا ماضی بھی صاف ہو۔''

''صرف عورت کا صاف ماضی کیوں مانگا جاتا ہے دادا؟'' میں نے سوال کیا۔ ''مرد کا کوئی کردار نہیں ہوتا، اس کا داغ دار ماضی بھی صاف ہی کہلاتا ہے؟''

''مرد اور عورت کے رشتے میں مرد کا جاتا بھی کیا ہے......'' دادا نے کہا۔ ''اگلے ہی روز تو تم مجھے کہانی سنا رہی تھیں ناں...... خربوزہ چھری پر گرے یا چھری خربوزے پر، دونوں صورتوں میں نقصان تو خربوزے کا ہی ہوتا ہے ناں بیٹا۔ ماضی کے تعلقات کا مرد پر کیا فرق پڑتا ہے، جہاں مرد کے پاس پیسہ ہوتا ہے وہاں بے وقوف لڑکیاں تتلیوں کی طرح اس کے گرد منڈلاتی اور اپنا نقصان کر دا بیٹھتی ہیں......''

''آپ کے پاس بھی تو بہت دولت ہے دادا، کبھی آپ کے ارد گرد کوئی نہیں منڈلائی...... آپ نے کسی کا نقصان نہیں کیا؟'' میں نے نظر اٹھا کر ان

کی طرف دیکھا۔ [illegible]

"ہمارے ساتھ اقدار تھیں بیٹا..... اب ماؤں کے پاس وقت نہیں ہے اقدار سکھانے کا۔"

"محسن انکل تو آپ کی اولاد ہیں ناں..... ان کے ساتھ؟"

"محسن نے بہت کم عمری میں ماں کو کھویا تھا بیٹا..... اور یوں بھی حقیقت یہ ہے کہ جو وقت اولاد کی تربیت کرنے کا تھا وہ ہم نے پیسے کے پیچھے دوڑتے گزار دیا، اولاد کو وقت نہ دیا، اب وہ بھی یہی کر رہے ہیں، ان کے پاس ہمارے لیے وقت نہیں ہے مگر میں گلہ نہیں کرتا کیونکہ وہ مجھے میرے ہی سکے لوٹا رہے ہیں....."

"یہ تو ہے دادا!"

"میں تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کرتا ہوں کہ میرے پاس تم ہوتی ہو تو مجھے کسی رشتے کی کمی محسوس نہیں ہوتی، بیٹی، پوتی اور اتنی پیاری دوست ہو تم میری....." میں ان کی بات پر مسکرا دی۔

☆☆☆

"اس میں ایسا کیا ہے بیٹا، مردوں کے پاس دولت ہو تو ایسی لڑکیاں خود ہی ان کے دائیں بائیں منڈلاتی ہیں!" اماں نے بھی وہی بات کہی تھی جو دادا نے کہی تھی۔ "اگر تمہیں محسن میاں پر اعتراض ہے تو بلال میں تو ایسی کچھ برائی نظر نہیں آئی ناں تمہیں؟"

"اماں دائیں بائیں منڈلانے اور گلے ملنے میں فرق ہوتا ہے اور بے حیائی نہیں برداشت ہوتی مجھ سے نہ مرد کی نہ عورت کی..... غضب خدا کا، شادی شدہ ہو کر بھی انکل محسن کے فراق میں مر رہی تھی، یہ تو ایک تھی ناں اماں..... جانے ان کے ساتھ زندگی بتانے میں کتنیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور کڑھ کڑھ کر زندگی گزاروں گی۔"

"تو پھر اس کا مطلب ہے کہ تمہارا فیصلہ بلال کے حق میں ہے؟" اماں کا چہرہ چمکا۔ "اس پر تو تمہیں

ظالمو!

ایک شخص جس کی عمر چالیس سال تھی جو کہ شادی کا از حد تمنائی تھا۔ کسی جگہ اس نے ایک نوجوان عورت کی لاش دیکھی جسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔ پولیس والے اپنی کارروائی کر رہے تھے۔ لوگ طرح، طرح کی باتیں بنا رہے تھے لیکن وہ شخص ایک جگہ کھڑا ہو کر خود کلامی کر رہا تھا۔ "ظالموں! یہ اتنی فالتو تھی تو اسے قتل تو نہ کرتے مجھے ہی دے دیتے۔"

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

پریتم لوٹ آؤ

میری خطائیں گر یاد ہیں
تو اپنے ظلم بھی یاد کر
میری بے اعتنائی نہیں بھولتی
تو اپنی بے رخی کا بھی دھیان کر
میں بہت غم زدہ ہوں
تنہا ہوں تمہارے بن
پریتم اب لوٹ آؤ
ہر تلخ یاد کو بھلا کر
زہر آلودہ ایام کے ہر پل کو بھلا کر
اپنی چاہتوں کو بڑھا کر
نفرت کے الاؤ بجھا کر
پریتم اب لوٹ آؤ
اس سے پہلے کہ
سانس کا تانا ٹوٹ جائے
اور یہ بندھن چھوٹ جائے
پریتم اب لوٹ آؤ

شاعرہ: سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا

کوئی اعتراض نہیں ہے ناں..... مجھے بھی وہ لڑکا پہلی نظر میں اچھا لگا تھا اور میرے دل میں خواہش جاگی تھی کہ کاش میری نگاہ کو اس جیسا کوئی ساتھی مل جائے..... اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میری سن لی!''

''اماں..... بلال ایک کمزور مرد ہے، عمر میں بھی مجھ سے دو برس چھوٹا ہے..... اس کے ساتھ شادی کر کے میں اس کی ایسی مجبوری بن جاؤں گی جسے نبھاتے، نبھاتے وہ ہلکان ہو جائے گا، اس کی ماں اور بہنیں نہ صرف میرا جینا حرام کر دیں گی بلکہ بلال کا ناطقہ بھی بند کر دیں گی، وہ مجھے فخر سے اپنی بیوی کے طور پر متعارف نہ کروا سکے گا کیونکہ میرا بیک گراؤنڈ کمزور ہے اماں!''

''اے خدا نہ کرے.....'' اماں نے خفگی سے کہا۔ ''کیوں کمزور بیک گراؤنڈ ہے تمہارا، کیا تمہارے باپ کا کاروبار نہیں تھا، وہ تو حالات نے ڈبو دیا ورنہ ہم کوئی ایسے گئے گزرے نہیں ہیں۔''

''ابا کی وفات کا حادثہ تو ہم چھپاتے پھر رہے ہیں.....لوگوں کو ابا اور میرے دادا کی خودکشی کا علم ہو تو وہ جانے کیا، کیا الزامات ہمارے متھے لگائیں گے..... دادا کو شبہ تھا کہ ابا ان کی اولاد نہیں ہیں..... اماں لوگ جب گڑے مردے اکھاڑنے پر آتے ہیں تو بلال کی ماں جیسی عورتیں کئی کئی نسلوں کے شجرے نکلوا کر اس کے اور میرے منہ پر ماریں گی، آپ نہیں جانتیں کہ دنیا میں کیا، کیا ہو رہا ہے.....''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ دنیا میں کیا، کیا ہو رہا ہے، میں تو اس نکتے پر خود حیران ہو گئی ہوں۔'' اماں نے دانتوں تلے انگلی داب لی۔

''مجھے کتابیں پڑھ کر یہ سب علم ہوا ہے اماں..... یہ..... وہ نسل ہے جس کی تربیت پڑوسی ملک کے چینلز نے کی ہے، ان ڈراموں کی سازشیں اور تمام بری باتیں ہمارے ہاں در آئی ہیں۔''

''دنیا میں کسی عورت کو کامل سسرال نہیں ملتی بیٹا، کہیں کچھ کمی ہوتی ہے کہیں کچھ.....'' اماں نے مجھے سمجھانے کو کہا۔ ''کسی معاملے میں کوئی کچھ کمی ہوگی کسی میں کچھ..... تمہیں فیصلہ کرتے وقت صرف یہ سوچنا ہے کہ کون سی چیز تم برداشت کر سکتی ہو..... اور ایک بات اور.....'' اماں رکیں۔ ''میری طرف سے تم پر ایسا کوئی جبر نہیں کہ تمہیں ان دونوں میں سے ہی کسی کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے..... صرف یہ تھا کہ تم یہاں رہو گی تو میں بھی اس کوارٹر میں سر چھپا کر بیٹھی رہوں گی ورنہ اس عمر میں اور جوڑوں کے اس بڑھتے درد کے ساتھ میں کہاں دربدر ہوتی پھروں گی.....''

''کسی کی طرف سے بھی مجھ پر کوئی جبر نہیں ہے اماں، دادا کی طرف سے بھی نہیں..... اور نہ ہی ایسا ہے کہ انکار کی صورت میں ہمیں یہ انیکسی خالی کرنا پڑے گی یا میری ملازمت ختم ہو جائے گی؟''

''پھر بھی دادا سے ایک جھجک سی تو قائم ہو جائے گی ناں.....''

''اس جھجک سے زیادہ مجھے فکر ہے اماں ان لوگوں کی.....'' میں نے گہری سانس لی۔ ''جو ہمارے ہاں آتے رہیں گے، میں ان کے لیے ٹرالیوں میں چائے پیش کرتی رہوں گی، وہ میرے اوپر توقعات کے حملے کریں گے، ایک ٹیگ لگائیں گے میری 'قدر و قیمت' کا اور ڈکار مار کر چلے جائیں گے، میں تو ایسے ایک ہی تجربے سے تھک گئی ہوں اماں.....'' میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''اللہ کرم کرے گا بیٹا! تم خود اچھی ہو تو اللہ نے تمہارے لیے سب سے اچھا ہی رکھا ہوگا، وقت آنے پر ہمیں مل جائے گا، مجھے اللہ کی رحمت پر پورا بھروسا ہے.....''

''جانتی ہوں اماں.....''

''جب وقت ملے تو استخارہ کر لو، میں بھی کروں گی اور دیکھتے ہیں کہ اللہ کیا فیصلہ کرتا ہے!'' اماں نے واقعی زبردست مشورہ دیا تھا، پہلے ذہن

میں یہ بات آئی ہی نہ تھی، جہاں انسان الجھ جائے وہاں اللہ سے مشورہ کرنے کی راہ تو کھلی ہے ناں!

☆☆☆

محل نما کوٹھی برقی قمقموں سے سجی رات میں دن کا سماں پیدا کر رہی تھی...... اس روز وہاں دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا گیا تھا...... میں سنہرے رنگ کے بھاری کامدار جوڑے میں، پارلر سے میک اپ کروا کر تیار ہوئی تھی تو مجھ پر میری اپنی نظر بھی نہ ٹھہر رہی تھی۔ لوگوں سے میں داد و تحسین کے ڈونگرے وصول کر رہی تھی، اتنے بڑے کاروباری خاندان کی شادی تھی تو لوگوں کی تعداد جتنی بھی ہوتی کم تھی۔ لوگ ٹولیوں میں کھڑے تھے، ہم دونوں ان کے درمیان چل پھر رہے تھے، کبھی کسی گروپ کے پاس کھڑے ہوتے تو کبھی کسی دوسرے کے پاس۔

اماں اس تقریب میں غائب دماغی کے ساتھ چل پھر رہی تھیں، اس خاندان کی سمدھن بنی تھیں تو بجائے ناز کرنے کے مرجھائی، مرجھائی سی پھر رہی تھیں...... ان کی تشویش تھی کہ کسی ایک سے بھی شادی نہ کی تو کہیں گھر نکالا نہ مل جائے...... مگر اللہ نے ان کے لیے کیسی تدبیر کی تھی کہ گھر نکالا ملنا تو دور کی بات...... دادا نے ان سے کہا چونکہ وہ میری والدہ ہیں اس لیے اپنے داماد کے گھر میں شفٹ ہو جائیں مگر اماں نے انیکسی میں رہنے کو ترجیح دی تو اس انیکسی کو چند دن میں ہی مرمت، دیکھ ریکھ کے علاوہ نئے فرنیچر سے آراستہ کیا گیا اور اس قابل بنایا گیا کہ جب چند لوگ نکاح کے لیے آئیں تو ان کے بیٹھنے کے شایان ہو۔

میں نے استخارہ کیا تو اللہ نے مجھے بہترین مشورہ دیا تھا، پہلے دو دن تو خیالات اور خواب مبہم رہے مگر تیسرے دن مجھے واضح اشارہ مل گیا۔ اماں ابھی دو دنوں میں سے ایک دن میرے پاس بیٹھی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ صرف دولت اگرچہ خوشی کا باعث

نہیں ہوتی نہ ہی ضمانت مگر یہ حقیقت ہے کہ دولت کے بغیر بہت سی خوشیاں نامکمل اور ادھوری رہتی ہیں۔ مجھے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے......" مجھے مزید سمجھانے کو انہوں نے کہا۔ "فرض کرو کہ دادا کی دولت دس کروڑ کی ہے (کروڑ سے آگے کی گنتی کا تصور وہ نہ کرتی تھیں) اس میں سے دادا کے بعد...... اور دادا ابھی اچھے خاصے صحت منداور توانا ہیں، جانے کب تک جئیں گے...... ان کی دولت ان کے پانچوں بیٹوں میں بٹ کر سب کو دو دو کروڑ ملے گی، اگر تم محسن کے حق میں فیصلہ کرتی ہو تو سمجھو دو کروڑ تمہارے پاس سیدھا، سیدھا آ گیا...... (سیدھا سیدھا نہیں اماں، دادا کے بعد) لیکن اگر تم بلال سے شادی کرو تو...... اس صورت میں جانے کب بلال کو اس کے حصے کا پیسہ ملے گا...... اِک عمر کا تفاوت ہی تو منفی نکتہ ہے محسن میں، اس کی بھی اتنی اہمیت نہیں ہے میرے خیال میں...... مگر سوچ لو۔"

اب اماں کیوں خوش نظر نہیں آ رہیں...... انہیں میرے فیصلے پر کیوں اعتراض ہوا، یہ تو میرا فیصلہ تھا بھی نہیں، اللہ کا فیصلہ تھا یہ...... اب اسے قبولنا ہی تھا، دادا تک کو میرے اس فیصلے پر اعتراض تھا اور ہمارے درمیان طویل بحث ہوئی۔ "خود ہی تو بتایا تھا آپ نے کہ ہمارے لیے رسول ﷺ نے شادی کے لیے ہر طرح کی مثالیں چھوڑی ہیں، پندرہ برس بڑی بھی اور پچاس برس چھوٹی بھی...... اب کیوں اختلاف ہو رہا ہے؟" میں نے ایک دلیل دی۔

دادا اور اماں، دونوں کے لیے سب سے بڑی فکر تھی کہ دنیا کیا کہے گی؟ دنیا کا کیا ہے، وہ تو کسی کو نہیں جینے دیتی، ہر حال میں اسے اعتراض کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے، وہ تو سانس بھی نہ لینے دے کسی کو۔ ابا نے خودکشی کی تو ہمیں جینے کے لیے ہجرت کرنا پڑی، اب دنیا کچھ کہے گی تو ہجرت کر کے کسی اور شہر چلے جائیں گے...... دادا کو اپنے بیٹوں اور بہوؤں کا بھی خوف تھا مگر مجھے ان سے ایک اور طویل مکالمہ کر کے انہیں قائل کرنا پڑا...... اماں کو تو بالآخر میں نے قائل کر ہی لیا مگر جس سے مجھے شادی کرنا تھی وہی نہیں مان رہا تھا، کبھی سنا آپ نے کہ لڑکی اصرار کر رہی ہو اور لڑکا نہ مان رہا ہو...... اماں مجھے محسن سے شادی کر کے انتظار کرنا تھا یا بلال کا انتخاب کر کے ایک مشکل زندگی کا انتخاب اور اس صورت میں تو انتظار بھی لایعنی تھا اور جانے کس قدر طویل...... اللہ نے مجھے اس سے بہتر صورت دکھا دی۔

میرے لیے وہ فیصلہ کیا جس سے مجھے ایک دن بھی انتظار نہیں کرنا پڑا اور میں ساری دولت کی مالک بن گئی ہوں، خود سے لگ بھگ چالیس برس بڑے دادا کے ساتھ شادی نے مجھے ایک ہی رات میں باحیثیت اور معتبر بنا دیا ہے، لوگ بھی تعریف کر رہے ہیں اور دادا کو مبارک باد کے ساتھ ان کے مستقبل کے لیے نیک خواہشات...... اب میں اس پوزیشن میں آ گئی ہوں کہ دادا کی موجودہ بگڑی ہوئی نسل کو سنوار لوں گی اور ممکن ہے کہ ان کی آئندہ نسل میں ایک دو اور اضافے بھی ہو جائیں۔

دادا نے اپنی پرانی وصیت میں نام تبدیل کروا دیے ہیں اور اس کے علاوہ جانے کیا کچھ مجھے تحفتاً ملا ہے...... ہمارے مزاج تو پہلے ہی ملتے ہیں، انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا جب میرے منہ سے حسبِ عادت دادا نکل جاتا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور یوں بھی لگتا ہے کہ یہ ان کا نام ہی ہے جو کوئی پیار سے پکار رہا ہو۔ ان کا اصل نام...جس کا مجھے علم ہی نہ تھا جب تک کہ مجھ سے پوچھا نہیں گیا...... "مسماۃ نگاہ ناز...... ولد محمد اکرام، تمہیں ملک اللہ داد...... ولد کرم داد سے، بعوض اس "مکان" کے جس میں اس وقت ان کی رہائش ہے، بطور مہر...... نکاح قبول ہے؟"

غلط فہمی

نور عین

''یہ لو بھئی کوفتے کا سالن تو بن گیا، انڈے بھی ابال کر رکھ دیے ہیں' سرو کرتے ہوئے ڈونگے میں ڈال دیں گے۔ تم روٹیاں ڈال لو میں نہا کر آتی ہوں تو پھر مل کر کھانا لگا دیں گے۔'' قندیل نے ہنڈیا میں ہرا دھنیا ڈالتے ہوئے اسے ہدایت کی جو گرم، گرم کوفتے کو منہ میں ڈال بیٹھی تھی اور اب آنکھوں سے جاری آنسو کے ساتھ اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔

''آپی کوفتے بہت مزے کے بنے ہیں، میں



ایک اور لے لوں؟'' قندیل کچن سے باہر نکلنے کو تھی جب عندلیب کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''تم نے تعریف کافی دیر سے کی ہے لیکن خیر میں نے تمہیں معاف کیا، آج تو کوفتے کافی زیادہ بن گئے ہیں تم جتنے چاہو کھا سکتی ہو۔'' عندلیب کے چٹورے پن سے لطف اندوز ہوتی قندیل مسکراتی ہوئی کچن سے باہر نکلی۔

ٹھنڈے، ٹھنڈے پانی سے شاور لینے کے بعد قندیل بالکل تازہ دم ہوگئی تھی۔ شیلف پر رکھے اپنے فیورٹ پرفیوم کو اپنے اوپر چھڑکنے کے بعد وہ مطمئن سی گنگناتی ہوئی باتھ روم سے باہر نکلی لیکن اگلا منظر اس کی ساری فریشنس کا کباڑا کر گیا۔ اس کا چھوٹا بھائی اس کے تازہ ترین نوٹس کے جہاز بنا، بنا کر کمرے کی فضا کے سپرد کر رہا تھا قندیل وہاں بیٹھے بھائی کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی ورنہ شاید ایسا نہ ہوتا۔ پورا کمرا ان ایف سکسٹین طیاروں کے شوروم کا منظر پیش کر رہا تھا یہ نوٹس قندیل نے آج ہی فوٹو کاپی کروائے تھے۔ پورے پانچ سو روپے کے نوٹس اس وقت نہ جانے کہاں، کہاں کی سیر کرتے پھر رہے تھے۔ غیظ و غضب سے لال ہوتی قندیل اس کی پشت کو گھورتی ہوئی آگے بڑھی، اگلے ہی لمحے دھڑ دھڑ کرتے ہوئے کتنے ہی دھموکے اس نے بھائی کی ننھی سی کمر پر برسا دیے تھے۔ اس چھوٹے سے بچے نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تب ہی قندیل نے جانا تھا کہ ہاتھوں کے طوطے اڑنا کسے کہتے ہیں، حواس کیسے ساتھ چھوڑتے ہیں۔ وہ حماد چچا کا اکلوتا بیٹا فواد تھا اور چچا جان آج کتنے ہی عرصے بعد ان کے گھر آئے تھے۔

''تت...... تم یہاں کیا کر رہے ہو اور یہ شرٹ تو عبدالواسع کے لیے رکھی تھی۔'' گھبراہٹ قندیل کے چہرے اور لہجے دونوں سے ہی چھلک رہی تھی۔

جواباً فواد نے اسے بس ایک نظر ہی دیکھا تھا اگلے ہی لمحے وہ بھاں، بھاں کرتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔ قندیل نے بے بسی سے ڈرائنگ روم کے ہلتے ہوئے پردے کی طرف دیکھا اور پھر سستی سے چلتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے...... سامنے کھڑی ہو کر مردہ دلی سے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

''قندیل بیٹا، تم نے فواد کو کیوں مارا ہے۔ وہ مہمان ہے، بچہ ہے اور سب سے بڑی بات کہ تم بچی نہیں ہو۔ تمہاری اس حرکت نے مجھے حماد بھائی کے سامنے کتنا شرمندہ کیا مت پوچھو...... آخر ایسا بھی کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا جو تم نے گھر آئے بچے کو تشدد کا نشانہ بنایا؟'' پاپا کا لہجہ بہت سخت تھا۔

''یہ دیکھیں پاپا! اس نے میرے سارے نوٹس کا کیا حشر کیا ہے۔ میں نے آج ہی فوٹو کاپی کروائے تھے اور میرا فواد پر ہاتھ اٹھانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا اس نے عبدالواسع کی شرٹ پہن رکھی تھی، مجھے یہ غلط فہمی ہوگئی کہ وہ عبدالواسع ہے بس اسی لیے ایسا ہوگیا۔'' قندیل نے اپنے گیلے بالوں کی لٹ کو انگلی میں لپیٹتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

''اسی لیے کہتا ہوں کہ کوئی بھی ایکشن لینے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا کرو۔ خیر تم ایسا کرنا کھانا سرو کرتے ہوئے یہ چاکلیٹس فواد کو دے دینا باقی سب میں سنبھال لوں گا مجھے پتا ہے معافی تو تم مانگو گی نہیں ویسے میری بیٹی بھی بہت عجیب ہے۔'' قندیل کے معصوم چہرے کو دیکھتے ہوئے انہوں نے بڑے پیار سے اس کی طرف چاکلیٹس بڑھائیں۔

''بس بھائی قندیل کو غلط فہمی ہوگئی تھی ورنہ وہ تو فواد سے بہت پیار کرتی ہے...... جب سے آپ لوگوں کے آنے کا پتا چلا تھا بہت خوش تھی اور مجھ سے خاص طور پر فواد کی فیورٹ چاکلیٹس منگوائی تھیں۔'' جواد صاحب کی آواز پر ڈونگا اٹھائے کمرے میں داخل ہوتی ہوئی قندیل کے ہاتھ

باقاعدہ کپکپا گئے۔

''یہ لو فواد تمہارے لیے..... اور بھی ہیں اگر دل چاہے تو مانگ لینا۔'' قندیل نے دوستانہ انداز میں کہتے ہوئے دو چاکلیٹ بارز فواد کی طرف بڑھائے جنہیں اس نے جھجکتے ہوئے آہستگی سے پکڑ لیا۔

''کوئی بات نہیں قندیل بیٹا، ایک غلط فہمی ہی تو تھی جیسے عبدالواسع ہے ویسے ہی فواد بھی تمہارا بھائی ہے۔ تم اس پر پورا حق رکھتی ہو۔'' حماد چچا نے قندیل کا شرمندہ چہرہ دیکھتے ہوئے رسانیت سے کہا۔

''ویسے اچھا ہی ہوا اگر فواد کی شرٹ پر چائے نہ گرتی تو یہ زبردست دھمو کے عبدالواسع کی نازک سی کمر کو برداشت کرنے پڑتے۔'' ان کی شرارت بھری بات پر حاضرینِ محفل کا جاندار قہقہہ پورے ماحول کو گرما گیا۔

☆☆☆

''زبردست قندیل، تم نے ڈائی گرام تو بہت زبردست بنائی ہیں کہیں بھی کوئی غلطی نہیں، پرفیکٹ اور بس پرفیکٹ۔'' کیمسٹری کا پریکٹیکل جرنل... ..... دیکھتے ہوئے عروہ اس کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔

''شکریہ، اب تم جلدی سے اپنا جرنل مکمل کر کے میرا جرنل واپس کر دینا ابھی میں نے سارے پریکٹیکلز کو یاد بھی کرنا ہے۔'' قندیل نے ہاتھ میں پکڑی کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ عروہ اس کی بیسٹ فرینڈ تھی۔ وہ دونوں ایک ہی کالج سے گریجویشن کر رہی تھیں۔ قندیل ہمیشہ کی طرح پوری ذمے داری سے اپنے پریکٹیکلز مکمل کر چکی تھی جبکہ آج کا کام کل پر ڈالتی عروہ اب اپنی پریشانی لیے اس کے پاس تھی اور حسبِ توقع قندیل نے اس کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ، تمہاری شادی کی تیاریاں کہاں تک پہنچیں؟'' عروہ نے پلیٹ سے ایک سینڈوچ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''امی اکیلی ہی بازار کے چکر لگا، لگا کر ہلکان ہو گئی ہیں۔ پیپرز ختم ہو جائیں تو میں بھی ان کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ خیر چھوڑو یہ سب...... تم یہ بتاؤ کہ تمہاری تمہارے بھائی کے ساتھ صلح ہو گئی یا نہیں ویسے بہت حیرت کی بات ہے کہ صرف پانی نہ دینے پر تمہارے بھائی نے پچھلے دو دن سے تم سے بات چیت ختم کر رکھی ہے اتنی چھوٹی سی بات پر اتنا شدید ردِعمل، ہے ناں عجیب۔''

''نہیں قندیل، غلطی میری ہی تھی بھائی اتنی گرمی میں باہر سے آئے تھے اور میں نے اتنی بدتمیزی سے انہیں پانی دینے سے انکار کر دیا..... اصل میں اس دن امی نے مجھ سے زبردستی کچن کے کیبنٹس کی صفائی کروائی تھی اور میں نے اپنا سارا غصہ بھائی پر نکال دیا۔ پھر میں نے بھائی سے معافی مانگ لی تھی اب سب ٹھیک ہے۔'' عروہ کے آرام سے کہنے پر قندیل نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''نہیں عروہ، اپنوں میں باقاعدہ معافی تلافی کیسی؟ آپس کی ناچاقی یا اختلافِ رائے کسی غلطی یا غلط فہمی کا نتیجہ ہی تو ہوتا ہے اور غلطی بھی تو غلطی سے ہی ہوتی ہے بھلا کبھی کوئی کسی اپنے کو نقصان کیسے پہنچا سکتا ہے اگر آپ کے اردگرد آپ کے چاہنے والے موجود ہیں تو اس بات کو سمجھتے ہوئے آپس کی ناچاقی غیر محسوس انداز میں خود بخود ختم ہو جانی چاہیے۔ سچی بات ہے میں تو اپنی عزتِ نفس کو پس پشت ڈال کر کبھی کسی سے باقاعدہ معافی نہیں مانگ سکتی۔ رشتوں کو سلیقے سے نبھانے کا کیا فائدہ جب یہی رشتے آپ کو سمجھنے میں غلطی کریں اور آپ کو ان کے سامنے اپنی شرمندگی کا اظہار کرنا پڑے۔'' قندیل بلاتکان بول رہی تھی جبکہ عروہ سینڈوچ کھانا چھوڑ کر قندیل کا عجیب و غریب فلسفہ سن رہی تھی۔

''ایسا نہیں ہے قندیل، معافی مانگنے سے تو انسان خود بھی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ تیسرے شخص کی مداخلت سے پہلے ہی اپنی غلطی کو سدھار لیں تو معاملہ سہولت سے نبٹ جاتا ہے۔ اپنے گھر میں تو تم پاپا کی لاڈلی ہو، وہ الٹی سیدھی باتوں کو نظرانداز کر دیتے ہوں گے اور دوسروں سے زبردستی نظرانداز کرواتے ہوں گے لیکن سسرال میں تو لڑکی کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوتے ہیں۔ تمہاری باتیں سن کر تو مجھے تمہاری شادی شدہ زندگی خطرے میں گھری لگ رہی ہے مجھے تو لگتا ہے کہ تم آئے دن میکے بیٹھی رہا کرو گی۔'' عروہ کے چہرے پر پریشانی نمایاں تھی۔

''میرے خیال میں تو میکے اور سسرال میں کوئی فرق نہیں ہوتا میں جو رشتے یہاں چھوڑ کر جاؤں گی وہی رشتے مجھے وہاں مل جائیں گے۔ میری نند، میری بہن، میری ساس اور سسر ماں، باپ کی طرح ہوں گے۔ دیور تو کوئی ہے نہیں ورنہ وہ میرے بھائی کی طرح ہوتا اور سب سے بڑی بات وہاں پر میرا شوہر میرا خیال بھی رکھے گا اور میری عزت نفس کی حفاظت بھی کرے گا۔ ایک بات تو طے ہے... کہ میں کبھی لڑ جھگڑ کر میکے نہیں آؤں گی۔ میرا اپنے آپ سے یہ عہد ہے اور مجھے یقین ہے کہ لڑنے جھگڑنے کی نوبت بھی آئے گی ہی نہیں جیسے میں ان لوگوں کو سمجھ جاؤں گی ویسے ہی وہ بھی میرے خلوص کو آسانی سے سمجھ جائیں گے اور میں بہو نہیں بیٹی بن کر پوری زندگی آسانی اور سہولت سے گزار دوں گی۔ چلو چھوڑو یہ سب باتیں تم میرے ساتھ آؤ میں تمہیں اپنے جہیز کی چیزیں دکھاتی ہوں۔'' وہ ای کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

''آپی میں نے آٹا گوندھ لیا ہے، آپ روٹیاں بنا لیں، سچ بہت بھوک لگی ہے۔'' دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی عندلیب بیڈ پر قندیل کے مقابل جا بیٹھی جو ڈائجسٹ میں منہ دیے اردگرد سے بے خبر تھی۔

''اچھا پانچ منٹ صبر کرو، بنا دیتی ہوں۔'' قندیل نے رسالے سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

''آپی آپ نے پانچ منٹ کا کہا تھا اور اب پندرہ منٹ گزر چکے ہیں۔ اب روٹیاں بنا بھی دیں بھوک سے جان نکل رہی ہے۔'' عندلیب نے اب بڑی بہن کے ہاتھ سے رسالہ چھینتے ہوئے کہا۔

''کیا مصیبت ہے، ساری کہانی کا ستیاناس کر دیا ناں۔ تمہیں اتنی بھوک لگ رہی ہے تو خود ہی اٹھ کر روٹیاں بنا لو، میں تو پوری کہانی پڑھے بغیر کچن کا رخ نہیں کروں گی۔'' تیز لہجے میں کہتے ہوئے قندیل نے اس کے ہاتھ سے رسالہ واپس جھپٹا لیکن دس منٹ بعد ہی اکتا کر رسالہ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا، اپنے ناروا رویے کا احساس اسے اندر ہی اندر کچوکے لگا رہا تھا۔

☆☆☆

''جی پاپا بس پتا نہیں کیوں فضول میں ہی غصہ آ گیا..... یقین کریں پاپا اسٹوری اتنے مزے کی تھی کہ چھوڑنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ نہیں پاپا، میں سوری نہیں کروں گی اتنی سی بات سے اس کا اعتماد میری محبت سے کیسے اٹھ سکتا ہے بھلا۔ بس اب آپ کو ہی کچھ کرنا پڑے گا۔'' قطعیت سے کہہ کر قندیل نے کال ڈسکنیکٹ کر کے موبائل سرہانے رکھ دیا۔ اب وہ اطمینان سے دوبارہ ڈائجسٹ پڑھنے میں منہمک تھی۔

''اب چھوڑ بھی دو ناں بیٹا، آپ کی قندیل آپی بھی تو انسان ہی ہے، فرشتہ تو ہے نہیں جو اس سے غلطی نہ ہوتی ہو شاید کسی وجہ سے اس کا موڈ خراب ہو گا اسی لیے اس نے ایسا ہی ہو گیا اب بس

اور نہیں رونا جلدی سے چینج کر کے آؤ آج ہم ڈنر باہر کریں گے۔'' پاپا نے عندلیب کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ دوپہر سے قندیل آپی اس سے بات نہیں کر رہی تھیں اور اس کا اپنا موڈ بھی خراب تھا جبھی پاپا قندیل کے کہنے پر اس کا موڈ خود ہی ٹھیک کر رہے تھے۔

''اور ہاں پاپا، ہم دونوں بہنوں کو ڈھیر ساری شاپنگ بھی کروایئے گا۔'' قندیل نے بہن کی گردن میں بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

''آج کی آئس کریم میری طرف سے۔'' عارفہ بیگم نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''واؤ، یعنی آج ہمیں ہماری کفایت شعار امی بھی آئس کریم کھلائیں گی۔ ہماری تو موج ہی ہوگئی۔'' عندلیب نے فوراً چہکتے ہوئے کہا تو قندیل نے سکھ کی سانس لی اس کے باقاعدہ معافی مانگے بغیر ہی سارا معاملہ سلجھ گیا تھا۔

☆☆☆

''واہ بہو، آج تو سارا کچن خوب جگمگا رہا ہے۔ اللہ نے مجھے صورت اور سیرت دونوں میں یکتا بہو سے نوازا ہے۔'' فائزہ بیگم کچن میں داخل ہوئیں تو ٹھٹک کر رک گئیں۔ قندیل صبح سے ہی کچن کی تفصیلی صفائی میں مصروف تھی۔ گزرتے ہوئے چھ ماہ میں قندیل نے اپنے آپ کو مکمل طور پر سسرال میں ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ قسمت سے سسرال بھی اچھی ملی تھی اس کے ساس، سسر اور نند نے کبھی اس کے کسی کام میں دخل اندازی نہیں کی تھی اور راحیل تو نرم خو سا، وسیع ذہن رکھنے والا پُرخلوص انسان تھا جس کے سنگ قندیل کسی تتلی کے مانند اڑتی چلی جا رہی تھی۔

''بیٹا وہ ہمسائے سے عظمیٰ بیگم اپنی بہن کے ساتھ آئی ہیں۔ انہیں ہمارے ہاں کی چائے بہت پسند آئی ہے۔ خاص طور پر فرمائش کی ہے، تم ایسا کرو

کچی عمر کی سادہ لڑکی

کچی عمر کی سادہ لڑکی
تم جو کچھ سوچ رہی ہو
کرنے کو پر تول رہی ہو
میٹھی باتیں، سنہرے سپنے
طلسمی وعدے، رنگین چاہتیں
ان دیکھا اِک جال ہے
جس میں تم پھنس جاؤ گی
پھر نکل نہ پاؤ گی
لمحوں کی اس لغزش کی
صدیاں سزا پائیں گی
آنے والی نسلیں تیری
طعنوں، تحقیر اور حقارت کے
تیروں سے چھلنی کی جائیں گی
جس نے تم کو جنم دیا ہے
راتیں جاگ کے بڑا کیا ہے
ماں تیری وہ مر جائے گی
اٹھا ہوا سر اور تنے شانے
باپ تیرے کے جھک جائیں گے
غیرت مند بھائی تیرا
منہ چھپا کے نکلے گا
نظر چرا کے گزرے گا
جذباتی سا قدم تیرا
تجھ کو بہت رُلائے گا
عمر بھر تڑپائے گا
سکھ چین کبھی نہ آئے گا

از: اُم ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

چائے بنا کر بھجوا دینا تمہیں تو تیار ہونے میں وقت لگے گا۔'' انہوں نے اس کے گیلے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں اب شاور لے کر سو جانا...... تھک گئی ہو گی ویسے تو مجھے تمہیں چائے کے لیے بھی نہیں کہنا چاہیے تھا لیکن کرن کے پیپرز ہیں اور مہمانوں کو اتنی دیر کے لیے اکیلے چھوڑنا بھی میثوب لگتا ہے۔'' فائزہ بیگم نے دروازے میں رک کر نرم لہجے میں کہا تو قندیل ہنس دی۔

''آپ اطمینان رکھیں امی جان میں ابھی چائے بنا کر بھجواتی ہوں۔'' گیلے شیلف پر خشک کپڑا پھیرتی ہوئی قندیل نے رسانیت سے کہا۔ گیلا کپڑا نچوڑ کر سنک کے قریب بندھے چھوٹے سے تار پر پھیلا کر وہ واپس پلٹی تو کرن چائے بنا رہی تھی۔

''تم چائے کیوں بنا رہی ہو کرن، میں بنانے ہی والی تھی۔'' قندیل نے نرمی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں بھابی، آپ صبح سے کام کر کر کے تھک گئی ہوں گی اب چائے بنانے جیسا معمولی کام تو میں خود بھی کر سکتی ہوں۔ آپ جائیں کچھ دیر ریسٹ کر لیں۔'' کرن نے مصروف سے انداز میں کہا تو قندیل مسکراتی ہوئی کچن سے باہر نکل آئی۔

ایک بھرپور نیند لے کر وہ شام کے پانچ بجے بیدار ہوئی ہلکی سی نمی لیے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر کیچر لگایا۔ راحیل کے آنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے الماری سے فیروزی رنگ کا اسٹائلش سا سوٹ نکالا اور پھر بڑے اہتمام سے دل لگا کر نفیس سا میک اپ کیا۔ پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد وہ سلیقے سے دوپٹا اوڑھے نیچے جانے کے لیے مکمل تیار تھی۔ وہ لاؤنج میں پہنچی تو فائزہ بیگم ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ خلافِ توقع اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔

''کیا ہوا امی جان، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' قندیل کا پوچھنا غضب ہو گیا۔ فائزہ بیگم تو جیسے پھٹ پڑیں۔

''اگر تمہارا چائے بنانے کا موڈ نہیں تھا تو تم مجھے پہلے ہی بتا دیتیں یوں مہمانوں کے سامنے ذلیل تو نہ کرتیں۔ غضب خدا کا پورا آدھا گھنٹا تمہاری چائے کا انتظار کرنے کے بعد میں کچن میں آئی تو خالی کچن بھائیں، بھائیں کر رہا تھا۔ پورا آدھا گھنٹا تمہاری چائے کا انتظار کرنے کے بعد میں نے خود چائے بنائی اور چائے پیتے ہوئے عظمیٰ بیگم اپنی بہو کی مہمان نوازی کے قصے سناتی رہیں...... درپردہ تو وہ مجھے میری بہو کے عیب گنوا رہی تھیں ناں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میری بہو چائے بنا کر بھجوا دے گی اور جب آدھے گھنٹے بعد میں پندرہ منٹ کچن میں گزار کر پسینے میں تر بتر چائے سمیت واپس لوٹی تو وہ دونوں ایک ہی نظر میں سارا معاملہ سمجھ گئیں اور میں...... بس سر جھکائے ان کی باتیں سننے پر مجبور تھی۔'' ان کے لہجے میں اتنی کاٹ تھی کہ قندیل تڑپ کر رہ گئی۔

''لیکن امی جان چائے تو کرن بنا رہی تھی پھر آپ نے کیوں بنائی؟'' حیران پریشان سی قندیل نے بڑی مشکل سے جملہ پورا کیا۔

''لیکن میں تو اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔'' اسی وقت کرن لاؤنج میں داخل ہوئی۔ قندیل کے سوال کا جواب اسی نے دیا تھا۔

''چلو مانا کہ مجھے ہی غلط فہمی ہو گئی تھی اگر میں سونے چلی گئی تھی تو تمہیں خود ہی چائے بنا لینی چاہیے تھی مہمانوں کے لیے یا پھر مجھے ہی بتا دیتیں۔'' قندیل کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکی سی تیزی لیے ہوئے تھا۔

''واہ جی واہ، غلطی آپ خود کریں اور نصیحتیں ہم کو کریں۔ ایک تو میں نے اپنی چائے بنانے کے لیے آپ کو تنگ نہیں کیا اوپر سے آپ فضول میں اپنا

رعب جھاڑ رہی ہیں اگر آنکھیں کھول کر دیکھتیں تو پتیلی میں صرف ایک کپ پانی تھا پھر آپ کو غلط فہمی کیسے ہوگئی۔ مجھے احساس دلانے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں اگر مجھے پتا ہوتا کہ ہمارے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں اور امی چائے کے لیے کہہ گئی ہیں تو میں خود ہی چائے بنا دیتی، ہمیں آپ کا احسان لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔'' بدتمیزی سے کہتے ہوئے کرن تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ فائزہ بیگم بھی اس کے پیچھے ہی لاؤنج سے باہر نکلی تھیں۔ قندیل مرئے مرئے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی اب اسے اپنے غمگسار اپنے شوہر راحیل کا انتظار تھا۔ ایک وہی تو تھا جو قندیل کی عزتِ نفس کو بچاتے ہوئے حالات کو سازگار بنا سکتا تھا۔

☆☆☆

''بھابی آپ کو بھائی بلا رہے ہیں۔ آپ امی کے کمرے میں آجائیں۔'' کرن نے تیزی سے پیغام پہنچا کر واپسی کی راہ پکڑی۔

فائزہ بیگم کے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ صحیح معنوں میں سُن ہوگئی اس کے سسر سمیت گھر کے سبھی افراد وہیں پر موجود تھے وہ اس کی ساس کا کمرا کم اور کمرا ہائے عدالت زیادہ لگ رہا تھا۔

''کیوں قندیل، تم نے ایسا کیوں کیا۔ پہلے تو امی کو مہمانوں کے سامنے بے عزت کروایا اور پھر کرن سے بدسلوکی کی۔'' راحیل نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں اس پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے صفائی چاہی۔

''یہ بھی میرے خلوص پر شک کر رہے ہیں۔'' یہ سوچتے ہوئے حیرت سے گنگ قندیل نے گھٹی گھٹی آواز میں اصل ماجرا سنایا۔

''غلط فہمی ہوئی تھی تو تم امی سے معذرت کرلیتیں، کرن سے لڑنے کی کیا ضرورت تھی۔'' اس کی دی گئی صفائی کے جواب میں راحیل بولا بھی تو یہ الفاظ۔

''لڑائی...... لیکن میں نے تو کوئی لڑائی نہیں کی بلکہ کرن نے مجھ سے بدتمیزی کی ہے۔'' قندیل نے منمناتے ہوئے کہا۔ راحیل اس معاملے میں اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس احساس نے اس کے ازلی اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی وہ خود کو اکیلا محسوس کررہی تھی بے حد اکیلا۔

''سسرال اور میکے میں بہت فرق ہوتا ہے، میکے میں آپ کی غلطی کا بوجھ آپ کے والدین، آپ کے بہن بھائی اٹھا لیتے ہیں لیکن سسرال میں کی ہوئی بہو کی کوئی بھی غلطی چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی اس کا بوجھ اسے خود ہی اپنے نازک کندھوں پر اٹھانا ہوتا ہے اور اس غلطی کی تلافی بھی اسے تن تنہا ہی کرنا پڑتی ہے۔'' عروہ کی کہی ہوئی بات کی حقیقت وہ اب جان رہی تھی۔

''کرن تو بچی ہے، تم تو بڑی ہو ناں چلو اپنی ساس سے معافی مانگو اور کرن سے گلے ملو آئندہ ایسی کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔'' اس کے سسر نے کھڑے ہوتے ہوئے تحکمانہ انداز میں معاملہ نمٹایا۔

''اب مجھے سسرال میں قدم جمائے رکھنے کے لیے مصلحت پسندی سے کام لینا ہوگا۔ اس خام خیالی سے باہر نکل کر کہ یہ سب میرے خلوص کو سمجھ چکے ہیں۔ اپنا خلوص جتانا ہوگا اگر غلطی کی معافی مانگ کر حالات سدھر سکتے ہیں تو میں آئندہ حالات کو اس نہج پر آنے ہی نہیں دوں گی۔'' وہ بالکل مختلف انداز میں سوچتی ہوئی اپنی عزتِ نفس کو اپنے پاؤں تلے کچلتی فائزہ بیگم کی طرف بڑھی اس کے بعد اپنی چھوٹی نند کو بھی منانا تھا۔

''بہو اور بیٹی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔'' اس کی اس غلط فہمی نے ابھی ابھی فہم کے کنارے کو چھوا تھا۔



ناولٹ

یقین

ہردلعزیز مصنفہ فرحانہ ناز ملک
کی ایک یادگار غیر مطبوعہ تحریر

ریسٹورنٹ میں موجود بھانت بھانت کے لوگوں کا ایکسرے بھی اس نے دل لگا کر پورا کرلیا تھا۔ حتیٰ کہ ویٹرز بھی اس کے اس مشاہدے میں آگئے تھے۔ خلافِ عادت ان کے لیے ہمدردی بھری تقریریں بھی اپنے ہی دل کو سنا ڈالی تھیں اور اب جب ..... اس کے دائیں طرف والی ٹیبل پر ایک خوب صورت سا کپل جلوہ افروز ہو بیٹھا تو اس کی ہمت اور برداشت زمیں بوس ہو گئی۔ نازک سی کلائی تھما کر اسٹائلش سی واچ پر اس نے کوئی



دسویں بار نگاہ ڈالی اور پھر یہی نگاہیں گلاس ڈور پر بھی چپکا ئیں۔

''آ کیوں نہیں رہا؟'' بہت بھنا کر وہ بڑبڑائی تھی۔ آنکھیں سکڑی ہوئی...... ابرو تنے ہوئے، ماتھا شکن آلود...... بس وہ اب کے تب رونے ہی والی تھی کہ عاشر آفندی گلاس ڈور دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ ٹیبل کی نادیدہ گہرائیاں کھوجنے میں لگی ہوئی تھی شاید کہ اس کی آمد سے بے خبر رہی۔

''لیجیے...... ہم آ گئے۔'' وہ جب عین اس کے سامنے آ کر شوخی سے گنگنایا تو وہ سکڑی ہوئی آنکھیں مزید سکوڑ کر اسے گھورنے لگی۔

''اب بھی نہ آتے...... کون سی بہت دیر ہوئی ہے۔ صرف ایک گھنٹا ہی تو سڑنا پڑا ہے۔'' وہ بھری بیٹھی تھی۔ اسی حساب سے لاوا برآمد ہوا۔ عاشر دلفریب مسکراہٹ کی بجلیاں گراتا...... کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''میں ہوتی کون ہوں جس کی تم پروا کرو۔'' شکایتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا عاشر کندھے ڈھیلے کر کے یوں بیٹھ گیا جیسے کہہ رہا ہو...... ''جو چور کی سزا وہ میری......''

''اتنے ڈھیر سارے لوگ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ تمہیں کیا پتا......!''

''مجھے سب پتا ہے۔'' عاشر فوراً بولا۔ ''لوگوں نے کیا گھورا ہوگا...... تم نے خود سب کے ایکسرے نکالے ہوں گے۔'' چونکہ سچ تھا سو وہ لحظہ بھر کے لیے چپ ہو گئی۔

''ہاں تو...... اور کیا کرتی؟'' پھر کچھ شرمندگی ڈھلی تو تڑخ کر کہہ دیا۔

''اچھا...... سچ بتاؤں ٹائم پہ ہی نکل رہا تھا کہ ڈیڈ کو اپنا کوئی کام یاد آ گیا، ساتھ لے گئے مجھے۔'' سونیا کا منہ اس وضاحت کے بعد بھی صحیح زاویے پر نہ آیا۔

''اب بس بھی کرو ناراضی...... اتنا امپورٹنٹ ڈے ہے۔ یعنی تمہارا برتھ ڈے۔ سونیا جہانزیب کا برتھ ڈے۔ کیک کو حلال کرو اور میری جیب سے...... تگڑا سا ڈنر کرو۔ ٹھیک......!'' عاشر کے صلح جو انداز پر وہ کچھ دیر تو اسے گھورتی رہی پھر بے ساختہ ہنس دی۔

''قسم سے ناراض بھی نہیں ہونے دیتے ہو۔''

''اچھی بات ہے ناں......!''



پنک دیدہ زیب نائٹی میں اپنی تمام تر حشر سامانیاں سمیٹے شائستہ آئینے کے سامنے بیٹھی تھیں۔ ہاتھوں کا مساج کرنے کے باوجود توجہ آئینے میں نظر آتے فیاض صاحب کے عکس پر تھی جو فون کال سننے کے بعد کسی سوچ میں غلطاں بیٹھے تھے۔

''کیا ہوا...... کون بیمار ہے...... کس کا فون تھا؟'' شائستہ نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

''تمہارے سامنے ہی تو کال سنی ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہوا کس کی ہے؟'' شائستہ کو ان کی اس بات سے سخت چڑ تھی۔ سوال کا جواب دینے کے بجائے بحث کرنے لگتے تھے۔

''کیا کہہ رہا تھا ریاض؟'' ناگواری کا شدید احساس جھٹک کر وہ دوبارہ پوچھنے پر مجبور ہوئیں۔

''ابا سائیں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا۔'' فیاض کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔ شائستہ نے رخ پھیر کر انہیں دیکھا۔

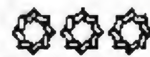
''تو تم نے کیا کہا...... یہاں لے آؤ۔'' بہت تیکھے چتون سجا کر وہ بولیں۔

''تمہارے سامنے بات ہوئی ہے...... میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔'' شائستہ کا مزاج کبھی کبھی انہیں برہم کر دیتا تھا۔ ''اور اگر میں ایسا کچھ کہتا بھی تو کیا حرج تھا، میرے والد ہیں وہ۔ میرا فرض بنتا ہے ان کی خدمت کرنا۔'' شائستہ نے کھٹاک سے مساج کریم پر ڈھکن رکھا تھا۔

''یہ......'' اسٹول سے اٹھ کر وہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ ''میرا گھر ہے...... میں اس گھر میں تمہارے اُجڈ خاندان والوں کی آمد برداشت نہیں کر سکتی۔'' انہوں نے ایک، ایک لفظ چبایا تھا۔ فیاض صاحب کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"میں جانتا ہوں تمہاری ذہنیت کو......" تھکے تھکے لہجے میں کہتے ہوئے وہ چادر کھولنے لگے۔ "اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے عاشر کو وہاں بھیج دوں، ابا سائیں عاشر کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔" چادر سر تک اوڑھ کر وہ کروٹ بدلتے ہی سوتے بن گئے۔ شائستہ جز بز ہو کر رہ گئیں۔

"عاشر کو کیا پڑی ہے اتنی گرمی میں گاؤں جانے کی اور پھر اس نے کون سی ڈاکٹری پڑھ رکھی ہے جو جا کر دادا کا علاج کرے گا اور وہ بھلے چنگے ہو جائیں گے' ہونہہ......"



آسمان پر بادلوں کی چادر کیا تنی وہ پیریڈ بنک کر کے گراؤنڈ میں آ بیٹھے۔ پیریڈ تو ویسے ہی چھوڑنا تھا کہ سونیا نے اس کی گوشمالی جو کرنی تھی۔ اور اب وہ گراؤنڈ میں بیٹھی اس کو اچھی خاصی تند نظروں سے گھور رہی تھی۔

"فار گاڈ سیک یار...... ایسی تلوار مار کا نظروں سے تو نہ دیکھو...... قتل تو تم مجھے پہلے ...... ہی کر چکی ہو۔ مرے ہوئے کو اور کیا گھائل کرنا۔" عاشر کے کراہ نما جملے بھی سونیا کے بگڑے تیور سنوار نہ سکے۔

"زہر لگ رہے ہو قسم سے......" عاشر نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا تھا۔

"بڑے دانت نکل رہے ہیں۔ یوں خوش ہو رہے ہو۔ جیسے گاؤں نہیں چاند پر جا رہے ہو۔"

"مائی گاڈ......" عاشر اس کے غصے سے لطف لے رہا تھا۔

"بے اعتبار ہو رہی ہو...... وہ بھی گاؤں جانے پہ......؟"

"کیوں......؟" سونیا نے ابرو تان لیے۔

"گاؤں میں لڑکیاں نہیں ہوتیں کیا؟" اس کے جلے ہوئے انداز نے عاشر کو ایک اور قہقہہ لگانے پر مجبور کیا۔

"میڈم...... اکیسویں صدی ہے۔ وہ زمانے گئے جب گاؤں کی گوریوں پہ دل آ جایا کرتے تھے۔" عاشر نے گویا سمجھانا چاہا تھا۔

"جی نہیں...... مرد آج بھی لڑکی دیکھ کر پھسل جاتا ہے۔ صرف لڑکی دیکھ کر...... گاؤں اور شہری لڑکی کی تمیز کیے بغیر...... اور جس حساب سے تمہارے قہقہے نکل رہے ہیں ناں تم مشکوک ہو رہے ہو میرے سامنے۔" اب کے عاشر نے بے حد سنجیدگی سے سونیا کو دیکھا تھا۔ جو نہ جانے اتنی بے اعتبار کیوں ہو رہی تھی۔

"میں اتنے کمزور ایمان کا مالک نہیں۔ نہ ہی دل پھینک ہوں...... آئی تھنک مجھے تم سے ناراض ہو جانا چاہیے...... صبح سے تم میری ایگو ہرٹ کیے جا رہی ہو یوں غلطی باتیں کر کر کے۔ کم از کم میرے بارے میں تمہارے خیالات دوسروں سے مختلف ہونے چاہئیں۔" عاشر کی سنجیدگی میں ڈوبی باتیں پل بھر میں سونیا کو شرمندہ کر گئیں۔

"بہت افسوس ہوا تمہاری بات سن کر...... گاؤں میں لڑکیاں تو ضرور ہوں گی مگر سونیا نہیں ہوگی، آیا سمجھ...... میں ناراض ہو گیا ہوں۔" اور وہ واقعی منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔ سونیا کے بھی ہاتھ پیر پھول گئے۔

"سس...... سوری عاشر ویری سوری۔" نیچی آواز میں دل کی گہرائیوں سے کہا مگر عاشر نے خود کو ہرٹ کیے جانے کا کچھ تو بدلہ چکانا تھا۔

"پلیز ناراض مت ہو...... دیکھو...... میرا ابھی تو سوچ میں اتنے بہت سارے دن تمہارے بغیر کیسے گزاروں گی۔" اس کا لہجہ لجاجت لیے ہوئے تھا۔ عاشر نے دیکھا آنکھیں نم ہو چلی تھیں۔ وہ ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔

"اچھا...... بھلا بتاؤ کیسے گزارو گی؟ مجھے بھی تو پتا چلے۔" اس کی آنکھوں سے شرارت جھانک رہی تھی۔ سونیا نے بھی شرمندہ ہونا موقوف کیا۔

"ٹھنڈی آہیں بھر کر نہیں گزاروں گی...... کسی اور سے دوستی گانٹھ لوں گی دیکھنا......" وہ گھاس توڑ توڑ کے اس پر پھینکتی جا رہی تھی۔

"بے شک گانٹھ لینا مگر فی الحال گھاس توڑنا تو بند کرو پہلے ہی ہمارا ملک ہریالی سے محروم ہے۔"



گزشتہ ہفتے دھواں دھار ہونے والی بارش کے نتیجے میں کھیت اب بھی پانی سے لبالب بھرے ہوئے تھے اور شاید اس سے بھی زیادہ بھرنے تھے کہ گھنگور گھٹائیں آسمان پر حکمران بنی ہوئی تھی۔ سروں پر منڈلاتے پرندوں پر سے نظر ہٹا کر سوہنی نے کھیت کے پانی میں ڈبوئے اپنے پیر نکالے اور سیاہ چپل میں مقید کیے۔ دھل دھلا کر پیروں کی سنہری رنگت دمکنے لگی تھی۔ قریب ہی موجود پیروں سے کیچڑ جھاڑتی رانی اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

''حق ہا سوہنی..... تیرا ناں وی سوہنی ہے اور تو سوہنی وی رج کے ہے۔'' سوہنی بے تاثر سی اپنی قمیص کا گیلا دامن نچوڑتی رہی۔

''تو غلطی سے پنڈ میں پیدا ہو گئی...... تجھے تو بادشاہوں کے گھر پیدا ہونا چاہیے تھا۔'' رانی بڑے دل سے تعریف کر رہی تھی مگر سوہنی نے ساری تعریف ان سنی کرتے ہوئے نگاہیں کھیت کے پانی میں چھلیں کرتی شنو اور راشدہ پر جما ئیں۔

''باہر نکلو۔'' اس کی چیخ پر شنو اور راشدہ نے مڑ کر اسے دیکھا دونوں نے شلواریں اڑسی ہوئی تھیں۔ پانی ان کے گھٹنوں کو چھو رہا تھا۔

''بہت لگا لیں ڈبکیاں اب باہر نکلو..... اس سے زیادہ دیر ہو گئی تو ماں جو میرا قیمہ بنائے گی تب آ کر دیکھنا میرا سوہنا روپ۔'' راشدہ اور شنو فوراً شڑاپ شڑاپ کرتی باہر آ گئیں۔

''تیری ماں ہے یا فرعون.....؟''

''لگتا ہے تیری ماں نے اللہ کو جان نہیں دینی.....؟''

''یہ اللہ اور ماں کا معاملہ ہے۔'' سوہنی نے دونوں کے اعتراضات اطمینان سے سننے کے بعد کہا۔ ''ابھی تو چلنے کی کرو کہ میں نانا کی دوائیں لینے کا بہانہ کر کے نکلی تھی۔ ماں کو خبر ہو گئی کہ میں یہاں آئی تھی تو توڑ کر دے گی۔''

''تیری ماں قسائی بھی ہے، یہ پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' رانی کے مزاحیہ سے انداز پر راشدہ اور شنو کے ساتھ ساتھ وہ بھی ہنس دی۔

''مسخریاں نہ کر اور چل۔'' سوہنی کو آزادی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وقتی طور پر ہی سہی..... طبیعت بہر حال فریش ضرور ہو گئی تھی۔ بھلے گھر جا کر پھر سے دکھنا شروع ہو جاتی۔ تینوں باتوں میں مگن آگے بڑھتی جا رہی تھیں جب اچانک سے شوکا سامنے آ کھڑا ہوا۔ سوہنی کے تاثرات سنگین تر ہو گئے۔ حلق یوں کڑوا ہو گیا جیسے کریلا سامنے آ کھڑا ہو۔

''بلے بھئی.....'' نظروں کا حصار سوہنی کے سنہرے روپ کے گرد باندھ کر وہ ادا سے بولا۔

''بڑے لوگ گھر سے نکلے۔''

''وے کالے بلے۔'' سوہنی تڑخ کر بولی۔

''راستہ چھوڑ میرا...... تجھے جند پیاری نہیں اپنی۔'' شوکے نے بڑا لطف لے کر اسے سر تا پا نظروں میں تولا۔

''جند تو بہت پیاری ہے مجھے۔'' اس پر بے باک نظریں ٹکا کر وہ معنی خیز جملہ بولا۔ جسے سمجھ کر سوہنی سلگ ہی اٹھی۔ دل ہی دل میں گالیوں کا اسٹاک خالی کر دیا۔

''تمیز سے بات کر...... میں زبانی بھی گلا کاٹ سکتی ہوں۔''

''اوئے تو زبانی کاٹے...... چاہے جند نکالے...... تجھے سب معاف ہے۔''

''کھوتا.....'' اب کے سوہنی بہ آواز بلند بڑبڑائی۔ شوکے کو یہ گالی بھی چینی میں ڈوبی محسوس ہوئی کہ بڑا..... بے ہنگم قہقہہ اس نے آس پاس بکھیرا۔

''چلو..... اس کو تو اپنی جند کی پروا نہیں پر مجھے تو ہے۔ دیر ہو گئی تو اس کی بہن میرے عرس پڑھ دے گی۔'' سوہنی نے دانت پیس پیس کر گھسائے اور پگڈنڈی سے نیچے اتر کر آگے بڑھ گئی۔ شنو، راشدہ اور رانی بھی پیچھے لپکیں۔

''کہا تو ہے...... مجھے اپنی جند کی بہت پروا ہے۔ میری جند کو ہی میری پروا نہیں۔'' شوکا پیچھے سے چلایا۔

''اوئے کتنی بار تجھے بولا ہے، میری دلہن بن جا پھر مجال ہے میری بہن۔ تجھ پر میلی نظر بھی ڈالے۔'' ایک اور ہانک اس کے کانوں تک پہنچی۔

''پہلے تو اپنی نظر تو دھو...... پھر بہن کو پاک کرنا۔'' سانی جل کر بڑبڑائی۔



گاؤں کی حدود شروع ہو چکی تھیں۔ گاڑی میں انگلش میوزک گونج رہا تھا۔ عاشر کی انگلیاں اسٹیئرنگ وہیل پر تھرک رہی تھیں جب ایک بار پھر موبائل گنگنایا۔

''او...... ناٹ اگین۔'' ڈیش بورڈ سے سیل اٹھاتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ حسب توقع اسکرین پر ''سونیا'' جگمگا رہا تھا۔ اس نے موبائل کان سے لگالیا۔

''ابھی تک نہیں پہنچے ہو؟'' چھوٹتے ہی سونیا نے وہ سوال کیا جو وہ اس سفر کے دوران اپنی ہر کال میں اس سے پوچھ چکی تھی۔ ''اتنا لمبا راستہ ہے کیا؟''

''راستہ تو لمبا نہیں۔'' عاشر نے ونڈ اسکرین پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ ''ہاں پر تمہاری ان متواتر آتی کالز کی وجہ سے لمبا ضرور ہو گیا ہے۔''

''کیا......؟'' دوسری طرف سے سونیا کی چیخ بلند ہوئی۔

''تم تنگ ہو رہے ہو میری کالز سے؟'' وہ صدماتی کیفیت میں تھی۔

''تنگ نہیں ہو رہا ہوں بٹ مجھے اسپیڈ سلو کر کے تمہاری کال سننی پڑتی ہے۔ دل سے بات کرنے کے لیے اور پلیز اچھی اچھی باتیں کر دیوں چیخنے کے بجائے دعا کیں دو، سفر میں ہوں۔'' عاشر کے عاجزانہ کہنے پر سونیا کو خفت بھری خاموشی نے جکڑ لیا۔

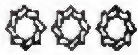
''سوری عاشر۔'' چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ منمنائی تو عاشر دھیرے سے ہنس دیا۔

''ساری زندگی سوری ہی کرتی رہنا بس......''

''کیا؟'' وہ ایک بار پھر چیخی...... ''بکو مت......'' وہ واقعی نہیں سدھر سکتی تھی۔ عاشر نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔

''اوکے...... اپنا خیال رکھنا...... میری خاطر۔'' آخر میں وہ بہت آہستگی سے بولی تھی۔

''اوکے بائے۔'' عاشر نے سیل ڈیش بورڈ پر رکھا اور احتیاط سے گاڑی چلانے لگا کہ گاؤں کے ٹوٹے پھوٹے راستے ڈرائیونگ کا امتحان لینے کے لیے شروع ہو چکے تھے۔



دادا جان کے کمرے میں چاچا، چاچی اور سونی موجود تھی۔

''او سارے انتظام شنتظام تو ٹھیک سے کر لیے ہیں ناں......؟ پہلی بار آ رہا ہے میرا بھتیجا۔ اسے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔'' چاچا ریاض نے کندھے پر رکھا اپنا صافا ہاتھ میں لے کر جھٹکا...... چاچی بڑی بری بری شکلیں بنائے کھڑی تھی۔

''اور بستر اوی نواں نکور نکال...... اور اپنے ان شتونگڑوں کو بھی سلا دے۔ تیرے پیکے والوں پر گئے ہیں۔ نرے جاہل کے جاہل......'' چاچا نے جس میں تیلی جلائی اور بجس بھڑک بھی گیا۔

''دیکھو میرے پیکے والوں کو کچھ مت کہو...... اگر اپنے بھتیجے کی خدمت کروانی ہے تو۔''

''اوئے تیرے پیکے والے کیا آسمان کی مخلوق ہیں؟ اور میرے بھتیجے کی خدمت تو کہاں کرے گی۔ سارا گھر تو سونی سنبھالتی ہے۔'' محاذ کھل چکا تھا۔

دادا بیچارے کبھی گردن بیٹے کی طرف پھیرتے تو کبھی بہو کی طرف...... جنہیں ایک دوسرے پر گولے برسانے کے لیے بہانہ درکار ہوتا تھا اور جو اس وقت اصل موضوع سے ہٹ گئے تھے۔

''ریاض پتر...... بس کر یہ بیکار کی باتیں۔ اصل موضوع کی طرف آ۔'' بالآخر انہیں اپنی نحیف سی آواز میں انٹری دینی ہی پڑی۔ تب جا کر چاچا، چاچی خاموش ہوئے۔

''اور سونی پتر......'' چاچا اس کی طرف مڑے۔ وہ کھانا شانا تو اس کے لائق ہے ناں......؟''

''پتا نہیں ماما جی۔'' وہ منمنائی ''بنایا تو ہے اب لائق شائق ہے یا نہیں یہ آپ کا بھتیجا بتائے گا۔''

''چنگا خیر میں دیکھوں...... گلی میں آنہ گیا ہو۔'' چاچا اپنا صافا کندھے پر سیٹ کر کے باہر نکل گئے۔

''حکیم بن کر آ رہا ہے یا کوئی جادوگر...... آج ہی

منتر پھونکے گا اور دادا بھلا چنگا ہو جائے گا...... ہونہہ۔''
چاچی بہ آواز بلند بڑبڑاتی کمرے سے باہر نکل گئی۔



ماحول بڑا آزردہ سا ہو گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی دادا جان ایسے آبدیدہ ہوئے کہ ابھی تک سنبھل نہیں پائے تھے۔

''یہ کیا بات ہوئی' میرے آنے پر بھی آپ دکھی ہو رہے ہیں، آنسو بہا رہے ہیں۔ میں نہ آتا کیا؟'' ان کے گلے سے لگے عاشر نے ملائمت سے کہا تو وہ اس سے الگ ہو کر نفی میں سر ہلانے لگے۔ عاشر نے ان کے آنسو اپنی پوروں پر چن لیے۔

''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں...... جیتے جی میں نے اپنا پوتا دیکھ لیا۔''

''آپ کو اللہ لمبی زندگی دے۔ آپ میرے بچے اور ان کے بچے بھی دیکھیں گے انشاء اللہ۔''

''شرارتی۔'' دادا کا بوڑھا چہرہ کھل سا گیا۔

''تیرا باپ اور ماں...... وہ دونوں بھی آ جاتے۔'' چند لمحوں کے توقف کے بعد دادا نے سوئی ہوئی خواہش کو جگا ڈالا۔

''ڈیڈی تو آنا چاہ رہے تھے دادا جان...... لیکن ان کی کوئی میٹنگ تھی۔ اسی وجہ سے نہ آ سکے اور ممی کا آپ کو علم ہے۔ گاؤں اور گاؤں والوں سے الرجک ہیں۔ میں آ گیا ہوں، یہ کافی نہیں ہے کیا؟ آپ کو میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی کیا؟'' ان کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے اس نے لاڈ جتایا تو دادا جان نے پیشانی چوم لی۔

''جی اٹھا ہوں میں...... دیکھ میرا بخار بھی اتر گیا۔'' وہ بچوں کی طرح خوش تھے۔ ''تو اب آیا ہے تو کچھ دن رہنا۔ جلدی نہیں مچانا جانے کے لیے۔''

''نہیں مچاؤں گا دیکھیے گا۔'' عاشر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''چل اچھا، منہ ہاتھ دھو لے...... نہانا ہے تو نہا لے۔ کھانا کھا...... پھر آرام کر...... اور باتیں کل کریں گے۔''



وسیع و عریض کے صحن میں یہاں وہاں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ پنکھے کے عین سامنے بچھی چارپائی پر نیا بستر بچھا ہوا تھا اور اس کے سرہانے عاشر بے چارگی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔

''اس پہ میں سوؤں گا؟'' چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے مریل سی آواز میں پوچھا۔

''آہو پتر...... سارا کچھ نیا بچھایا ہے۔'' جواب میں چاچا نے جوش دکھایا۔ چاچی ایک چارپائی پر بیٹھی اپنے چھوٹے والے کو تھپک رہی تھیں۔

''پر میں اس پر نہیں سو سکتا۔''

''پر۔ کیوں ہ؟'' چاچے کو جھٹکا لگا۔ ''چارپائی پسند نہیں آئی کیا؟''

''نہیں نہیں۔ سب کچھ پسند آیا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ مجھے باہر کھلے آسمان کے نیچے سونے کی عادت نہیں ہے۔ میں اندر سوؤں گا۔'' اس نے جلدی جلدی مدعا بیان کیا۔ مبادا بستر کی کوئی اور خوبی سننے کو مل جائے۔ چاچا اور چاچی کی حیرانی تجاوز کر گئی۔

''لے...... اتنی قہر کی گرمی میں تو اندر سوئے گا؟''
چاچا کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس اسٹائل میں بولے جیسے عاشر کی دماغی حالت پر شک کا اظہار کیا ہو۔

''اور پتر تیرے دادا جی یہاں تیرے ساتھ والی چارپائی پر سوئیں گے۔ تجھے تیرے بچپن کے قصے سناتے رہیں گے۔ دیکھنا کیسے جلدی نیند آ جائے گی۔''

''میں اندر ہی سوؤں گا۔'' وہ اپنی بات سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ چاچا نے اس کے بعد بہتیرے دلائل دیے...... کھلی ہوا میں سونے کے فوائد گنوائے...... پر وہ مان کے نہ دیا۔

''چنگا خیر...... جو تیری مرضی۔ سوہنی کو کہہ عاشر پتر کا بستر اندر لگا دے۔'' بالآخر چاچا نے ہار مانی اور عاشر نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

گرم تپتے ہوئے کمرے میں گھرر، گھرر کرتے پنکھے کے نیچے نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ مگر اس پر غنودگی ضرور چھا گئی کہ لمبے سفر کی تھکاوٹ حاوی تھی۔ ذہن

شاید بیدار تھا کہ کمرے میں تواتر سے گونجتی چوڑیوں کی جھنکار سماعتوں کو ڈسٹرب کرنے لگی۔ وہ چاہ رہا تھا آنکھیں کھول کر چوڑیوں والی کو بھی دیکھ لے مگر نیم وا آنکھوں سے ملگجی سی روشنی میں ایک ہیولہ ہی نظر آسکا۔ چوڑیوں کی کھنک پر بڑبڑاہٹیں حاوی ہوگئیں۔

''رانی ٹھیک کہتی ہے۔ شہر والوں کی عقل گٹوں میں ہوتی ہے۔ اب یہ بھلا کیا تک بنتی ہے تندور جیسے گرم کمرے میں سونے کی۔ ایک تو پتلون چڑھا کر بگلا بن کر آگیا۔ اوپر سے یہ عورتوں والی حرکتیں۔ ہائے کتنی نیند آرہی تھی...... اس بگلے کے لیے، بستر بنانے، پانی بنانے کا حکم مل گیا۔'' وہ شاید پانی والا کولر رکھنے آئی تھی۔ بڑبڑاہٹیں ختم ہونے تک وہ بھی نیند میں گم ہوگیا تھا۔



کھلی کھڑکی سے سورج کی تیز اور شریر شعاعیں پورے کمرے میں رقصاں تھیں۔ وہ پہلے تو آنکھوں پر کبھی ہاتھ تو کبھی تکیہ رکھ کر ان کی شرارتوں سے بچنے میں لگا رہا مگر جب اندازہ ہوا کہ نیند بس اتنی ہی تھی تو آنکھیں کھول ہی ڈالیں۔ سورج کی شعاعوں نے آنکھیں چندھیا کر صبح بخیر کہا۔ ساتھ ہی باہر صحن سے آتی عجیب سی آوازیں بھی سر پر دھم دھم برسنے لگیں۔ وہ چارپائی سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ اِدھر اُدھر گردن موڑ کر غسل خانہ نام کی چیز تلاش کرنی چاہی لیکن ندارد...... سو اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ آنکھیں جو منظر دیکھ رہی تھیں وہ حیران کن تھا۔ سوہنی ایک مرغے کے پیچھے شاید پکڑم پکڑائی کھیل رہی تھی۔ جدھر جدھر مرغا پرواز بھر رہا تھا، اُدھر اُدھر وہ۔ چارپائی کے نیچے تک گھس گئی۔ ساتھ ہی اس کی دھمکیاں......

''رک تو ذرا...... آج میں چھری پھیرتی ہوں تیری گردن پہ۔ روز چولھے پر گند کرنے آجاتا ہے نامراد۔ جیسے تو نے بھی پراٹھے کھانے ہوں۔'' بالآخر مرغا ہاتھ آ گیا تھا۔ اسے دبوچے وہ ڈربے تک گئی اور ڈربے میں ڈال کر صحن میں بندھی بھینس کے پاس جانا ہی چاہ رہی تھی کہ عاشر نے پکارلیا۔

دسمبر

دسمبر کے دن ہیں
دسمبر کی راتیں
کہاں تک کرے کوئی
کمرے سے باتیں
اے یادِ غمِ یار
وعدہ نبھانا
ابھی تم نہ جانا
ابھی تم نہ جانا

شاعر: اقبال ناظر
مرسلہ: زرین ارمان، جہلم

''سنو...... بات سنو۔'' وہ پوری کی پوری گھوم کر اسے دیکھنے لگی...... آنکھیں ماتھے پر رکھ کر۔ عاشر کو وہ ناراض ناراض سی لگی۔

''کیا ہے؟'' مرغے کو بہ آواز بلند دھمکیاں دینے والی زبان اس وقت کسی اور ٹون میں برآمد ہوئی۔

''وہ...... چاچی کہاں ہیں......؟'' عاشر کو چاچی کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔

''کیوں......؟'' اس کا لہجہ و انداز مزید تیکھا ہوا۔

''میں نے نہانا ہے۔'' عاشر نے جلدی سے بتایا۔ جسے سن کر وہ منہ کھول کر اسے دیکھنے لگی۔

''لے فیر...... چاچی...... نہلائے گیا؟'' بے حد کڑا انداز تھا۔

''واٹ......'' عاشر کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''وٹ۔'' سوہنی کے لہجے میں تشویش گھل گئی۔ وہ دو قدم آگے آئی۔

''پیٹ میں وٹ پڑ رہے ہیں کیا......؟'' وہ سوال پوچھنے لگی۔

''مجھے پانی چاہیے نہانے کے لیے۔'' زچ ہو کر وہ

جلدی سے بولا تھا۔

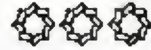
"آ..... اچھا۔" سوہنی اب مطمئن ہوئی۔ "ایسے بول ناں..... میں بھر دیتی ہوں۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے بڑی ساری بالٹی صحن میں ایک طرف لگی ٹونٹی کے نیچے رکھی بالٹی پانی سے بھر گئی تو وہ اٹھانے کو لپکی۔

"یہ تم اٹھاؤ گی؟" سوچ کر ہی عاشر کو گھبراہٹ نے آلیا۔

"تے فیر..... میرا ماما آئے گا کیا؟" بڑے آرام سے اس نے بالٹی اٹھا کر ایک طرف بنے غسل خانے میں رکھ دی۔ عاشر غش کھانے تک آ گیا۔ اتنا نازک سا وجود اور یہ بڑی بھری ہوئی بالٹی۔ سونیا ایسی کوشش کرتی تو بالٹی سمیت سجدہ ریز ہو چکی ہوتی۔

"میں نے پانی رکھ دیا ہے..... نہاتے ہو یا اب بھی چاچی کی ضرورت ہے؟" کمر پر ہاتھ رکھ کر وہ سنجیدہ سی پوچھنے لگی۔

"لاحول ولاقوۃ!" عاشر نے کہا اور جلدی سے نہانے چل دیا۔



جھلسا دینے والی دوپہر میں آدھی ادھوری نیند لینے کے بعد وہ خاکی جینز پر ٹی شرٹ پہنے باہر آیا تو سوہنی کو بھینس کے ساتھ مصروف پایا۔ اس کے ہاتھ بڑی مشاقی سے بھینس کا چارا بنا رہے تھے۔ عاشر کچھ دیر تک دم سادھے اسے دیکھتا رہا پھر آہستگی سے گلا کھنکھار کر بولا۔

"وہ..... چاچی کہاں ہے؟" سوہنی کے ہاتھ لحظہ بھر کو رک گئے۔ اسے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور پھر سے چارا بنانے لگی۔

"کیوں..... تو نے فیر نہانا ہے؟" کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا وہ مذاق کر رہی ہے۔

"مائی گاڈ.....!" عاشر کا ہاتھ بے ساختہ سر پر گیا۔

"نہیں..... چائے پینی تھی۔" خود کو کمپوز کرنے کے بعد فرمائش بتائی۔

"آ..... چھا۔" سوہنی نے اسے سر تا پا گھورا۔

"میں بنا دیتی ہوں۔" وہ دیوار کے ساتھ رکھی چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

"لے میری ڈیانا..... تیرا بھوجن تیار ہو گیا تو پیٹ بھر میں مہمان کی سیوا کروں۔" بھینس پر ہاتھ پھیرنے کے بعد وہ نل کے پاس گئی۔ ہاتھ دھونے کے دوران اس کا گھنگھروؤں والا پراندہ آگے آ گرا تھا۔ گھنگھروؤں کی چھنچھناہٹ پر عاشر پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ پینڈو سی تھی..... مگر کوئی شک نہیں بے انتہا خوبصورت تھی۔ عاشر لحظہ بھر کو تو اس کے جسم کے پیچ و خم میں کھو سا گیا۔ پھر وہ چھوٹی سی بنی دیواروں کے بیچ بنے چولھے کے گرد چائے کے برتن رکھنے لگی۔ عاشر کی تمام تر توجہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر تھی کہ جس کی چوڑیاں اور گھنگھرو سماعتوں کو نئی آواز سے روشناس کرا رہے تھے۔ مٹی کے چولھے میں اس نے لکڑیاں دہکائیں اور دیگچی میں پانی ڈال کر چڑھا دیا۔

"شہر میں کڑیاں نہیں ہوتیں کیا؟" عاشر کی محویت سوہنی کے اس طنزیہ جملے سے ٹوٹی۔ وہ لاشعوری طور پر ہی سہی بڑی بری طرح سے سوہنی کو تکے جا رہا تھا۔

"نہیں..... وہ..... میں..... دراصل" اس بدلحاظ سے طنز کے جواب میں اسے جتنا شرمندہ ہونا پڑا یہ وہ جانتا تھا یا اوپر والا۔ سو اس کے بعد نظریں بھوری (بھینس) پر چپکا دیں جو رغبت سے چارا کھا رہی تھی۔

"کہیں جا رہے ہو؟" چائے کا کپ اس کے حوالے کرتے ہوئے وہ شاید یونہی پوچھنے لگی۔

"ہوں۔" عاشر کو شاید چائے کی بہت طلب ہو رہی تھی۔ فوراً پہلا سپ لیا۔ چائے ہٹ کر تھی۔ بے حد سوادی۔

"یہی کپڑے پہن کر.....؟" وہ ایک بار پھر چولھے کے پاس چوکی پر بیٹھ چکی تھی۔

"ہاں، کیوں.....؟" عاشر جی بھر کر حیران ہوا۔

"ان کو کیا ہوا ہے؟" واقعی انہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ پر تیرا یہ خاکی پاجامہ دیکھ کر پنڈ والے تجھے پتھر نہ مارنے پڑ جائیں؟"

"کیوں.....؟" عاشر کو اس کے اگلے جملے کی سنسناہٹ کا پتا نہیں تھا۔ ورنہ استفسار نہ کرتا۔

"یہ سمجھ کر کہ تو کچھ پہنے بغیر ہی باہر نکل آیا۔"

بڑے آرام سے اس نے جملہ پورا کیا تھا۔ مگر سننے والے کی تاب بس اتنی ہی تھی۔ عاشر کو اچھو لگ گیا۔ اس کے منہ سے چائے کا فوارہ دور تک اچھلا۔

''مجھے نہیں پینی یہ چائے۔'' تھوڑے حواس سنبھلے تو وہ کھڑا ہو گیا۔ ''اس چائے کے عوض جو تم میرا ایکسرے نکال رہی ہو...... وہ مجھے منظور نہیں۔'' وہ اٹھ کر عاشر کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔ بوکھلائی ہوئی۔

''ہائے کیا ہوا...... گرم، گرم چائے کیوں پی لی۔ کہیں بھاگی جا رہی تھی کیا؟'' معصومیت کی انتہا تھی۔ عاشر نے...پیالی چارپائی پر پٹخنے کے بعد باہر نکل جانے میں ہی عافیت جانی۔



چاچا ریاض کی دکان پر گیا تو وہاں چاچا وہ شوکے کے ساتھ الجھے ہوئے تھے۔ شوکا...... حلیے سے جتنا ناپسندیدہ لگ رہا تھا۔ بولتے ہوئے اس سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت تھا۔ چاچا اس سے ہاتھ ملانے کے بعد پھر سے شوکے پر برسنے لگے۔

''تاں میں پوچھتا ہوں تجھے ضرورت کیا تھی پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی۔ ہیرو بننے کی؟''

''پرایا پھڈا۔'' شوکا چلایا۔ ''مجیدا میرا بیلی ہے۔ میرا یار ہے...... اس کے اور میرے پھڈے الگ کیسے ہوئے؟''

''ہاں تو فیر مجیدے کے سر پر لگنے والی اٹ (اینٹ) اپنے سر پہ لے لیتا۔ بڑا آیا بیلی والا۔'' چاچا چڑ کر بولا تھا۔ شوکے کی ترچھی تند نظریں عاشر پر بھی پڑ رہی تھیں۔ اسے یوں عاشر کے سامنے اپنی عزت کا کباڑا گوارا نہیں ہو رہا تھا۔

''تو میری مدد کرتا ہے ٹھیک...... نہیں تو بے عزتی نہ کر میری۔''

''تیری عزت ہے جو بے عزتی ہوگی۔'' چاچا گرجے۔

''تیرے پاس آنا ہی فضول تھا۔ میں اپنا مسئلہ خود حل کر لیتا۔'' عاشر پر ترچھی نظر ڈالنے کے بعد شوکا لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔

''ٹھیک ہے...... جب بات تھانے کچہری تک پہنچے تب دم ہلاتے میرے پاس نہ آنا......'' چاچا اس کے پیچھے چلائے تھے۔ اور پھر لمبی، لمبی سانس لیتے ہوئے دکان کے سامنے رکھی چارپائی پر آ بیٹھے۔ عاشر بھی بیٹھ گیا۔

''اللہ کرتا یہ اٹ (اینٹ) اسی کے ہاتھ پر لگ جاتی۔ میری جان چھوٹ جاتی۔ ان روز، روز کے پھڈوں سے۔'' چاچا کا غصہ کم نہیں ہو پا رہا تھا۔ عاشر کنفیوز سا بیٹھا رہا۔ کیسے ان کو کول ڈاؤن کرتا سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔

''سالا ہے میرا بدقسمتی سے...میری جان کا روگ۔ آئے روز میرا خون جلانے کے لیے کسی نہ کسی کے ساتھ بھڑ جاتا ہے۔ اگلے میری جان کو آ جاتے ہیں۔''

''آپ پلیز ٹینشن مت لیں۔ پلیز غصہ تھوک دیں۔ دیکھیے...... میں فرسٹ ٹائم آپ کی دکان پر آیا ہوں۔ مجھے پنڈ دکھانے کا وعدہ کیا تھا آپ نے۔'' بالآخر چاچا کے چہرے پر نرمیاں اتریں۔

''چل فیر۔'' اس کے لیے نرم مسکراہٹ سجا کر وہ کھڑے ہو گئے۔

''چلیے۔''



''عاشر۔'' کمرے میں دھیما دھیما میوزک گونج رہا تھا۔

وہ بیڈ پر عاشر کی چھوٹی سی تصویر کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھی۔

''ابھی تو صرف دو دن ہی ہوئے ہیں تمہیں گئے ہوئے...... اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تمہارے بغیر۔ نا معلوم میرے بغیر تم کیسے ہو گے۔'' اس نے تکیہ گود میں بھینچ لیا اور تصور کی آنکھ سے عاشر کی بے چینی دیکھ کر محظوظ ہونے لگی۔

''یہ درد...... یہ کسک...... میٹھی ضرور ہے مگر ناقابلِ برداشت......'' وہ موبائل ہاتھ میں لے کر عاشر کا

نمبر ڈائل کرنے لگی۔ جو گزشتہ دو دنوں سے مل ہی نہیں پا رہا تھا۔ پر اس وقت اللہ کو اس کی حالت پر رحم آ گیا تھا کہ دوسری طرف فون جانے لگی۔ وہ باقاعدہ اٹھ کر سیدھی ہوئی۔

''عاشر۔'' دوسری طرف کال ریسیو ہوتے ہی وہ بے تابی سے بولی تھی۔

''جناب۔'' عاشر کی فریش سی آواز سونیا کو بھی فریش کر گئی۔

''کب آ رہے ہو؟''

''ہائیں...... یار آج دوسرا دن ہے مجھے آئے ہوئے...... میرے دادا کو جو خوشی ملی ہے وہ میرے کل چلے آنے سے ختم ہو جائے گی......''

''کیسے ہو؟'' اس کی مجبوری سمجھ کر وہ پوچھنے لگی...... دل میں کہیں تھا وہ کہے گا۔ ''بہت اداس......''

''مزے میں......'' جواب الٹ موصول ہوا۔ سونیا کی رنگت مدھم پڑ گئی۔

''میرے بغیر......؟''

''نہیں...... تمہارے بغیر اداس ہوں پر انہوں نے مجھے خوش رکھا ہوا ہے۔'' سونیا نے بے ساختہ سکون محسوس کیا تھا۔

''اور یہ تم...... ہر وقت سیل آف کیوں رکھتے ہو؟''

''آف نہیں رکھتا۔ یہاں نیٹ ورک پرابلم ہے۔ سگنل ٹھیک نہیں آتے۔''

''تو اب کیسے ٹھیک ہو گئے۔'' وہ جرح کرنے لگی۔

''اب میں باہر آیا ہوا ہوں، میدان میں۔ والی بال کا میچ ہو رہا ہے یہاں۔''

''اچھا...... اور گاؤں کی گوریاں نہیں آنے دے رہیں کیا؟''

''شٹ اپ...... یہاں گوریاں نہیں کالیاں زیادہ ہیں۔'' سونیا اس جواب پہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔



دادا جان کے کمرے میں وہ عاشر اور انہیں رات کا کھانا دینے آئی تو دادا جان نے بٹھا لیا۔

''بیٹھ...... عاشر پتر پوچھ رہا ہے سوہنی میری اصلی پھوپھو زاد ہے کیا؟'' وہ موڑھے پر بیٹھ گئی تو دادا جان نے بتایا۔ وہ پلکیں اٹھا کر عاشر کو دیکھنے لگی۔

''اس کی ماں نسرین میری بھانجی تھی سگی۔'' دادا جان عاشر کو بتانے لگے۔ سوہنی نے سر جھکا لیا۔ ''اس کی پیدائش کے دو سال بعد ہی اپنے رب کے پاس چلی گئی۔ چھوٹی سی عمر لکھوا کر لائی تھی، کم نصیب۔'' دادا جان کی آواز میں دکھ ہلکورے لے رہا تھا اور سوہنی کی آنکھوں میں نمی۔

عاشر نے اچٹتی سی نظر ڈال کر ہی اندازہ کر لیا کہ وہ پلکیں جھپک کر آنسو روکنے میں لگی ہوئی ہے۔

''پھر میں اس کو اپنے پاس لے آیا کہ میری بھانجی بن ماں کی تھی۔ سوہنی کے دادکے پُٹھے (الٹے) مغز کے تھے۔ انہیں سوہنی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ یہاں جب تک تیری دادی زندہ رہی سوہنی سکون سے رہی۔ اس کے آنکھ بند کرتے ہی اس کے برے دن آ گئے۔'' وہ بے چینی سے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

''تیری چاچی بڑے کرخت مزاج کی ہے۔ سارے گھر کے کام اس معصوم کے کندھوں پر ڈال دیے اور خود محلہ، محلہ پھرتی ہے۔''

''دادا جان...... اس کے والد؟'' عاشر نے اٹک، اٹک کر پوچھا۔ سوہنی کے آنسو گالوں پر پھسل ہی آئے۔

''نشئی، جواری تھا حرام خور۔ اسے اپنی جان کی فکر نہیں تھی...... سوہنی کی کیا فکر پالتا۔ میں سوہنی کو یہاں لے آیا تو کبھی بھولے سے بھی جھانک کر نہ دیکھا کہ بیٹی کن حالوں میں ہے۔ مر کھپ گیا وہ بھی کچھ سال پہلے۔'' دادا جان نے آزردگی سے بتایا۔ عاشر نے دیکھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''مم...... مجھے مامی بلا رہی ہیں۔'' وہ شاید رونا چاہ رہی تھی...... بہانہ بنا کر نکل گئی۔ حالانکہ مامی نے نہیں بلایا تھا۔ وہ جب بلاتی تھیں تو قریب قریب گھروں میں تو ان کی آواز ضرور ہی جاتی تھی۔

''دکھی ہو گئی نمانی۔'' دادا جان خود بھی افسردہ

ہو چکے تھے۔

عاشر سوہنی کی پلکوں پر اٹکے ایک آنسو میں کھویا رہا۔



سارے صحن میں گرم چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چاچی اپنے کمرے میں تو دادا اور عاشر اپنے کمرے میں دوپہر کی نیند لے رہے تھے۔ آج شنو آئی بیٹھی تھی۔ بڑے سارے چھپر کے نیچے وہ دونوں چارپائی پر بیٹھی فریم ہاتھ میں لیے ٹھیکے پر لیے دوپٹے ٹانک رہی تھیں۔ شنو کے چہرے پر غم کے سائے لہرا رہے تھے۔

''کچھ دنوں میں تو دلہن بننے جا رہی ہے......''

اس پر وقتاً فوقتاً نظریں ڈالنے کے بعد سوہنی نے اپنا فریم ایک طرف رکھ کر خوش دلی سے کہا۔ ''اس سوہنے روپ پر مسکراہٹ سجا، سڑی ہوئی بوتھی کیوں بنا کر بیٹھی ہے۔''

شنو گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ چہرہ کچھ اور ستا گیا تھا۔

''جیسی دلہن میں بن رہی ہوں۔ رب ایسی دلہن بنا کسی کے نصیب میں نہ لکھے۔'' دور خلاؤں میں کچھ تلاشتے ہوئے وہ رنجور لہجے میں بولی تو سوہنی بھی چپ ہو گئی۔ دونوں کو گرم دوپہر کی چبھن کچھ زیادہ محسوس ہونے لگی۔ دونوں کچھ دیر تلک خاموش اداس بیٹھی رہیں۔

''سب نصیب کے کھیل ہیں سہیلی۔'' سوہنی نے اپنا فریم اٹھاتے ہوئے کہا تو شنو زخمی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلانے لگی۔

''ہاں......سب نصیب کے کھیل ہیں۔'' اس نے تائید کی پھر سوہنی کی ٹھوڑی چھو کر بولی۔ ''پر مجھے یقین ہے اوپر والے نے ہماری سوہنی کا نصیب بہت اونچا بنایا ہوگا۔'' اس کے ہونٹوں پر ویران سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

''اس پنڈ کی ہر لڑکی کا نصیب ایک جیسا ہے نہ کالا اور ڈراؤنا... میرا بھی الگ نہیں ہوگا۔'' وہ آہستگی سے کہتی کپڑے پر جھک گئی۔

''الگ ہی ہوگا......دیکھ لینا۔'' شنو کو کچھ زیادہ ہی یقین تھا۔

''وہ جو اندر سوئی خراٹے لے رہی ہیں۔'' سوہنی نے چاچی کے کمرے کی جانب آنکھ سے اشارہ کیا ''وہ کہاں میرے نصیب کی اونچائی برداشت کریں گی۔ ڈھونڈ لائیں گی میرے لیے بھی کوئی شوکا یا شوکے جیسا۔''

''نہیں ہوگا ایسا......''

''شوکے کے وٹے میں دے دے یا دلی ہنا دے......سب ماں کے ہاتھ میں ہے۔''

''شوکا تیرا ابھرا تو نہیں ہے جو تو اس کے وٹے میں کہیں جائے۔''

''تو بھی تو اپنے چاچے کے وٹے میں جا رہی ہے۔'' سوہنی نے یہ کہہ کر شنو کو چپ لگا دی۔ وہ واقعی اپنے چاچے کے وٹے میں جا رہی تھی ایک بڈھے کے گھر۔

''خیر چھوڑ، دفع کرو......میں سوہنی ہوں شنو نہیں۔ جب وقت آئے گا تو مردوں کی طرح مقابلہ کروں گی۔ ابھی میرا موڈ خراب نہ کرو۔''



بیرونی دروازہ کھول کر عاشر نے گھر میں قدم رکھتے ہی عجب منظر دیکھا۔ سوہنی چاچے ریاض کی سائیکل صحن میں دوڑاتی پھر رہی تھی۔ کمر کے گرد دوپٹا کس رکھا تھا۔ بالوں کی چوٹی میں سے آوارہ لٹیں نکل کر گالوں کے ساتھ چھیڑ خوانی کر رہی تھیں۔ پسینے اور گرمی سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ مگر وہ بڑے جوش سے یوں سائیکل دوڑا رہی تھی جیسے فضا میں راکٹ اڑا رہی ہو۔

عاشر کو بڑے مزے کا منظر لگا۔ وہ دبے پاؤں ایک طرف جا کھڑا ہوا۔ سوہنی اس کی آمد سے بے خبر راکٹ اڑا رہی تھی۔

''آپاں...... ہماری باری کب آئے گی؟'' چاچا کے تینوں بچے اپنی باری کے منتظر تھے۔ بڑا دالا تھک کر روہانسا ہوا۔

''پہلے میں تو چلا لوں۔'' سوہنی نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں اماں کو بتا دوں گا تو ابا کی سائیکل چلاتی ہے۔'' منجھلے والے کی دھمکی کارگر رہی۔

''وڑ ونتے منہ۔'' سوہنی نے سائیکل کو بریک لگائی۔ ''میں نہیں ڈرتی ورتی...... تیری ماں ہے..... بڑا آیا دھمکی دینے والا آج تیری باری بند۔ آ چھوٹے..... پہلے تجھے سیر کراؤں۔'' چھوٹا اچھل کر پیچھے بیٹھا اور سوہنی لگی ایک بار پھر پیڈل مارنے۔ اسی اثنا میں بڑے والے کی نظر عاشر پر پڑ گئی۔ جس نے کئی لڑکیوں کو سائیکل چلاتے دیکھا تھا لیکن سوہنی کو دیکھ کر الگ ہی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

''آپاں..... اُدھر دیکھ۔'' بڑا والا چلّایا۔ سوہنی نے اُدھر دیکھا..... اور عاشر پر نظر پڑتے ہی سائیکل ڈول گئی۔ وہ بھی بیرونی دروازے کے عین سامنے۔ جو عین اس ٹائم کھلا اور چاچی اندر داخل ہوئیں۔ سائیکل کچھ اور بدمست ہوئی۔ عاشر نے تو آنکھیں میچ ڈالیں۔ زوردار دھماکے کے ساتھ سوہنی سائیکل اور بچے سمیت تو گری ہی..... چاچی بھی لپیٹ میں آ گئیں۔

''ہائے سوہنی..... تیرا بیڑا غرق۔'' چاچی کا واویلا ٹیپ ریکارڈر کی طرح آن ہوا۔ ''موت کا کنواں سمجھ کر چلا رہی تھی نامراد! اپنی ان زرافے جتنی ٹانگوں کا ہی لحاظ کر لیا کر۔ میری غیر موجودگی میں اکھاڑا بنا ڈالتی ہے گھر کو نامراد۔'' چاچی کو شاید زیادہ چوٹ آئی تھی۔ وہ بھی اپنی کمر سہلاتی کھڑی ہو گئی۔ دوپٹا کھول کر سر پر جمایا اور سائیکل دیوار کے ساتھ۔ خاصی مغموم شکل بنائے..... عاشر کے سامنے سے گزر رہی تھی جب وہ شوخی سے بولا۔

''موت کا کنواں سمجھ کر چلا رہی تھیں کیا؟'' وہ جھپاک سے کمرے میں گھس گئی۔



''تو یہاں آ گئی۔'' ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کا مُکا مارتے ہوئے شوکے کا بس نہیں چلا چاچی کو دوبارہ سے اس کے اپنے گھر بھیج دے۔

''وے..... تجھے کیوں تپ چڑھ رہی ہے۔ میں اپنے ماں بیٹو کے گھر آئی ہوں کوئی تیرے نہیں۔'' چاچی کو بے حد برا لگا۔ وہ چھوٹے کو سلا رہی تھیں..... جب شوکا ان کی آمد کا سن کر اندر چلا آیا۔

''او میری بہن..... تو غلط نہ سمجھ۔'' وہ مارے اضطراب کے کمرے کے چکر کاٹنے لگا۔

''جیسا تو رویّہ دکھا رہا ہے ویسا ہی سمجھوں گی ناں.....!'' چاچی بھی دوبدو بولیں۔

''دیکھ آپاں۔'' شوکا ان کے قریب آ بیٹھا۔ ''جب تک یہ فارمی ککڑ یہاں آیا ہوا ہے تو گھر کو اکیلا نہ چھوڑا کر۔''

''گھر کو یا سوہنی کو؟'' چاچی کایاں تھیں۔ اس کا مطلب سمجھ کر پوچھنے لگیں۔

''ہوشیار تو، تو خود ہے۔ پوچھ مجھ سے رہی ہے۔'' شوکے نے مکھن لگایا۔

''پر یہ انگریز ادھر آیا کیوں ہے؟''

''اس کے چاچا کا گھر ہے..... جب مرضی آ سکتا ہے۔''

''ہاں پر تو نظر رکھ.....'' اسے کوئی اور ہی مروڑ اٹھ رہے تھے۔

''وے شوکے..... شہری لڑکا ہے۔ اِدھر گاؤں کی چھوریوں میں اس کی کیا دلچسپی۔''

''او تو ہے..... پر سوہنی بھی تو سوہنی ہی ہے۔'' شوکا لگتا تھا آج کل اس مسئلے کی زد میں تھا۔ چاچی بھی سوچنے لگیں۔

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' مکاری کے ساتھ بولتی وہ دوسرا شوکا لگیں۔

''یہ تو چنگا ہوا خیر..... میرے لاکھ ناپسند کرنے پر بھی وہ مہارانیوں کی طرح اُدھر رہ رہی ہے میرے سینے پر سانپ لوٹتی..... اچھا ہے عاشر کے ساتھ بدنام ہو جائے۔ اس کا ماما خود ہی دفع کرے گا دونوں کو۔'' شوکے کو اس کا پلان سلگا گیا۔

''اسی واسطے تو ان کے لیے میدان کھلا چھوڑ آئی۔'' وہ عجیب خرخراتی آواز میں بولا تو چاچی کو چپ لگ گئی۔



چولھے کے قریب چوکی پر بیٹھی وہ پرات میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ عاشر چارپائی پر بیٹھا بظاہر صحن میں

پھدکتی مرغیوں اور چوزوں کو دیکھ رہا تھا مگر اس کے دھیان کی زد میں سوہنی کی چوڑیوں کی کھنک اور پراندے کے گھنگھروؤں کی جھنکار آرہی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ سوہنی کو دیکھے گیا جو سر پر دوپٹا اوڑھے مگن سی آٹا گوندھ رہی تھی۔ وہ محویت سے لال دوپٹے کے ہالے میں سے جھانکتے اس کے نمکین روپ کو دیکھے گیا۔ وہ ایسا نظر باز نہیں تھا۔ مگر اس وقت وہ نظر بازی کر رہا تھا۔ دل کے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی۔

''وے......'' آٹا گوندھ چکا تھا۔ سوہنی اسے ڈھکنے کے بعد کڑے تیوروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ''تیری آنکھیں خراب ہیں کیا...... ایک ہی جگہ پر ٹھہر گئی ہیں۔'' بڑا اچانک حملہ تھا۔ عاشر کی محویت تو ٹوٹی ہی وہ خود بری طرح سے گڑبڑا گیا۔

''تم بہت خطرناک ہو۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

''تیری طبیعت تو ٹھیک ہے...... یہ زنانیوں کی طرح گھر کیوں بیٹھ گیا ہے۔ باہر جا...... پنڈ دیکھ۔''

''میری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے جان چھڑانے کے لیے کچھ تو کہنا تھا مگر جان مزید پکڑ میں آگئی۔

''ہائیں...... کیا ہوا...... ادھر دکھاؤ...... ٹُچر تو نہیں ہے؟'' وہ چہرے پر پریشانی سوار کیے اس کے قریب ہوئی۔

''کیا نہیں ہے؟'' عاشر کو واقعی...... کچھ سمجھ نہیں آیا۔

''او ٹچر...... مطلب...... او تم کہتے ہو نچر۔'' وہ وضاحت نہیں کر پا رہی تھی۔ عاشر ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا۔

''تمہارا مطلب ہے ٹمپریچر......''

''آہو۔'' وہ مطمئن ہوئی۔

''نہیں...... مجھے ٹچر نہیں ہے۔'' ہنستے، ہنستے عاشر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''مجھے جو ہے وہ میری اپنی سمجھ سے بھی باہر ہے۔'' پھر ہنسی روک کر وہ معنی خیز انداز میں بولا تھا۔ سوہنی کندھے اچکاتی بھوری کے پاس چلی گئی۔

''مجھے کچھ دنوں سے سونیا اور سوہنی ایک کیوں لگ رہی ہیں؟'' بھوری کے ساتھ لاڈ کرتی سوہنی کو مرکزِ نگاہ بنا کر عاشر نے تھکے، تھکے ذہن کے ساتھ سوچا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔



ہرے بھرے لان کے عین وسط میں رکھی چیئرز میں سے ایک پر شائستہ بیٹھی تھیں۔ ملازم ان کے آگے چائے سرد کر رہا تھا۔

''جاؤ تم۔'' وہ چلا گیا تو شائستہ نے نمبر ملا کر سیل کان سے لگالیا۔

''ہاں...... عاشر!'' بیٹے کی آواز نے ان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

''بہت بور ہو رہی ہوں بچی...... تمہارے ڈیڈ جرمنی گئے ہیں۔ سوچو میرے دن رات کیسے گزر رہے ہوں گے تم دونوں کے بغیر......'' وہ نرم لہجے میں بات کر رہی تھیں۔

''میری پارٹیز اور کلب کی مصروفیات کم نہیں ہوئیں لیکن تمہاری کمی نے زیادہ اثر کر رکھا ہے۔'' وہ سچ کہہ رہی تھیں اکلوتے بیٹے کی اہمیت کا احساس اب ہو رہا تھا۔

''بس آنے کی کرو...... اتنی گرمی میں نہ جانے وہاں کیسے رہ رہے ہو؟'' اب کے وہ سختی سے بولیں۔

''ٹھیک ہے...... اوکے...... ٹیک کیئر۔'' سیل آف کرنے کے بعد وہ دھیرے سے بڑبڑائیں۔

''ہونہاں پینڈو باپ کی اولاد مجھ سے زیادہ اس کی کوالیٹیز آگئی ہیں تم میں۔ گاؤں اٹریکٹ کر رہا ہے۔ وہ بھی گرمیوں میں، ویری فنی......!''



وہ دادا جان کے کمرے میں سیل فون پر بزی تھا جب اچانک سے کمرے میں کھنکھناہٹ سی گونجی اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سوہنی کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر بدحواس سی ہو گئی۔

''میں...... نانا جان کو دوائی......'' جملہ پورا کرنے کے لیے ہمت ہی ختم ہو گئی۔ عاشر بنا سوچے سمجھے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ معمول سے ہٹ کر کپڑوں میں ملبوس

تھی۔ دیدہ زیب رنگوں کے سادے سے شلوار سوٹ میں ہاں دوپٹا بہت چمکیلا سا تھا۔ شاید ستارے ٹنکے ہوئے تھے اس پر۔ اس کی کلائیوں میں معمول سے زیادہ چوڑیاں بھری ہوئی تھیں اور کانوں میں لٹکتے بڑے بڑے جگمگاتے آویزے۔ وہ سونیا کے پاسنگ بھی نہیں لگ رہی تھی مگر بے بسی سی بے بسی تھی...... بے یقینی سی بے یقینی تھی کہ عاشر کی نظروں کی گرفت میں آئی کھڑی تھی۔ اس کے دل کو لبھا رہی تھی۔

''دادا جانی ابھی اٹھ کر گئے ہیں بیٹھک میں۔ ان سے کوئی ملنے آیا ہوا ہے۔'' بالآخر عاشر نے خود کو کمپوز کیا اور نظروں کی گستاخی کو سمیٹا۔ سوہنی بھی اپنی جھجک پر قابو پاتے ہوئے رخ پھیر کر دروازہ عبور کرنے ہی لگی تھی کہ چاچی سے ٹکراؤ ہو گیا۔ سوہنی کی گھبراہٹ واپس لوٹ آئی۔

''تُو یہاں ہے۔'' چاچی نے بڑا معنی خیز جائزہ لیا اس کا۔

''میں سمجھی ننھے کو سلا رہی ہے۔'' ساتھ ہی انہوں نے بھولپن سے ...کہہ کر سوہنی کو مزید سمٹنے پر مجبور کر دیا۔

''میں نانا سے کہنے آئی تھی دوائی میں واپس آ کر دوں گی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ وضاحت دینے لگی۔ چاچی مکاری سے آنکھوں کے ڈیلے پھیر پھیر کر کبھی سوہنی تو کبھی عاشر کو دیکھنے گئی جو کھڑا ہو گیا تھا۔

''بے فکر رہ...... تیرا نانا تیری غیر موجودگی میں دوائی نہیں کھائے گا۔ تیرے ہی ہاتھ سے کھائے گا اور ابھی تیرے سامنے ہی تو وہ بیٹھک میں جا رہا تھا۔'' جملے کے آخر میں تیر مارا۔ سوہنی نے بے ساختہ دانت پیس ڈالے۔

''اور عاشر پتر۔'' پھر چاچی مٹھاس سمو کر عاشر سے مخاطب ہوئیں۔ ''شنو ہمارے ہی خاندان کی ہے۔ رشتے میں تیری پھوپھو زاد لگتی ہے تو بھی چل ناں شادی میں...... پردے کا کوئی مسئلہ نہیں۔'' سوہنی عاشر کا جواب سننے سے پہلے کمرا چھوڑ گئی۔

''میں......؟'' عاشر تذبذب میں پڑ گیا۔



دلہن بنی شنو جتنی اداس اور افسردہ لگ رہی تھی۔ اس کا ساٹھ سالہ دولہا اتنا ہی نہال...اس کے وٹے میں اٹھارہ سالہ دلہن لانے والا اس کا چاچا بھی کم خوش نہیں تھا۔ یہ واقعی جہالت اور عورت کا استحصال تھا۔ عاشر تو دولہا دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دنیا میں اور وہ بھی پاکستان میں آج بھی ایسے بے جوڑ رشتے ہوتے ہوں گے۔ وہ گنگ سا کھڑا رہا مگر زیادہ دیر تک نہیں۔ جلد ہی اس کی توجہ...... تھال اٹھا کر اس پر ڈھولک بجاتی ...... ٹپے گاتی سوہنی کی جانب مبذول ہو گئی۔ اس بات کا دکھ بھلائے کہ شنو ظلم کا شکار ہوئی ہے وہ ہنس ہنس کر شادی کے گیت گائے جا رہی تھی۔ سہیلی کا بھاری دکھ ایک طرف...... اس کی شادی کی کچھ تو خوشی منانی تھی۔ عاشر لاشعوری طور پر یک ٹک اسے دیکھے گیا جس کے کانوں میں پڑے آویزے اپنا عکس اس کے گالوں پر ڈال رہے تھے اور اس کے چہرے ... کو منور کر رہے تھے۔ اس کی سڈول کلائیوں میں بھری ہوئی چوڑیاں بہت دلفریب محسوس ہو رہی تھیں۔ عاشر کی محویت سے یکسر بے خبر وہ بڑے جوش سے تالیاں پیٹ رہی تھی اور عاشر کو علم ہی نہیں تھا کہ اس کی محویت چاچی بھی بڑا دل لگا کر دیکھ رہی ہیں...... ورنہ محتاط تو ضرور ہو جاتا۔



آج کمرے میں حبس اور گرمی کا نام نہیں تھا...... آج نیند بھی غیر حاضر تھی۔ کچھ انوکھا...... کچھ ان ہونا...... کچھ میٹھا اور خوشگوار سا احساس تھا کہ جو رگ و پے میں گردش کر رہا تھا اور اسے موسم کی شدت بھی محسوس نہیں ہونے دے رہا تھا۔ وہ تکیے کی ٹیک لگا کر چھت پر نظریں مرکوز کیے ہوئے تھا۔ سوہنی کا کھلکھلاتا چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا...... اور وہ اتنا بے بس تھا کہ چاہ کر بھی اس سے رخ نہیں پھیر سکا تھا۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک...... وقفے وقفے سے ساعتوں میں گھس کر چونکا رہی تھی تھک ہار کر وہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے مجھے...... اسے کیا کہوں...... محبت......؟ نہیں نہیں...... یہ محبت نہیں، اسے محبت کہہ ہی

نہیں سکتے ،محبت تو مجھے سونیا سے ہے، ہاں سونیا سے۔ یہ ایک وقتی کشش اور تاثر ہے...... سونی کی مضبوط شخصیت کا تاثر جو میرے دل کو بے قرار کر رہا ہے اور کچھ نہیں ۔''

اوٹ پٹانگ سوچتے ،سوچتے وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا تھا اور بڑی حیرت کی بات...... سونیا کی محبت میں اس نے رت جگا کبھی نہیں منایا تھا اور جس کی محبت سے انکار کر رہا تھا...... اپنی بے قراری کو محض اس کی شخصیت کا تاثر سمجھ رہا تھا...... اس کی وجہ سے آج کی رات اختر شماری کرتے گزر رہی تھی۔



مٹی کے چولھے پر سالن کی دیگچی چڑھی ہوئی تھی۔ نل کے پاس کپڑوں کے ڈھیر میں گم وہ رگڑ رگڑ کر کپڑے دھونے میں مگن تھی۔ چاچی سر پر پٹی باندھے چارپائی پر لیٹے ہائے وائے کر رہی تھیں۔ سونی کسی مشین کے مانند...... کپڑوں اور سالن دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ ہر پانچ منٹ بعد دیگچی کی جانب دوڑ لگاتی اور اس میں ڈوئی چلا کر پھر کپڑوں کے انبار میں گم ہو جاتی عاشر کھڑکی میں سے یہ سارا منظر تاسف سے دیکھ رہا تھا۔

''ہائے ربا...... سر پھٹ رہا ہے۔ آنکھیں اندھی ہو رہی ہیں اور دو گھڑی کو دبانے والا کوئی نہیں ۔'' چاچی کی مُسریلی تانیں عاشر کو بہت بری لگیں۔ وہ جب سے یہاں تھا چاچی سر پر پٹی باندھے ہی نظر آئی تھیں۔ چاچی کے واویلے کے جواب میں سونی نے بڑی، بڑی آنکھوں میں قہر سمو کر اسے دیکھا۔

''اللہ کرے سر بھی پھٹ جائے اور آنکھیں بھی اندھی ہو جائیں۔'' بڑے جی جان سے اس نے دعا مانگی تھی۔

''وے سونی۔'' چاچی نے پوری قوت سے گلا پھاڑا۔ ''میرے منہ سے کہنے تک تو حیا نہیں کرے گی کہ خود سے آ کر میرا سر دبائے۔ بس کر کپڑے رات کو دھو لینا ابھی میرے سر میں تیل ڈال دے۔'' سونی نے نچوڑ کر کپڑے ٹب میں رکھے۔

''گلے میں درد ہوتا تو حیا کر کے دبانے ضرور آتی۔ میرا فائدہ جو ہوتا۔'' کپڑوں کا ڈھیر سمیٹنے کے بعد دل ہی دل میں چاچی کی ہائے وائے کے جلے ہوئے جواب دیتی وہ سالن کی دیگچی اتار کر تیل کی شیشی اٹھائے ان کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔ ساری سچویشن دیکھتا عاشر ٹھنڈی سانس بھرتا کھڑکی سے ہٹ گیا۔

''سونی کی ہڈیوں میں واقعی رس ہے۔ اب یہ رات گئے تک یہ کپڑوں کا ڈھیر دھوئے گی۔'' عاشر کو سونی کا بے تحاشا کام کرنا کھل رہا تھا۔



''کیا کر رہی ہو؟'' سونی نے ہڑبڑا کر پانی میں سے پاؤں نکالے تھے۔ مڑ کر دیکھا تو عاشر کھڑا تھا۔ وہ گہری سانس بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اپنی ڈیا نا باندھنے آئی تھی۔ گھر میں اس وقت دھوپ آ جاتی ہے۔'' وہ چپل پہن رہی تھی۔ عاشر کی آنکھیں پیروں پر ٹک گئیں۔ دھلے دھلائے سنہری رنگت کے حامل خوب صورت پاؤں...... وہ نظر انداز کیے جانے کے لائق ہرگز نہیں تھے۔

''اداس ہو؟'' وہ درخت کے ساتھ بندھی بھوری پر ہاتھ پھیر رہی تھی جب عاشر نے پوچھا۔

''نہیں تو......!''

''ہو تو سہی...... بتا دو...... کسی اپنے کو کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔''

''اپنا......؟'' سونی نے آنکھیں سکوڑیں۔ ''تو میرا اپنا کب سے ہو گیا؟''

''نہ سمجھو تو اور بات ہے ورنہ میں اپنا ہی ہوں۔''

عاشر کے اس جملے نے سونی کو خاموش کر دیا تھا۔

''مجھے شنو کا دکھ اداس کر رہا ہے۔'' اس کے لہجے میں کرب تھا۔ سہیلی کے ساتھ بیتی کا دکھ تھا۔ عاشر سن کر چپ رہ گیا۔

''ہمارے یہاں کی بیٹیاں گروی سانسیں لیتی ہیں، ادھار کی زندگی جیتی ہیں۔ وقت آنے پر اس ادھار کی واپسی کا تقاضا کر کے سانسیں قبض کر لی جاتی ہیں۔'' سونی بہت دلگرفتہ تھی...... عاشر کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

''تم جب فلسفہ بولتی ہو تو بہت خطرناک لگتی ہو۔''

عاشر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ سوہنی بے تاثر کھڑی رہی۔

''مجھ سے دوستی کرو گی؟'' اچانک عاشر نے یہ کہہ کر سوہنی کو جھٹکا ہی لگا دیا۔ وہ ابرو اچکا کر اسے دیکھنے لگی۔

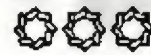
''غلط مت سمجھنا...... کسی بری نیت سے نہیں کہہ رہا بس ویسے ہی مجھے تم اچھی لگی ہو۔'' سوہنی کی نظروں سے گھبرا کر وہ جلدی جلدی بولا۔ سوہنی پھر بھی گھورتی رہی حتیٰ کہ عاشر نے اپنا ہاتھ اس کے آگے کر دیا۔

''دوستی؟'' وہ بڑا پُرامید تھا۔ سوہنی نے پہلے اسے دیکھا پھر اس کے پھیلے ہاتھ کو...... اور پھر گہری سانس بھرتے ہوئے انتہائی جھجک کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''دوستی......'' ساتھ ہی مسکرا کر بولی۔ عاشر نے اس کا نرم ہاتھ دھیرے سے دبا کر چھوڑ دیا۔ سوہنی کا چہرہ بلش ہو گیا۔

''تو بھی مجھے برا نہیں لگا۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا تو عاشر کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''بڑی مہربانی...... یہ بڑی اچھی بات ہے اب ایک اور احسان وی کر دو...... مجھے تو کے بجائے تم کہہ کر بلایا کرو تو اچھا لگے گا...... تو کہتی ہو تو لگتا ہے پتھر کھینچ کر مار رہی ہو۔'' وہ شرمندہ شرمندہ سی ہنس دی پھر وہیں پگڈنڈی پر دونوں کتنی ہی دیر تک کھڑے رہے۔



صبح کا وقت تھا...... سب ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ عاشر، دادا جانی کے ہمراہ باہر گیا تھا اور چاچا ریاض اپنی دکان پر۔ تینوں بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ سوہنی نل کے نیچے برتن کھنگال رہی تھی۔ چاچی نے کیتلی میں بچی ہوئی چائے پینے کی غرض سے چولھے پر گرم کرنے کے لیے رکھ دی۔

''نی مرن جوگی......'' چنگھاڑ کر انہوں نے سوہنی کے خیالات کو منتشر کیا تھا۔ ''انہی دو پلیٹوں کو گلے لگا کر بیٹھ گئی ہے۔ آج کل تیرے ہوش کدھر ہیں جو کام کرتی ہے اسی کو پیاری ہو جاتی ہے باقی کام پڑے رہتے ہیں۔'' اس نے جلدی سے پلیٹیں دھو کر چارپائی پر الٹی کیں اور جھاڑو اٹھائی۔ سارے صحن میں دھوپ آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔

''جھاڑو رکھ...... پہلے مجھے چائے دے ...... آج کل تو نواب زادی کی ٹور ہی وکھری ہو گئی ہے۔'' وہ چولھے کے قریب جا کر رک گئی۔ درشت نظریں چاچی پر اٹھائیں جو آج کچھ زیادہ ہی بپھری ہوئی تھیں۔

''کیا ہو گیا ہے میری ٹور کو؟'' اس کے سنجیدگی سے پوچھنے پر چاچی نے قہقہہ بلند کیا۔

''میسنی نہ بن...... مجھ سے چھپ رہی ہے؟ میں سب جانتی ہوں۔ تانے کے کمرے اور کھیتوں میں کون سا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟'' سوہنی کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

''ہاں بھئی...... جس قماش کی ماں تھی بیٹی بھی ویسی ہی نکلی۔''

''میری ماں کو کچھ مت کہنا۔'' چاچی کے چمک کر کہنے پر اس نے انگلی اٹھا کر جیسے وارن کیا۔

''کیوں نہ کہوں...... اس کا غلیظ خون تو ہے جو ایسی حرکتوں پر اتر آیا ہے۔'' سوہنی کی آنکھوں سے خون چھلکنے لگا۔

''بازاری ماں کی بازاری بیٹی۔'' بس سوہنی کی برداشت اتنی ہی تھی۔

''تم خود ہو ایسی...... تمہارا پورا خاندان۔'' وہ دانت پیس پیس کر غرائی تھی۔ چاچی کو تو سر تک آگ لگ گئی۔

''تیری زبان میں کیڑے پڑیں نامراد......'' کہتے ہی چاچی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اتنی زور کا اسے دھکا دیا کہ وہ بچتے بچتے بھی چولھے کے اوپر جا گری گرم چائے کی کیتلی الٹ کر اس کے ہاتھ اور بازو کو جلا گئی۔ سوہنی کی دلدوز چیخ پورے گھر میں گونجی تھی۔



بھوسے والے گرم، تپتے ہوئے کمرے میں دیوار کی ٹیک لگائے وہ تکلیف سے دُہری ہو کر روئے جا رہی تھی بازو اور ہاتھ سرخ انگارہ ہو گئے تھے۔ چھالے بھی بن گئے تھے۔ تکلیف اتنی ہو رہی تھی کہ برداشت ہی نہیں

پریشانی ہوئی۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

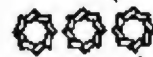
''کیوں ہونے دیتی ہو یہ ظلم...... آواز کیوں نہیں اٹھاتی ہو۔ مامی تمہاری خدا تو نہیں؟''

''آواز ہی تو اٹھائی تھی۔'' اس نے بھیگے بھیگے لہجے میں کہا اور پھر سے آنسو بہانے لگی۔ عاشر چند لمحوں تک اسے روتا دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔ سوہنی نے متورم آنکھیں اس پر جمائیں...... گویا عاشر کے جذبات کو ہوا دی۔ اسے وہ کچھ کہنے پر مجبور کیا جو شاید وہ ابھی نہ کہتا۔ جھیل جیسی آنکھوں کا وار کام کر گیا۔ وہ بہت جلدی سوہنی سے ہارا تھا۔

''مجھ سے شادی کرو گی؟'' سوہنی کو لگا کہ رے کی چھت اس پر آ گری ہو۔ بہت متوحش سی وہ اسے دیکھنے لگی جیسے اس نے موت کا پروانہ تھما دیا ہو اور پھر بنا کوئی جواب دیے...... اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کمرے سے بھاگ گئی۔ عاشر سر ہاتھوں میں گرا کر بیٹھ گیا تھا۔



واپسی کا سفر بہت بوجھل...... بہت مضطرب کر دینے والا تھا۔ وہ سوہنی سے کوئی بھی بات کیے بنا چلا آیا تھا۔ سوہنی کسی نہ کسی کام کی وجہ سے کتنی ہی بار اس کے سامنے آئی تھی...... شاید کوئی آس ولاتا جملہ سننے کی خاطر، ہمت بندھاتی نظر کی امید پر...... مگر وہ نظریں ہی چرا لیتا تھا اور ا...... سینے پر بوجھ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ڈیش بورڈ پر رکھا اس کا موبائل کتنی بار گنگنایا تھا اور ہر بار اسکرین کو تک کر اس نے رکھ دیا تھا وہ اس وقت سونیا تو کیا سوہنی کی بھی آواز نہیں سننا چاہتا تھا دماغ اور دل دونوں ہی شل ہو رہے تھے۔



مٹی کے چولھے میں لکڑیاں دہک رہی تھیں۔ اس کے شعلوں کا عکس سوہنی کے سنہرے چہرے پر پڑ کر اسے اور سنہرا بنا رہا تھا۔ وہ چولھے پر رکھی ساگ کی دیگچی سے یکسر بے خبر ہوئی نہ جانے کس جہاں میں کھوئی ہوئی تھی۔ چاچا کے تینوں بچے اس کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔

''آپاں۔ جلدی پکا پھر لکن میٹی (آنکھ مچولی) کھیلتے ہیں......'' بڑا والا چلایا تھا۔

''نہیں آپاں۔ ابا کی سائیکل چلاتے ہیں۔'' منجھلے والے نے اپنی خواہش بتائی۔

''مجھے میٹھا پراٹھا بنا دے آپاں۔'' چھوٹے کو بھوک نے ستا رکھا تھا۔ چاچی چارپائی پر بیٹھی بڑے غور و خوض سے اس کی گم صم کیفیت کا مطالعہ کر رہی تھیں اور جز بز ہو رہی تھیں۔

''وے چپ کرو...... آج آپاں کسی اور دنیا میں گئی ہوئی ہے۔'' چاچی نے طنزیہ کہا تھا۔ سوہنی.... پھر بھی متوجہ نہ ہوئی۔

''آپاں نے تیل ڈال رکھا ہے کانوں میں۔ وہ میں نکال دوں پھر باتیں سنے گی۔'' چاچی کا بس نہیں چل رہا تھا۔ جوتا لے کر اس کے سر پر کھڑی ہو جائیں اور جو خناس اسے گونگا اور بہرا بنائے بیٹھا تھا، وہ ناک کے رستے نکال باہر کرے۔ سوہنی ہر آواز، ہر کوسنے، ہر ڈانٹ سے بے نیاز بڑی نرم مسکراہٹ لیے اپنی کلائی کو چھوئے جا رہی تھی جس پر اب بھی کسی کا لمس زندہ تھا۔



شائستہ اسے دیکھ کر اس بے تابی سے ملیں کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا ان کی بے قراری سے یوں ظاہر تھا جیسے وہ گاؤں نہیں کسی اور ولیس سے واپس آیا ہو۔

''یار سمجھا کرو ناں...... تمہاری ممی کو یقین نہیں آ رہا کہ تمہیں میرے باپ، بھائی نے جیسے گئے تھے ویسا ہی انہیں سونپ دیا ہے۔ اپنے رنگ میں نہیں رنگ دیا۔'' فیاض صاحب البتہ اس محبت کے مظاہرے پر نہ صرف مشکوک ہو رہے تھے بلکہ جو شک ذہن میں تھا اسے کہنے میں بھی نہیں ہچکچائے۔

''میرے بیٹے تو ذرا بھی نہیں لگ رہے ہو تم۔ بالکل پینڈو...... بلیک، بلیک ہو آئے ہو۔''

''دیکھا...... دیکھا'' شائستہ کے پیار جتلانے پر فیاض صاحب جلدی سے بولے۔

''اور اتنے کمزور بھی۔'' شائستہ کو ایک اور پریشانی لاحق ہوئی۔

''حالانکہ مجھے موٹا نظر آنا چاہیے تھا۔ اتنی فیٹی غذائیں کھا کر آیا ہوں میں۔''

''مائی گاڈ۔'' شائستہ سچ مچ دہل گئیں۔

''او کے ماما...... باقی ایکسرے بعد میں۔ ابھی میں فریش ہولوں۔ بہت مٹی مٹی ہو رہا ہوں۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔



بڑے بزرگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ کوئی وقت منہ سے نکلی کو سچ ثابت کر دینے والا بھی ہوتا ہے اور شاید...... شنو کے ساتھ کی گئی اس کی باتیں بھی ایسے وقت کی تھیں کہ قبولیت پا گئیں۔ اس کا نصیب شنو کے یقین کے مطابق اونچا تو نہیں...... سیاہ اور ڈراؤنا بنانے کی تیاریاں ضرور شروع ہو گئیں۔

اس شام وہ کمرے میں دری بچھائے چاچا کے کپڑے استری کر رہی تھی۔ قریب ہی چارپائی پر چاچا اور چاچی دونوں آموں سے انصاف کر رہے تھے۔ چاچا نے اسے بھی پیش کش کی تھی لیکن اس کا دل نہیں کر رہا تھا سو انکار کر دیا۔ دفعتاً چاچا کا بڑا بیٹا ہانپتا کانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''ابا...... اماں...... ماسے کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔'' چاچی کے ہاتھ سے گٹھلی چھوٹ کر گر گئی۔

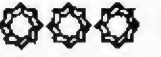
''ہائے ربا۔'' وہی آم میں لتھڑے ہاتھ انہوں نے سینے پر دے مارے۔

''پر کیوں......؟'' چاچا چارپائی سے اتر آئے۔

''ماسے کی لڑائی ہو گئی تھی کسی سے' ماسے نے اینٹ دے ماری۔ وہ بندہ وہیں پھڑک گیا اینٹ اس کے سر پر لگی تھی۔''

''یہ شوکا......!'' چاچا دھوتی سنبھالتے باہر کو لپکے۔

''ہائے میرا ویر...... ننھے کے ابا مجھے بھی لیتا جا۔'' چاچی بھی آنسو بہاتی پیچھے گئیں۔ سوہنی بے تاثر چہرہ لیے استری کرتی رہی۔



دروازہ زوردار دھماکے سے کھلا تھا۔ مبک ریک میں سر گھسیڑے عاشر نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور فریز ہی ہو گیا۔ سامنے سونیا کھڑی تھی۔ اپنی ازلی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ۔

''یہ تم گاؤں سے آئے ہو یا گوانتاناموبے سے؟'' بڑے شوخ سے انداز میں اس نے خفیف سا طنز کیا۔ اس کا اشارہ عاشر کی بڑھی ہوئی شیو کی جانب تھا۔

''اتنے دن ہو گئے تمہیں واپس آئے ہوئے اور جناب نے انفارم بھی نہیں کیا...... میں کال کروں تو ریسیو نہیں کرتے...... گاؤں میں تو سگنل کا مسئلہ تھا۔ یہاں کیا ہے؟'' وہ ہمیشہ کی طرح پٹر پٹر بول رہی تھی۔ عاشر کی خاموشی محسوس کیے بغیر......

''اور یونیورسٹی تمہارے ڈیڈ نے خرید لی ہے کیا؟ مزے سے گھر بیٹھ گئے ہو۔'' وہ اس کا جواب سنے بنا ایک کے بعد ایک سوال پٹاری میں سے نکالتی جا رہی تھی۔ عاشر ذہنی مفلوج انسان کی طرح کھڑا تھا جسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے، کیا کرے اور سونیا کیا کہہ رہی ہے؟ سونیا اس کی خاموشی محسوس کر کے یک دم چپ ہوئی تھی۔ تین چار منٹ دونوں کے بیچ خاموشی رہی پھر وہ کاؤچ ...... کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''بیٹھ جاؤں؟'' عاشر جیسے ہوش میں آ گیا گہری سانس بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور خود بیڈ پر بیٹھ گیا۔ سونیا بڑی گہری نظروں سے اسے جانچ رہی تھی۔

''کیسی ہو......؟'' سونیا کو یقین تھا وہ یہی پوچھے گا۔

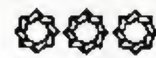
''تمہیں کیسی لگ رہی ہوں؟'' وہ نارمل ہو گئی تھی۔ چند لمحے پیشتر والا جوش مدھم پڑ گیا تھا۔

''فٹ فاٹ۔'' عاشر نے شوخ ہونا چاہا مگر کوشش ناکام رہی۔ اس کے تاثرات اور کیفیت بے نام سی ہو رہی تھی۔

''حیرت ہے......!'' سونیا بے ساختہ مسکرائی۔

''میرا دو کلو وزن کم ہو گیا ہے اور تم کو فٹ نظر آ رہی ہوں...... تم البتہ......'' اتنا کہہ کر وہ اسے سرتاپا بغور دیکھ کر پھر بولی۔

''موٹے ہو گئے ہو۔'' عاشر محض مسکرا کر رہ گیا۔
اس کے بعد دونوں کے بیچ دبیز خاموشی چھا گئی۔ عاشر قالین کے رنگوں میں تو سونیا اس کے مزاج کے اس نئے رنگ میں کھوئی ہوئی تھی۔
''ہم یوں اجنبیوں کی طرح کیوں بیٹھے ہیں؟'' اسے عاشر کی خاموشی اور سنجیدگی گھبراہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔
''تم میرے والے عاشر کو وہیں گاؤں بھول آئے ہو..... بہت بدلے، بدلے لگ رہے ہو؟'' عاشر کیا جواب دیتا۔ اپنی کیفیت سے تو وہ خود بھی نگاہیں چرا رہا تھا۔
''چلو کہیں باہر چلتے ہیں ممکن ہے جانی پہچانی جگہیں دیکھ کر تمہاری یادداشت لوٹ آئے اور تمہیں میں بھی یاد آ جاؤں؟'' وہ خفیف سا طنز کرتے ہوئے بولی۔ عاشر کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔
''ابھی یار کچھ سستی ہو رہی ہے، شام میں پروگرام بنائیں گے۔'' سونیا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کہنے کے لیے تو بہت کچھ تھا..... کئی گلے شکوے تھے، اپنی بے قراریوں کی داستانیں تھیں..... مگر مدِمقابل آج سننے کے موڈ میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔
''اوکے..... مجھے کال کر لینا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دروازہ پار کر گئی۔ عاشر ڈھیلا ڈھالا سا بیڈ پر گر گیا آج وہ واقعی سونیا سے اجنبی بن کر ملا تھا۔



شوکے کو معافی نامہ سوہنی کے گلے میں پھندا ڈال کر دیا جائے گا یہ سوہنی تو کیا ماما ریاض کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ مامی نے محض اشارہ دیا اور وہ سن کر ساکت ہو بیٹھے۔
''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' ہوش لوٹے تو وہ سرگوشیانہ انداز میں بولے۔ مامی منہ پر دوپٹا ڈالے روئے جا رہی تھیں۔
''ہو کیوں نہیں سکتا.....؟ آج تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔'' دوپٹا ہٹا کر وہ بھاری آواز میں بولیں۔ ماما تلملا کر اسے دیکھنے لگے۔
''ایسا نہیں ہوتا۔ بھلا سوہنی شوکے کی کہاں سے بہن ہو گئی جسے وہ معافی کے بدلے مانگ رہے ہیں اور میں اسے آسانی سے ونی بنا کر بھیج بھی دوں۔'' مامی کے رونے میں اور شدت آ گئی۔ ماما سوہنی کی زندگی برباد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ مامی کو شوکا پھانسی کے پھندے پر لٹکا صاف نظر آیا۔
''اب کیا ہو سکتا ہے پرلوں نے جب سوہنی کا ہاتھ مانگا ہی خود ہے اور سوہنی شوکے کے ماسے کی دھی ہے۔ بہن ہی ہوئی ناں!''
''بہن ہی ہوئی۔'' ماما نے فوراً بیوی کی نقل اتاری۔ ''اس کی چمڑی ادھیڑتے وقت یہ بہن یا ماسے کی بیٹی کا رشتہ یاد نہیں آتا تھا۔ آج جب موت سامنے نظر آ رہی ہے تو وہ بہن ہو گئی۔'' ماما کے سفاکیت سے کہنے پر وہ ..... ایک بار پھر رونے لگیں۔
''او تو تو بند..... کر اپنے بین۔'' ٹہلتے ٹہلتے وہ اچانک رک کر گرجے۔ ''ایک تو تیرے بھائی کے کرتوتوں کی وجہ سے سر پھٹ رہا ہے اوپر سے تیری ریں ریں..... چپ کر۔'' مامی اور زور و شور سے رونے لگی۔ ماما بیچارگی طاری کیے دوسری چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سوہنی کا سوچتے تو بیوی ہاتھ سے جاتی تھی اور بیوی کو راضی کرتے تو سوہنی مظلوم نظر آنے لگتی۔ وہ صحیح معنوں میں دو پاٹوں کے بیچ آ گئے تھے۔



فضا میں حبس اور اداسی رچی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ میں بھی سوز سا لگ رہا تھا۔ وہ دونوں سنگی بینچ پر یوں بیٹھے تھے جیسے آج ملے ہوں یا آج کے بعد پھر کبھی نہ ملنے والے ہوں۔ سونیا آسمان پر کچھ تلاشتے تلاشتے تھک گئی تو عاشر کی طرف دیکھنے لگی جو شاید چپ بیٹھے رہنے کی قسم کھا کر آیا تھا۔
''تم بہت بدل گئے ہو عاشر..... میرا عاشر کھو گیا ہے۔'' سونیا آزردہ ہو رہی تھی۔
''وہم ہے تمہارا۔'' عاشر نے دھیرے سے کہا۔ سونیا نفی میں سر ہلانے لگی۔

''وہم نہیں ہے..... تم واقعی بدل گئے ہو۔'' وہ زور دے کر بولی۔ ''پہلے والے عاشر تو لگتے ہی نہیں ہو..... نہ وہ شوخیاں..... نہ شرارتیں..... اور نہ.....''

''ایسا نہیں ہے سونی یار.....'' وہ اتنی بے ساختگی سے زچ ہو کر بولا کہ اسے خود بھی کہنے کے بعد احساس ہوا کہ کیا کہہ گیا ہے۔ سونیا حیرت و مسرت سے منہ کھولے اسے دیکھتی رہی۔

''سونیا سے سونی.....!'' اس کی آواز میں خوشی سے بھرپور لرزش نمایاں تھی۔

''اتنا کیوٹ سا نیم..... آہم..... مجھے اچھا لگا عاشر۔'' کچھ دیر پہلے والی پژمردگی چھٹ گئی وہ کھل کر مسکرائی تھی اس بات سے بے خبر..... کہ عاشر کی آنکھوں میں دھواں بھر رہا ہے، وہ لب کچل رہا ہے۔ جب خود پر قابو پانے میں ناکام رہا تو کھڑا ہو گیا۔ اضطراب بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا دل منوں بوجھ تلے کرلا رہا تھا۔ اس نے موبائل پاکٹ سے نکالا اور بٹن پریس کرنے لگا۔ سونیا اس کی طرف دیکھ رہی تھی کچھ مسرور..... اور کچھ تحیر میں گھری۔

عاشر نے بٹن پریس کرنا بند کر دیے۔ اس کی نظریں موبائل اسکرین پر جمی تھیں۔ چند پل وہ یونہی اسکرین کو تکتا رہا پھر اچانک ہی سونیا کی طرف بڑھا دیا۔

''کیا ہے..... مجھے کیوں دے رہے ہو؟'' وہ حیران کم پریشان زیادہ ہوئی۔

''دیکھو.....'' عاشر نے زور دے کر کہا۔ اس نے نہ سمجھتے ہوئے موبائل لے کر اس پر نظر دوڑائی اور مزید حیران ہوئی۔ موبائل اسکرین پر بہت عام سی، پینڈو نظر آتی لڑکی کی تصویر تھی جو کیمرے کے بجائے کہیں اور متوجہ تھی۔

''یہ..... یہ کون ہے؟'' بنا کوئی غلط بات سوچے وہ معصومیت سے استفسار کرنے لگی۔

''سونی.....'' عاشر نے کچھ توقف کے بعد بتا دینا ضروری سمجھا۔ سونیا کا دل بلاوجہ دھڑکا۔

''سونی.....'' وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔

اقبال کی شگفتہ مزاجی

شاعر مشرق علامہ اقبال بڑی پیاری شخصیت اور اچھی عادات کے حامل تھے جہاں آپ تمام معاملات میں سنجیدہ تھے وہاں زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حاضر جوابی اور خوش دلی عموماً روح کو بالیدگی بخشنے والے لطائف کا روپ دھار لیتی ہے۔ ایسے ہی کچھ واقعات میں سے صرف ایک ماجرا بیان کیا جا رہا ہے۔

اللہ اللہ کیجیے.....

میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں علامہ اقبال سکونت پزیر تھے۔ ان کے عقب میں قدرے گہرائی لیے ایک میدان تھا۔ اس میدان میں بارشوں کے موسم میں عموماً پانی بھر جاتا تھا۔ ساری رات مینڈک ٹرٹرا کر نیند حرام کرنے کی حد تک خلل انداز ہوتے۔ علامہ اقبال کی زوجہ محترمہ نے ان مینڈکوں کے ٹرانے کی بہت شکایت کی تو علامہ اقبال اپنی محترم بیوی کی شکایت سن کر بے ساختہ قہقہہ بار ہوئے اور فرمایا۔ ''یہ تو بڑی اچھی بات ہے، لوگ شب بیداری کے لیے کیا، کیا جتن کرتے ہیں لیکن آپ کے لیے تو قدرت نے خود ہی انتظام کر دیا ہے۔ اس لیے مینڈکوں کو برا بھلا کہنے کے بجائے۔ ''اللہ اللہ کیجیے۔''

مرسلہ: فضہ بتول، بہارہ کہو

''ہوں.....'' عاشر نے نظریں اس کے چہرے پر جمائیں جہاں خوف پنجے گاڑ رہا تھا۔ ''وہیں میرے دادا کے گھر رہتی ہے۔'' اس نے موبائل اس کے ہاتھ سے لے کر آف کر دیا۔ سونیا پر خود کو ''سونی'' کہنے کے اسرار کھلتے چلے گئے۔ ایک ٹیس سی تھی جو پورے وجود میں ابھری تھی اور بے حال کرتی چلی گئی۔ بالکل چپ..... اور ساکت..... وہ ایک ٹک عاشر کو دیکھنے لگی نہ کوئی سوال

کیا نہ جواب کی خواہش تھی کہ دونوں صورتوں میں اپنی تباہی نظر آ رہی تھی۔ عاشر کا نظریں چرانا ہی ان ہونی بتا رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا محض سوہنی کا نام اور پھر تصویر دیکھتے ہی وہ بے جان کیوں ہوتی جا رہی ہے جو وہ سوچ رہی تھی وہ غلط بھی تو ہو سکتا تھا مگر کبھی کبھی ہمارے سوچنے کے مطابق بھی ہو جاتا ہے سب...... عاشر نے یونہی نظریں چرائے...... دھیرے دھیرے سوہنی کے بارے میں اپنے دل کی کیفیت کے بارے میں، سوہنی سے کیے گئے شادی کے وعدے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور وہ...... اپنے...... بے جان ہوتے پیروں پر حیران ہوتی رہی کہ جنہوں نے اس کا بوجھ سہارا ہوا تھا پتا بھی نہیں چلا اور آنکھیں جھیلیں بن گئیں...... بند ٹوٹ گئے۔

''عا...... شر'' وہ چپ ہو گیا تھا۔ بالکل چپ اب امتحان اس کا تھا۔ سرسراتے لہجے میں اسے پکارا۔

''میں نے کہا تھا ناں...... میرے عاشر کو بھول آئے ہو...... میرا عاشر کھو گیا ہے۔'' اس کے گلوگیر لہجے میں جو درد جھلک رہا تھا وہ کسی کو بھی رُلا سکتا تھا پھر عاشر کیسے نہ تڑپتا۔

''نہیں سونیا نہیں...... مجھے اب بھی تم سے محبت ہے میں اب بھی تم سے پیار کرتا ہوں...... تم غلط مت سمجھو...... تم۔'' وہ اس کے کندھے جھنجوڑ کر، تڑپ کر بولا تھا۔ سونیا نفی میں سر ہلاتی رہی۔

''بس...... اور توہین مت کرو جو تھوڑی بہت محبت مجھ سے تھی...... اسی کی قسم مجھے اور تکلیف مت دو...... بہت دکھ ہو رہا ہے...... بہت درد ہو رہا ہے۔'' اس کے دونوں ہاتھ جھٹک کر وہ بکھر بکھر کر رو دی۔ ٹوٹ ٹوٹ کر ہچکیاں لینے لگی۔ عاشر کی پریشانی کا کوئی عالم ہی نہیں رہا وہ بے بسی سے اسے روتا دیکھتا رہا۔

''سونیا ہار گئی...... سوہنی جیت گئی۔'' وہ درد سے چور لہجے میں روتے روتے بولی تو عاشر کا اپنا آپ بھرا گیا کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر سونیا نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''آج مجھے پتا چلا ہے...... محبت مدت پر ڈپینڈ نہیں کرتی۔'' وہ شکست خوردہ تھی۔ ''محبت طویل یا مختصر نہیں ہوتی...... محبت بس محبت ہوتی ہے۔'' وہ نہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ ''سوہنی کی پندرہ دن کی محبت شاید بہت تاثیر والی تھی کہ میری دو سالہ محبت پر حاوی ہو گئی اس کی محبت کی طاقت میری محبت کی طاقت سے زیادہ نکلی۔'' وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔

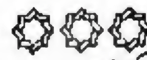
''پلیز سونیا پلیز...... میں تم سے جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' اس نے سونیا کے دونوں ہاتھ چہرے پر سے ہٹا کر اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس کے عاجزانہ انداز پر سونیا اور زیادہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔

''یہ تم اب کہہ رہے ہو ناں......!'' اپنے ہاتھ چھڑا کر وہ سسکی۔ ''سوہنی سامنے ہوتی تو نہ کہتے۔'' اس کی آواز پھر سے بھرا گئی۔ چاہ کر بھی وہ ضبط نہیں کر پا رہی تھی۔ رونا آ رہا تھا۔ خود بخود آ رہا تھا۔ آنسو بے اختیار ہو چلے تھے اور عاشر یوں کھڑا تھا جیسے سونیا کے تمام تر حقوق سے دستبردار ہو گیا ہو...... آنسو صاف کرنے کا خواہشمند...... اسے سینے سے لگا کر چپ کرانے کا خواہاں...... مگر بے بس کہ سونیا اسے خود سے دور بہت دور محسوس ہو رہی تھی۔

''اور ایک بات......'' اپنے گال بے دردی سے پونچھ کر وہ بھاری آواز میں بولی تھی۔ ''میں نے تمہیں پورے کا پورا سوہنی کو سونپ دیا ہے...... جاؤ...... اپنی محبت کی بوند بوند اس پر نچھاور کر دو...... مگر اس کے ساتھ ساتھ تم مجھ سے بھی محبت کا دعوٰی کرو یہ میں کبھی نہیں چاہوں گی...... کیونکہ تم جانتے ہو ناں۔'' وہ رخ پھیر کر پلکیں جھپکنے لگی۔ ''مجھے...... آدھی ادھوری چیزیں پسند نہیں اور نہ مطمئن کرتی ہیں...... محبت بھی مجھے مکمل چاہیے ورنہ نہیں......'' گلے میں پھنسے گولے نے آگے کے الفاظ گھونٹ لیے۔ وہ ہونٹ چبا چبا کر خود پر قابو پانے لگی۔

''آج کے بعد......'' پھر یک دم اس کے عین سامنے آ کر بولی۔ ''بھول جانا کہ کوئی سونیا نام کی لڑکی تمہاری زندگی میں آئی تھی...... میری پرچھائیں کو بھی یاد

کرنے کی جرأت نہ کرنا...... میں بھی تمہیں ایک بےاعتبار اور ہرجائی سے زیادہ یاد نہیں کروں گی۔'' اتنا کہہ کر وہ تقریباً دوڑتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔ عاشر سے قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا۔



ماں اسے زبردستی کھینچ کر باہر لانا چاہ رہی تھیں اور وہ پوری طاقت کے ساتھ انہیں جھٹک رہی تھی۔

''چل ...... بی بی پارسا...... سیدھی عزت کے ساتھ چل نہیں تو......!''

''نہیں تو کیا؟'' وہ بپھر کر پوچھنے لگی۔ انداز بے حد جارحانہ اور خطرناک ہو رہے تھے۔

''نہیں تو پھر بات منوانا مجھے آتی ہے۔''

''میرے جیتے جی تو آپ میری قسمت پر زور نہیں کر سکتیں...... میں کسی کی غلام نہیں......''

''جانتی ہوں تیرے منہ میں یہ زبان کس نے اگائی ہے؟'' وہ بولیں۔

''اللہ نے۔'' وہ دوبدو بولی تھی۔

''زبان تو اللہ نے اگائی ہے پر اس میں چابی جس نے بھری ہے اسے سارا پنڈ جانتا ہے...... چل...... تو کیا تیرا باپ بھی مانے گا۔'' ماں آخری زور آزمائی میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ اسے بالوں سے کھینچتی وہ کمرے سے باہر لے گئیں۔



جیپ دھول اڑاتے راستوں پر ڈگمگا رہی تھی۔ عاشر کے ہاتھ مہارت سے اسٹیئرنگ وھیل پر تھے مگر دماغ کہیں اور تھا۔ اس کی سماعتوں میں اب بھی دادا جانی کی چند گھنٹے قبل آنے والی کال کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''بڑی مشکل سے تمہارا نمبر ملا ہے جتنی جلدی ہو سکے آ جاؤ...... ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔ میرے علم میں لائے بغیر یہاں سونی کا گلا کاٹا جا رہا ہے۔'' وہ جو سونیا سے بچھڑنے کے غم میں ادھ موا ہوا جا رہا تھا بنا سوچے سمجھے گاؤں کے لیے چل نکلا اور اب آندھی کی طرح جیپ دوڑائے جا رہا تھا۔ جس وقت شام کے دھندلکے رات کی سیاہی اوڑھنے لگے...... اس کی جیپ گاؤں کی حدود میں داخل ہوئی تھی۔



چاچی کے سر پر جلدی سوار تھی۔ انہیں نہ جانے کیوں عجیب سا کھٹکا ہو رہا تھا۔ ان کی چھٹی حس آج کچھ زیادہ ہی جاگی ہوئی تھی سب کچھ ویسا ہی ہونے جا رہا تھا جیسا وہ چاہتی تھیں پھر بھی خوشی سے زیادہ عجیب قسم کی بے چینی انہیں گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔ مولوی صاحب بھی بس آیا ہی چاہتے تھے۔ وہ ننھے کو سلانے کے بعد دادا جان کے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھیں کہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دروازہ کھلا اور عاشر نے اندر قدم رکھا۔ چاچی کے پیروں سے زمین ہی نکل گئی اسے دیکھ کر۔

''تو......؟'' ان کے حلق سے عجیب سی آواز

باذوق

ایک نہایت بدصورت آدمی نے ایک حسینہ سے کہا۔ ''کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟''

''نہیں۔'' حسینہ نے کہا۔ ''مگر میں تمہارے ذوق کی ہمیشہ داد دیتی رہوں گی۔''

ماں

تیری تعریف اِک لفظ میں بیاں ہو نہیں سکتی
ماں تیری تعریف میں تو سارا نصاب چاہیے

مرسلہ: مسز فرح امجد، لاہور

احسان تیرا

دوستوں سے پرابلم شیئر کرنا اچھا ہوتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ مسئلے حل کرتے ہیں بلکہ کمبخت ایسے، ایسے مشورے دیتے ہیں کہ بندہ پرابلم ہی بھول جاتا ہے۔ جیو میرے دوستو!

مرسلہ: سنبل ملک اعوان، شاہدرہ

برآمد ہوئی۔

''کیا لینے آیا ہے؟'' بہت تلملاہٹ کے ساتھ انہوں نے پوچھا۔ عاشر کی آنکھوں سے شعلے پھوٹ رہے تھے۔

''سوہنی.....'' سرد وسپاٹ لہجے میں جواب دیتا وہ داداجان کے کمرے کی جانب بڑھا۔



وہ چارپائی پر کسی مورتی کی طرح بے جان و ساکت بیٹھی تھی۔ دوسری چارپائی پر داداجان اور چاچا ریاض بیٹھے تھے۔ داداجان کا باریش چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ چاچا سر جھکائے شرمندگی چھپانے میں لگے ہوئے تھے۔ تبھی اچانک دروازہ کھول کر عاشر اندر داخل ہوا۔ داداجان اسے دیکھتے ہی کھل اٹھے۔

''تو آ گیا پتر......!''

''چنگے ویلے آیا پتر۔'' چاچا ریاض اپنی شرمندگی چھپائے مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''اپنی سوہنی کی رخصتی ہے آج۔'' وہ چاچا ریاض کی طرف طیش زدہ نظروں سے دیکھنے کے بعد سوہنی کے سامنے جا بیٹھا۔

''میرے ساتھ ...... ہے ناں......؟'' اس کے لہجے کی مضبوطی اس کے ارادے کا پتا دے رہی تھی۔ چاچا گڑبڑا گئے۔ دادا مسکرا دیے۔ البتہ سر پر سرخ گوٹا کناری سے سجا دوپٹا اوڑھے ہر میک اپ اور زیورات سے عاری...... دلہن بنی سوہنی عجیب ویران، متوحش اور خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی...... اس کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ جنہیں وہ زبردستی کھول رہی تھی اور اس کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو سوہنی؟'' عاشر کو گھبراہٹ نے آ لیا۔ اس نے بے اختیار اس کے ٹھنڈے برف ہوتے ہاتھ پکڑ لیے۔

''تم ٹھیک نہیں ہو...... تم ٹھیک نہیں ہو۔''

سوہنی کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ عاشر کے ساتھ ساتھ دادا اور چاچا ریاض بھی اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

''دیکھو...... مم...... میں آ گیا ہوں، تم سے شادی کرنے، تمہیں اس زندان سے چھٹکارا دلانے کے لیے۔'' عاشر کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے سوہنی کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ عاشر کا رنگ فق ہو گیا جو وہ دیکھ رہا تھا وہ جان نکال دینے والا سچ تھا۔

''دیر کر دی تو نے۔'' سوہنی کی آواز بہ مشکل نکلی۔

''میں نے اسپرے پی لیا ہے۔''

''او...... نہیں۔'' عاشر نے بے ساختہ اپنے بال نوچے تھے۔ داداجان بری طرح سے رو پڑے اور چاچا کا بس نہیں چل رہا تھا سوہنی کے پیروں میں گر کر معافی مانگ لیں۔

''یہ کیا، کیا تم نے...... میرا یقین نہیں تھا تمہیں؟'' اس کے انداز میں ہار ہی ہار تھی۔

''تُو نے یقین دلایا ہی کب تھا...... تُو، تو...... ایک پرچھائیں تھا...... نظر آیا...... اور پھر غائب۔'' سوہنی کے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ عاشر کا دل چاہا اس کا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دے جس نے اس کا ذرا بھی انتظار نہیں کیا۔

''مگر دیکھ...... سوہنی قربانی کی بھینٹ نہیں چڑھی...... سوہنی ونی نہیں بنی۔ سوہنی......'' اس کے آگے بھی وہ کچھ بولتی مگر خون کی الٹی نے الفاظ بہا دیے...... کچھ دیر تک بے قرار رہنے کے بعد اس نے داداجان کی بانہوں میں دم توڑ دیا اور عاشر کی زندگی سے محبت نام کا جذبہ ہی فنا ہو گیا۔ داداجان، چاچا ریاض ضبط کے بند توڑے رو رہے تھے۔

وہ چند لمحوں تک سوہنی کے چہرے پر نظریں جمائے رہا بے حد ملول اور ویران نظریں...... پھر الٹے قدموں پیچھے ہٹتے، ہٹتے دیوار سے جا لگا۔ ایک ہارے ہوئے انسان کی طرح تہی دست و تہی داماں۔ جس نے قدرت کی طرف سے عطا کردہ محبت کو خود سے دور کیا...... اور وہ محبت جو اس کی نہیں ہوئی تھی...... اسے قدرت نے دور کر دیا اس جیسا کنگال بھی بھلا کوئی ہو سکتا تھا......! اپنے سامنے پڑے مجسم تلخ سچ پر بھی وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

تم یاد آؤ گی بہت....

انجم انصار

بعض رشتے کسی طرح بھی قریبی رشتوں سے کم نہیں لگا کرتے۔ بات تو عجیب سی ہے مگر یہ سچ ہے کہ قلم کاروں کا اپنے ساتھی قلم کاروں کے ساتھ اور اپنے قارئین کے ساتھ بھی ایسا ہی ایک عجیب وغریب سا رشتہ ہوتا ہے۔ ان کی خوشی، اپنی خوشی لگتی ہے اور ان کا غم اپنا غم...... اور ان کی ذات کے بارے میں ایک عجیب سی جستجو بھی رہتی ہے۔ میرے پاس آج بھی شازیہ چوہدری کے لیے کچھ اس قسم کے سوالات مصنفات بہنیں بھی کرتی ہیں اور قارئین بھی گاہے بہ گاہے فون پر پوچھتے ہیں...... شازیہ چوہدری کے بچے کس کے پاس ہیں......؟ اب وہ کون، کون سی کلاسوں میں آگئے ہیں، ان کے شوہر نے دوسری شادی تو نہیں کی یا کرلی ہوگی، ان کی والدہ بیمار تھیں اب وہ کیسی ہیں؟ وغیرہ، وغیرہ...... حالانکہ ان کا اس شہر سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے جہاں وہ لوگ رہتے ہیں۔ مگر شازیہ چوہدری ایک قلم کار تھی اور لکھنے والا دلوں اور ذہنوں پر راج کیا کرتا ہے۔

اور اب اسی طرح...... فرحانہ ناز...... اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوئی مگر ہم سب کے اور قریب آگئی...... اتنی قریب کہ اس کے چاہنے والے...... اس کے لیے رو رہے ہیں...... ایک دوسرے کو فون کرکے پُرسہ دے رہے ہیں۔ فرحانہ کے زخمی بیٹے دانیال کی صحت اور زندگی کی دعائیں نہ صرف پاکستان میں بلکہ خانہ کعبہ تک میں کی گئیں کہ ہر پڑھنے والے کو اور ہر قلم کار کو ایسا ہی لگ رہا تھا کہ یہ سانحہ خود اُن پر بیتا ہو اور فرحانہ ناز ان کی کوئی قریبی عزیزہ ہو...... اس لحاظ سے قلم کا رشتہ کتنا بڑا رشتہ ہے اور پھر یوں بھی تحریریں شیشے کی دیواریں ہی تو ہوتی ہیں تو لکھنے والے کی شخصیت اپنے قارئین سے کیسے چھپی رہ سکتی ہے اور فرحانہ ناز تو خوب پٹر، پٹر بولنے والی تھی...... اس کا جب فون آتا تو وہ خوب بولتی اور میں سنا کرتی اور بعض عادتیں تو بالکل بچوں جیسی تھیں ”پلیز، پلیز، پلیز باجی آپ نے میرا ناولٹ لگانے میں دیر بالکل نہیں کرنی۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ پاکیزہ کے لیے قسط وار ناول لکھے، میں نے اس سے کہا...... تم اپنے ناول کا ون لائنر بھجوا دو تاکہ شائع ہونے والے دیگر ناولوں میں کوئی مماثلت نہ ہونے پائے۔

”ارے...... ون لائنر تو میں دو دن میں آپ کو بھیج دوں گی...... مگر آپ پلیز وعدہ کریں...... اسے ضرور لگائیں گی۔“

...... فرحانہ ناز کی باتوں اور تحریروں میں ایک ’معصومیت‘ الہڑپن اور شوخی اور ایک اپنا پن تھا...... وہ ایک بہت خوب صورت لڑکی تھی اور اپنی خوب صورتی سے وہ خود آگاہ تھی...... اس نے مجھے بتایا بھی تھا اور شاید کہیں لکھا بھی تھا...... ”اب فرحانہ ناز ملک کا نام کچھ جانا پہچانا ہوگیا ہے لیکن اگر پھر بھی...... پھر بھی کوئی سوچ لے کہ یہ کون...... تو ان کی آسانی کے لیے آج سے...... بس کچھ عرصہ قبل تک پیاری، پیاری سی سبز بڑی، بڑی آنکھوں اور لمبے بالوں کی مالک بچی کے ننھے منے ذہن و دل کے لیے اس فخر و انبساط کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے امی، ابو بہت، بہت خوب صورت ہیں۔ ابو کی اعلیٰ پوسٹ، معاشرے اور خاندان میں اونچا مقام، لوگوں کا ان کو عزت دینا...... سر فخر سے بلند کرتا...... ینگ اور اسمارٹ سی امی کی تعریفیں اسے اپنا کارنامہ محسوس ہوتیں وہ کہتی جناب......! میری امی آج بھی اتنی ہی اسمارٹ اور ینگ لگتی ہیں جتنی ہمارے بچپن

کے وقت تھیں۔'' (اور یہ واقعی سچ ہے کہ یہ فیملی حسین ترین کہلائی جاتی ہے) فرحانہ ناز ملک کی کزن عائشہ ملک سے جب ہم نے بات کی تو انہوں نے گلوگیر لہجے میں بتایا۔ فرحانہ باجی خاندان بھر کی لاڈلی تھیں ان کی شادی اپنے چچازاد ملک بشیر احمد سے ہوئی تھی۔ اور وہ ایک بہت خوشحال اور محبت بھری زندگی گزار رہے تھے۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں بھی وہ ایک ذہین اور ایکٹو طالبہ رہی تھیں۔ ان کی ٹیچرز، مس ثمرہ اور مس تہمینہ، ان سے بہت محبت کرتی تھیں...... اور اچانک رحلت کا سن کر سب ہی شاکڈ رہ گئے۔ نکہت اور نصرت یہ دونوں بہنیں فرحانہ کی گہری سہیلیاں ہیں۔ الماس اور سلمیٰ اعوان بھی ان کی سہیلیاں ہیں۔ اس حادثے میں ان کا بھائی خاور عباس بھی جاں بحق ہوا ہے، جس کی محرم کے بعد شادی تھی۔ چھوٹی بہن ڈاکٹر۔ مہرالنسا بھی...... جو ہاؤس جاب کر کے فارغ ہوئی تھی اور پیاری سی ماں فرحت بھی...... جن کے بغیر فرحانہ نے اپنے ابدی سفر پر بھی نہیں جانا چاہا اور یہ تصور بھی کتنا روح فرسا ہے۔ جب ایک گھر سے ایک ساتھ چار جنازے اٹھے ہوں گے مگر اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر رحمٰن، رحیم اور کریم ہے اور وہی صبر دینے والا ہے۔ ہماری بھی یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرحانہ ناز ملک کے بچوں اور اس کے خاندان کے تمام لوگوں اور اس سے پیار کرنے والوں سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور تمام مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین ثم آمین بے شک آسمانِ ادب کا ایک ستارہ غروب ہو گیا ہے مگر اس کی روشنی اس کی تحریروں کے طفیل ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اب آئیں ایک نظر فرحانہ ملک کے اس انٹرویو پر ڈالتے ہیں جو پاکیزہ کے سالگرہ نمبر 2، مئی 2005ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کے سادہ سے سوالات کو اپنے شوخ و چنچل جوابات سے فرحانہ نے خاص بنا دیا تھا۔

س: پورا نام، بہن، بھائیوں میں آپ کا نمبر؟

ج: پورا نام ''فرحانہ ناز ملک'' ہی ہے، بہن، بھائیوں میں، میں پہلے نمبر پر ہوں اور ہم ماشاء اللہ چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ نک نیم میرا ''بے بی'' ہے۔ جس کو پکارنے سے میاں جانی شادی کے بعد انکاری ہو گئے۔ اس دلیل کے ساتھ کہ تمہیں بے بی پکارا تو ساری زندگی میرے لیے بے بی ہی بنی رہو گی۔''

اور اب اگرچہ وہ مجھے فرحی یا فرحی پکارتے ہیں مگر میں ان کے لیے بے بی سے کم ثابت نہیں ہوئی۔ بچوں کے لیے بھی ''بے بی ماما'' ہوں۔

س: کب؟ کہاں پیدا ہوئیں؟ موجودہ جائے رہائش......؟

ج: جناب زیادہ عرصہ نہیں ہوا...... (ہنسنا منع ہے) ڈی، جی، خان کے قریب اپنے ننھیالی گاؤں ''واہوا'' میں پیدا ہوئی۔ 7 ستمبر...... وہ عظیم دن جب مابدولت نے اس دنیا کو رونق بخشی اور پیدائش کے بعد سے آج تک ''ڈیرا پھلاں دا سہرا'' یعنی ڈی جی خان میں رہ رہی ہوں۔

س: شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ؟ بچوں کی تعداد؟ شادی کب ہوئی؟

ج: خیر سے شادی شدہ ہوں۔ 27 فروری 1998ء میں ہماری شادی ہوئی اور ماشاء اللہ دو پیارے، پیارے بچوں کی ماما ہوں۔ ملک دانیال احمد چھ سال کا ہے اور حیفہ رابیل ملک تین سال کی۔

س: آپ کی تعلیم......؟

ج: جاری ہے پیاری بہنو...... میٹرک کے بعد امی، ابو نے تب ہماری شادی کی جب شادی کے معنی بھی نہیں آتے تھے۔ ایسی بالی عمریا تھی کہ سہیلیوں اور پڑوس کی لڑکیوں کو خود سے ڈانس کے آئٹم سکھائے تھے۔ یہی نہیں گھر آئی سبھی چھوٹی بڑی ہر سائز کی خاتون و لڑکی کو لاجواب قسم کی مہندی بھی مابدولت نے لگائی تھی۔ شادی کے بعد انجوائے منٹ کم اور کتابوں میں زیادہ سر کھپایا ہے۔ آج کل ایم اے ایجوکیشن فائنل ایئر کی ریگولر اسٹوڈنٹ ہونے کے ساتھ، ساتھ پی سی ایس کے ایگزام کی تیاری بھی دل و جان سے کر رہی ہوں۔

س: پروفیشنل لائن میں ہیں یا گھریلو......؟

ج: پڑھائی کے لیے گھر سے باہر جانے کے علاوہ انتہائی گھریلو، مستقبل کا کوئی پتا نہیں۔

س: پہلی تحریر کب چھپی؟

ج: ''دل کے آنگن میں اترا چاند'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔

س: پاکیزہ میں کب لکھنا شروع کیا؟ پہلی تحریر کا نام؟

ج: پاکیزہ میں پہلی تحریر...... ''رویوں کا بوجھل پن'' اپریل 2004ء میں شائع ہوئی تھی۔

س: آپ کی اب تک لکھی گئی کہانیوں میں سے مقبول ترین تحریر کون سی تھی؟

ج: مقبول ترین شرمندہ کر دیا آپ نے تو...... اتنی مشہور ابھی نہیں ہوئی۔ ویسے پاکیزہ میں بے اعتبار بہاریں، شائع ہوئی تو ارد گرد سے کافی تھاپیاں وصول ہوئی تھیں۔

س: آپ کی اپنی نظر میں بہترین تحریر؟

ج: ساری کی ساری...... بھئی پھر شرمندہ کر دیا۔ ابھی تو آغاز ہے۔ میری تحریریں ڈائجسٹ کی دنیا میں پاؤں، پاؤں چلنا سیکھ رہی ہیں۔ جب جوان ہو جائیں گی تب شاید کوئی جھنڈے گاڑیں اور مجھے بہترین لگیں...... ابھی نہیں۔

س: کہانی کا پلاٹ بناتے ہوئے آپ کی دلچسپی کا میدان کون سا ہوتا ہے؟ شوخ، رومینٹک، سوشل یا سنجیدہ؟

ج: یہ سب کہانی کے موضوع پر ڈیپنڈ کرتا ہے، میں نے اب تک جتنے افسانے لکھے ہیں حقیقت پر مبنی لکھے ہیں۔ کچھ تلخ حقیقتیں تھیں کچھ خوشگوار، اپنے موضوع کے اعتبار سے کہانی کا پلاٹ سنجیدہ و شوخ یا رومینٹک خود سے بن گیا یا بن جاتا ہے۔ میری شعوری کوشش کا عمل دخل کم ہوتا ہے۔

س: ڈائجسٹوں میں چھپنے والی تحریریں اس کے قاری کے روزمرہ مسائل زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں؟

ج: یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ڈائجسٹ کی دنیا قاری بہنوں کے لیے پُرکشش حیثیت رکھتی ہے اور پُرکشش چیز چاہے کسی بھی انداز میں ہو، اٹریکٹ ضرور کرتی ہے۔ جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے۔ افسانے اور ناول وغیرہ گھریلو قسم کی خواتین پر مختلف انداز سے اثر انداز ہوتے ہیں اور ٹین ایجز لڑکیوں کے اذہان تک کچھ اور انداز سے رسائی حاصل کرتے ہیں۔ بہت سی خواتین افسانوں میں چھپے پیغام سے اپنی زندگی مزید بہتر گزارنے کی تگ و دو میں لگ جاتی ہیں۔ بہت سی کم عمر لڑکیاں اپنے انداز سے افسانوں کو معنی پہناتی ہیں۔ امپریسو پرسنالٹی کے ہیروز دماغ میں زیادہ گھستے ہیں اور زندگی کے مسائل حل کرنے والی باتیں کم...... بہرکیف بہت سی قاری بہنیں ایسی بھی ہیں کہ جو ڈائجسٹ کی تحریریں محض وقت گزاری کے لیے نہیں بلکہ کچھ حاصل کرنے کے لیے پڑھتی ہیں۔

س: آپ کہانی کا مرکزی خیال بناتے ہوئے کتنے فی صد سچ کی آمیزش کرتی ہیں؟

ج: جتنی بھی تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ سب سچ کی پیداوار ہیں۔ مجھے بذات خود ذہنی اختراع سے افسانے کا پلاٹ و موضوع تلاشنے کا موقع خال، خال ہی ملا ہے۔ ارد گرد ایسی، ایسی تلخ، تکلیف دہ یا پھر قدرے دلچسپ سچائیاں نظر آتی ہیں کہ خود سے افسانہ بنانے کو قلم یا ذہن مانتا ہی نہیں۔ کہانی کا مرکزی خیال سچا ہوتا ہے۔ تھوڑا بہت اسے افسانوی رنگ و روپ دینا پڑتا ہے تاکہ جن کو موضوع بنا کر ڈائجسٹ تک پہنچایا ہے وہ پڑھ کر جان کے درپے ہی نہ ہو جائیں اور مجھے جان کے لالے ایک بار پڑ بھی چکے ہیں۔ (تفصیل پھر کبھی سہی)

س: ڈائجسٹ کی دنیا میں آپ کن پرانی ادیبہ سے متاثر ہیں؟

ج: صرف ایک ادیبہ سے نہیں...... بہت سی ادیباؤں سے...... اور ان میں ''عنیزہ سید'' ٹاپ آف دا آل ہیں۔ ان کا انداز تحریر غضب کا ہے۔ آسیہ رزاقی،

رفعت ناہید سجاد، ناہید سلطانہ، عمیرہ احمد، فائزہ افتخار، ثمرہ بخاری اور نگہت سیما۔

س: ڈائجسٹ کے مصنفین کا اس معاشرے میں مقام؟

ج: ادب گزیدہ بندے تو نو لفٹ کا بورڈ لٹکائے ملتے ہیں مگر معاشرہ عزت ضرور دیتا ہے۔ دوسروں کا نہیں پتا البتہ میں اپنے حلقۂ احباب میں بحیثیت ڈائجسٹ کی رائٹر کے خاص تعریف و توصیف سمیٹ رہی ہوں۔ خصوصاً اپنے کالج میں لڑکیوں کا کلاس میں آ، آ کر پوچھنا کہ فرحانہ ناز ملک کون ہیں؟ اور پتا چل جانے پر مابدولت کو کوئی اور ہی مخلوق سمجھنا..... خاصا شرمندہ کر جاتا ہے۔ خصوصاً ہمارے محترم پروفیسر سر عبدالغفور قریشی کے توصیفی کلمات مجھے سرمایۂ حیات لگتے ہیں۔ سر کو جب پتا چلا کہ میں لکھتی ہوں تو انہوں نے میری کوئی بھی تحریر پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تب میں نے انہیں پاکیزہ میں شائع شدہ افسانہ رویوں کا بوجھل پن لا کر دیا۔ جسے پڑھ کر وہ اتنے مسرور ہوئے کہ مجھے اضافی اہمیت دینے لگے۔ یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ڈائجسٹ میں لکھنے کے باوجود بھی میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہوں۔

س: آپ نے زندگی سے کیا سیکھا؟

ج: یہی کہ یہ دنیا عارضی مقام ہے۔ آخرت میں اپنا اچھا حصہ ڈالنے کے لیے ہمیں یہاں ایک امین کی حیثیت سے رہنا چاہیے۔ زندگی کو امانت کے طور پر برتیں۔ مقصدیت اپنی زندگی کا حصہ بنائیں اور ہنسی خوشی یہاں سے چلے جائیں۔ رنگینیٔ دنیا میں کھو کر اپنا آنے والا کل پُرخار نہ بنائیں۔ یہی سیکھا ہے۔

س: فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟

ج: ویسے تو بچوں اور پڑھائی میں مگن رہتی ہوں لیکن اگر فراغت ہو تو دانیال اور حیفہ کے ساتھ ہلا گلا کرنے کے بعد ڈائجسٹ یا کچھ اور پڑھنا بہترین سمجھتی ہوں۔ مجھے ٹی وی دیکھنے کا کریز نہیں۔ خصوصاً انڈین چینلز اور ان پر دکھائے جانے والے مصنوعی ڈرامے مجھے زہر لگتے ہیں۔ ساڑی میں لپٹی پیلے میک اپ میں یرقان زدہ ناریاں، ساسیں، بہوئیں مجھے مانند روبوٹ لگتی ہیں۔ ڈائجسٹ ختم ہو گیا ہو تو ٹی وی پر ہارر یا ایکشن انگلش موویز ضرور دیکھتی ہوں۔ نہیں تو پھر بچوں کے ساتھ اچھل کود ہوتی ہے۔

س: کس قسم کا لائف اسٹائل پسند ہے؟

ج: سادگی سے بھرپور، ہنستا مسکراتا، نمود و نمائش سے پاک لائف اسٹائل خود بھی اپنانا اچھا لگتا ہے اور دیکھنا بھی اچھا لگتا ہے مگر صد افسوس زمانہ بدل گیا ہے۔ آج کل نمود و نمائش کو اعلیٰ پن تصور کیا جاتا ہے اور اس اعلیٰ پن کو دیکھ کر طبیعت الگ متلانے لگتی ہے...... بہرحال مجھے سادگی اور وقار اٹریکٹ کرتا ہے۔

س: کس مزاج کے لوگ اچھے لگتے ہیں؟

ج: جو بہروپیے نہ ہوں۔ گرگٹ جیسے اوصاف سے مبرّا ہوں۔ اندر باہر سے ایک جیسے ہوں۔ مخلص، سچے خوش مزاج، بے تکلف (یعنی اپنے جیسے) لوگ متاثر کرتے ہیں۔

س: اب تک کتابی شکل میں چھپ چکی ہیں یا آئندہ ارادے ہیں؟

ج: آئندہ ارادے ہیں، ابھی تعلیمی مصروفیات جان نہیں چھوڑ رہیں۔

س: محبت کو کہانی میں کتنی اہمیت دیتی ہیں؟

ج: محبت مختلف معنوں میں استعمال ہوتی ہے اور جس محبت کو میڈیا ہر دوسرے سین میں دکھاتا ہے۔ اس سے میں تھوڑا کنی کتراتی ہوں اور اپنی تحریروں میں صرف ضرورتاً ہی اس محبت کو دکھاتی ہوں۔ رومینس کو بلاوجہ لکھنا اور دکھانا بھی نقصان دہ ہے۔

س: آپ کی تحریروں کا آپ کی نظر میں کمزور پہلو.....؟

ج: جناب بڑا تنقیدی قسم کا ذہن پایا ہے میں نے اور میری اچھی عادت کہیں یا بری عادت...... اپنی

تحریروں کی میں خود زبردست قسم کی نقاد ہوں کوئی بھی تحریر اس وقت تک روانہ ڈاک نہیں کرتی جب تک کہ اس سے پوری طرح مطمئن نہ ہو جاؤں مگر ہر بار ہی ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ افسانہ یا ناول لگ جاتا ہے۔ تب پڑھنے پر مجھے اس میں مزید خامیاں یا کمیاں نظر آجاتی ہیں۔ یوں کہہ لیں میں کوئی بھی تحریر پڑھتی اس نقطۂ نظر سے ہوں کہ اس میں کون، کون سے کمزور پہلو ہیں اور اصلاح کیسے ممکن ہے؟ میری اپنی تحریر میں ایک سو ایک خامیاں ہیں۔ تحریر میں روانی نہیں ہے۔ برجستہ جملوں کا استعمال نہیں کر سکتی۔ منظر نگاری پر عبور نہیں۔ ذخیرۂ الفاظ کی کمی ہے۔ ''محبت'' کو بیان کرنے کے ہنر سے ناواقف ہوں اور بھی بہت ساری خامیاں ہیں، کتنی لکھوں......!

س: تین لفظوں میں اپنی خوبیاں بیان کریں؟

ج: صرف تین لفظوں میں...... ظلم ہے بھئی...... تین سو خوبیاں لکھنی ہوتیں تو بھی کم لگتیں...... کیا کروں...... میں اپنے آپ کو خوبیوں کا مرقع نظر آتی ہوں۔ (اندازہ کریں کچھ) ارے، ارے...... ناراض مت ہوں جیسی زبان ہے قلم بھی ویسا ہے۔ پھسل جاتا ہے۔ تین لفظوں میں خوبیاں بیان کرنے کے لیے مجھے خاصا مغز کھپانا پڑے گا۔ اب کون، کون سی لکھوں؟ چلیں مغز کھپاتے ہیں، ایک رخ سے دیکھوں تو...... بامروت، پُرخلوص، خوش مزاج......! اور دوسرے رخ سے دیکھوں تو...... حساس، غصیلی، غیر مستقل مزاج......!

س: لکھنے کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمے داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتی ہیں؟

ج: خاصا نمک چھڑکنے والا سوال ہے۔ اگرچہ گھریلو ذمے داریوں میں کھانا پکانا، روٹی پکانا وغیرہ کا بوجھ مجھ پر نہیں لیکن پھر بھی صفائی ستھرائی اور بچوں کے کاموں میں کافی ٹائم خرچ ہو جاتا ہے۔ بے شک کھانا نہیں پکانا پڑتا لیکن بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ تیار کرنے کے لیے چولھے کی زیارت کرنی ہی پڑتی ہے اور سب سے بڑھ کر اپنی پڑھائی کی اضافی مصروفیت۔ ان سب سے بھی بڑھ کر میری پیاری نیند...... جو دوپہر کو بھی مجھ پر حملہ آور ہوتی ہے اور رات کو بھی گیارہ بجے دبوچ لیتی ہے۔ میرے بچے رات کے گیارہ بجے تک نیند سے منہ موڑے کھیل کود میں مصروف رہتے ہیں اور میں ان کے پیچھے، پیچھے...... اگر بچے نو، ساڑھے نو بجے سو جائیں تو میں لکھنے کا کام بارہ بجے تک بہ آسانی کر لوں مگر کیا کریں کہ ایسا سہانا موقع کبھی آیا نہیں۔ بچے گیارہ بجے سے پہلے بستر کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے اور جو میں زبردستی کروں تو بستر پر لیٹ ضرور جائیں گے مگر سوئیں گے گیارہ بجے۔ یوں ان کے سونے کے بعد میری ہمتیں بھی مردہ ہو چکی ہوتی ہیں اور لکھنے لکھانے کو بھول بھال میں بھی سو جاتی ہوں۔

س: کس کے لیے لکھتی ہیں؟

ج: صرف اپنے لیے۔ لکھنے سے میرا کتھارسس ہوتا ہے۔ دلی تسکین ملتی ہے۔

س: پسندیدہ شعر......؟

اس کی اور میری ذات میں اتنا فرق تھا
مجھے بس وہ، اسے سارا زمانہ چاہیے تھا

س: پسندیدہ شخصیت......؟

ج: حضرت محمدؐ، صلاح الدین ایوبی، قائداعظم محمد علی جناح، اسامہ بن لادن۔

س: آپ کی سب سے بڑی خامی آپ کی اپنی نظر میں؟

ج: شدت پسند بہت ہوں۔

س: اگر آپ سے قلم چھین لیا جائے تو؟

ج: بلاوجہ نہ چھینا جائے۔ وجہ بتا کر چھینا جائے۔ معقول ہوئی تو نہیں لکھوں گی ورنہ ضد پر آ جاؤں گی۔ ویسے لکھنا پڑھنا مزاج کا حصہ بن گیا ہے اور اس میدان میں سب سے اونچی جگہ پر جھنڈا گاڑنا چاہتی ہوں۔

س: آپ کو گراں گزرتا ہے؟

ج: مرضی کے مطابق کوئی کام نہ ہوا ہو۔ جب کوئی غلط بات کو صحیح ثابت کرنے پر تل جائے، جھوٹے،

دو غلے، غیبت گو لوگوں کا ترقی کرنا۔ اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے والے لوگ بہت گراں گزرتے ہیں۔ شیخیاں مارنے والے بھی دونوں آنکھوں سے زہر لگتے ہیں۔

س: گھریلو زندگی پسند ہے یا سوشل؟

ج: خالص گھریلو، سوشل زندگی اپنانا مجبوری کے تحت ہے۔ ویسے گھر، پیارے گھر میں رہنا پسند ہے۔

س: میں روپڑتی ہوں؟

ج: کسی زمانے میں بہت رونی صورت ہوتی تھی۔ بات بات پر آنسو مہمان بن جاتے تھے۔ اب ویسی کیفیت تو نہیں لیکن تب روتی ہوں جب بچے بیمار پڑجائیں اور میں باقاعدہ بیمار پڑجاتی ہوں۔ مسلمانوں پر امریکی مظالم رُلانے کا سبب بنتے ہیں۔

س: اگر ارادوں سے محبت کو نکال لیا جائے تو؟

ج: زیست کے لمحے مشکل ہوجائیں گے۔

س: پاکیزہ بہنوں کے نام کوئی پیغام؟

ج: پیاری پاکیزہ بہنو...... اسلام اور پاکستان کے ساتھ مخلص رہیں۔ انڈیا کسی بھی وقت ڈنک مار سکتا ہے۔ ہندو...... مسلمان کا دوست کبھی نہیں ہوسکتا اور جب بھی کوئی تحریر پڑھیں یہ سوچ کر پڑھیں کہ رائٹر نے کچھ سوچ کر یہ پلاٹ لکھا ہوگا۔ اس میں چھپے پیغام کو سمجھیں...... نئے اور پرانے موضوعات کا الزام نہ لگایا کریں، ٹھیک ہے والسلام......!

یہ تھا فرحانہ کا نو، دس سال پہلے کا دیا گیا انٹرویو...... اور اب آئیں اپنی مصنفات اور تبصرہ نگار بہنوں کے احساسات سے آگاہ ہوتے ہیں۔

غم میں برابر کی شریک

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

فرحانہ ناز ملک کے ایکسیڈنٹ اور ان کی وفات کی خبر دل ہلا دینے والی تھی۔ والدہ، بھائی اور بہن بھی ساتھ ہی ختم ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان سب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ فرحانہ کی بیٹی اور بیٹا ابھی بہت چھوٹے ہیں ان کو سنبھالنا اور سمجھانا بہت مشکل ہے۔ ہم انسان بے بس اور بے اختیار ہیں۔ سوائے دعا کے کچھ نہیں کرسکتے...... میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ اس طرح کی خبریں میرے ذہن پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہیں، مرحومہ کے لیے بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں مگر اس وقت نہ ذہن ساتھ دے رہا ہے اور نہ قلم...... ہاں پھر بھی اتنا ضرور کہوں گی کہ فرحانہ کی تحریریں زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہیں اور ان کے شگفتہ اندازِ تحریر نے کبھی موضوع کو بوجھل یا بور نہیں ہونے دیا۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ پاکیزہ کا دسمبر کا شمارہ فرحانہ ناز نمبر ہے...... میں ان کے تمام عزیز و رشتے داروں سے یہ کہنا چاہوں گی کہ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی اور ناصر ہو...... آمین ثم آمین۔

دوست کہاں کھوگئیں؟

اقبال بانو، وہاڑی

11 اکتوبر 2014ء کو ملتان سے شام کو واپسی ہوئی اور میں عشا کی نماز پڑھ کر اٹھی تو فون کا ان باکس دیکھا تو حیا بخاری کا میسج تھا۔ پلیز آپی اگر فرحانہ ناز ملک کا فون نمبر ہے تو مجھے دے دیں۔ میں نے فوراً نمبر سینڈ کردیا پھر اس کا میسج آیا کہ خدا ایسا نہ کرتا کاش......؟ میری چھٹی حس پھڑکی...... اللہ خیر کرے......! میں نے حیا بخاری کو کال کردی...... اور یہ روح فرسا خبر سنی کہ اب فرحانہ ناز اس دنیا میں نہیں مع اپنی والدہ، بہن اور بھائی کے...... مجھے لگا کسی نے میری جان کھینچ لی ہو۔ حیا بتا رہی تھی کہ نو بجے دفنا بھی دیا گیا۔ میں نے وقت دیکھا رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ یہ کیسے ہوا؟ ابھی عید کے روز

تو اس سے میری خاصی تفصیلی بات ہوئی تھی۔ میں نے بتایا کہ میں ملتان جاؤں گی عید کے دوسرے روز تو کہنے لگی۔ پلیز آپی ڈیرا بھی آئیں۔ مگر تم تو واہوا جاؤ گی کزن کی شادی میں ہفتے کے دن...... جلدی سے بولی۔ میں نہیں جاؤں گی اگلے دن چلی جاؤں گی اور اگر میرا دل اگلے دن بھی تمہارے پاس رکنے کو چاہے تو؟ میں نے شرارت سے کہا۔ ہائے آپی...... آپ پورا ہفتہ رہیں میرے پاس...... میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ خوش ہو کر۔ نہیں بھئی میں تو مذاق کر رہی ہوں تم جاؤ ضرور شادی میں، میں ٹیپو کے ایگزام کے بعد مارچ میں آؤں گی۔ خوشی دے کر چھین لی۔ میں بات نہیں کرتی۔ مجھے یقین ہے اس نے بچوں کی طرح منہ بسور لیا ہوگا۔ کاش میں چلی جاتی اور وہ کہیں نہ جاتی، اسی دنیا میں ہم سب کے درمیان ہوتی۔ ہنستی کھلکھلاتی ہوئی ...شعر اور جوکس سناتی ہوئی۔

بہت عرصہ نہیں ہوا یہی کوئی پانچ چھ برس پہلے کی بات ہے ایک روز فرحانہ کا مجھے فون آیا۔ مجھے آپی اقبال بانو سے بات کرنی ہے ہوسکتی ہے بات؟ جی میں بول رہی ہوں ۔میں نے جواب دیا۔ آپ اقبال بانو ..... نہیں بھئی وہ جو رائٹر ہیں۔ میں وہی ہوں۔ مگر آپ کی آواز ...... فرحانہ پریشان ہوگئی۔ کیا بہت بری ہے۔ لوگ میری آواز پر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ نہیں آپی ...... مجھے یقین نہیں آرہا ...... آپ کی آواز تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی یونیورسٹی، کالج کی طالبہ ہو،آپ آواز سے نہیں لگتیں کہ آپ اتنے عرصے سے لکھ رہی ہیں۔ میری امی، خالائیں اور ممانیاں آپ کی زبردست فین ہیں۔ سچ بتائیں آپ وہی ہیں۔ دیکھو لڑکی...... رائٹر کی عمر ٹھہر جاتی ہے وہ سولہ سال سے کم اور بیس سال سے کبھی زیادہ کا نہیں ہوتا...... اور میں بھی بیس سال کی ہوں۔ میری بات پر وہ خوب ہنسی...اب مجھے یقین آگیا کہ آپ ہی اقبال بانو ہیں۔ اس طرح میری اور فرحانہ کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔ گزرے چھ برس میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے مجھے میسج نہ کیا ہو۔ صبح، صبح گڈ مارننگ اور رات کو گڈ نائٹ کا میسج ضرور وہ کرتی۔ فون پہ بات ہوتی تو خاصی لمبی گفتگو ہوتی۔ بار بار پوچھتی...... آپی آپ بور تو نہیں ہوئیں میری باتوں سے۔ ارے نہیں، میں ہنس کر کہتی۔ ایک دن کہنے لگی۔ میں نے آپ کو دیکھا ہوا ہے آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ مجھے دیکھیں؟ کیوں نہیں چاہتا...... دوستوں کو دیکھنے کے لیے مگر کیسے دیکھوں تمہیں۔ آپ نے میرا کیا خاکہ بنایا ہوا ہے، میں کیسی ہوں؟ تم بہت خوب صورت ہو...... بے ساختہ میں نے کہا تو ہنسنے لگی۔ کیسے آپ نے یہ کہا ہے؟ اس لیے کہ تمہاری آواز، تمہارا لہجہ تمہاری محبت اور خلوص ان سب باتوں کو ملاؤ تو بہت خوب صورت سی لڑکی فرحانہ ناز ملک بنتی ہے۔ مجھے سب یہی کہتے ہیں مگر آپ کی طرح کسی نے نہیں کہا۔ میں آپ کو اپنی تصویریں فون پر سینڈ کروں؟ ہاں کردو...... اور بس چند سنٹ بعد ہی اس نے مجھے اپنی بچوں کی اور میاں جی کی پندرہ تصویریں بھیج دیں جو انتہائی خوب صورت تصاویر تھیں پھر کہنے لگی آپ انہیں ڈیلیٹ کر دیجیے گا کہ ایسے ہی کوئی دیکھ لے...... اور میں نے اس کے کہنے پر وہ تصاویر ڈیلیٹ کردیں۔ کاش ایک دو سیو کر لیتی ۔ ایم اے کیا اس نے تو بہت خوش تھی اور لیکچرر بننا اس کا خواب تھا۔ اس نے مجھے کہا۔ آئیں، میں ایم اے پاس کرنے کی خوشی میں آپ کے اعزاز میں ایک شام مناتی ہوں۔ میں ہنسی...... پاس تم ہوئی ہو اور شام میرے لیے۔ وہ مجھے بہت بلاتی۔ آپ آئیں ناں...... ملتان تک آتی ہیں آگے صرف ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ میں کہتی تم ملتان آجاؤ کبھی...... مگر میرے ساتھ یہ معاملہ رہا کہ اتنی جلدی میں جاتی کہ صرف ایک رات رک کر واپس آنا پڑتا۔ دو چار مرتبہ ہوا بھی کہ میں نے فرحانہ

کو کہا کہ تم ملتان آجاؤ مگر اس کی بھی مجبوری...... اور ہم مل نہ سکے۔ دانیال نے میٹرک اچھے نمبروں سے کیا تو کہنے لگی آپی میں سب سے پہلے آپ کو یہ خوشخبری سنا رہی ہوں۔ میں نے مبارک باد دی۔ جب بھی اس کا کوئی افسانہ پرچے میں چھپتا ضرور میں رائے دیتی...... مئی 14ء میں پاکیزہ میں میرا جو انٹرویو شائع ہوا پسندیدہ نئی رائٹرز میں فرحانہ کا نام رہ گیا تو مجھ سے اس نے اتنا شکوہ کیا۔

بانو آپی! شاید میں ابھی آپ کے معیار تک نہیں پہنچی ورنہ آپ میرا نام بھی لکھتیں۔ اور مجھے دنوں افسوس رہا کہ فرحانہ ناز ملک اور صائمہ اکرم چوہدری کے نام کیسے رہ گئے کہ میں انہیں بہت شوق سے پڑھتی ہوں...... مگر اسے پتا تھا کہ ان دنوں میری طبیعت بھی خراب رہی تھی اور انٹرویو کے جواب بہت مشکل سے لکھ پائی تھی۔ پیاری فرحانہ تم بہت اچھی بیٹی...... وفا دار بیوی، اور بہترین محبت کرنے والی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی پُر خلوص دوست بھی تھیں۔ تمہاری باتیں، تمہارے مہکتے لفظ کبھی نہیں بھلائے جائیں گے۔ یقیناً اللہ نے تمہیں، تمہاری امی، بہن اور بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ دی ہوگی۔ اللہ تمہارے درجات بلند کرے، آمین۔ تمہارے ابو جی، میاں جی اور بچوں کو صبر عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔ دانیال کو صحت و تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ انجم بہت دکھ سے یہ لکھا ہے جملے آگے پیچھے ہوں تو معذرت کہ یقین کریں ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ فرحانہ چلی گئی۔ آج بھی عنیزہ سید سے بات ہو رہی تھی جب بھی بات ہو عنیزہ جی سے تو فرحانہ کا ذکر ضرور ہوتا ہے اور انجم رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ کئی بار عنیزہ سید کی آواز بھی بھرا جاتی ہے۔ بقول عنیزہ جی۔ یہ ایسا دکھ ہے جو ہم کبھی بھلا نہ پائیں گے۔ ہاں فرحانہ ناز ملک ہم تمہیں کبھی نہیں بھلا پائیں گے۔ تم ہمیشہ ہماری یادوں میں ہماری باتوں میں زندہ ہو اور زندہ رہو گی، انشاء اللہ۔

پیاری فرحانہ

رخ چوہدری، کراچی

زندگی در حقیقت ایک سانس کا نام ہے۔ سانس آئی تو اس کے ساتھ ساتھ یہ ہنگامے، مصروفیات، خواب، ہلچل اور جہاں یہ سانس رکی وہیں سب ختم...... کیسی زندگی، کیسی مصروفیت کیسے کیسے خواب اور تعبیریں، ہنگامے اور سانس بھی کسی لکھاری، کسی اچھے قلم کار کی رکے تو اس کے ساتھی رائٹرز کے قلم بھی تھم جاتے ہیں۔

فرحانہ ناز ملک ایک بہت اچھی رائٹر ہیں، میری ان سے دوستی تھی نہ بات چیت نہ جان پہچان، ہاں مسلمان اور پاکستانی ہونے کے ناسطے جو میرا ان سے بہترین رشتہ تھا وہ قلم تھا۔ اور اسی رشتے کے حوالے سے جب یہ اطلاع ملی ہے کہ ہماری پیاری ساتھی رائٹر فرحانہ ناز ایک جان لیوا حادثے کا شکار ہو گئی۔ ان کے ساتھ ان کی والدہ، بھائی اور بہن جو کہ ڈاکٹر تھی وہ سب بھی اس حادثے میں ان کے ساتھ جاں بحق ہو گئے ہیں تو یہ سن کر اس قدر دکھ ہوا کہ مجھے لگا جیسے میں فرحانہ ناز کو صدیوں سے جانتی ہوں، ان سے برسوں کی دوستی ہے جو اتنا دکھ ہو رہا ہے۔

اظہار کے لیے لفظ گونگے اور بے جان ہو گئے ہیں۔ بھری جوانی میں فرحانہ کی موت نے ان کے خاندان کو اتنا بڑا صدمہ پہنچایا ہے کہ میرا نہیں خیال یہ زخم کبھی بھر پائے گا۔ ایک ساتھ چار عزیز ترین رشتوں کی موت کا صدمہ برداشت کرنا ناممکن ہے۔ فرحانہ کی بے وقت موت ان کی فیملی اور بچوں کے لیے تو ناقابلِ برداشت ہے ہی ہم جیسے دوست احباب جو اُن کو مکمل جانتے بھی نہیں تھے ان کے لیے بھی یہ صدمہ برداشت کرنا ممکن نہیں۔ فرحانہ کے بچوں کے لیے دل بہت دکھی ہے۔ اللہ پاک فرحانہ ان کی والدہ، بہن اور بھائی کو جنت الفردوس میں بلند درجہ عطا فرمائے۔ ان کے والد، شوہر اور دوسرے بہن بھائیوں کو یہ عظیم صدمہ

برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ اور ان کے بچوں کو سلامت رکھے اور ماں کے خواب پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین، ثم آمین

سچی اور کھری لڑکی

نزہت اصغر، کراچی

11 اکتوبر 2014ء شب آٹھ بجے سدرۃ المنتہیٰ نے بذریعہ میسج ایک دلدوز خبر دی، دل یقین کرنے کو... ہرگز تیار نہ ہوا...... ابھی دوسری جگہ سے کنفرمیشن کا سوچ ہی رہی تھی کہ نیر رانی شفق کے فون نے مہر تصدیق ثبت کردی...... پھر ایک، دو، تین نہ جانے کتنے میسجز اور فون کالز آتی چلی گئیں۔ دل و دماغ سن ہو کے رہ گئے۔ گھر والے حیران پریشان کہ ایسا کیا ہوگیا۔ دو تین دن عجیب کیفیت رہی۔ میں فرحانہ ناز ملک کے پہلی اکتوبر سے گیارہ اکتوبر کی صبح تک کے آنے والے خوب صورت پیغامات پڑھتی رہی اور روتی رہی۔ ذہن نو دس سال پیچھے چلا گیا جب ماہ اگست ستمبر 2005ء میں ماہنامہ دلکش کی اشاعت کے سلسلے میں فرحانہ ناز ملک سے پہلا، پہلا رابطہ ہوا تھا اور پھر یہ رابطہ گہری دوستی اور بہناپے میں تبدیل ہوگیا۔ وہ بہت پیار سے آپی کہتی...... معصوم، الہڑ، جذباتی اور پرخلوص سی فرحانہ نے دلکش کے لیے بہت لکھا، مجھے اس کی تحریروں میں اپنی اقدار اور روایات سے جڑے رہنے کا بھرپور تاثر ملتا جو میں نے اس کی ایک کتاب کے تبصرے میں بھی لکھا تھا کہ اس کی تحریریں اپنی دھرتی سے جڑی ہیں۔ اس کے لکھے کردار اس کے بہت نزدیک اس کے آس پاس پھرتے بلکہ پڑھنے والے کو بھی جیتے جاگتے سے محسوس ہوتے...... وہ اپنے خطے کی معاصرانہ عکاسی کرنے میں ماہر ہے۔ وہ کرداروں کو خواہ مخواہ کی اڑانیں نہیں بھرواتی بلکہ عملی اور حقیقت پسندانہ رویے کے حامل کردار دکھاتی۔ اس کے لیے "تھی" کا لفظ نہیں لکھا جا رہا کیونکہ وہ اپنی تحریروں اور کرداروں کے ذریعے ہمیشہ، ہمیشہ زندہ رہے گی۔ بھری جوانی میں داغِ مفارقت دے جانے والی فرحانہ ناز نے وقت سے پہلے شاید اپنے مقاصد کو پالیا تھا۔ اس نے اپنی مختصر زندگی میں بڑے، بڑے امور انجام دے لیے تھے۔ اپنے قارئین کے لیے ایک وسیع مواد فراہم کرنے والی فرحانہ اپنے بچوں کے مستقبل کا بھی تعین کرگئی۔ جو خواب اس نے اپنے بچوں کے حوالے سے دیکھے تھے اب وہی خواب اس کے پیچھے رہ جانے والے اس کے پیارے پورا کرنے کی تگ و دو میں ہیں۔ فرحانہ ناز کے جانے کا غم تو بے شک بہت شدید ہے مگر اس کے ساتھ، ساتھ ان کی والدہ، بہن اور بھائی کے جانے کا صدمہ بھی بہت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت وہی جانے...... اس نے پہلے کتنا صبر اتارا ہوگا کہ ایک ہی خاندان کے اتنے افراد کو اپنے حضور بلا لیا۔ پروردگار عالم ان سب جانے والوں کی مغفرت کرے۔ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اس کے بچوں پر رحم خاص ہو۔ ہم تو اسے آیاتِ قرآنی کا حسین تحفہ ہی ارسال کرسکتے ہیں۔ رب کریم کے حضور دعا گو ہوں کہ ہم سب کا خاتمہ بالخیر اور ایمان قوی پر ہو۔ (الٰہی آمین)

میری سہیلی...... میری فیری

صائمہ اکرم چوہدری، اسلام آباد

فرحانہ ناز ملک سے میرے بہت سے رشتے ہیں...... ان میں سب سے مضبوط رشتہ دوستی کا، چھیڑ چھاڑ کا اور مسابقت کا تھا۔ ہم دونوں کا تعلق بہت پرانا تھا۔ سترہ، اٹھارہ سال پہلے جب سیل فون اتنا عام نہیں تھا، فرحانہ کا مجھے قلمی دوستی کے لیے ایک شرارتی سا خط موصول ہوا۔ قلمی دوستی سے شروع ہونے والی دوستی آہستہ، آہستہ پی ٹی سی ایل فون سے سیل فون تک آن پہنچی...... بچوں کے لیے لکھتے، لکھتے ہم دونوں افسانہ نگاری کے میدان میں اتر آئے۔ 2008ء میں میرا پاکیزہ میں بند مٹھی میں سلگتی ریت اور اس کا نوائے زیست سلسلے وار ناولٹ تقریباً اکٹھے ہی شروع ہوئے۔ ہم دونوں میں سے

کسی ایک کا بھی ناولٹ یا ناول ڈائجسٹ میں چھپ جاتا تو دوسرے کو ٹینشن ہو جاتی کہ میں پیچھے رہ گئی ہوں، میرا ایک ڈائجسٹ میں سلسلے وار ناولٹ، دیمک زدہ محبت شروع ہوا تو اس نے ایک اور جگہ سلسلے وار ناول لکھ کر بدلہ چکا دیا..... ہم دونوں اکثر اس بات کو تسلیم کرتے اور ہنستے تھے۔ گھنٹوں سیل فون پیکجز پر باتیں ہوتیں اور دنیا جہان کے گناہ بخشوائے جاتے..... فرحانہ بہت سادہ دل، حساس، مخلص اور بہت جلد دوسروں پر اعتبار کرنے والی لڑکی تھی۔ اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے چھوٹی، چھوٹی باتوں پر خفا ہو جاتی اور اکثر بہت عرصے کے بعد بتاتی کہ میں اس وجہ سے ناراض تھی۔

اپنی زندگی کی چھوٹی، چھوٹی باتیں، دکھ اور خوشیاں شیئر کرنے کی عادت تھی اسے..... اپنی ازدواجی زندگی سے بہت مطمئن تھی اور اکثر اپنے میاں اور اپنی ماں کی بہت تعریف کرتی تھی۔ بچوں کی چھوٹی سی تکلیف بھی اسے بے چین کر دیتی، دانیال، حیفہ اور عبداللہ تینوں میں اس کی جان تھی۔ عبداللہ کے جسم پر خسرہ کے دانے نکل آئے اور وہ اس وجہ سے بہت دن اپ سیٹ رہی۔ دانیال نے میٹرک میں اچھے نمبر لیے تو بالکل بچوں کی طرح خوش ہو کر اس کے مستقبل کی پلاننگ کی۔

ہم دونوں میں چھیڑ خانی کا سلسلہ اکثر چلتا رہتا تھا۔ ایک دن میں نے یونہی اس سے پوچھا۔ ''فرحانہ سچ، سچ بتاؤ، تمہاری عمر کتنی ہے؟'' اس نے شرارت سے جواب دیا ''چوبیس سال.....'' جسے سنتے ہی میں تڑپ اٹھی۔ ''خدا کا خوف کرو فری، اب تو دانیال نے بھی میٹرک کر لیا ہے، اگر اس کی عمر پندرہ سال بھی ہو تو کیا تم نے نو سال کی عمر میں اسے پیدا کیا تھا۔'' میں نے جلدی سے انگلیوں پر حساب کتاب کر کے اسے جتانے کی کوشش کی تو وہ ہنستی چلی گئی۔

''میرے اماں، ابا نے میرا بیاہ بھی تو میٹرک کے بعد کر دیا تھا۔'' اس نے مجھے شوخی سے مطمئن کرنے کی کوشش کی..... اس نے بہت سال جوائنٹ فیملی سسٹم میں بڑی مطمئن زندگی گزاری۔ کچھ سال پہلے ہی علیحدہ گھر لیا تو اسے سجانے میں مگن ہو گئی۔ اپنا کیریئر بنانے کی دھن تھی اسے، جہاں کہیں گورنمنٹ جاب کا ایڈ دیکھتی تو فوراً اپلائی کر دیتی۔ ایم اے اردو کے دوران اکثر وہ گائڈ لائن لینے کے لیے کال کرتی اور ہم دونوں کتابوں کو چھوڑ کر ایک دفعہ پھر ناولز پر شروع ہو جاتے۔ ایک گھنٹے کے بعد فرحانہ کو یاد آتا کہ اس نے کال کس لیے کی تھی۔ اپنی چیزوں اور اپنے رشتوں کے معاملے میں بہت شدت پسند تھی ان کو شیئر کرنا اس کے لیے بہت تکلیف دہ امر ہوتا تھا، مجھ سے اکثر گلہ کرتی تھی کہ تم نے نئی، نئی فرینڈز بنالی ہیں اور اب مجھے اگنور کرتی ہو اور میں اس کے معصومانہ شکوؤں کے جواب میں ہنستی رہتی..... ہمارے درمیان جتنی بھی لڑائیاں یا اختلافات ہوتے، ہم لوگ ہر صبح کو گڈ مارننگ کا میسج کرنا ایک دوسرے کو نہیں بھولتے تھے۔ بہت سالوں سے یہی روٹین تھی۔

وہ بہت چھوٹی، چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتی تھی اور اس وجہ سے اس کی راتوں کی نیند اڑ جاتی تھی۔ لکھنے کے معاملے میں بہت کریزی تھی۔ اس کے پاس بے شمار ادھوری کہانیوں کا ایک اسٹاک تھا۔ آج کل اس پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ تمہارا ٹی وی پر سیریل آیا ہے اور جب تک میرا نہیں آئے گا مجھے سکون نہیں آئے گا۔ انہی کوششوں میں اپنی کہانیوں کے مختلف آئیڈیاز مختلف پروڈکشن ہاؤسز کو بھیج رہی تھی۔

ایک ڈائجسٹ میں اس کا سلسلے وار ناول شامِ آرزو چل رہا تھا، اس کے لیے وہ بہت فکر مند تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ اسے جلد از جلد مکمل کر لے۔ میں جب بھی اسے میسج کر کے پوچھتی کہ کیا ہو رہا ہے..... اس کا فوراً جواب آتا۔ شامِ آرزو مکمل کر رہی ہوں۔ مجھے تو اس وقت گمان تک نہیں تھا کہ

وہ ساتھ، ساتھ اپنی زندگی کے دن بھی مکمل کر رہی ہے۔ اس کی عمر کے خیمے بھی اکھڑنے والے ہیں۔

اسے لوگوں کے بدلتے ہوئے رویے اور منافقت سے لبریز باتیں بہت پریشان کرتی تھیں، وہ اب بار ہا کہتی تھی کہ میں نے رائٹرز سے اپنے رابطے بہت کم کر دیے ہیں۔ لوگ ویسے نہیں ہوتے جیسے نظر آتے ہیں...... کسی زمانے میں اس کا سب ہی رائٹرز سے بہت رابطہ رہتا تھا جو آہستہ آہستہ اس نے محدود کر دیا تھا۔ کچھ گھریلو ذمے داریوں کی وجہ سے اسے ٹائم بھی کم ملتا تھا...... اس کے والد صاحب بیمار ہوئے تو ان دنوں بہت زیادہ ٹینس تھی۔

اسے اپنی بیٹی حیفہ سے بہت محبت تھی...... اس کے اسٹائل، اس کی باتیں اکثر شیئر کرتی۔ اکثر فخریہ لہجے میں بتاتی کہ حیفہ تو اب میرے جتنی لمبی ہوگئی ہے۔ اس کا بڑا بیٹا دانیال اس کے ساتھ کھڑا ہوتا تو وہ ماں اور بیٹا کم اور بہن بھائی زیادہ لگتے تھے۔ خاور اس کا بہت لاڈلا بھائی تھا اور کرن سے اسے بہت پیار تھا۔ کرن (مہرالنسا) ہاؤس جاب کر کے واپس آئی تو ان دنوں وہ بہت خوش تھی۔ اسے اپنے بچوں کی شادیاں کر کے ینگ سی ساس کہلانے کا بڑا شوق تھا۔ اکثر کہتی تھی دانیال اب ینگ ہوگیا ہے، اب جلدی سے اس کی شادی کر دوں گی۔

ایک دفعہ اس نے فیس بک پر اپنی آنکھوں کی تصویر شیئر کی تو میں نے شرارت میں نیچے ایک شعر لکھ دیا۔

مے کدے سے جو بچ نکلتا ہے
تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے

فرحانہ ناز ملک کے ساتھ میرا اٹھارہ، انیس سال رابطہ رہا۔ بے شمار یادیں ہیں لیکن دل غم سے لبریز ہے اور انگلیاں مزید لکھنے سے انکاری ہیں۔ دو دفعہ اس کے میاں سے بات کر چکی ہوں، ابھی تک دل و دماغ اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ میری دوست، میری سہیلی، وہ زندہ دل، شوخ لڑکی جس کی آنکھوں میں زندگی سے بھرپور چمک تھی، وہ دنیا سے جا چکی ہے...... جس کو لگتا تھا اسلام آباد کی سڑکیں بہت خونی ہیں۔ جنھوں نے ہم سے پروین شاکر اور شازیہ چوہدری کو چھین لیا، اس سادہ دل کو معلوم ہی نہیں تھا، سڑکیں خونی نہیں، موت بے رحم ہوتی ہے۔ وہ خوب صورت لفظ تخلیق کرنے والی فرحانہ کو ڈی جی خان میں بھی ہم سے چھین سکتی ہے۔

مجھے تو اس کے جانے کے بعد علم ہوا کہ وہ تو بہت سے دلوں پر حکمرانی کر رہی تھی، بے شمار لوگ تو مجھ سے ہی تعزیت کر چکے ہیں تو اس کے گھر میں کتنے چاہنے والے پہنچے ہوں گے۔ اس کے بوڑھے باپ پر کیا قیامت ٹوٹی ہوگی۔ اس کی بہن شبانہ کو کس، کس نے دلاسا دیا ہوگا۔ حیفہ کو کس، کس نے پیار کیا ہوگا؟ عبداللہ اتنے لوگوں میں اپنی ماما، اپنی نانی، اپنی کرن آنی اور خاور ماموں کو ڈھونڈتا ہوگا یہ سارے لوگ جو موت کی چادر اوڑھ کر ایک ساتھ ہی سو گئے۔ کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا، شادی میں شرکت کرنے کے لیے جانے والے یہ پیارے لوگ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

اللہ تعالیٰ فرحانہ، اس کی امی، بہن اور بھائی کی مغفرت فرمائے، ان سب کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ اس کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ اس کے بیٹے دانیال کو زندگی اور صحت دے، آمین۔

تجھ کو کس پھول کا کفن دیں ہم
تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں
آئینے جس کو ڈھونڈتے تھے خود
ایسا بے مثال عکس گر تھا وہ
سارے کانٹے سمیٹ لیتا تھا
ایسا انمول ہم سفر تھا وہ
اپنے دل میں سنبھال کر اس کو
آج ہاتھوں سے کھو رہے ہیں اسے

ہچکیاں بندھ گئی ہیں لفظوں کی
آئینہ خانے رو رہے ہیں اسے
اس کو کس روشنی میں دفنائیں
اس کو کس خواب کا بدن دیں ہم
وہ جو خوشبوؤں میں ڈھل گیا یارو
اس کو کس پھول کا کفن دیں ہم

آہ فرحانہ ناز ملک

نسیم آمنہ، کراچی

ہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہانی بُننے والے خود کہانی بن جائیں۔ ایک المناک داستان کے امر کردار۔ سوچتی ہوں تو دل بوجھل ہوا جارہا ہے۔ فرحانہ ناز ملک میری پسندیدہ ترین رائٹرز میں سے ایک تھیں۔ پسندیدہ نہ بھی ہوتیں تو بھی یقیناً قلم کے رشتے کے حوالے سے دل کے بہت قریب تھیں۔ کوئی گفتگو نہ رابطہ نہ ملاقات مگر تحریر کا رشتہ سارے فاصلے مٹا دیتا ہے۔ کسی ڈائجسٹ میں کوئی کہانی پڑھتے وقت اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تحریریں دل چھو لیتی ہے کہ بے اختیار ایک بار صفحات پلٹ کر دوبارہ سے رائٹر کا نام دیکھنے پر مجبور کر ڈالتی ہے اور فرحانہ ناز ملک کی تحریر پڑھ کر تو میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوا ہے۔ اور ہر بار میں نے سوچا تھا ''اوہ...... تبھی'' فرحانہ ناز ملک یوں اچانک بچھڑ جائیں گی۔ ایسا کس نے سوچا تھا۔ ان کے گھر والوں کا خیال آتا ہے تو تسلی کے الفاظ کمزور پڑنے لگتے ہیں۔ ان کی اور ان کی تحریروں کی کمی یقیناً ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔

مل کر روتے ہیں

اختر شجاعت، کراچی

شام غم بھگوتے ہیں
آؤ مل کر روتے ہیں
بہنوں کی محفل پڑھتے، پڑھتے آخر میں محترمہ

فرحانہ ناز ملک کے حادثے کی خبر پڑھی تو لگا سر پر بم گر گیا۔ کچھ حادثے، سانحے اتنے اچانک رونما ہوتے ہیں اور اس قدر تکلیف دہ ہوتے ہیں کہ ہمارا ذہن اس کو قبول کرنے سے انکاری ہوتا ہے۔

میں کیسے یقین کرلوں کہ ہماری پیاری سی رائٹر اور بہترین تحریروں کی خالق اب اس دنیا میں نہیں رہی...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہوں اور کیا لکھوں...... کہ الفاظ کھو گئے ہیں۔ حادثہ اس قدر دل دہلانے والا ہے کہ اس میں ایک ساتھ ان کی فیملی کے اور ممبرز بھی جاں بحق ہوگئے...... اللہ تعالیٰ ان کے بیٹے کو صحت و تندرستی عطا فرمائے اور ان کی فیملی کے دیگر لوگوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آج ہم ان کی بہترین تحریروں سے محروم ہوگئے...... ان کی کمی شاید ہی پوری ہوسکے...... بس اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرحانہ ناز ملک کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ موت ایسی چیز ہے جس کے سامنے ہم سب بے بس ہیں۔

بیتے ہوئے پل لوٹ کر نہیں آتے
یہی سب سے بڑا قصور ہے زندگی کا

فرحانہ ناز ملک کے لیے

یہ سطور پاکیزہ کے سالگرہ نمبر اپریل 2006ء میں پاکیزہ کی ایک تبصرہ نگار مہتاب خان نے کراچی سے بھیجی تھیں۔

تو میرا کچھ نہیں لگتا مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں
سب ضدیں اس کی میں پوری کروں ہر بات سنوں
ایک بچے کی طرح ہی اسے ہنستا دیکھوں
بند کر کے میری آنکھیں وہ شرارت سے ہنسے
بوجھے جائے گا میں ہر روز تماشا دیکھوں

محبت کا استعارہ

عالیہ حرا، کراچی

ہائے...... اِک اور نقصان، اِک اور خسارہ......

اب فرحانہ ناز ملک...... اُف...... اسے مرحوم لکھنا...... آہ...... تو کیا اب ہم اس کی زندہ جاوید، ہنستی مسکراتی دلوں کو گرماتی، جذبوں کو گدگداتی تحریریں نہیں پڑھ سکیں گے۔ یہ احساس ہی سوہانِ روح ہے۔

زندگی نے کیسا مرثیہ لکھا ہے ان کی زندگی کے نام...... دل یقین ہی نہیں کرتا...... ایسے لوگ کیسے مرجاتے ہیں۔ طاہر صاحب کا ٹیکسٹ آیا تھا۔ میں دم بخود سیل کی اسکرین دیکھے گئی۔ لفظ ابھرے پھر اندھیرا...... پھر اک اور ٹیکسٹ ابھرا۔ یقین و بے یقینی کی زمین پر یقین نے پنجے گاڑھ دیے۔ فرحانہ ناز اب ہم میں نہیں رہیں۔

آنکھوں سے آنسو اور دل سے کراہ نکلی...... دل یقین نہیں کر پارہا تھا۔ موت کو اس ماں پر بھی رحم نہ آیا کہ اس کے بغیر اس کے بچے کیسے جئیں گے۔ پاکیزہ کے صفحات پر اب ان کی نئی تحریر نہیں جھلملائے گی۔

شازیہ چوہدری کی جواں مرگی کا دکھ تازہ تھا کہ اب...... تم ہم فرحانہ ناز ملک...... تم کیسے اس جہاں میں رہو گی اپنے بچوں کے بغیر...... آنسو ہیں کہ تھمتے نہیں...... دل ہے کہ صبر نہیں آتا۔ فرحانہ ناز ملک کی تحریروں کا بے ساختہ پن، ان کی تحریروں میں زندہ ہے۔ ان کی بے ساختہ دلوں کو مہمیز کرتی تحریریں دلوں پر ان مٹ نقش تحریر کرتی تھیں۔ پڑھنے والا اِک محبت بھرے ماحول کے دائرے میں رہتا۔ یہ دائرہ سکڑتا، سمٹتا اور پھیلتا ہے۔ پڑھنے والا مسحور ہوتا جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں باسی پھولوں کی مہک بھی ہے اور چنبیلی کی تازگی بھی...... چاندنی کا حسن بھی ہے۔ سورج کی تابناکی بھی اِک جلترنگ ہے اور اسے محسوس کرنے کو میں ان کی تحریریں پڑھتی تھی۔

اِک دفعہ فرحانہ نے مجھے کہا تھا کہ مجھے آپ کی تحریریں بہت پسند آتی ہیں مگر تم کیا جانو فرحانہ تمہاری تحریروں کا کون، کون دیوانہ تھا۔

محبت کی کہانی لکھتے لکھتے تم کہاں جا سوئیں...... جہاں کوئی پیامبر نہیں جاتا۔ کوئی خط نہیں جاتا۔ سوائے دعاؤں کے تحفوں کے...... کتنی دعاؤں کے میسج تمہاری طرف رواں ہیں۔ آنسوؤں کے ہچکیوں کے...... اداسیوں کے تم وصول تو کرتی ہو مگر جواب نہیں آتا...... تم سے محبت کرنے والے یہاں اداس ہیں اور تم اُدھر دور آسمانوں پر چپ سادھے انگشت بدنداں ہو یہ کیا ہوا......؟ یہ کیا مشیتِ ایزدی ہے؟ کوئی نہیں جانتا، ناگہانی جواں مرگی بھلائے نہیں بھولتی۔

خدا فرحانہ کے درجات بلند کرے، ان کے بچوں کو صبر دے، اس دکھ کو برداشت کرنے کا اور ہمارے دلوں کو بھی قرار دے۔

آنسو رکتے نہیں
درد مسلسل ہے جو تھمتا نہیں
آہ......

ہر دل عزیز استعارہ شازیہ چوہدری...... اور اب تم......
کیسے بھلا پائیں گے تمہیں!

بچھڑا کچھ اس ادا سے

آمنہ حماد، کراچی

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

موت...... ایک ایسی حقیقت ہے جس کو ہم بھی بدل نہیں سکتے...... پلٹ نہیں سکتے...... لیکن پھر بھی ہم اس سے خوفزدہ رہتے ہیں...... کچھ حادثے ایسے ہوتے ہیں جن کو کبھی ذہن قبول نہیں کرپاتا شاید اس لیے کہ وہ لوگ جن کے ساتھ حادثہ پیش آتا ہے وہ دل کے بہت قریب ہوتے ہیں...... صائمہ اکرم کے میسج سے مجھے فرحانہ ناز ملک کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر ملی تو ذہن جیسے بالکل سن ہوگیا۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوا...... حالانکہ میری فرحانہ ناز ملک سے بہت زیادہ بات چیت نہیں ہوئی شاید دو تین دفعہ ہی

سرسری سی بات کہانیوں کے حوالے سے ہوئی ہے لیکن ان کی تحریروں کے ذریعے ہی ایک تعلق...... ایک رابطہ بن گیا تھا۔ ان کی تحریریں ہمارے ذہن میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

ہم کہ اس خاک سے تخلیق ہوئے
خاک کا رزق بنیں گے اِک دن
خاک کا روپ ہیں ہم خاک ہمارا ورثہ
جادۂ خاک کہ جس کا نہ ازل ہے نہ ابد
زادۂ خاک ہیں جب چاپ بکھر جائیں گے
ہم کہ اس خاک سے تخلیق ہوئے

ہنستی مسکراتی لڑکی

پروفیسر شیریں سلیم، لاہور

حسبِ عادت سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھی اور جب آخری صفحے پر پہنچی تو فرحانہ ناز کے انتقال کی خبر پڑھی...... آہ...... ابھی تو ہم شازیہ چوہدری کی حادثاتی موت کو نہیں بھول پائے تھے کہ ایک ہنستی مسکراتی لڑکی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوگئی...... بے شک وہ اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور پاکیزہ کے قارئین تو اس کا نام کبھی بھول نہیں پائیں گے بس اس کے لیے دعا ہی کرسکتی ہوں اللہ اس کی مغفرت کرے، اس کے درجات بلند ہوں اور اس کے بچوں کو اپنی عافیت میں رکھے، آمین۔

فرحانہ کی کتابیں شائع کی جائیں

خالدہ نسیم، لندن

یہ انسانی فطرت ہے...... کہ ماحول کے اثرات اس پر مرتب ہوا کرتے ہیں، اگر کوئی خوشی کی تقریب میں جاتا ہے...... تو اس کی تیاریوں میں خوشیوں کے رنگ ہی کھلے ہوتے ہیں۔ فرحانہ کیا کچھ سوچ کر شادی کی تقریب میں جارہی ہوگی...... اپنے ڈریس، اپنی جیولری...... سب کا اسے خیال ہوگا...... اور جب خون میں لتھڑی لاشیں گھر پہنچی ہوں گی...... تو کیسا روح فرسا منظر ہوگا...... اللہ ہم سب کو خوشی کو خوشی کی طرح اور غم کو غم کی طرح منانے کی توفیق دے۔ بے شک وہ ہر شے پر قادر ہے جو دکھ دینے والا ہے وہی صبر بھی دینے والا ہے اللہ تعالیٰ فرحانہ کی فیملی کو صبر عطا فرمائے اور اس کی بکھری تحریروں کو اکٹھا کیا جائے اور انہیں کتابی صورت میں لایا جائے...... اس کی کتابیں اس کا نام ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

آہ میری بہن فرحانہ ناز

مس امینہ عندلیب، سلانوالی

12 اکتوبر (اتوار) تین بج کر پانچ منٹ پر اسپتال میں باجی انجم انصار کا دل دہلا دینے والا میسج ملا۔ رائٹر فرحانہ ناز کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ باجی جان کو فون کیا۔ باجی یہ کیا ہوگیا...... کیسے......؟ فرحانہ ناز کی ڈیتھ؟ باجی انجم انصار کی آنکھیں اشکبار، آنسوؤں سے بوجھل لہجہ۔ ہاں بیٹا، فرحانہ ناز، والدہ، بھائی، بہن ایکسیڈنٹ میں وفات پاگئے ہیں۔

میں نے فون بند کیا اور اتنا روئی پھر باجی انجم انصار کو فون کیا۔ باجی نے کہا۔ سب نے جانا ہے۔ ہاں موت تو حقیقت ہے پر ہمارے درمیان سے اپنا پیارا یوں اچانک چلا جائے یقین نہیں آتا، نہ چاہنے کے باوجود نہ صرف یقین بلکہ صبر کرنا پڑتا ہے، فرحانہ ناز کی موت ناقابلِ یقین لگتی ہے۔ ان سے دل کا رشتہ تھا۔ بہت اچھی رائٹر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی تبصرہ نگار بھی تھیں۔ بچوں کو ماں کی آغوش، ٹھنڈی چھاؤں کی ضرورت تھی۔ ایک ہی خاندان کے افراد کی اچانک موت ناقابلِ برداشت حادثہ ہے۔ کچھ سال پہلے پاکیزہ میں فرحانہ ناز کی تصویر لگی تھی۔ بڑی، بڑی گہری آنکھیں، کڑھائی والا سوٹ، ہاتھوں میں چوڑیاں، چہرے پر دلکش مسکراہٹ، آنکھوں کے سامنے ہے، نہ صرف مجھے بلکہ میرے تمام عزیز و اقارب کو دلی دکھ ہوا۔ جس نے بھی سنا ڈی جی خان عزیز و اقارب بہن بھائیوں سے رابطہ کیا۔ حادثہ ہوا

ہے ایک ہی گھر کے چار افراد وفات پاگئے۔ کچھ پتا ہو کس بلاک میں؟ ڈی جی خان اتنا بڑا شہر ہے۔ بہن، بھائی، بھتیجی، باجی، کزنز کو فون کیے ان کے آس پاس فرحانہ ناز ملک کا گھر نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ فرحانہ ناز، والدہ، بہن، بھائی تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین) فرحانہ ناز کے زخمی بیٹے کو اللہ تعالیٰ جلد از جلد شفائے کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ فرحانہ، تم ہمیشہ میری دعاؤں میں رہوگی۔ تم تو پلٹ کر نہیں دیکھوگی نہ تم لوٹ کر آؤ گی۔

رنج کتنا ہی کریں ان کا زمانے والے
جانے والے تو نہیں لوٹ کر آنے والے

ایک پیاری سی لڑکی

مسز عظمیٰ خورشید، لاہور

فرحانہ ناز ملک سے میری وابستگی اس کی تحریروں کے حوالے سے تھی۔ وہ مجھ کو اکثر ایس ایم ایس کیا کرتی تھی...... چھوٹی، چھوٹی نظمیں بھی بھیجا کرتی تھی...... جس طرح اکثر اس عمر کی لڑکیوں کو شوق ہوا کرتے ہیں۔ میں اس کے خوب صورت میسجز کو پڑھ کر مسکرا دیتی تھی...... مگر کبھی اس کے میسجز کا جواب تک نہیں دیا اور نہ ہی اس نے بھی یہ کہا...... مگر جب اس کی حادثاتی موت کا پتا چلا تو میں تو شاکڈ رہ گئی اور اتنا روئی کہ چپ ہونا مشکل ہوگیا میں تو ابھی تک اپنے پیارے بیٹے کی حادثاتی موت کے غم سے باہر نہیں آسکی ہوں کہ ہر وقت وہی آنکھوں میں سمایا رہتا ہے اور جب اس کے گھرانے سے ایک ساتھ ایک نہیں چار جنازے نکلے ہوں گے تو اس کے گھر والوں، عزیز و اقارب کا کیا حال ہوا ہوگا...... میرے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یا اللہ ان سب کی مغفرت کرنا، ان سب کے درجات بلند کرنا...... اور ان کے گھر والوں کو صبرِ جمیل عطا فرمانا، آمین۔

اتنی کم عمری میں ... اتنا نام

شگفتہ شفیق، کراچی

فرحانہ ناز ملک میری فیورٹ رائٹر تھی اور میں باقاعدگی سے ان کی تحریریں پڑھا کرتی تھی کہ ان کا یہ وصف تھا کہ پڑھنے والا کبھی ڈپریشن کا شکار نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی ان کی تحریروں میں بوجھل پن تھا۔ میں کسی بھی رسالے میں فرحانہ ناز کا نام دیکھ کر اسے سب سے پہلے پڑھا کرتی تھی اور اب مجھے یقین نہیں آرہا کہ اتنی کم عمری میں اتنا نام کمانے والی رائٹر ہم سے جدا بھی ہوگئی...... بے شک موت کا ذائقہ ہر ایک نے چکھنا ہے کسی نے پہلے کسی نے بعد میں...... مگر اپنی زندگی میں کچھ کر دکھانا ہر کسی کو نہیں آتا...... مگر فرحانہ ناز ملک اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہے گی...... اللہ تعالیٰ اس کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

پھولوں کی طرح

نوشین ساجد، لاہور

اچھے لوگوں کے بارے میں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ پھولوں کی طرح ہوتے ہیں۔ خوشبو کی طرح ہماری سانسوں میں مہکتے ہیں اور بادِ صبا کی طرح ہمارے اردگرد بستے ہیں۔ ستاروں کی طرح ہمیں راستہ دکھاتے ہیں۔ ان سے ہمارا تعلق شبنم کی طرح ہوتا ہے۔ وہ سرگوشیوں کی طرح زندگی گزار کر آنسوؤں کی طرح ہم سے جدا ہوجاتے ہیں۔ ہمیں ان کی قدر اُن کے جانے کے بعد ہوتی ہے اور پھر ہم ہجر کے موڑ پر مدتوں صدائیں دیتے رہتے ہیں لیکن وہ پھر لوٹ کر نہیں آتے...... فرحانہ سے وابستگی صرف تحریری طور پر تھی مگر تحریریں بھی تو آئینہ ہوتی ہیں۔ اس کی تحریریں لوگوں میں پسند کی گئیں مگر آنے والے وقت میں وہ مزید پسند کی جائیں گی اور اس کا نام پھولوں کی طرح سب کو مسحور کرے گا، انشاء اللہ۔

ایک اچھی رائٹر

مہوش مشعل،احمد پور شرقیہ

فرحانہ ناز ملک ایک اچھی رائٹر تھیں.....جن کی تحریروں میں رنگ اور خوشی نظر آیا کرتی تھی۔ ان سے صرف تحریری رشتہ تھا مگر مجھے ایسا صدمہ ہوا ہے جیسے وہ میری قریبی عزیزہ ہوں۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ان کے بچوں کو سلامت رکھے اور ان کو ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے، آمین۔

فرحانہ ناز ملک

شبنم توصیف،راول پنڈی

بہنوں کی محفل پڑھتے ہوئے جب اچانک فرحانہ ناز ملک کے انتقال کی خبر پڑھی تو یک دم لرز کر رہ گئی۔ مجھے فرحانہ کی تحریریں بے حد پسند تھیں۔ اور کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ یک دم موت کا بلاوا کسی کا بھی آسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

دلکش انداز

تسنیم ماہ پارہ،کراچی

آہ فرحانہ ناز سچ ہے کہ دنیا فانی ہے اور حادثات سے اللہ سب کو بچائے، آمین۔ فرحانہ کی تحریروں میں سادگی، سچائی اور روانی تھی اور وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دلکش انداز میں تحریر کیا کرتی تھی۔ مجھے ان کے ناولٹ بہت پسند آتے تھے۔ تم سنگ نہیں دوگے.....تو بہترین تھا۔ پاگل دل میرا بھی یادگار رہے گا۔ اللہ ان کے گھر والوں کو صبر عطا فرمائے اور فرحانہ کے درجات بلند کرے، آمین۔

پیارے لوگ

صائمہ سجاد بنگش،کوہاٹ

ستارے زمین پر نہیں رہا کرتے
لوگ پیارے ہمیشہ نہیں رہا کرتے

لوگ مر جاتے ہیں لیکن رائٹر ہمیشہ اپنی تحریروں میں زندہ رہتا ہے اور فرحانہ ہمارے ساتھ بہت سی اچھی یادوں کی صورت امر رہیں گی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ آپ کو اُس جہان کی خوشیاں دے، یہ دنیا تو بس فانی ہے اللہ آپ کے اہل خانہ کو صبر دے۔

اللہ کا کرم

مسز نزہت اشفاق،کراچی

فرحانہ کی تحریریں مجھے ہمیشہ سے پسند تھیں۔ ہلکی پھلکی سی...... اور اب یہ پڑھ کر کہ وہ ہم میں نہیں رہیں...... دلی طور پر ایک دھچکا سا محسوس ہوا۔ میرے خیال سے وہ پینتالیس سال سے زیادہ کی نہیں ہوں گی (فرحانہ چالیس سے بھی کم تھی) اور اتنی کم عمری میں اتنا نام کما گئیں...... یقیناً ان پر اللہ کا کرم تھا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

لفظوں کے پھول

سعدیہ سلیم،سڈنی

مجھے ہمیشہ سے ایسی تحریریں پسند ہیں جن کو پڑھ کر ڈپریشن نہ ہو، دل کو اداسی کی طرف نہ لے جائیں بلکہ فرحت اور طمانیت حاصل ہو اور فرحانہ ناز ملک کی تحریریں ایسی ہی تھیں، اس کا پیغام...... اس کے لفظوں کے پھولوں کے ذریعے بخوبی دوسرے تک پہنچ جایا کرتا تھا...... اور اب وہ پیاری سی مصنفہ...... کبھی اپنی تحریروں کے ساتھ شامل نہیں ہوگی...... جب ہم اتنے دکھی ہیں تو اس کے عزیز و اقارب کا کیا حال ہوگا...... اللہ ہم سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔

شوخ و چنچل سی

اسما،فیصل آباد

انجم باجی...... پاکیزہ میں فرحانہ ناز ملک کی

رحلت کا پڑھتے ہی دل کو عجیب سا دکھ ہوا...... یہ تو شوخ و چنچل کہانیاں لکھنے کے ساتھ خود بھی چنچل سی تھیں۔ مجھے اُن کی تصویریں بھی یاد ہیں۔ بہت پیاری سی تھیں، سچی کہہ رہی ہوں باجی...... یہ نیوز پڑھنے کے بعد کچھ نہیں پڑھا گیا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

خوب صورت رائٹر

زینت شاہ، حیدر آباد

فرحانہ ناز ملک خود بھی بے حد خوب صورت تھیں اور اسی طرح بے حد خوب صورت رائٹر بھی...... ان کا اندازِ تحریر دل کو چھو لیتا تھا...... ان کے چلے جانے سے ہم حقیقتاً ایک خوب صورت رائٹر سے محروم ہو گئے...... جس کی ہر تحریر اپنی مثال آپ تھی۔ اللہ اس کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

بے حد افسوس ہوا

مسرت رانی خلیل، کراچی

فرحانہ ناز کے یوں چلے جانے کا پڑھ کر میں تو کانپ سی گئی۔ بے حد...... بے حد افسوس ہوا...... اور بڑی، بڑی آنکھوں والی ایک پیاری سی رائٹر آنکھوں کے سامنے آ گئی، اللہ مغفرت کرے۔

فرحانہ ناز ملک کا درد

نور افشاں شیخ، شکار پور

24 اکتوبر کے دن 12 بجے میں ایک رسالے میں فرحانہ ناز ملک کا ناول ''محبت کی کہانی'' میں ناول کی ہیروئن اسوہ کی شرارتیں اور شوخیاں پڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ماشاء اللہ فرحانہ ناز ملک کتنی ایکٹو ہے۔ اس کے دو دن بعد 26 اکتوبر کو پاکیزہ ڈائجسٹ ملا۔ سب سے پہلے جائزہ لے رہی تھی کہ کس، کس رائٹر کی کہانیاں آئی ہیں اور کس، کس قاری کے خط آئے ہیں۔ بہنوں کی محفل کے آخری پیراگراف میں باجی فرحانہ کی اس طرح اچانک حادثاتی موت پڑھ کر تو مجھے کرنٹ لگ گیا میری تو جیسے سانس ہی بند ہو گئی آنکھوں میں آنسو آ گئے ابھی لکھتے ہوئے بھی دل دھڑک رہا ہے۔ بہت ساری شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو زندگی میں کتنی ہی نامور کیوں نہ ہوں اپنی موت کے بعد کچھ دنوں تک یاد رہتی ہیں پھر ایک پرانا قصہ بن کر ماضی کی کتاب میں بند ہو جاتی ہیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے کردار اور خوب صورت باتوں کی وجہ سے ہمیشہ دلوں میں دھڑکتے ہیں اور یادوں میں ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔ آپی فرحانہ ناز ملک بھی ایسی شخصیت تھیں۔ اللہ پاک فرحانہ ناز ملک اور ان کی امی، بہن، بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کی فیملی کو صبرِ جمیل دے اور دانیال ملک کو بہت ساری صحت دے، صبر دے اور ان کا مستقبل روشن کرے، آمین۔

قلم کا رشتہ

سلمیٰ غزل، کراچی

فرحانہ ناز ملک کی ایکسیڈنٹ میں وفات کسی عظیم سانحے سے کم نہیں، دل یقین کرنے پر آمادہ نہیں کہ ایک ہنستا بستا گھر اس طرح اجڑ جائے گا حالانکہ ان سے کوئی خون کا رشتہ تھا نہ دوستی لیکن قلم کا رشتہ بڑا مضبوط تھا۔ وہ دنیائے ادب کا چمکتا ہوا ستارہ جن کا سلسلے وار ناول ہو یا افسانہ، میں ہمیشہ بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔ خدا ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے کہ انہوں نے فرحانہ ناز ملک کے ساتھ، ساتھ اور بھی قریبی رشتے کھو دیے۔ خدا ان کے بیٹے کو زندگی اور صحت دے اور جانے والوں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور اہلِ خانہ کو اس عظیم سانحے کو برداشت کرنے کا صبر اور حوصلہ دے۔ دکھ اتنا بڑا ہے کہ الفاظ چھوٹے پڑ رہے ہیں شاید اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اسی طرح آزماتا ہے۔

بے تحاشا دکھ

ڈاکٹر کومل عبدالستار، جام شورو

ہمارا درد کس نے دیکھا ہے
ہمیں تو بس خدا نے تڑپتے دیکھا ہے

آہ فرحانہ ناز ملک ......رات کے 7 بجے میں آرام سے لیٹ کے موبائل استعمال کر رہی تھی کہ فیس بک کی ٹائم لائن پر صائمہ اکرم چوہدری کا اسٹیٹس...... میں اِک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر کتنی ہی دیر تک سکتے میں کھڑی رہی۔ بے تحاشا دکھ...... بے بسی، شاک...... آنسو تھے کہ تھم نہیں رہے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں کس کے گلے لگ کر رووں...... کوئی پوچھے تو کیا بتاؤں؟ میرا کون مرگیا ہے؟ وہ کون تھی میرے لیے وہ کیا تھی؟ بہت سالوں پہلے وہ پاکیزہ میں تبصرے لکھا کرتی تھی اور میں پڑھ کر کتنی دیر ہنستی تھی۔ کہاں سے ہر بار اتنے مزے کی باتیں لے آتی ہیں۔ اب کون ہوگا جسے پڑھ کر میں ہنسا کروں گی پھر اس نے چھوٹے، چھوٹے افسانے شروع کیے اور مجھے ایسی ہی خوشی ہوئی تھی کہ جیسے میں نے لکھنا اسٹارٹ کیا ہے اور ان چھوٹے افسانوں سے اِک مکمل، میچور رائٹر بننے تک کا سفر میں نے اس کے ساتھ طے کیا۔ کم عمری میں شادی کیوں ہوئی؟ اب سمجھ آیا ہے! اللہ نے تھوڑی سی عمر میں ہر خوشی دکھانا تھی۔ شوہر، بچے اور پھر ڈگری ...... میری ابھی کچھ دن پہلے فیس بک پر بات بھی اسٹارٹ ہوئی تھی۔ میں ہمیشہ تحریروں سے زیادہ ان کی آنکھوں کی تعریف کرتی تھی ......اور......وہ آنکھیں اب نہ کھل سکیں گی، میں ان کو اب نہ دیکھ سکوں گی۔ میرے موبائل میں اب بھی ان کی آنکھوں کی تصویر ہے۔

کل اس کی آنکھوں نے کیا زندہ گفتگو کی تھی
گماں بھی نہ تھا کہ یہ شخص بچھڑنے والا ہے

میں جب دیکھتی ہوں میرا دل پھٹتا ہے۔ اتنی بڑی رائٹر ہونے کے باوجود وہ جنگ میں میرے تبصرے دیکھا کرتی تھیں یا میرے فیس بک پر پوسٹ کرنے پر تو بولا کرتی تھیں تم بہت اچھی رائٹر ہو۔ صائمہ کے نئے ڈرامے پر ہم نے آخری بار تبصرہ کیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ اب ان کی پروفائل سے مجھے کبھی ریپلائی نہیں آئے گا تو...... میں کیا کروں گی۔ پتا نہیں کیوں تین چار دن تک بے مقصد، بلاوجہ، بے فضول میسج کر رہی ہوں کہ مجھے جواب دیں، میری بات سنیں، واپس آئیں۔ میں کیا کروں تکلیف ہے کہ ختم نہیں ہو رہی۔ روزانہ اخبار میں پڑھتے ہیں کہ ٹرالر، گاڑی پر چڑھ گیا اور اتنے لوگ جاں بحق اور صفحہ پلٹ دیا اب میں کیسے صفحہ پلٹا کروں گی؟ دل کرتا ہے چیخ، چیخ کر اس ڈرائیور کو کوسنے دوں اب ہر روز یاد آئے گی اور پھر ہر روز رُلائے گی ......کہانیاں لکھتے، لکھتے وہ کہانی کا حصہ بن گئی۔

جنہیں ہم رکھتے تھے اپنی آنکھوں میں
کیوں نکل جاتے ہیں وہ پانی بن کر

اللہ ان کے گھر والوں کو صبر، دانیال کو صحت یابی اور ہم سب فینز کو حوصلہ دے۔ اِک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا ضرور کیجیے گا۔

بہت بڑا دکھ

رفاقت جاوید، اسلام آباد

میں کبھی فرحانہ ناز سے نہیں ملی، فون پر بھی بات نہیں ہوئی۔ کبھی اس کا کوئی میسج بھی میرے نام نہیں آیا اور میں نے اس کی تحریریں بھی صرف وہی پڑھی ہیں جو پاکیزہ میں شائع ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے اس کی حادثاتی موت کا اتنا دکھ ہوا کہ مجھے ایسا لگا کہ اس لڑکی کو تو میں بہت زیادہ جانتی تھی اور وہ تو شاید میرے پڑوس میں ہی رہتی تھی۔ موت برحق ہے اور دنیا فانی ہے۔ جو آیا ہے اسے جانا بھی ہے مگر فرحانہ ناز کا اس طرح چلے جانا...... میرے لیے یہ اتنا بڑا دکھ ہے کہ میں کچھ کہنا بھی چاہتی ہوں مگر کچھ کہہ نہیں پا رہی۔ بار بار اس کے معصوم بچوں کا خیال میرے دل میں آرہا ہے۔ اللہ ان کو سلامت رکھنا......اور فرحانہ کو

جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمانا، آمین۔

وہ تیری یادیں خیال تیرے

تحسین اختر،فیصل آباد

فرحانہ ناز ملک میری ہم عصر قلم کار تھی۔ پیاری سی صورت، موتی جیسے لفظوں کی کھلاڑی جس کے ہر، ہر حرف میں زندگی دمکتی تھی۔ تحریر کی چاشنی ایسی کہ بے ساختہ چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دے۔ جانے اس کے دل میں کیا، کیا خواب ہوں گے۔ تھوڑی سی عمر میں ابھی دیکھا ہی کیا ہوگا...... خواب بڑا قلم کار بننے کے لیے ہوں گے۔ اپنی اولاد کے اچھے مستقبل کے لیے ہوں گے شریکِ حیات کے سنگ، سنگ لمبی زندگی جینے کے ہوں گے۔ ماں، باپ، بہن، بھائیوں کے لیے ہوں گے مگر 11 اکتوبر 2014ء میں یہ سب خواب آنسو بن گئے وہ آنسو جو ہر کسی کی آنکھ سے بہنے کے لیے بے تاب ہیں۔ فرحانہ ناز ملک ہم تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اور میرے جیسے دوسرے لوگ بے بس ہیں، ہم تمہیں کسی بھی طرح واپس نہیں لاسکتے۔ ہم تمہارے اور تمہارے پیاروں کے قاتلوں کو نہیں پکڑ سکتے مگر ہم تمہارے لیے دعا کر سکتے ہیں۔ تمہاری مغفرت کے طالب ہوسکتے ہیں۔ تمہاری روح کو سکون پہنچانے کے لیے خدا کے سامنے سرنگوں ہوسکتے ہیں اور جب سے تمہارے روٹھ جانے کی خبر سنی ہے ہم ایسا ہی کررہے ہیں۔ خدا پاک سے التجا ہے ہماری دعاؤں کو اور ہمارے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے دکھ کو بہت قریب ہوکے سنے اور تمہارے بچوں و شریکِ حیات اور دوسرے لواحقین کو صبرِ جمیل اور تمہیں اپنے سائے میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

وہ تیری یادیں خیال تیرے
وہ رنج تیرے ملال تیرے
وہ تیری آنکھیں سوال تیرے
وہ تم سے جُڑ کے تمام رشتے
بچھڑ گئے ہیں، اجڑ گئے ہیں

فرحانہ ناز ملک

حمیرا نوشین،منڈی بہاؤ الدین

رسالہ کھولتے ہی فرحانہ کی وفات کی اندوہ ناک خبر پڑھ کر دل درد کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ فرحانہ سمیت گھر کے چار افراد کا ایک ساتھ دنیا سے ناتا توڑلینا، ناگہانی موت زخموں سے چور لاشے...... یاالٰہی کیسے ان کے اہل وعیال نے قیامت سے پہلے قیامت کا منظر دیکھا ہوگا۔ غموں کے پہاڑ تلے ان کے وجود ریزہ، ریزہ ہوگئے ہوں گے۔ بہنیں ماں کی ممتا سے محروم ہونے کا ماتم کریں یا بھائی کے لاشے کو دیکھ کر روئیں۔ بہنوں کے اس دنیا سے رخصت ہوجانے پر آنسو بہائیں یا فرحانہ کے جگر گوشوں کو سینوں سے لگائیں جو اتنی صغرسنی میں ماں کی محبت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئے۔ معصوم کلیاں مرجھا کے رہ گئی ہوں گی۔ ابھی ممتا کے لمس سے پوری طرح آشنا بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ اس کی خوشبو سے وہ جدا ہوگئے۔

اے دور نگر کے بنجارے گر چھوڑ کے ایسے جانا تھا
کیوں چاہ کی راہ دکھائی تھی کیوں پیار کا ہاتھ بڑھایا تھا

مشیتِ ایزدی کے سامنے سب لاچار و بے بس ہیں۔ فرحانہ سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا ہاں مگر ایک انسانیت اور قلم کا مضبوط رشتہ ضرور تھا۔ اس کے بارے میں اتنا ہی کہوں گی۔

گو جانے کے مشتاق یہاں ہم جیسے لاکھ بچارے ہوں
وہ لوگ ہی رخصت ہوتے ہیں جو لوگ کہ سب کو پیارے ہوں

اللہ ان سب کو غریقِ رحمت کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین!

بیاد فرحانہ ناز ملک

حیا بخاری، ڈی، آئی، خان

بے حد سادہ مزاج...... بہت ہی خوش گفتار اور دوسروں کو سراہنے والی فرحانہ...... کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان سے دوستی کا یہ سلسلہ اس قدر مختصر ہوگا۔ مگر کہتے ہیں ناں کہ بعض لوگوں سے دل اور روح کے وہ رشتے

جڑ جاتے ہیں کہ ہاتھ تو چھوٹ جاتے ہیں مگر ساتھ پھر بھی نہیں چھوٹ پاتے۔ فرحانہ ناز ملک بھی اپنے خوب صورت الفاظ، بہترین برتاؤ اور یادوں کے ساتھ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ان کے لیے کچھ بھی لکھنا اور یہ سوچ کر لکھنا کہ وہ اب ہم میں موجود نہیں بے حد مشکل امر ہے۔ صرف اتنی سی دعا کہ......

تیری خاطر میرے لبوں پہ
آج اتنی سی بس دعا ہے
کہ تیری خواہش رہی جو ہمیشہ
وہ ایسا اعلیٰ مکاں ہو تیرا
جو پھول لفظوں کے تم نے اپنے
اس زمیں پہ بکھیرے سارے
مہکتے جائیں اور اپنی خوشبوؤں سے
اپنے رنگوں سے، تیرا راستہ ہی سجا دیں
کہ اس جہاں سے اُس جہاں تک
کے اس سفر میں
تمہاری خاطر ایک جنت ہی وہ سجا دیں (آمین)

اپنے گلشن کو

مصباح رضا سعید، فیصل آباد

کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْت
لیکن موت بھی تو ایسی ہو کہ یقین آجائے۔

مجھے شام کو امینہ عندلیب کا میسج ملا کہ فرحانہ ناز کی ڈیتھ ہوگئی۔ کئی دفعہ پڑھا...... لکھا تو صحیح تھا مگر یقین کرنا مشکل ہوگیا۔ جب سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تو کہا موت تو برحق ہے۔ کسی بھی وقت آسکتی ہے تو آنسو نہ رکے کہ ان کے گھر میں تو قیامتِ صغریٰ کا منظر ہوگا جب ایک ساتھ چار جنازے اکٹھے اٹھے ہوں گے۔ گھر والوں نے پتا نہیں کس حوصلے سے اپنے گلشن کو قبرستان میں تبدیل کیا ہوگا۔ فرحانہ آپ نے تو جانے میں بہت جلدی کی۔ اپنے بچے چھوڑ کے جانے کو دل تو نہیں کیا ہوگا بس اپنے رب کے حکم کے آگے سر جھکایا ہوگا۔ اللہ آپ کو اور آپ کی والدہ، بہن اور بھائی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین!

اٹوٹ بندھن

اُمِ طفیور، گوجرانوالہ

دلِ غافل نہ ہو یک دم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے
باغیچے چھوڑ کر خالی زمیں اندر سمانا ہے

سب نے جانا ہے، کس کو سدا اس دنیا میں رہنا ہے۔ کسی نے ماں، باپ کا غم اٹھانا ہے اور کسی نے جیتے جی اولاد کو اندھیری کوٹھڑی میں اتارنا ہے۔ دوست احباب سب ساتھ چھوڑ جائیں گے مگر دنیا کا چکر چلتا رہے گا۔ اسی دنیا میں رہتے کبھی کبھار ہمیں کچھ ایسی ہستیاں ٹکرا جاتی ہیں جن سے نہ ہمارا خون کا رشتہ ہوتا ہے اور نہ وانت کاٹے کی دوستی...... مگر ان کے ساتھ ہم ایسے اٹوٹ بندھن میں بندھے ہوتے ہیں جو کسی دنیاوی تال میل کا محتاج نہیں۔ نُسک چہرے اور دھیمے، سلجھے مزاج کی فرحانہ ناز کو شاید کوئی بھلا نہ پائے گا۔ جس طرح شازیہ چوہدری آج تک بھلائی نہ جاسکیں۔ خوب صورت موتی لفظوں کی صورت پرونے والی فرحانہ ہم میں نہیں رہیں...... یہ خبر جس وقت میں نے فیس بک پر پڑھی تو ایسا زوردار جھٹکا لگا کہ اعصاب جھنجھنا گئے...... کئی پل یقین کرنے میں ہی گزر گئے۔ تصدیق کی...... تب بھی دل سے یہی دعا نکلی کہ کاش یہ جھوٹ ہو۔

آہ...... کھا گئی زمیں، آسماں کیسے کیسے...... بچے تو سبھی پھول کے مانند نازک ہوتے ہیں مگر کوئی فرحانہ کے بچوں کو دیکھے...... پھولوں کی نازکی اور دلکشی کو مات دیتے اس کے تین ستارے...... آج ماں کا معطر وجود کھو بیٹھے ہیں۔ وقت سب کچھ آگے دھکیلتا ہے...... کچھ بھی واپس نہیں پلٹتا...... جانے والے کبھی نہیں آتے مگر جب تک فرحانہ سے وابستہ کوئی ایک شخص بھی دھرتی پہ رہے گا، اس کی یادوں کا انمول خزانہ باقی رہے گا...... اپنے خوب صورت اور نفیس خیالات واحساسات لیے

آج وہ منوں مٹی تلے جا سوئی ہے..... بہت کچھ کرنے کی لگن اور عزم..... بچوں کے سنگ زندہ رہنے کی ترنگ.....تمام عمر خاوند کے ہمراہ بتانے کی امنگ .....سب کچھ مٹی میں جا ملا۔ آج سب دکھ مناتے ہیں، فرحانہ کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں.....مگر فرحانہ سب سے بے نیاز اپنی آخری آرام گاہ میں منتقل ہوگئی۔ بچوں کا تڑپنا، سسکنا کچھ بھی اس کے آرام میں خلل نہیں ڈالتا، روزِ محشر ملنے کی آس تھما کر.....موت کا کڑوا ذائقہ چکھ کر مٹی اوڑھ کر سوگئی۔ پڑھنے والوں سے استدعا ہے کہ اس تعزیتی پیراگراف کو پڑھ کر اگر بے پناہ دکھ محسوس کریں تو پلیز، پلیز اس ساری شدت کو دعا کی صورت اپنی زبان سے ادا کر دیجیے کہ فرحانہ کو اب صرف دعاؤں کے ہار اور بخشش کے پھولوں کی طلب ہے۔ آپ جو بھی اس کو پڑھ کر بخش سکیں اس کو ایصالِ ثواب کرتے رہیں۔ یہی اس کے آخری سفر کی آسانی کا سبب ہوگا.....اس کی قبر میں روشنی ہوگی۔ اللہ فرحانہ کے درجات بلند فرمائے.....قبر کو کشادہ اور منور فرمائے۔ اس کے بھائی، بہن اور والدہ کی مغفرت فرمائے اور بچوں کو صبر اور استقامت سے نوازے.....آمین!

لہو لہو تحریر

فصیحہ آصف خان، ملتان

اچھے لوگوں کو چھینتی ہے موت
کتنی مردم شناس ہوتی ہے

نصرت ادیب ہاشمی کا شعر آج ذہن میں گردش کررہا ہے۔ بچھڑنے کا احساس، جدائی اِک کربناک سوچ ہے، جو خون کے آنسو رُلاتی ہے، اچانک ہی جب کسی اپنے، بہت عزیز ہستی کی ہمیشگی کی جدائی کی خبر ملے تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔ جیسے قدموں تلے زمین سرک گئی ہو، دھڑکنیں بے ترتیب، ذہن منتشر ہوجائے۔ کچھ سمجھ نہ آئے، بالکل ایسے ہی۔

فرحانہ ناز ملک جسے ابھی تک مرحومہ سمجھنے کو دل یقین کی بھول بھلیوں میں ہے۔ 11 اکتوبر کی صبح حسب معمول اس کا صبح بخیر کا پیغام آیا۔ دن گزرتا رہا۔ دن میں، اسے میں نے کئی پیغام کیے حسب عادت پھر سر شام ایک رسالے کی مدیرہ کا فون آیا کہ تمہیں پتا ہے فرحانہ ناز ملک کا بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، میں نے یکا یک دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ مجھے تو علم نہیں.....مگر دل تھا کہ پوری رفتار سے دھڑکے جا رہا تھا پھر اس کے بعد فرح طاہر کے دلخراش پیغام نے تصدیق کردی کہ فرحانہ ہمیں چھوڑ گئی۔ سباس گل کا سسکتا پیغام آیا۔ جس میں بین کی آوازیں تھیں اس کے بعد دردناک پیغامات وصول کرتی رہی، موت کے بے رحم پنجوں نے آخر کار اسے دبوچ ہی لیا..... صائمہ اکرم، محترمہ عظمیٰ خورشید، تسیم نیازی، خوش بخت منظور کتنے ہی روتے ہوئے فون آئے۔ سعدیہ ہما شیخ حیران تھی کہ ابھی چند دن پہلے ہی تو بات ہوئی تھی، فرحانہ سے۔ نزہت جبیں ضیا بھی روتی رہیں پھر رات نو بجے نیر رانی شفق کا فون آیا۔ اُف موت کو رحم بھی نہ آیا۔ انہوں نے اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ فرحانہ اس کی والدہ، بھائی خاور اور جواں سال بہن ڈاکٹر کرن شادی میں جا رہے تھے کہ ڈی جی خان سے 28 کلومیٹر دور ٹبی قیصرانی کے مقام پر ان کی گاڑی کو ایک ٹرالر نے ٹکر ماری جس سے یہ چاروں افراد موقع پر ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ واحد بچ جانے والا فرحانہ کا بیٹا دانیال شدید زخمی ہوا۔ مگر اللہ کے کرم سے زندگی تھی تو بچ گیا۔

آہ.....دل ہے کہ درد سے بوجھل ہے، یک دم چار جنازے، اُف.....کوئی دن ایسا نہ تھا کہ اس کا پیغام نہ آتا ہو۔

میری اس سے بس ایک ہی ملاقات ہوئی تھی۔ کتنا مزہ آیا تھا۔ ہم دو تین گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ جیسے برسوں پرانا رشتہ ہو، ہاں خلوص، وفا اور محبت کے بے غرض رشتے ہی تو ہیں۔ وہ اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتی تھی، وہ اداس ہوتی تو میں اسے ہنساتی، اس کی بے ریا ہنسی بڑی، بڑی آنکھوں میں شرارت آمیز ذہانت..... وہ حسین، ذہین اور معصوم سی تھی۔ دوستی نبھانے والی،

سادہ دل اب تو سب کچھ ہی مٹی میں مٹی ہوگیا۔ ابھی تو دانیال، دیفہ اور سات سالہ عبداللہ کو تمہاری بہت ضرورت تھی۔ تمہاری تو بچوں میں جان تھی، بچے اب کسے نانی، خالہ اور ماموں کہیں گے؟ سبھی آن کی آن میں دنیا چھوڑ گئے کیسی قیامت کی گھڑی ہے۔ کس قدر ہولناک منظر ہوگا، ابھی تو فرحانہ نے بھائی خاور کی شادی کرنا تھی، کرن کو دلہن بنا دیکھنا تھا اُف...... دماغ پھٹتا ہے سوچتے ہوئے یارب العالمین تیری حکمتوں اور مصلحتوں سے بے خبر لوگ ہم بس تیرے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ ان سب کی مغفرت فرما، آمین۔ جانا تو سبھی کو ہے مگر کچھ مختصری زندگی میں بڑا نام کما جاتے ہیں اور دل کے قریب ہو جاتے ہیں کہ دل ان کی دائمی جدائی کو بہ مشکل تسلیم کرتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک کامیاب لکھاری تھی بلکہ ایک اطاعت شعار بیٹی، خدمت گزار بیوی اور محبت کرنے والی ماں تھی، دوستی کے تقاضوں پر پورا اترنے والی، میری پاکیزہ کے ہر قاری سے دعا ہے کہ وہ تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کریں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت میں اعلیٰ مقام پر فائز فرمائے اور ان کی بخشش فرمائے۔ آمین۔

دل کا رشتہ

بشریٰ باجوہ، اوکاڑہ

گیارہ اکتوبر کی رات کو فصیحہ آصف آپی کا ایس ایم ایس آیا کہ فرحانہ ناز کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ میسج پڑھ کر یقین نہ آیا۔ آپی کو میسج کیا تو پتا چلا فرحانہ کے ساتھ اس کی سسٹر، بھائی اور والدہ بھی انتقال کر گئے ہیں۔ بے حد شاک لگا، دل افسردہ ہوگیا۔ فرحانہ کی خوب صورت تصویر جو پاکیزہ میں لگی تھی آنکھوں کے آگے گھوم گئی۔ جب بھی تصویر دیکھتی تو سوچتی کہ فرحانہ بہت خوب صورت ہیں۔ وہ وقت یاد آیا جب صائمہ اکرم، فرحانہ ناز اور سعدیہ ہما کے خوب صورت تبصرے پاکیزہ کی جان ہوا کرتے تھے پھر یہ رائٹرز بن گئیں۔ شازیہ چوہدری یاد آ گئی۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے ہم بھاگ نہیں سکتے لیکن کبھی، کبھی موت جاتے ہوئے ایسے لوگوں کو لے جاتی ہے جن کی یاد آپ کے دل سے نکل نہیں سکتی۔ پتا نہیں فرحانہ کی فیملی نے کس طرح اتنا بڑا صدمہ جھیلا ہوگا۔ فرحانہ کے والد نے کس طرح اپنی بیٹیوں، بیٹے اور بیوی کو سپردِ خاک کیا ہوگا۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو میں مزید کچھ لکھ سکوں میری دعا ہے کہ اللہ تمام مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین اور فرحانہ کی فیملی کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ فرحانہ کے بچوں پر اپنا رحم کرے، آمین۔ مجھے تو ابھی تک فرزانہ سہیل یاد آ جاتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض لوگوں کو دیکھا تک نہیں ہوتا لیکن ان سے ایسا دل کا رشتہ بن جاتا ہے کہ جیسے کوئی خونی، قریبی رشتہ۔

میرا یہ دکھ بہت بڑا ہے

شگفتہ ناز ملک، علی پور

میرا بہت زیادہ وقت ڈی جی خان میں گزرا ہے۔ میں نے اور فرحانہ ناز نے تقریباً ایک ساتھ ہی لکھنا شروع کیا۔ فون پر ان سے بہت اچھی سلام دعا تھی مگر میری یہ بدنصیبی کہ کبھی ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میرا یہ دکھ بہت بڑا ہے اور الفاظ اس کے آگے اتنے چھوٹے ہیں جو یہ دکھ بیان ہی نہیں کر سکتے اور نہ مجھے ابھی تک یہ یقین آ رہا ہے کہ خوب صورت آنکھوں والی، لمبے بالوں والی اور محبت بھرے لہجے والی چلی گئی ہے۔ اللہ اس کے درجات بلند کرے۔ میں انشاء اللہ ڈی جی خان ان کی بہن کے پاس ضرور جاؤں گی افسوس کے لیے...... یہ افسوس تو ہمیشہ ہی رہے گا کہ میں اپنی دوست سے کبھی مل نہ سکی۔

فرحانہ کا حق

افشین شاھد، شاھدرہ

پاکیزہ میں شازیہ چوہدری نمبر دیکھا پھر لبنیٰ عروج نمبر اور اب فرحانہ ناز نمبر...... یہ قابلِ ستائش بات ہے کہ پاکیزہ تمام لکھنے والوں کو عزت ان کی زندگی میں بھی اور ان کے مرنے کے بعد بھی دیتا ہے

اور ہر سال سالگرہ نمبر کی خصوصی اشاعت میں جس طرح تمام جانے والی مصنفات کو یاد کیا جاتا ہے اور انہیں دعاؤں کے پھول بھیجے جاتے ہیں اس کی مثال کہیں نہیں ہے اور فرحانہ ناز ملک کا یہ حق تھا کہ اس کے بارے میں مضامین شائع کیے جائیں۔ فرحانہ ناز نے بہت زیادہ تو نہیں لکھا مگر جتنا بھی لکھا بہت خوب لکھا۔ پیاری فرحانہ تم میری دعاؤں میں ہمیشہ شامل رہو گی۔

بے حد افسوس ہوا

نگہت آصف، اسلام آباد

پیاری آپی انجم !السلام علیکم......میں تبصرہ کم کم لکھتی ہوں مگر فرحانہ ناز ملک کی ڈیتھ کی خبر نے کچھ لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ ابھی شاید دو تین سال پہلے اسلام آباد کی ایک رائٹر بُنیٰ عروج کی ڈیتھ پر بھی افسوس ہوا تھا۔ جب آپ نے سب لوگوں کے تاثرات چھاپے تھے۔ اس طرح سب نے ہی تعزیت کی۔ میں آپ کے رسالے کے ذریعے فرحانہ ناز کے شوہر اور ان کے بچوں سے تعزیت کرتی ہوں۔ فرحانہ ناز کے ساتھ، ساتھ ان کے بھائی، بہن اور ماں کی بھی موت پر اتنا رنج ہے کہ الفاظ نہیں ہیں بیان کرنے کو۔ پاکیزہ میں بہنوں کی محفل میں پڑھ کر دل کو بہت صدمہ ہوا۔ اگرچہ وہ ہماری رشتے دار نہیں مگر ہم سب کی پسندیدہ رائٹر تو تھیں ناں۔ اللہ تعالیٰ ان کے تمام گھر والوں کو ڈھیر سارا صبر دے، آمین۔

روح فرسا خبر

نفیسہ آرا، راس الخیمہ

باجی بہنوں کی محفل کے آخر میں ایک روح فرسا خبر پڑھ کر دل غم میں ڈوب گیا۔ بہنوں کی محفل پڑھ کر ہمیشہ مزہ آتا تھا مگر اس بار یہ محفل رُلا گئی۔ یہاں پر مقیم پاکیزہ کے دیگر مستقل پڑھنے والوں کے لیے بھی یہ خبر کسی بڑے کرب سے کم نہیں۔ فرحانہ کی ہلکی پھلکی شگفتہ تحریر ہم سب ہی شوق سے پڑھتے تھے۔ آپ سے التماس ہے کہ ان کی پرانی تحریروں میں سے ضرور کچھ نہ کچھ لگائیں، باجی پرچے پر فی الحال تبصرہ نہیں کیا جا رہا کیونکہ دل غم سے بھرا ہوا ہے۔ اللہ پاک فرحانہ ناز ملک کی مغفرت کرے اور ان کے بچوں پر اللہ تعالیٰ کا کرم خاص ہو۔

شدید دکھ

صائمہ قیصر ہاشمی، راول پنڈی

فرحانہ ناز کی اندوہ ناک موت پر گہرا رنج و دکھ ہوا ہے۔ پروردگار فرحانہ ناز کو عالم بالا میں بلند مقام عطا کرے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ان کی والدہ، بہن اور بھائی کی المناک موت پر بھی شدید دکھ ہوا۔ پروردگار ان کے بچوں کا حامی و ناصر ہو۔

رنج جاں

عروبہ ناز، کوٹلی

باجی یوں تو میں پاکیزہ زمانے سے پڑھ رہی ہوں کبھی کبھی شعر یا مراسلے بھیج دیتی ہوں مگر اس دفعہ خاص طور پر خط لکھنے کی وجہ فرحانہ ناز ملک ہیں۔ میں ان کی کہانیاں شوق سے پڑھتی تھی۔ ابھی کچھ ماہ پہلے ان کی کہانی پاکیزہ میں پڑھی تھی تو میں نے فرحانہ آپی سے بات بھی کی تھی۔ مجھے ان کی اچانک موت کا شدید رنج ہوا ہے وہ بھی اتنا المناک حادثہ......یوں تو آئے دن حادثے ہوتے رہتے ہیں مگر جب اپنا کوئی جاننے والا جاتا ہے تو پھر دوسروں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔ میں تو ان کے بچوں کا سوچ کر ہی پریشان ہو جاتی ہوں۔ معلوم نہیں اب ان کا زخمی بیٹا کیسا ہے؟ (ماشاء اللہ اب وہ ٹھیک ہے) آپ لوگ ہم سب کی تعزیت قبول کریں۔ پروردگار ان کے تمام خاندان کو ڈھیر سارا صبر اور حوصلہ عطا کرے۔

☆☆☆



دائیں سے یاسمین رشید، رضوانہ پرنس، عظمیٰ آفاق، عامرہ شاہد، عذرا رسول، انجم انصار، تسنیم ماہ پارہ

تارے زمین پر

عظمیٰ آفاق سعید

بہت دنوں سے سوچ رہی تھی کہ گھر پہ رائٹرز کی کوئی گیدرنگ کی جائے تاکہ سب کو بیٹھنے کا، باتیں کرنے کا اور ملنے کا موقع ملے۔ فون پر کی گئی گفتگو ویسے بھی آدھی ملاقات ہوتی ہے۔

کبھی بچوں کے امتحانات تو کبھی فیملی میں شادیاں... ٹائم ہی نہیں سیٹ ہو رہا تھا۔ آخر کار یہ گیدرنگ ایک چھوٹی سی عید ملن پارٹی کی صورت میں طے ہوگئی۔ چونکہ دوپہر کی ضیافت تھی اسی لیے صبح ہی سے گھر کو چندن کی طرح صاف کر دیا گیا تھا۔ کسی بچے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کچرا لاؤنج تو کیا کمرے میں بھی پھینک تو دے۔

''امی مہمانوں کے جانے کے بعد تو آپ یہ کاٹنے والی فراک اتار دیں گی ناں.....؟'' کسوٹی کوئی چوتھی بار مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

''ہاں، ہاں بیٹا...... پھر وہی نرم والی فراک پہن لینا۔'' میں اسے مطمئن کر رہی تھی۔

مہمانوں کی آمد کا ٹائم دوپہر تین بجے طے تھا جبکہ ہمارا پورا خاندان بارہ بجے سے اٹینشن تھا۔

سب سے پہلے آنے والوں میں ہماری اماں اور آپ کی باجی انجم انصار تھیں۔ وقتِ مقررہ سے پہلے ہی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ مہمانوں میں یاسمین رشید، رضوانہ پرنس، عامرہ شاہد، عطیہ عمر، تسنیم ماہ پارہ اور عذرا رسول صاحبہ شامل تھیں۔ سیما یاسمین مجتبیٰ، شگفتہ شفیق کو کہیں اور جانا تھا سو انہوں نے آنے سے معذرت کرلی تھی۔ ہم نے ان کی معذرت قبول کرلی جبکہ اختر شجاعت کا بھی کنوینس کا مسئلہ تھا۔ آپ تینوں خواتین اگلی بار کی تیاری رکھیں کیونکہ اگلی دفعہ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔

ہماری اماں بلو اور گرین کلر کے سوٹ میں ہمیشہ کی طرح بہت ڈیسنٹ لگ رہی تھیں۔ بلو ان کا فیورٹ کلر بھی ہے اسی لیے یہ کلر ان پر بہت سوٹ بھی کرتا ہے۔ آنٹی رضوانہ پرنس کریم کلر کے کاٹن کے اسٹائلش سوٹ میں ملبوس تھیں لیکن مجھے وہ پہلے کے مقابلے میں تھوڑی دبلی لگیں۔

''کچھ دبلی ہوگئی ہیں آپ''؟ میں نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تو اچھی بات ہے ناں..... کیا چاہتی ہو ہم موٹے ہوجائیں۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''ارے نہیں..... میں تو بس پوچھ رہی ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں، بس گرین ٹی پینی شروع کردی ہے ہم نے اور نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔'' رضوانہ آنٹی تمام معلومات دے رہی تھیں۔ ''نتیجہ تو اول آیا ہے۔'' امی نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ان کے ساتھ ہی ٹی وی پروڈیوسر عامرہ شاہد بیٹھی تھیں۔ چونکہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی، اسی وجہ سے وہ تھوڑی ریزرو سی لگ رہی تھیں۔ یوں بھی نئی جگہ اور نئے لوگوں میں انسان ذرا دیکھ کر ہی کھلتا ہے۔ شاکنگ پنک کلر کے سوٹ میں ملبوس عامرہ کافی رعب دار شخصیت کی مالک لگیں۔

یاسمین رشید کہنے کو تو امی کی اور عذرا آنٹی کی دوست ہیں مگر ان کی عادت ایسی ہے کہ وہ کسی بھی عمر کے لوگوں میں آرام سے ایڈجسٹ ہوجاتی ہیں ان میں ملنساری اور محبت حد درجہ ہے اور ان سے مل کر ہمیشہ ایک اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ سو آج بھی ایسا ہی تھا۔

تسنیم ماہ پارہ، مصالحہ ٹی وی کی مشہور زمانہ شیف ہیں۔ گھبراتی ہیں، ہر وقت مسکراتی ہیں۔ باتیں اتنی سمجھداری کی کرتی ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ ان کی باتیں سنے جاؤ حالانکہ آج کل کے دور میں کسی کی سننا آسان کام نہیں۔



دائیں سے کسوئی، انجم انصار، یاسمین رشید، عذرا رسول، عظمیٰ آفاق،

عذرا رسول یہ نام ہے ان خاتون کا..... کہ جن کو لوگوں کی عزت دل سے کرنی آتی ہے۔ وہ ہر ایک کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں۔ رسالے کی روح رواں ہونے کے باوجود وہ کسی کے بلانے پر اس کے چھ منزلہ فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر اس کے گھر جا کر اس کا مان بھی بڑھادیتی ہیں۔ تو کبھی کسی کے غریب خانے آکر..... حالانکہ وہ ہر وقت مصروف رہتی ہیں۔ ایک تو رسالے، اس کے بعد میٹنگ، آئے دن کی ادبی تقریبات کے بلاوے جو اُن کے بغیر ہو نہیں سکتے لیکن اس کے باوجود میرے ایک دفعہ کے بلانے پر انہوں

نے فوراً آنے پر رضامندی کا اظہار کیا جس کی میں تہِ دل سے مشکور ہوں۔

سفید سوٹ جس پر گلابی پھول بنے ہوئے تھے، سر پر قرینے سے جمے دوپٹے میں وہ ہمیشہ کی طرح گریس فل لگ رہی تھیں۔

عطیہ عمر نے فون پر کچھ دیر سے آنے کا کہا تھا، اس لیے کھانا لگوانے کے لیے میں نے اپنے کک کو اشارہ کیا۔ ویسے بھی تین سوا تین ہو رہے تھے۔

''پہلے کچھ تصویریں بنوالی جائیں۔ پھر کھانا شروع کیا جائے۔ کیا خیال ہے......'' امی نے رائے دی۔

پریس فوٹو گرافر کا انتظام آفاق نے صبح سے ہی کر دیا تھا۔ سب کے ساتھ گروپ فوٹوز بنے۔ باقی سب کا تو پتا نہیں پر میں نے تو خوب پوز مارے۔ جلدی، جلدی تصویریں بنوا کر کچن کی طرف دوڑ لگائی۔ یوں بھی چیتا پرنٹ کا سوٹ پہنا تھا۔ شاید اسی وجہ سے پورے گھر میں چیتے کی طرح بھاگ رہی تھی۔

''باہر گاڑیوں میں جتنے ڈرائیورز ہیں ان کے کھانے کا بھی ارینج کر دینا۔'' میں اپنے کک کو ہدایات دے رہی تھی۔

ٹیبل سیٹ کر کے مہمانوں کو لاؤنج میں آنے کا کہا گیا۔ سب مہمان ڈرائنگ روم سے لاؤنج میں آگئے اور وہیں پہ لنچ لے کر بیٹھے...... شاید کھانا اچھا تھا اسی لیے تعریف تو سب کر رہے تھے۔ یوں بھی کسی کے گھر جاؤ تو برائی تو کوئی ویسے بھی نہیں کر سکتا۔ مہمان اور مغوی میں زیادہ فرق تھوڑی ہوتا ہے۔

کھانے کے ہی دوران سب نے میرے لکھے سفرنامے ملائشیا یہ تو نے کیا کیا...... کی بہت تعریف کی۔ (سب سے پہلے اس کی بھرپور تعریف عذرا آنٹی مجھے فون کر کے کر چکی ہیں۔ عذرا آنٹی آپ کی حوصلہ افزائی کا بہت شکریہ) باقی تمام قاری بہنوں کا بھی شکریہ جن کو میری اوٹ پٹانگ تحریر پسند آگئی۔ بس دل سے لکھا اور دل کو لگ گیا شاید......

میں نے بھی موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے تازہ ترین سفرنامے کا ایک حصہ رائٹرز کی نذر کیا۔ وہ بھی شاید انہیں اچھا لگ گیا کیونکہ سننے کے بعد تھوڑی دیر تک تالیاں تو بجی تھیں۔

تسنیم ماہ پارہ سے ان کی پاٹ دار آواز میں غزل سننے کی فرمائش ہوئی جو انھوں نے غزل ''ایک بار مسکرا دو'' گا کر پوری کی۔ بڑی اچھی آواز ہے ان کی۔

ہمارے نئے سفرنامے کا کچھ حصہ سن کر پروڈیوسر عامرہ شاہد بولیں۔ ''آپ ٹی وی کے لیے کیوں نہیں لکھتیں، جو مزاح لکھتا ہے وہ سیریس بھی بہت اچھا لکھ سکتا ہے۔ آپ میرے پاس آؤ، میں بتاتی ہوں آپ کو...... کہ کیسے لکھتے ہیں ٹی وی کے لیے۔'' وہ بڑی محبت اور کافی سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔

اور میں دل میں سوچ رہی تھی کہ اتنا برا وقت آگیا ہے ٹی وی پر...... خیر اُن کی محبت کی میں عزت کرتی ہوں۔ اور ایک دن ضرور ان کے پاس جاؤں گی۔ یہ وعدہ ہے میرا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ کھانے کے بیچ میں عطیہ عمر بھی ہمیں جوائن کر چکی تھیں۔ فل پردہ کرتی ہیں، چونکہ یہ خواتین کی محفل تھی، کک کو بھی میں نے کھانا لگوانے کے بعد باہر کر دیا تھا اور فوٹو گرافر کو بھی...... اسی لیے عطیہ بھی اپنے برقع سے آزاد بیٹھی تھیں۔ بڑی سادہ خاتون ہیں، سادی اور سچی......

یوں ہی باتوں، باتوں میں معاشرے میں آئے بگاڑ کی بحث چھڑ گئی۔ ''آج کل کی لڑکیوں میں برداشت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ کوئی ایک سنائے تو اسے چار سنائی جائیں، ایسے گھر نہیں چلتے۔'' امی کافی فکرمند لہجے میں حالات پر روشنی ڈال رہی تھیں۔

''ہماری اماں نے تو شادی کرتے وقت ہمیں کہا



دائیں سے انجم انصار عذرا رسول، عظمیٰ آفاق اجیہ

تھا کہ بیٹا یہ دو آنکھیں کھلی رکھنا...... دو کان کھلے رکھنا مگر یہ زبان اس کو تالا لگا کر رکھنا...... ایسے گزرتی ہے زندگی۔'' تسنیم ماہ پارہ اپنی رائے دے رہی تھیں۔

''زندگی بہترین گزارنے کے دو طریقے ہوتے ہیں کہ اگر آپ میں اتنے گر ہیں کہ آپ اپنے شوہر کو اپنا بنالیں تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو اس کے بن جائیں۔ یعنی اپنی منوالو ورنہ اس کی مان جاؤ۔ سیدھی سی بات ہے۔'' یہ میری رائے تھی۔

''کم عمری کی شادی میں لڑکیاں دب جاتی ہیں تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، کبھی نہ دب کے گھر توڑنے سے بہتر ہے کہ دب کر گھر بن جائے اور زندگی کوئی ریسلنگ رنگ تھوڑی ہے کہ جیتنے کا کپ عورت کے ہاتھ میں ہی ہو۔ کپ کسی کے ہاتھ میں بھی ہو جیت ہمیشہ عورت کی ہی ہوتی ہے۔ سمجھ سمجھ کی بات ہے۔'' عطیہ عمر رائے دے رہی تھیں۔

چائے کے بعد پان کھائے گئے...... سب کو مزہ آرہا تھا کہ کوئی بھی جانے کے موڈ میں نہیں تھا جیسے ہی رضوانہ آنٹی اٹھیں سب اٹھتے چلے گئے مگر اس محفل کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ ہم سب نے معروف مصنفہ مرحومہ فرحانہ ناز ملک کو نہ صرف بے حد یاد کیا تھا بلکہ بھرپور خراجِ عقیدت بھی پیش کیا...... ایک ایسی شخصیت جو نہ اس محفل میں تھی اور نہ اب روئے زمین پر...... مگر اُن کی تحریروں کے حوالے سے کہ اس پیاری سی لڑکی کو اللہ نے بہت جلد اپنے پاس بلالیا کہ اس میں بھی یقیناً اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی...... اللہ فرحانہ ناز ملک کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

اچھے اور پیارے سے لوگوں سے مل کر مجھے ہمیشہ بہت خوشی ہوتی ہے اور اس دن تو آسمانِ ادب کے تارے...... عین دوپہر میں میرے چھوٹے سے گھر میں اتر آئے تھے۔ جس کے لیے میں ان سب کی شکر گزار ہوں اور اللہ تعالیٰ کی بھی!

حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے

شائستہ زریں

جمع و تفریق کے اس مسلسل عمل میں
جو لمحہ بھی گزرے پلٹتا نہیں

بلاشبہ جانے والے پل لوٹ کر نہیں آتے لیکن جاتے، جاتے ہمیں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دے جاتے ہیں، ایسا پیغام جو ہماری آئندہ زندگی پر دور رس اثرات مرتب کرتا ہے۔ سال کے آخر میں اگر ہم اپنے سالانہ رویّوں اور طرزِ عمل کا جائزہ دیانتداری سے لیں تو خود احتسابی کے اس کڑے عمل میں بے حساب نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ ندامتیں ہمارے حصے میں ضرور آجاتی ہیں کہ ہم انسان ہیں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔ ہماری زندگی میں ایسے کئی موڑ آتے ہیں جب جانے انجانے میں ہم سے کوئی غلطی یا کوتاہی ہو جاتی ہے جس کا اعتراف کرنے میں اکثر لوگ ہچکچاتے ہیں جبکہ بڑائی اسی میں ہے کہ نہ صرف اپنی خطا کو تسلیم کرلیں بلکہ اس کی تلافی کی کوشش بھی ضرور کریں۔

اور پاکیزہ ۲۰۱۴ء کے اس آخری شمارے کے ہمارے سروے کا موضوع بھی یہی ہے۔ اس کی مناسبت سے ہم نے سروے کے شرکاء سے معلوم کیا کہ......

سوال نمبرا: گزرتے ماہ و سال ہمیں کیا پیغام دیتے ہیں؟ ہماری آنے والی زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں؟

سوال ۲: رواں سال میں سرزد ہونے والی کسی بھی غلطی یا کوتاہی کی تلافی آئندہ کیسے کرنا چاہیں گی / چاہیں گے؟

یاسمین طاہر
(براڈکاسٹر)

یہی کہ ہم وہی ذمے داری قبول کریں جو ہم پوری کر سکتے ہیں اور ہوتا یہ ہے کہ بسا اوقات ہم وہ ذمے داری پوری بھی کر سکتے ہیں مگر کبھی کوتاہی، سستی یا کسی بھی وجہ سے وہ رہ جاتی ہے تو اس غفلت کا نتیجہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے تدارک کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کوتاہی کی اصل وجہ پر توجہ دیں، اسے سمجھیں اور پھر اسے کبھی نہ دُہرائیں۔ ہم سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات ہمیں ان کا احساس نہیں ہوتا دوسرے احساس دلاتے ہیں۔ تب ہمیں سوچنا چاہیے کہ ان سے گریز کیسے کیا جائے کیونکہ



یاسمین طاہر

ہمارے جذبات بھی ہمیں سیدھے راستے پر چلاتے ہیں تو کبھی منفی راہ پر...... اور میرا تجربہ ہے کہ اپنی کسی بھی غلطی یا کوتاہی کے تجزیے کا بہترین وقت رات کا ہوتا ہے۔ جب ہم بستر پر لیٹ کر اپنے دن بھر کے معمولات کا جائزہ لیتے ہیں۔ میں تو ایمانداری سے اپنا احتساب ضرور کرتی ہوں کہ آج میرا طرزِ فکر اور طرزِ عمل کیا رہا؟ کیونکہ ہمارا ایک چھوٹا سا فقرہ کسی کی زندگی بنا سکتا ہے اور ایک چھوٹا سا فقرہ زندگی تباہ بھی کر سکتا ہے۔ اپنی کسی بھی غلطی یا کوتاہی کے اعتراف میں ہونے والا احساسِ ندامت اور اسے کبھی نہ دُہرانے کی خواہش ہی دراصل تلافی ہے۔

سلطان جمیل نسیم
(افسانہ نگار)

۱: ایک مشہور مقولہ یا شعر ہے کہ پیش کر غافل اگر کوئی عمل (نیک) تیرے دفتر میں ہے۔ دراصل ہم نے اپنی موجودہ زندگی کو دائمی سمجھ رکھا ہے اور جس بات کو بھی دنیاوی دکھاوے کے لیے قابلِ داد سمجھتے ہیں اسی پر عمل کر ڈالتے ہیں۔ زندگی ایک نعمت ہے' اس کو نعمت ہی کی طرح سنبھال کر اور احتیاط سے گزارنا چاہیے۔ میرے خیال میں تو ہر روز ہمیں یہی سبق دیتا ہے۔ یہ الگ بات کہ ہم سمجھ کر بھی نا سمجھ بن جائیں اور جو کچھ گزرنے والا ہر روز چپکے سے ہمیں سمجھاتا ہے اس کو سنا ان سنا کر دیتے ہیں بلکہ وقتِ گزراں کے پیغام کو سمجھتے ہی نہیں۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ہم پیدائش سے ہوش سنبھالنے تک جس ماحول میں وقت گزارتے ہیں اس ماحول میں ڈھل جاتے ہیں لیکن بڑے اور ذہین لوگ ہوش آنے پر صحیح اور غلط میں تمیز کرتے ہیں اور آنے والی زندگی کے لیے خود کو اس ڈھب میں ڈھال لیتے ہیں کہ جس کے اثرات نہ صرف ان کے لیے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی بہترین ہوں۔



سلطان جمیل نسیم

۲: غلطی آج کی ہو یا برسوں پہلے کی، وہ غلطی ہی رہے گی تاوقتیکہ احساس ہونے کے بعد آئندہ غلطی نہ کرنے کا عہد کیا جائے اور ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے بقول شاعر۔

اب میرے بعد راہ نہ بھولیں گے قافلے
دنیا کو راہِ راست دیے جا رہا ہوں میں

پر عمل پیرا ہوں۔

پرویز اختر
(سابق سینئر پروڈیوسر ریڈیو پاکستان)

۱: گزرتے مہ وسال کا تو ازل سے ایک ہی پیغام ہے، ہر عمر کے لوگوں کے لیے کہ وقت قیمتی ہے۔ اس کی قدر کرو۔ یہ گزرتا جا رہا ہے، نان اسٹاپ۔ اس میں کوئی ریوائنڈ یا ری پلے نہیں ہے اس لیے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ محبتیں پھیلاؤ۔ نفرتیں کم کرو۔ سادہ سی بات ہے، جو بوؤ گے وہی کاٹو گے والی بات سو فیصد درست ہے بقول اقبال

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

۲: کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں ایسی ہوتی ہیں کہ



پرویز اختر

جن کی تلافی ممکن نہیں یا زندگی بھر بھی تلافی کرو تو معافی ممکن نہیں اس غلطی کی ایک مثال شادی جیسی عام غلطی ہے۔ اوراس کی سزا عمر قیدِ با مشقت ہے۔ (اگر دبی زبان سے شکوہ بھی کروتو ایسا طعنہ نما جواب ملتا ہے کیوں کی تھی پھر شادی؟) جس کے بعد روزمرہ کی غلطیوں کا لا متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جن میں خراب سودا خرید کر لانا یا بیگم کے خیال میں اس چیز کے پچاس روپے دے آنا جو تیس کی ملتی ہے یا باتھ روم کا نل یا استری کا سوئچ کھلا چھوڑ دینا وغیرہ، وغیرہ۔ رواں سال میں بھی ایسی غلطیوں کا سلسلہ اور اس کے صلے میں تقریریں سننے کا سلسلہ جاری ہے۔ جن میں سے اکثر زبانی یاد بھی ہو چکی ہیں۔ باقی کسی بڑی غلطی کی ہمت اور گنجائش نہیں ہے۔

شہناز رمزی
(جنرل منیجر پبلک ریلیشن اینڈ پبلیکیشن ہم ٹی وی نیٹ ورک)

1: ماہ وسال انتہائی برق رفتاری سے گزر رہے ہیں۔ ایک دن کے بعد دوسرا دن' ایک ہفتے کے بعد دوسرا ہفتہ اور ایک سال کے بعد دوسرا سال تیزی سے ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں۔ یہ گزرتے ہوئے ماہ وسال ہمیں پیغام دیتے ہیں کہ مختصر ہوتی زندگی کے ہر لمحے کا بروقت اور درست استعمال کرنا چاہیے۔ ہر لمحے کو قیمتی سمجھتے ہوئے اس کو بھرپور انداز میں گزاریں، کوشش کریں کہ انفرادی طور پر دنیا میں بہتر کام کر کے لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائیں۔ جب ہم وقت کی اہمیت کو سمجھنے لگتے ہیں تو ہم اپنی زندگی کے ہر لمحے کو قیمتی سمجھتے ہیں۔ پھر ہم کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کے ہر رنگ سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی ذات سے دوسروں کو فیض یاب



شہناز رمزی

کریں۔ اپنی ذات سے دوسروں کو نقصان پہنچانے کے بجائے لوگوں میں خوشیاں بانٹیں۔ بہت بڑے نہ سہی چھوٹے، چھوٹے کاموں کے ذریعے لوگوں کے کام آنے کی کوشش کریں۔ یہ کوششیں ہمیں اپنی توانائیوں کو مثبت سمت لے جانے کا سبب بنتی ہیں اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ، ساتھ ہمیں کسی قسم کا پچھتاوا اور رنج نہیں ہوتا بلکہ ہم خوشی، خوشی اس دنیا سے رخصتی کی تیاری کرتے ہیں۔

۲: اللہ کا کرم ہے کہ رواں سال میں مجھ سے

کوئی ایسی قابلِ ذکر غلطی یا کوتاہی تو نہیں ہوئی جس کا مجھے پچھتاوا ہو لیکن مصروفیات کے باعث میں اپنی آنے والی کتاب کے لیے وقت نہیں نکال پا رہی ہوں جس کا مجھے یقیناً افسوس ہے۔ نئے سال میں میری کوشش ہوگی کہ میں اپنی آنے والی کتاب پر زیادہ سے زیادہ توجہ دوں۔

زبیر الدین

(سابق نیوز کاسٹر پاکستان ٹیلی وژن)

ا: یہ وقت کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا، اس لیے اپنے آج کو انجوائے کرو۔ اچھا وقت گزر رہا ہو تو اچھے اثرات اور اگر برا وقت گزر رہا ہو تو اس سے بھی اچھے اثرات کیونکہ انسان غلطیوں سے سیکھتا ہے۔ ویسے اب تو کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ کیونکہ آنے والا کل بھی گزرے ہوئے کل جیسا لگتا ہے۔

۲: نہ تو غلطی کی گنجائش ہے اور نہ اصلاح کی اس لیے میں کہتا ہوں کہ جانے انجانے میں اگر ۲۰۱۴ء میں مجھ سے آپ کا دل دُکھا ہو تو اس کے لیے ۲۰۱۵ء میں



زبیر الدین

بھی تیار رہنا کیونکہ صرف کیلنڈر بدلے گا ہم نہیں۔

ربیعہ اکرم

(پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان کراچی)

ا: مٹا سکو تو مٹا دو دلوں کے ویرانے
وگرنہ شہر بسانے سے کچھ نہیں ہوتا

ہم اس زندگی میں مثبت تبدیلیاں لائیں اور جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ کی تفسیر بن جائیں۔

۲: غلطیوں کو دُہرانا سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے۔ لہٰذا ماضی کی غلطیوں کو پسِ پشت ڈال کر آئندہ ان سے اجتناب برتا جائے گا تاکہ آنے والے مہ و سال



ربیعہ اکرم

میرے لیے تمام تعمیری و مثبت پیغام لے کر آئیں۔

سہیل احمد صدیقی

(ٹی وی میزبان)

ا: ہار دینا نہ ہمت کہیں
ایک سا وقت رہتا نہیں

اور اگر ہمت ہار دی تب؟



سہیل احمد صدیقی

وہ چاٹ لیتا ہے دیمک کی طرح مستقبل
تمہیں پتا نہیں ماضی جو حال کرتا ہے

۲: وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

لہٰذا ہر پل، ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا اور گزشتہ غلطیوں کو دُہرانے سے گریز کرنا ہوگا۔

عنبرین حسیب عنبر

(شاعرہ)

بُجز محبت یہ زندگی کیا ہے
گردشِ ماہ و سال ہے شاید

طے شدہ بات ہے کہ انسان جو بیج بوتا ہے اسی کی فصل کاٹتا ہے۔ لہٰذا گزرے ماہ و سال کا آئندہ زندگی پر اثر لازمی ہے بسا اوقات یہ اثرات نسل در نسل بھی مرتب ہوتے ہیں۔ سو، انسان کو بساط بھر کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ وہ گلاب کی فصل لگائے ببول کی نہیں۔

یہ اپنی روح میں بن کر ببول چبھتی ہے
زمینِ دل میں عداوت اگایئے کیونکر



عنبرین حسیب عنبر

ہر سال ہونے والی کوتاہی اس سال بھی سرزد ہوئی ہے اور وہ ہے اللہ اور اس کے نبی ﷺ کے ذکر میں کمی..... کیونکہ تمام تر عبادات کے باوجود یہ احساس دامن گیر رہتا ہے کہ

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لہٰذا کوشش اور دعا بھی ہے کہ اگلے سال اس کوتاہی کو پورا کرنے کی توفیق حاصل ہو (آمین)

قیصر خان نظامانی

(ٹی وی آرٹسٹ، پروڈیوسر، صحافی)

ا: گزرتا وقت مجھے شدت سے یہ احساس دلاتا ہے کہ ہم ترقی یافتہ ممالک سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ تعلیم، ٹیکنالوجی، اقدار، اخلاقیات..... سب سے بڑھ کر اقدار میں اور اس کے اثرات؟ ظاہری بات ہے جب ہم نے اپنے آنے والے کل کے لیے کچھ نہیں کیا تو اس کے اثرات بھی منفی ہی مرتب ہو سکتے ہیں..... جہل بو کر علم کی توقع عبث ہے۔ ہماری آنے والی نسل آج کے ماہ و سال کو سامنے رکھتے ہوئے جہالت کا ہی پیغام دے سکتی ہے۔



قیصر خان نظامانی



وجاہت علی عباسی

۲: جب تک ہم دوسروں پر انحصار کرتے رہیں گے کہ فلاں شخص یا فلاں ملک ہمارے حالات سدھارے گا...... ناممکن جو غلطیاں ہو چکیں سو ہو چکیں dent لگ گئے سو لگ گئے۔ اب نئی گاڑی چاہیے اور وہ ایک سال میں آئے یا دو سال میں۔

وجاہت علی عباسی
(کالم نگار)

۱: Steve jobs نے کہا تھا کہ "آپ کی زندگی محدود ہے اسے کسی اور کی زندگی جی کر ضائع نہ کریں۔ جو حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کی طرف کام کیجیے" ہر گزرتا سال ۹۰ فیصد لوگوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ میں نے زندگی کا ایک اور سال ضائع کر دیا، اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کی طرف پہلا قدم نہیں اٹھایا۔ دو چیزیں ہو سکتی ہیں یا تو انسان خود کو بدلنے کی کوشش کرے گا یا پھر اگلے سال پھر یہی سوچے گا کہ ایک اور سال ضائع ہو گیا۔

۲: اول تو ہمارے یہاں لوگ اپنی غلطی مانتے ہی نہیں لیکن میں کوشش ضرور کروں گا اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بھی اور آئندہ اس سے گریز کر کے اس کی تلافی کی بھی۔

نوشین نوشی
(مصنفہ)

۱: وقت کا کام ہے آنا اور گزر جانا، پہلے نئے سال کا انتظار بھی رہتا تھا۔ وش کرنا، کارڈز، میسجز اور پھر status update مگر اب احساس ہونے لگا ہے کہ یہ سیکنڈز، منٹس، گھنٹوں دنوں مہینوں کا کھیل تو بس ایک بہانہ ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق "یہ دنیا ایک انگلی کے برابر ہے اور آخرت ایک سمندر کی طرح وسیع و بے کنار" اب خود سوچیے، انگلی کو سمندر میں ڈبو دیں تو سمندر کی وسعت کے سامنے اس کا کیا وجود اور حقیقت؟ سو گزرتے مہ و سال ایک واضح پیغام دیتے ہیں کہ ہر دن عمر کے اس سفر کو بتدریج گھٹا رہا ہے اور ہر لمحہ جو ہاتھوں سے پھسل رہا ہے یہ پھر کبھی نہیں آئے گا۔ زندگی میں ہم جو بوتے ہیں وہی کاٹنا بھی پڑتا ہے، ہاں اس میں بھی شک نہیں کہ کچھ آزمائشیں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں مگر گزرتے مہ و سال کے بے حد گہرے اثرات ہماری زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ تکلیف دہ یادیں

جسم و ذہن دونوں پر اذیت ناک اور دیرپا اثرات چھوڑتی ہیں جن کو مٹتے کبھی سال اور کبھی پوری عمر گزر جاتی ہے۔

۲: روز وشب کے مدار میں ہم سے بہت سی غلطیاں ایسی سرزد ہوتی رہتی ہیں جن کو ہم ایک تسلسل سے دُہراتے چلے جاتے ہیں۔ مگر افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہم غلطی کرنے کے باوجود اسے غلط تصور نہیں کرتے تو اس کی اصلاح کی طرف خاک دھیان دیں گے؟ میں اپنی تمام غلطیوں اور کوتاہیوں پر نادم ہوتے ہوئے اللہ سے دعا کرتی ہوں میری گزشتہ تمام کوتاہیوں کو اپنے رحم و کرم کے صدقے معاف فرمائے، آمین۔

امینہ عندلیب

(معلمہ)

گزرے ہوئے مہ و سال خوشیوں اور غم سے جڑے ہوتے ہیں۔ ہر گزرتا پل ہمیں پیغام دیتا ہے کہ غم کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے اپنے اندر حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کریں کہ یہ مصائب اور تکلیفیں اللہ کی طرف سے ہمارے لیے آزمائشیں ہی تو ہیں جو ہمیں با مقصد زندگی کی جانب مائل کرتی ہیں، اس پیغام پر عمل کرنے کے اثرات بھی خوشگوار ہوتے ہیں۔ مایوسی اور نا امیدی کو میں اپنی مضبوط قوتِ ارادی سے شکست دے دیتی ہوں۔ اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اگر مجھے آزمائش میں ڈالا ہے تو حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی دیا۔ اگر سالِ رواں کا جائزہ لوں تو بظاہر کوئی غلطی یا کوتاہی سرزد نہیں ہوئی اور اگر جانے انجانے میں ایسا ہو جائے مجھ سے کسی انسان کا دل دُکھا ہو یا پھر اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات کی تعمیل میں کوتاہی ہوئی تو اپنے مزاج کے مطابق معافی مانگے بنا سو بھی نہ پاؤں گی خواہ وہ غلطی یا کوتاہی ادنیٰ درجے ہی کی کیوں نہ ہو۔ اور آئندہ کے لیے محتاط ہو جاؤں گی۔

☆☆☆

قارئینِ کرام!

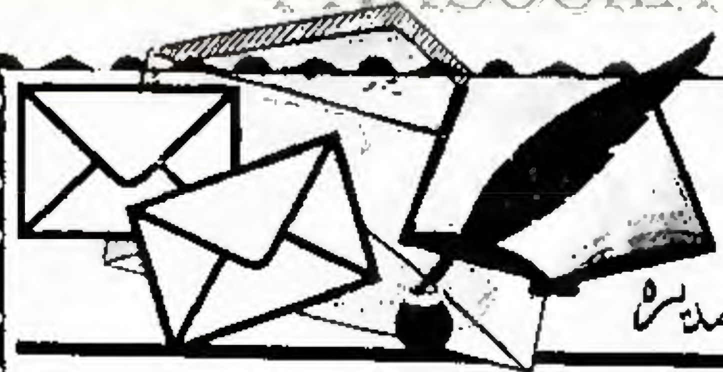
حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کر دیکھا تو سب خسارہ ہے

اور یہ ''تمہیں'' اگر ''وقت'' ہے تو اس کا بروقت اور درست استعمال نہ کرنے سے خسارے ہی ہماری زندگی میں آتے ہیں۔ گزرتے ہوئے مہ و سال نے مجھے ایک ہی پیغام دیا ہے کہ اب بھی وقت ہے سو وقت کی قدر کرنا سیکھ لو۔ گیا وقت بھی واپس نہیں آتا اس کے اثرات بھی ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' کے تحت مرتب ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم وقت کی غیر منصفانہ تقسیم سے نامکمل رہ جانے والے کاموں کی طرف دھیان دیں تو یقیناً اس کے مثبت نتائج سامنے آئیں گے اور یہ جب ہی ممکن ہے جب ہم اپنی زندگی کو نظام الاوقات کے مطابق ڈھال لیں۔ وقت کے درست استعمال ہی سے سالِ رواں میں سرزد ہونے والی غلطی یا کوتاہی کی تلافی ممکن ہے۔ دور کیوں جاؤں میری اپنی مثال سامنے ہے، سالِ رواں کے آغاز ہی میں ارادہ کیا تھا کہ اس سال قرآن حکیم کی معلومات پر مبنی اپنی کتاب ''بحرِ بیکراں'' پر زیادہ سے زیادہ کام کروں گی۔ زیادہ کام تو بڑی بات ہے معمولی سا وقت بھی نہ دے سکنے کے سبب اپنے ارادے اور مقصد میں ناکام رہی۔ اس کوتاہی کی تلافی کے لیے انشاء اللہ آئندہ زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی کوشش کروں گی اس یقین کے ساتھ کہ

راہِ عمل میں جذبۂ کامل ہو جس کے ساتھ
خود اس کو ڈھونڈ لیتی ہے منزل کبھی کبھی

سعیِ مسلسل کے سفر میں آپ سب کی دعائیں بھی تو میرے ساتھ ہیں ناں۔





بہنوں کی محفل

مدیرہ

★ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

★ حمد وستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود وسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

★ پیاری بہنو! زندگی میں بعض مرتبہ ایسے مقامات ضرور آتے ہیں جن میں فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے..... ایسے میں دل و دماغ تک مفلوج سے ہو جاتے ہیں کہ کسی ایک کی مان لینے میں بھی دکھ کی بستی دل میں آباد ہی رہتی ہے۔ ایسا ہی کڑا وقت لندن میں رہنے والی ہماری ایک قاری بہن پر آیا۔ پاکستان میں اس کے اکلوتے بھائی کی شادی تھی اور اس کے سر پھرے شوہر نے اس سے کہا اگر تم اپنے بھائی کی شادی میں پاکستان جاؤ گی تو تم واپس نہیں آؤ گی..... پھر اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ ہمیشہ پاکستان میں ہی رہنا..... ایک ایسا شوہر جس نے اپنی بیوی سے نہ کبھی محبت کی ہو اور نہ کبھی اس کی عزت..... جب دل چاہے اسے گالیاں سنا دے اور جب جی چاہے اسے طلاق کی دھمکیوں سے خوف زدہ کرتا رہے..... ایسے میں اس عورت کا اگر یہ دل چاہے کہ اس زندگی سے نجات حاصل کرلوں اور اپنے میکے کی خوشی میں شریک ہو جاؤں اور کبھی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھوں تو کوئی غلط احساس نہیں تھا مگر وہ تذبذب کا شکار تھی کہ وہ بے شک ظالم شوہر تھا مگر بچیوں کا باپ بہت اچھا تھا، گھر میں کمانے کی ذمے داری بھی اسی کی تھی۔ وہ دیگر مردوں کی طرح اس پر شک بھی نہیں کرتا تھا..... بس اس کا جلال اس بات سے ہمیشہ شروع ہوتا تھا کہ وہ کبھی اپنے میکے والوں کا نام نہیں لے گی..... اس کے میکے سے اس کے دل میں ایک کینہ سا تھا۔ اس لڑکی نے مشورے کے لیے مجھے فون کیا..... باجی..... میں تھک چکی ہوں..... اب اگر اپنے اکلوتے بھائی کی شادی میں نہیں گئی تو میں مر جاؤں گی..... میں نے سوچ کر کہا۔ بیٹا..... اپنی اولاد، بہن بھائیوں سے زیادہ ہوا کرتی ہے۔ تمہارا شوہر واقعی تم پر ظلم کر رہا ہے۔ مگر جہاں تم نے اتنے ظلم سہے ہیں ایک اور سہہ لو کیونکہ تمہاری طلاق کا سب سے بڑا نقصان تمہاری بچیوں کو ہوگا۔ وہ لڑکی میری بات سن کر خاموش ہو گئی۔ نہ اس نے یہ کہا کہ میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گی اور نہ ہی اس نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ہر صورت اپنے بھائی کی شادی میں پاکستان آئے گی۔ کافی دنوں تک مجھے بھی یہ ملال رہا کہ شاید میں نے اسے غلط مشورہ دیا۔ ایک اکلوتی بہن کی ڈھیر ساری خوشی اپنے اکلوتے بھائی کے ساتھ ہوا کرتی ہے اور وہ لڑکی تو یقیناً مر گئی ہوگی اور میں نے اپنے اوپر نفرین تک بھیجی..... کہ جب مجھے کوئی بات خود سمجھ میں نہ آئے تو اپنی رائے بھی نہیں دینی چاہیے۔ بہرحال اس بات کو کئی مہینے بیت گئے اور آج اس بہن کا خوشی سے چہکتا فون آیا ہے اور اس نے بتایا کہ وہ اپنے اکلوتے بھائی کی شادی میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ خاندان کے لوگوں نے میرے شوہر کو بے حد برا بھلا کہا مگر انہوں نے کہا کہ میری بیوی خود ہی نہیں گئی۔ اور اس بات کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ان موسم سرما کی تعطیلات میں وہ مجھے ساتھ لے کر ہمارے گاؤں جائیں گے اور میں یہ سمجھتی ہوں کہ یہ اس کے صبر کا انعام ہے کہ اس کے شوہر کے مزاج میں ملائمت آ گئی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے مگر پھر بھی نہیں کھاتے اور کاش یہ پھل کھانے کی اللہ ہمیں توفیق دے اور استعداد بھی دے۔

یہ 2014ء کا آخری شمارہ ہے یہ سال ختم ہونے پر جہاں دو رکعت شکرانہ ادا کریں وہاں دو رکعت توبہ کے بھی ضرور ادا کیجیے گا اور اس کے ساتھ، ساتھ آج ان تمام لوگوں کو دل سے معاف کر دیں..... جنہوں نے آپ کا دل دکھایا ہو، چغلی کی ہو، غیبت کی ہو، آپ کو گرانے کی کوشش میں ایسی باتیں لوگوں سے کی ہوں جن میں کوئی سچائی بھی نہیں تھی۔ بے شک اللہ سب سے بڑا ہے اور عزت دینے والا ہے..... لوگوں کی خوشنودی اور دوستی حاصل کرنے کے بجائے اللہ کی خوشنودی اور دوستی کے طلب گار بن جائیں..... یقین

کیجیے آپ کے دشمنوں کے دلوں میں بھی آپ کی محبت کا پودا سر اٹھالے گا۔(انشاءاللہ)

اور اب آیئے اپنی سرگرمیوں کی جانب مگر اس سے قبل صرف ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لاالہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں (نوٹ) یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیتِ کریمہ کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب اپنی بہنوں کی سرگرمیوں سے ذرا آگاہ ہوتے ہیں کہ کون کیا کچھ کر رہا ہے۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ معروف مصنفہ رفاقت جاوید، اسلام آباد کا بیٹا اور بہو اُن سے مل کر واپس امریکا جا چکے ہیں۔ رفاقت کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کی دو کتابیں بہت جلد شائع ہو کر آنے والی ہیں (ماشاءاللہ)

☆ معروف مصنفہ خالدہ نسیم، لندن سے پاکستان آ چکی ہیں اور ان دنوں اپنے عزیز و اقارب کی تقاریب میں لاہور میں مصروف ہیں۔

☆ معروف شاعرہ شگفتہ شفیق اپنے دوست احباب سے ملنے کے لیے لندن گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ گزشتہ دنوں پاکیزہ کی معروف شاعرہ فریدہ فری کے شعری مجموعے محبت یادرکھوں گی کی تقریب رونمائی الحمرا ادبی بیٹھک لاہور میں ہوئی۔ جس کی صدارت اعتبار ساجد نے کی۔ دیگر مہمانوں کے ساتھ شاعرہ نسیم نیازی، زمر نعیم اور رضوانہ کوثر بھی شامل تھیں۔ (مبارک باد)

☆ مصنفہ سلمیٰ غزل، کراچی کی بیٹی ڈاکٹر کہکشاں اپنے شوہر اور ساس کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کر کے ... واپس آ گئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ گزشتہ دنوں کراچی میں ہونے والے خواتین کے ایک مشاعرے میں ہماری دو معروف شاعرات شگفتہ شفیق اور زہرہ جنید نے بھی شرکت کی اور بے حد داد پائی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز قاسم، آسٹریلیا سے پاکستان آئی ہوئی ہیں اور ان دنوں وہ کراچی میں ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز گل خان، کراچی آئندہ چند روز میں اپنی نئی کوٹھی میں شفٹ ہو رہی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار، پرائیویٹ طور پر انٹر کا امتحان دے رہی ہیں۔ واضح رہے اس پیاری سی لڑکی نے صرف ہمارے کہنے پر اپنی تعلیم کا ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ شروع کیا ہے۔ (ماشاءاللہ اور بہت ساری دعائیں)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مونا وقار، لاہور اور مسز خان، کراچی نے گزارش کی ہے۔ قارئینِ پاکیزہ ان کے لیے بطورِ خاص دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پریشانیوں کو دور فرمائے۔ (آمین)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار انجم نگلز اب شازیہ محبوب کے نام سے لکھا کریں گی۔ ان کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ان دنوں راولپنڈی گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ ارسلا ارمین، پنجاب بیٹا آپ اپنا نیا قلمی نام رکھنا چاہتی ہیں۔ ضرور رکھیے..... مگر اتنی جلدی نام چینج نہیں کرنا چاہیے۔ باقی آپ کی مرضی۔

☆ معروف افسانہ نگار، سفرنامہ نگار، سلمیٰ اعوان، لاہور کا ہند یاترا کے بارے میں دوسرا سفرنامہ آ گیا

ہے۔(ماشاءاللہ)

☆اس ماہ ہمارے پاس سندھی زبان کا ایک شعری مجموعہ تبصرے کے لیے آیا ہے، جسے نور افشاں، شکار پور نے ہمیں بھیجا ہے۔ کتاب کا نام ہے نم جی چانوری ہیٹ اور شاعرہ ہیں محترمہ عذرا سرور...... اس نام کا مطلب یہ ہوا کہ میں نیم کی چھاؤں تلے، فلیپ پر مہتاب اکبر راشدی کی رائے درج ہے...... جس میں انہوں نے عذرا کے مشاہدے، تجربے کو آج کی عورت کے حوالے سے بہترین قرار دیا ہے۔ اس خوب صورت مجموعۂ کلام کی قیمت صرف سو روپے ہے۔ حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں۔ ناری پبلیکشن۔ 443/3 صدر حیدر آباد سندھ۔

☆آپ کی باجی انجم انصار کی کتاب انمول خزانے کی دعائیں اور آزمودہ ٹوٹکے اور علاج اضافی دعاؤں اور روحانی مشوروں کے ساتھ نیا ٹائٹل لیے ہوئے یہ ضخیم کتاب شائع ہو کر اردو بازار میں موجود ہے۔ جس کی قیمت صرف تین سو روپے ہے۔ براہِ راست منگوانے کے لیے رابطہ کیجیے۔ القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور۔فون نمبرز۔042.37668958.042.37652546۔

☆یہ نیوز ہمیں ڈی جی خان سے ملی ہے۔ پاکیزہ کی معروف مصنفہ نیر رانی ڈی جی خان، آنچل تنظیم کی چیئر پرسن ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کی زیرِ صدارت ایک تقریب ہوئی۔ جس میں معروف مصنفہ فرحانہ ناز ملک کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور ان کے کام کو سراہا گیا مرحوم شاعر جاوید احسن کے لیے بھی مغفرت کی دعا کی گئی۔ واہگہ بارڈر کے شہدا کے لیے بھی دعا کی گئی اور مسیحی جوڑے کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے اس کے خلاف مذمتی قرار داد پیش کی گئی آخر میں شہدائے کربلا کے لیے محفلِ مسالمہ ہوئی۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض معروف شاعر ایمان قیصرانی نے انجام دیے...... اور مہمانِ اعزازی بھی معروف شاعرات تھیں۔ جن کے اسمائے گرامی...... پروفیسر بشریٰ قریشی، ڈاکٹر نجمہ شاہین اور ڈاکٹر شاہینہ نجیب کھوسہ ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مصنفات اور تبصرہ نگار زرین زبیر کوٹھاری اور نزہت جبیں ضیا کی رہائش گاہ پر مرحومہ فرحانہ ناز ملک کے لیے فاتحہ خوانی اور دعائے مغفرت کا اہتمام کیا گیا اور مرحومہ کو ایصالِ ثواب پہنچایا گیا۔

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار مہوش مشعل، احمد پور شرقیہ کی والدہ بیمار ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ ہم سب کی لاڈلی تبصرہ نگار اور شاعرہ امینہ عندلیب، سلانوالی بے حد بیمار ہیں۔ گزشتہ ہفتے ان کا بی پی 30/20 تک چلا گیا تھا۔ آپ سب ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں ظفر، کراچی ہنوز بسترِ علالت پر ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار نجمہ ناز اصغر، کراچی کی والدہ ان دنوں بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی ہنوز بسترِ علالت پر ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عنبرین ندیم، کراچی کی والدہ نیر بیگم کو فالج ہو گیا ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ شعیب، سوات علیل ہیں۔

☆ ہماری پیاری مصنفہ سیما مناف، کراچی تا حال بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ فرزانہ فری، لاہور ہنوز بسترِ علالت پر ہیں۔

انتقالِ پُرملال

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری کی والدہ عائشہ خان کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ ڈاکٹر ثروت ممتاز صدیقی کی والدہ اور خاندان بھر کی سب کی چہیتی تہذیب باجی انتقال کر گئیں۔
☆ پاکیزہ کی قاری نورینہ عالیہ، کراچی کی اس ماہ برسی ہے۔
نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کی دعا کریں۔

☆ نسیم آمنہ، کراچی سے۔ ''ہاکر کی پرانی مہربانیوں کی وجہ سے پچھلے دو ماہ کے پاکیزہ پڑھ نہ پائی تھی۔ پرسوں رات حیدرآباد سے بڑی بہن زینت شاہ نے فون پر بتایا کہ پاکیزہ میں فرحانہ ناز ملک کے بارے میں خبر آئی ہے۔ اس خبر نے ایک دم شاکڈ کر ڈالا۔ صبح ہوتے ہی دونوں شمارے مارکیٹ سے منگوائے۔ اتنی پیاری رائٹر، اتنا بڑا سانحہ...... یقین پھر بھی نہیں آتا تھا۔ ایک ہی خاندان کے چار افراد یوں ایک ساتھ اچانک حادثے کا شکار ہو جائیں تو اس گھر میں کس قیامتِ صغریٰ کا عالم ہوگا۔ تصور کیا جا سکتا ہے، یہ عظیم صدمہ پیچھے رہ جانے والے کس طرح سہہ پائیں گے۔ بس اللہ ہی جانتا ہے۔ وہ بے نیاز بادشاہ ہے، آزمائش دیتا ہے، ساتھ میں صبر دیتا ہے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور دانیال کو صحت کاملہ، سب گھر والوں کو صبر و حوصلہ عطا فرمائے۔ حوصلے کی یہی دعا غزالہ فرخ کے لیے بھی ہے۔ پاکیزہ کے پچھلے شمارے میں ان کے بھائی کے بارے میں پڑھا بہت دکھ ہوا۔ غزالہ دکھ کی اس گھڑی میں ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تمہیں اتنی ہمت دے کہ تم اپنے آپ کو سنبھالو اور اپنی محبت و شفقت سے اپنے بھائی کے بچوں کو ان کی کمی محسوس نہ ہونے دو، آمین۔ انجم میں یوں بھی محفل میں خط لکھنے کا سوچ رہی تھی...... وجہ اور کیا ہوگی، وہی غضب جو ملائشیا کی سیر نے ڈھایا ہے اور ہر طرف عظمیٰ کا چرچا ہو رہا ہے۔ اتنی سادگی، روانی، برجستگی اور شگفتگی تھی تحریر میں کہ سفرنامہ ختم ہو گیا مزید پڑھنے کی تشنگی رہ گئی۔ اب کیا ہے عظمیٰ نے اپنی ماں کی صحیح جانشین ہونے والا کام۔ لفاظی میری عادت نہیں مگر بہت دنوں بعد واقعی کوئی تحریر اتنی دلچسپ لگی تھی کہ پڑھ کر لطف آگیا۔ خاص کر بچوں کی بار، بار گنتی اور جہاز میں ٹیبل کھولنے اور کھٹ سے بند کرنے والا سین۔ کیپ اٹ اپ عظمیٰ اور نئے سفر کے لیے کمر کس لو۔'' (پیاری نسیم آمنہ ایک طویل عرصے کے بعد تمہارا خط ملا ہے اور اب پھر مت غائب ہو جانا ورنہ زینت کے ساتھ تمہارے گھر آنے کا سوچوں گی)

☆ اقبال بانو، وہاڑی سے۔ ''پاکیزہ مجھے بہت پسند ہے اور اس کے سب سلسلے ہی زبردست ہیں۔ مجھے کچھ کہنا ہے، میں واقعۂ کربلا کی اہمیت اور قربانی کا جو نمونہ ہمیں ملتا ہے، آپ نے بتایا بہت اچھا لگا۔ اختر شجاعت، دین کی باتیں بتا رہی ہیں۔ علم، معرفتِ الٰہی سبحان اللہ اختر کے افسانے آج بھی یاد ہیں اور یہ باتیں تو کبھی بھلانے والی نہیں۔ ناول اور افسانے پسند آئے...... نایاب جیلانی کا ناولٹ تو ناول ہو گیا ہے۔ ویسے تجسس سے بھرپور ہے...... حیا بخاری کا مکمل ناول اچھا لگا۔ قرۃ العین ہاشمی، فرح طاہر اور فرحین اظفر کے افسانے پسند آئے۔ عظمیٰ آفاق کی ڈائری ہمیشہ کی طرح پسند آئی مگر اس سے پہلے عظمیٰ کے سفرنامے کا ذکر ضرور کروں گی یار زبردست تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہم بھی عظمیٰ کے ساتھ ہیں۔ عظمیٰ مزاح بھی اچھا لکھتی ہیں اور سفرنامہ بھی مزے کا ہے۔ عظمیٰ اب تم زبردست ناولٹ لکھ ڈالو۔ شاعری کیوں چھوڑ دی، نظمیں لکھو بھئی۔ سیما سراج ہماری ہم عصر ہیں، ماشاء اللہ بہت زبردست لکھتی تھیں۔ شاعری پڑھ کر لگتا تھا یہ بھی میرے دل میں تھا...... لکھنے سے باز تو نہیں آتی ہوں گی۔ سیما سراج یہ بتاؤ وہ نظمیں، غزلیں کہاں چھپا کر رکھی ہیں......؟ بھئی ہمیں پڑھائیں پاکیزہ میں چھپوائیں۔ نزہت اصغر نے انٹرویو بہت اچھا لیا...... مزہ آ گیا...... مزہ تو مجھے غزالہ نگار اور کزنی اور قیصرہ حیات کے انٹرویو پڑھ کر بھی آیا تھا۔ شائستہ زریں اور حیا ترمذی کے مضامین اچھے لگے اور جلترنگ...... ہاہاہا...... بس ہنستے جاؤ۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ...... تمام پاکیزہ بہنوں کو میرا اسلام کہیں اور جلد میں لکھوں گی پاکیزہ کے لیے۔ انشاء اللہ۔ عذرا رسول صاحبہ مجھ سے خفا نہ ہوں آپ لوگوں کی محبت اور خلوص کی میں مقروض ہوں۔ عذرا جی اور نزہت جی کو میرا اسلام۔'' (خوب صورت تبصرے کا شکریہ...... اب جلدی سے آ جاؤ...... تمہارے سلام کے جواب میں دعاؤں کے ٹوکرے......)

☆ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ''نومبر کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے اور واقعۂ کربلا سے متعلق آپ کی مختصر مگر خوب

صورت (مجھے کچھ کہنا ہے) تحریر پسند آئی۔ اس کے بعد دین کی باتوں نے سوچ وادراک کے در کھول دیے۔ بے شک عالم بے عمل سے ہمیں اللہ بچائے۔ کہاں ہیں وہ لوگ وہ اساتذہ ... اور امائیں، وادیاں جو باتوں، باتوں میں کہانیوں کی شکل میں اپنے بچوں کی ذہنی تربیت کرتی تھیں۔ آج کے دور کا استاد یہ موبائل، انٹرنیٹ اور ساری سائنسی فضولیات نے ہماری نئی پود کو برباد کر دیا ہے۔ گھر میں کھانے کو روٹی نہیں ہوگی مگر ہاتھ میں موبائل فون ضرور ہوگا۔ پروردگار آگے کی نسلوں نے اور کیا دیکھنا ہوگا۔ اس بات نے ہر ایک کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ دوسروں کی آمد و رفت پر نظر اور جاسوسی...... ہمارے معاشرے میں ایسے کردار بہت ہیں۔ سیما یاسمین مجتبٰی کی کہانی شروع کرتے ہی میں جان گئی تھی کہ وہ ضرور بلی ہوگی جو بالآخر تھیلے سے باہر آگئی۔ سیما ہمیشہ منفرد موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں۔ جنگل کا پھول کہانی آہستہ، آہستہ بڑھ رہی ہے اور رنگ جلتش ایک زاہد خشک، خود پسند انسان کی کہانی ہے۔ انجام کیا ہوگا......؟ دوسرا رخ ایک اچھی مخلص دوست نے اپنی دوست کا گھر اجڑنے سے بچالیا۔ غلط راہ پر ڈالنے والے بہت ہوتے ہیں مگر صحیح راہ دکھانے والے کم...... کہ یہ دنیا ہے۔ زندگی بدلتی ہے، میں واقعی سب کی زندگی بدل گئی۔ دھجیاں نوجوان لڑکیوں کے بہکے قدم روکنے کے لیے بہترین نصیحت کہ گھر کی دہلیز پار کرنے والیاں ساری زندگی اپنا اعتبار کھو بیٹھتی ہیں۔ سیما سراج صاحبہ کے خوب صورت انٹرویو سے لطف اٹھایا...... ہماری معلومات میں اضافہ ہوا، ہماری نظم شائع کرنے کا شکریہ...... نوازش۔ مستقل سلسلے شاندار، جلترنگ اور پاکیزہ ڈائری کے ساتھ ساتھ روحانی صفحہ بے حد پسند آیا۔ جلترنگ میں بی اے کی ڈگری والا کالم مزہ دے گیا۔'' (شکریہ)

بھ ظلِ شاہین، رحیم یار خان سے۔ ''ہمیشہ کی طرح آغاز دین کی باتوں اور اداریے سے کیا۔ اداریہ حسبِ حال امام عالی مقام، اہلِ بیت رسول ﷺ کی لازوال قربانی کے بارے میں لفظ، لفظ بہترین اور حق سچ ہے۔ اس بار سب سے پہلے محترمہ ناہید سلطانہ اختر کا ناولٹ، زندگی بدلتی ہے پڑھا۔ ٹاپک ذرا ڈفرنٹ تھا۔ ویسے تو اسٹوڈنٹ ٹیچر کے مابین اکثر اس قسم کے افسانے پڑھنے کو ملتے ہیں مگر یہاں ٹیچر اسپیشل پرسن تھے اور کہانی منفرد انداز میں آگے بڑھی۔ فلزا کی محبت مستقل مزاجی اور ایثار و قربانی سے گندھی ہوئی تھی۔ ایسے لوگوں کی عظمتوں اور سچی محبتوں کو سلام کرنا چاہیے۔ ایک بات کا مجھے دکھ ہوا اور اچھی ہی نہیں لگی جب مونس کے والد نے فلزا کو سخت باتیں کہیں۔ یہ سرزنش اگر مونس کی والدہ کرتیں تو زیادہ مناسب تھا کہ وہ بھی ایک عورت تھیں۔ بہر حال ناہید آپا نے ہمیشہ ہی اصلاحی ادب پیش کیا اور یہ کہ سچی کہانی تھی۔ اہم کون...... سیما مجتبٰی کی کہانی جس کی تصویر پر بلی کو دیکھ کر اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ افسانہ کسی جانور کے متعلق ہی ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ پالتو جانور سے بہت محبت ہو جاتی ہے۔ کئی برس پہلے ہم نے بھی ایک ڈوگی پالا ہوا تھا جس کا نام بنی رکھا تھا چند سال بعد جب وہ مرگیا تو ہر گھر کا ہر فرد رنجیدہ رہا۔ بہت دنوں تک ہم سب اسے یاد کرتے رہے اور میں تو بہت روتی تھی...... اس کے بعد ہم نے پھر کبھی جانور نہیں پالا۔ باجی جان آج ہمارے معاشرے میں دہشت گردی عام ہے اخلاقی اقدار کو پامال کیا جارہا ہے۔ ایسے میں انسانی جان کس قدر غیر محفوظ اور بے وقعت سی ہو کر رہ گئی ہے کہ انسان کی اہمیت جانور کی سی ہوگئی ہے لیکن اب بھی نسلِ انسانی میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو انسان تو کیا جانور کے دکھ بھی محسوس کرتے ہیں۔ پری، ناہید فاطمہ حسنین اکثر بہترین افسانے دیتی ہیں، لکھنے کا ہنر جانتی ہیں۔ کہانی کا آغاز تو خوشگوار اور مزاحیہ انداز میں ہوا۔ ڈائیلاگ بھی اچھے رہے مگر کیا آج کل کا لڑکا جو سوشل میڈیا سے بھی اس قدر اٹیچڈ ہو وہ اپنی ذات کے لیے اپنی محبت کے لیے اتنا بزدل ہو سکتا ہے کہ ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد بھی والدین کو اپنے دل کی بات نہیں بتا سکا۔ ایسی تو گائے آج کل کی لڑکیاں بھی نہیں۔ اور پھر مصنفہ نے یہ کیا، کیا کہ ہیروئن کی شادی کہیں اور کروادی۔ جہاں اتنے برس کا انتظار کیا تھا دو ماہ اور کر لیتیں والدہ پری کی۔ اینڈ پڑھ کر دکھ ہوا، سچ کہا ہے کسی نے کہ ہر جذبہ اظہار چاہتا ہے۔ بہر حال محترمہ سیما سراج کا انٹرویو پڑھا، اچھا لگا ہم بھی ان کی ذہانت اور علمیت کے مزید قائل ہوگئے ہیں۔ دیگر مستقل سلسلوں میں روحانی مشورے، پاکیزہ ڈائری بہترین ہے۔ اپنی نظم پاکیزہ ڈائری میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' (تبصرے کا شکریہ)

٭ شگفتہ سحر فیروز، سیالکوٹ سے۔ ’’اکتوبر کا پاکیزہ ہمیشہ کی طرح لیٹ ملا۔ سر پر دوپٹا اوڑھے ماڈل اچھی لگی۔ کیا کریں آنٹی جی پاکیزہ لیٹ ملے گا تو ایسا ہی ادھورا سا تبصرہ کریں گے ناں...... دین کی باتوں سے مستفید ہونے کے بعد ایک دو افسانے ہی پڑھ سکی۔ فرح طاہر قریشی کی سوچنے کی بات اچھی لگی۔ سیما سراج سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ نگہت سیما سے بھی ملاقات کروا دیں جلدی سے۔ (انشاء اللہ ضرور) باقی تمام مستقل سلسلے بھی اچھے تھے، پاکیزہ ڈائری زبردست تھی (شکریہ) آنٹی جی بزم پاکیزہ دوبارہ شروع ہو جانا چاہیے (اچھا جی) فرحانہ ناز ملک کے حادثے کی خبر دل دہلا گئی۔ بالکل بھی یقین نہیں آ رہا۔‘‘ (ہاں، ایسا تو سب کو ہی لگ رہا ہے۔ آپ اس کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں)

✉ شازیہ قاسم، کھڈیاں خاص، قصور۔ آپ اپنے مراسلات صفحے کے دونوں جانب لکھ دیتی ہیں۔ آئندہ احتیاط کریں...... آپ کی اچھی تحریریں بھی شائع ہونے سے رہ جاتی ہیں۔

✉ انمول پنجاب۔ پیاری بٹی تمہاری پریشانی کوئی پریشانی ہے ہی نہیں...... اکثر لڑکیاں کھانا پکانا شادی کے بعد سیکھتی ہیں۔ تم بھی سیکھ جاؤ گی۔ اب تو مسالوں کے ڈبوں پر کھانا پکانے کی ترکیبیں درج ہوتی ہیں۔ فی الحال ان کو ہی آزماؤ...... ہاں مسالے والی بریانی کی بے حد آسان ترکیب میں تمہیں فون پر بتا دوں گی۔ اب پریشان ہونا چھوڑ دو۔

✉ کمیرا یونس، بلدیہ کراچی۔ آپ کے خط میں لکھے گئے سیل نمبر پر میں نے بارہا فون کیا مگر ہمیشہ بند ملا۔ آپ کی تحریریں قابلِ اشاعت ہیں۔ دیگر باتوں کے لیے آپ مجھ سے اس نمبر پر بات کر سکتی ہیں۔ میرا نمبر ہے۔ 021.36981952

✉ حیا ترمذی، کاغان۔ پیاری بٹی ماشاء اللہ آپ بہت ٹیلینٹڈ ہیں۔ آپ نے پہلی مرتبہ کچھ لکھا اور بہت اچھا لکھا۔ ہمارے قارئین نے آپ کی تحریر کو خصوصی طور پر پسند کیا ہے۔ شکریہ تو ہمیں آپ کا ادا کرنا ہے، ہاں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے۔ مشکور رہوں گی۔

٭ ارم نعیم، گجرات سے۔ ’’انجم باجی کسی بھی رسالے کے لیے...... میرا یہ پہلا، پہلا رابطہ ہے۔ میں پاکیزہ کے علاوہ بھی دیگر ڈائجسٹ اور رسائل کا مطالعہ کرتی ہوں۔ پاکیزہ اور دیگر ڈائجسٹوں میں ایک بات عام طور پر لکھی جاتی ہے کہ شادی ایک جوا ہے۔ جب نکاح سنت ہے تو ہم شادی کو جوا کیسے کہہ سکتے ہیں۔‘‘ (پیاری ارم سب سے پہلے تو اس محفل میں خوش آمدید...... آپ نے بالکل صحیح بات کی ہے۔ جب نکاح کرنا سنت نبوی ﷺ ہے تو پھر ہم شادی کو جوا ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ انشاء اللہ آپ اس طرح کا کوئی فقرہ آئندہ پاکیزہ میں تو ہرگز نہیں پڑھیں گی۔ اتنی اچھی بات بتانے کے لیے جزاک اللہ)

٭ شبنم توصیف، راولپنڈی سے۔ ’’پاکیزہ کا سرورق اچھا لگا...... اور مجھے سب سے زیادہ تعریف عظمیٰ آفاق کے سفرنامے کی کرنی ہے۔ جب میں پڑھتی تھی تو اسی طرح کے جملے بولا کرتی تھی...... بہرحال اتنی عمدگی سے تھی کہ پڑھ کر مزہ آ گیا...... پلیز اب آپ عظمیٰ سے ناولٹ یا ناول لکھوائیں...... ناول نگاروں میں میری موسٹ فیورٹ رائٹرز عنیزہ سید، شیریں حیدر اور نایاب جیلانی ہیں...... مجھے ان سب کی تحریریں بے حد پسند ہیں پلیز ان تک میری مبارک باد اور میرا سلام ضرور پہنچا دیں۔‘‘ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

٭ ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس سے۔ ’’نگہت سیما، رفاقت جاوید اور نایاب جیلانی کے ناولوں کی اقساط پسند آئیں...... عظمیٰ آفاق کی اس مرتبہ کوئی تحریر نہیں تھی۔ ہم پڑھنا چاہتے ہیں آپ عظمیٰ سے کہیں کہ وہ کوئی افسانہ ہی لکھ دیا کرے...... یا اس کا پاکستان کے شمالی علاقہ جات پر لکھا گیا سفرنامہ پاکیزہ میں شائع کر دیں کہ ہم بھی تو دیکھیں...... کہ وہاں کیسی پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں۔ سیما سراج کا انٹرویو اچھا تھا مگر تصویریں اس سے زیادہ اچھی تھیں۔ عنیزہ سید، نایاب جیلانی کا انٹرویو جلدی لگائیں۔‘‘ (آپ کی تمام فرمائشیں نوٹ کر لی گئی ہیں جو پوری بھی کی جائیں گی۔ انشاء اللہ)

٭ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ’’ناولوں کے بعد حیا بخاری کا مکمل ناول بے حد پسند آیا۔ افسانوں میں روشانے... عبدالقیوم، سیما یاسمین مجتبیٰ اور فرح طاہر قریشی نمایاں رہیں۔ شائستہ زریں کا خصوصی مضمون بہت عمدہ رہا...... سیما سراج کا

انٹرویو اچھا رہا کاغان کے بارے میں حیا ترمذی نے بڑی اچھی معلومات دیں۔ (حیا ترمذی، کاغان میں رہتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے واقعی بڑے بھرپور انداز میں لکھا ہے حالانکہ یہ ان کی پہلی تحریر تھی۔) بہنوں کی محفل کا مزہ ہمیشہ ہی مختلف ہوتا ہے۔ خاص طور پر بچیوں کو سمجھانے کا انداز بے حد موثر ہے۔''پیاری شگفتہ میں اپنی بہنوں کو سمجھاتے ہوئے یہی سوچ رکھتی ہوں کہ وہ میری اپنی بچیاں ہیں..... اور ان کو ہر وہ بات ضرور بتاتی ہے جو انہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اور الحمدللہ میری یہ بچیاں مجھ پر ٹرسٹ بھی کرتی ہیں اس لیے میری باتیں مان لیتی ہیں)

☜ نجمہ اصغر، کراچی سے۔ ''پاکیزہ پڑھا اور منہ سے بے اختیار واہ نکلا...... ناول، ناولٹ اور افسانے تو اچھے ہی تھے مگر کاغان کے بارے میں حیا ترمذی کا مضمون اچھا لگا۔ اداریہ تو بہترین تھا۔ اختر شجاعت نے علم، معرفتِ الٰہی بہت عمدہ لکھا..... اور اب میں بات کروں گی ان مستقل سلسلوں کی جو پاکیزہ میں مجھے بے حد پسند ہیں۔ جلترنگ، بہنوں کی محفل اور انٹرویو کا سلسلہ سیما سراج سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' (نجمہ آپ کا تبصرہ پڑھ کر ہمیں بھی دلی خوشی ہوئی)

☜ زینت شاہ، حیدر آباد سے۔ ''پہلے میں اپنا تعارف کرادوں کہ میں آپ کی پاکیزہ کی رائٹر نسیم آمنہ کی بڑی بہن ہوں اور میں بھی بفضلِ خدا رائٹر ہوں۔ نسیم آمنہ شاہ میری چھوٹی بہن بھی ہیں اور میری دیورانی بھی ہیں۔ (سچ سچ بتانا کہ کبھی دیورانی اور جیٹھانی میں لڑائی ہوتی ہے یا نہیں) پاکیزہ سے وابستگی کتنی زیادہ ہے اس بارے میں صرف یہ سمجھ لیں کہ گھر کا سودا بعد میں آتا ہے اور پاکیزہ پہلے آتا ہے اور اس میں ہم سب گھر والوں کا پسندیدہ سلسلہ جلترنگ ہے اور ''کمینی سی خوشی'' جس طرح آپ نے لکھی تھی وہ سب کے دل کی آواز تھی۔ ہاں عظمیٰ آفاق کا سفر نامہ ہمیں بہت پسند آیا تھا۔ (پیاری زینت اس محفل میں خوش آمدید..... پاکیزہ کی پسندیدگی کے لیے مشکور ہوں اور رہی بات کمینی خوشیوں کی تو جب دوسرے کا دکھ اپنی خوشی کا روپ دھارے تو اسے کمینی سی خوشی ہی کہا جاسکتا ہے)

☜ شبنم کنول، پاپانگری سے۔ ''ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ علم، معرفتِ الٰہی زبردست جارہا ہے۔ قیصرہ حیات سے بھرپور گفتگو بہت اچھی رہی، جلترنگ کی سرگوشیاں اچھی لگیں۔ پھر ہم نے سیدھی چھلانگ لگائی اعتبارِ وفا کی طرف۔ نگہت سیما آنٹی تسی تے گریٹ ہو۔ جب کہانی سپرہٹ ہو... تو اک دم بہت مبارک باد ہو۔ زاہدہ پروین، سعدیہ عزیز آفریدی، ہما قادری، شبانہ شوکت سب نے بہت اچھا لکھا۔ میں اکثر گنگناتی ہوں اس دفعہ بھی زبردست رہا بلکہ پورے کا پورا پاکیزہ ہی زبردست ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

☜ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ''قیصرہ حیات کا انٹرویو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بہت اچھا لکھتی ہیں اور بہت اچھی اور اسلامی انفارمیشن کے ساتھ لکھتی ہیں۔ ناہید فاطمہ حسنین کا بھرپور تبصرہ تھا۔ خصوصاً واہگہ بارڈ کی تقریب کا بہت مزہ آتا ہے۔ اس قسم کی تقریبات میں جبکہ مدِمقابل انڈیا ہو۔ صائمہ اکرم کا جنجوعہ ہاؤس مستی سے بھرپور تھا۔ ہر ہر جملہ مزاح سے بھرپور تھا۔ خاص کر پپو کے گھر کو جی ایچ کیو ہیڈ کوارٹر کا نام دیا اس جملے نے تو بہت زیادہ محظوظ کیا، طنز و مزاح سے بھرپور تھا۔ ویل ڈن صائمہ..... کیپ اٹ اَپ ام ثمامہ کا بوجھو تو جانیں اینڈ تک سمجھتے رہے کہ کسی لڑکی کا قصہ ہے۔ اینڈ میں سمجھ پڑی کہ یہ تو بلوگائے نکل آئی۔ رفاقت جاوید کا رنگِ خلش اچھی موضوعاتی اسٹوری شروع ہوئی ہے۔ بشریٰ گوندل کی تحریر سبق آموز تھی۔ جلترنگ میں سزا اور مزے کا تھا، مارکیٹ اور اسٹیشن کے علاوہ جس کا گھر مین روڈ کے بھی نزدیک ہو اس کی زندگی عذاب ہوتی ہے۔ بچے کو شو شو بھی آیا ہو تو گھر رستے میں پڑتا ہے۔ ہر کوئی حاضری کے لیے ضرور آئے گا۔ مجھے اب بھی نہیں بھولتا۔ میرے ابو نے گھر کے ساتھ ایک درخت کے سائے میں بڑے، بڑے مٹکے پانی کے فکس کرائے تھے مسافروں کے لیے اور روز گلاس غائب ہوتے تھے پھر آخر یہ حل نکالا کہ پیپسی کی بوتل کاٹ کر گلاس بنا کر لٹکا دیے جائیں کم از کم دکھ تو نہیں ہوگا۔ ہم پاکستانی ہر معاملے میں کرپٹ ہوتے جارہے ہیں جبھی تو نا اہل حکمران ہمارے اوپر عذاب کی صورت مسلط ہیں۔ اللہ ہم سمیت سب کو ہدایت دے۔ فرحانہ ناز ملک کے انتقال کی خبر سن کر بہت رنج ہوا۔ بہت دل دکھی ہوا۔ اللہ ان کے اہلِ خانہ کو صبر دے۔ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

☜ تسنیم قریشی، کوہاٹ سے۔ ''کافی عرصے بعد صائمہ اکرم کی ہلکی پھلکی تحریر پڑھنے کو ملی بہت اچھی لگی اور صائمہ پلیز پہلے کی

طرح اپنے بھرپور تبصروں کے ساتھ بہنوں کی محفل میں حاضر ہوا کرو۔ سارہ ملک نے بھی اچھا لکھا بے شک ہم انسان اللہ کی نعمتوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہیں اور بعض لوگ سچ اتنا کھاتے ہے کہ پھر کسی کام کے نہیں رہتے۔ زیادہ کھانا ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اہلِ صبر نے دکھی کر دیا۔ عجب عاقبت نااندیش بھائی تھا کہ خود اپنے ہاتھوں بہن پر سوکن لا دی۔ ام ایمان نے بھی اچھے موضوع پر لکھا زندگی میں اکثر ایسے لوگوں کا سامنا ہوتا رہتا ہے جو پڑھے لکھے جاہل ہوتے ہیں۔ اعتبارِ وفا کی دوسری قسط بھی اچھی لگی اور باقی تحریریں ابھی پڑھی نہیں۔ قیصرہ حیات سے ملاقات پسند آئی۔ قیصرہ حیات سے ملاقات بھی ان کی تحریروں کی طرح خوب صورت لگی۔ غزالہ فرخ کی تحریر نے دکھی کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے بھائی کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ غزالہ فرخ اور ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اینہ عندلیب کے لیے ڈھیر ساری دعائیں اللہ تعالیٰ انہیں شفائے کاملہ عطا فرمائے۔'' (اللہ آپ کو بھی ہمیشہ خوش و خرم رکھے)

☆ المیس جبار خان، آزاد کشمیر سے۔ ''باجی آپ نے پاکیزہ میں میرا خط شامل کیا مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ پاکیزہ میں واقعی سب کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور یہ محفل ہمیں بے حد پسند ہے۔ اختر شجاعت کا علم، معرفتِ الہٰی کا اختتام بھی بہت پسند آیا۔'' (پیاری المیس تمہیں خوش دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہو رہی ہے۔ ہاں اختر شجاعت تک آپ کی رائے پہنچا دی گئی ہے)

☆ رابعہ عمران چوہدری، رحیم یار خان سے۔ ''اکتوبر کا پاکیزہ خاصا لیٹ ملا اشتہارات سے کودتے ہوئے نگہت سیما کے سلسلے وار ناول کی طرف بڑھے۔ ابھی تو دوسری قسط ہے نگہت سیما کیا جادو چلائیں گی یہ تو آگے جا کر پتا چلے گا۔ نگہت سیما کا ناول پڑھتے ہوئے نظر اپنی تصویر پر جا رکی۔ لو جی مجھے تو لگتا ہی نہیں تھا کہ میری شادی کا احوال آپ کو ملا ہوگا۔ واہ جی واہ کمال ہو گیا۔ آنٹی انجم بہت تھینکس کہ آپ کو ہم یاد ہیں۔ آپ نے ڈائجسٹ میں میرے ناول و افسانے پڑھے ہوں گے۔ عنقریب پاکیزہ کے لیے اپنی تحریریں روانہ کروں گی۔ دراصل شادیاں اتنی اٹینڈ کرنی ہیں کہ ٹائم ہی نہیں مل رہا۔ اتنی برائیڈل ہیں کہ میں فی الحال ان پر توجہ دے رہی ہوں جی تو سویٹ آنٹی اب آتے ہیں شمیم فضل خالق کی تحریر کی طرف کافی اچھی اسٹوری تھی مگر آج کل ایسے دوست ملنا بڑا مشکل ہے جو مرنے کے بعد بھی رابطے میں رہیں۔ آج کل کی دوستی پر تو وہ مثال سوٹ کرتی ہے۔ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات...... بہر حال تحریر کافی اچھی لگی۔ سعدیہ عزیز آفریدی کی تحریر میری گڑیا ٹاپ آف دی لسٹ رہی۔ دو سطحے کی اس کہانی میں کیا کچھ نہیں تھا۔ آنٹی میری امی والوں کا جہاں گھر ہے وہاں ساتھ ہمسائیوں کا ایک لڑکا جس کے چار بچے ہیں، دو بیٹے، دو بیٹیاں اس لڑکے نے محلے کی چھ سالہ بچی سے زیادتی کی اور آپ یقین کریں اسی عمر کی اس کی اپنی بچی بھی ہے۔ پہلے ٹی وی میں سن لیا اخبار میں پڑھ لیا۔ اب جب آس پاس اس طرح کے واقعات دیکھے...... قسم سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ نہ جانے کیسے بے حس جانور لوگ ہیں۔ اللہ پاک سب کی بیٹیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور بیٹوں کو ہدایت دے، آمین۔ سارہ ملک نے اچھی تحریر لکھی۔ ام ثمامہ نے خوب لکھا۔ بشریٰ گوندل کی تحریر پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے اور تمام سلسلے لاجواب رہے۔'' (پاکیزہ کی تحریریں پسند کرنے کا شکریہ ... آپ نے جو واقعہ لکھا ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہم سب دین سے دور ہیں۔ آپ سب اپنے چھوٹے بچوں کا بھی ایسے ہی خیال رکھا کریں جیسے جوان بچوں کا)

☆ فرزانہ نگہت، راولپنڈی سے۔ ''ماہ اکتوبر کا پاکیزہ حسبِ روایت بہت عمدہ اور خوب صورت پایا۔ شمیم فضل خالق کی میں ہمیشہ بڑی فین رہی ہوں۔ اس وقت سے جب وہ دوشیزہ میں لکھا کرتی تھیں۔ تمام افسانے، ناول، مضامین اپنی جگہ بہترین تھے۔ جلترنگ روح میں ترنگ پیدا کرنے والا سلسلہ ہے، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ...... اس زمانے میں ہونٹوں پر مسکراہٹ لانا ہی بڑی نیکی ہے...... آپ کے زیرِ ادارت پاکیزہ واقعی عروج پر پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی پیدا کردہ جدتیں اور اضافے قابلِ تحسین ہیں۔ میری طرف سے محترمہ عذرا رسول کو سلام کہہ دیجیے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ، عذرا رسول بھی آپ کو سلام کہتی ہیں)

☆ فرحت احمد، کراچی سے۔ ''تمام علیل بہنوں کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جلد از جلد صحت یابی نصیب کرے، آمین اور ان تمام بہنوں کو میری جانب سے تعزیت پہنچا دیجیے گا...... جن کے پیارے ان سے جدا ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان

سب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر عطا فرمائے، آمین...... باجی بہنوں کی محفل میں آخر میں اچانک محترمہ فرحانہ ملک ناز کا پڑھ کر میں شاک میں رہ گئی...... دیر تک بیٹھی افسوس کرتی اور سوچتی رہی ان کے پڑھے ہوئے افسانوں کے بارے میں سچ بے حد رنج ہوا۔ اتنی اچانک اور حادثاتی موت...... یقین نہیں آرہا تھا بالکل ایسے ہی جیسے محترمہ شازیہ چوہدری کا پڑھ کر بھی بے یقینی تھی۔ پاکیزہ کا دسمبر کا شمارہ فرحانہ ناز ملک نمبر ہوگا یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی اور آپ کے لیے دل سے ڈھیروں دعائیں نکلیں۔ واقعی وہ اس کی مستحق ہیں اور ہم سب بھی ان کے گھر والوں کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ سلسلے وار ناول اعتبار، وفا اور رنگ خلش دونوں ہی اچھے لگ رہے ہیں۔ ترکِ وفا تجسس سے بھرپور ایک اچھا ناولٹ ہے بس اب اینڈ ہو جانا چاہیے۔ ناہید سلطانہ صاحبہ کا زندگی بدلتی ہے بہت اچھا لگا اور یہ حقیقی کہانی ہے۔ یہ پڑھ کر تو بہت خوشی ہوئی۔ جنگل کا پھول بھی اچھا جا رہا ہے۔ حیا بخاری کا ناول کرچیاں محبت کی بے حد پسند آیا۔ آخر خودداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ یعنی اس مرتبہ سلسلے وار ناول، منی ناول، ناولٹ، مکمل ناول سب ہی بہت پسند آئے۔ افسانوں میں سوچنے کی بات...... ام کون، بدلتی رتوں میں، دوسرا رخ، پری، دھجیاں، ع عورت م مجبور، سب ہی اچھے لگے مگر پری اور دھجیاں سب سے اچھے لگے۔ محترمہ سیما سراج سے ملاقات بھرپور رہی۔ میں اور میرا شہر کاغان نے بہت اہم معلومات بہم پہنچائیں۔ باقی تمام مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح بہت اچھے لگے۔ میں تو انہیں سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔“ (پسندیدگی کا شکریہ، ہاں آپ کے افسانے جلد شائع ہوں گے)

رفاقت جاوید، اسلام آباد سے۔ ”سب سے پہلے ان بہنوں کا خصوصی شکریہ ادا کروں گی جنہیں میرا ناول پسند آرہا ہے اور اپنی ان دوستوں کا بھی شکریہ جنہوں نے فون کر کے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا...... محترمہ عذرا رسول کا بھی شکریہ جنہوں نے فون کر کے میرے ناول کی تعریف کی اور اب اس شکایت کی جانب...... جنہیں میرا طرزِ تحریر مشکل لگا ہے۔ اس بارے میں عرض کردوں۔ اب تو میں بہت آسان انداز میں لکھ رہی ہوں۔ آپ میرا پہلا ناول سفرِ جاوداں پڑھیے کہ اس کی تحریر قدرے مشکل ہے۔ بہرحال مزید کوشش کروں گی مگر کیا کہوں کہ یہ میرا انداز ہے۔ میں نے ادبی موضوعات پر چونکہ زیادہ لکھا ہے...... اسی لیے یہی انداز میرے اندر رچ بس گیا ہے۔ ملائشیا میں بھی جا چکی ہوں مگر عظمیٰ آفاق کا ملائشیا کا سفرنامہ پڑھ کر اتنا مزہ آیا ہے کہ میں خوب ہنسی ہوں۔ ہاں اکتوبر، نومبر کے شائع ہونے والے تمام افسانے بہت عمدہ تھے۔“ (تبصرے کا شکریہ آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

ایک بہن، مقام نامعلوم...... نے تمام رائٹرز سے پوچھا ہے کہ کیا کوئی ایسی آیت یا حدیث موجود ہے جس کے مطابق انجوائے منٹ کے لیے لکھنا پڑھنا اور خاص طور پر بامقصد قصہ کوئی جس کو ڈرامائی انداز میں لکھا گیا ہو۔ (بہنیں توجہ دیں)

تسنیم منیر علوی، دبئی سے۔ ”تمہید طولانی آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی۔ آخر جلترنگ جیسی پُرمزاح طنز و مزاح میں بھی تو سب پوشیدہ ہوتا ہے اور سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں جو نہ سمجھے وہ اناڑی ہے۔ جب پانی میں آگ لگ سکتی ہے تو...... بہرحال ناچیز موسمِ گل کے لیے سراپا منتظر ہے۔ (بس یہ جاڑا گزر جائے تو موسمِ گل آنے ہی والا ہے) اس سے پہلے یہ تمہید طویل ہو کر اپنا اثر کھو بیٹھے بات کے اصل پر آتے ہیں۔ رفاقت جاوید کے ناول نے ہمیں قلم اٹھانے پر مجبور کیا...... ناول کیا ہے ایک عورت کی انتہا سے زیادہ مستقل مزاجی، ہمت و طاقت کی لازوال داستان ہے۔ بعض دفعہ زیادتی ہر چیز کی بری ثابت ہوتی اب جیسے انتہائی ذہانت آئی کیو لیول ہائی...... اس پر زورِ قلم خوب اور بہت خوب انسانی نفسیات پر گرفت بھی مضبوط نظر آئی۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے پروین شاکر پر کتاب تصنیف کی ہے۔ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ سرسید کالج میں تھیں انٹر کے بعد آنرز کرنے جامعہ کراچی چلی گئی تھیں۔ فرح طاہر کی سوچنے کی بات، ایک پُراثر کہانی ہے بات تو اکثر معمولی ہوتی ہے مگر اثرات گہرے ہوتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کان دو ہیں کہ زیادہ سنا جائے اور زبان صرف ایک ہے کہ کم بولا جائے۔ سیما یاسمین کی کہانی گو کہ ایک عام سی کہانی تھی مگر اندازِ نگارش نے...... اس کو خاص بنا دیا۔ بدلتی رتوں میں شاہدہ ملک نے ایک عام سی اسٹوری لکھی۔ دوسرا رخ میں بھی وہ ہی صورتِ حال ہے کم و بیش ہر لکھاری نے اس کو موضوع بنایا۔ کوئی ندرت یا نیا پن نہیں تھا...... زندگی بدلتی ہے، ناہید سلطانہ اختر کا خوب صورت اور حقیقت سے ہم آہنگ افسانہ ہے اب ایسی حوصلہ مند لڑکی کی کہانیوں، افسانوں میں ہی نظر آسکتی ہے فی زمانہ ذرا مشکل ہے......

روشانے نے خوب لکھا اور جم کر لکھا۔ دل ایک نازک شیشہ ہے۔ جب اس طرح کے فیصلے جذبات میں ہوں گے تو صلے میں گالیاں اور طعنے مقدر ہوں گے...... ناہید فاطمہ حسینین نے پری لکھ کر انسان کی اس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جستجو میں جنون شامل ہو جاتا ہے تو سامنے کی چیز نظر نہیں آتی پھر سوائے پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اچھا تاثر چھوڑا۔ پچھلے دنوں عظمیٰ ہنی کا سفر نامہ نظر سے گزرا لکھنے کا انداز بیاں بہت دلچسپ تھا اس کو اس پر توجہ دینی چاہیے تو ایک اچھا سفر نامہ تخلیق کر سکتی ہے، ویل ڈن ہنی...... انجم کی جلترنگ ہمیشہ کی طرح خوب ترنگ میں ہے۔ ہاں سیما سراج ہماری پسندیدہ شاعرہ اور لکھاری ہیں، ہر سید میں ہی ہوتی تھیں نہ جانے کون سے سن میں ہم بھی سحر میگزین کے ایڈیٹر اور سیکرٹری رہے...... سیما کی کئی نظمیں ہماری بیاضِ دل میں رقم ہیں۔ یاد تازہ ہوئی، بھولے ہوئے فسانے کی۔ ہمارے تمام ساتھی اور عذرا رسول کو بہت سلام......'' (سیما سراج کا انٹرویو...... آپ کو ماضی میں لے گیا...... ایسا ہم چاہتے بھی ہیں...... ہاں تبصرے کا شکریہ)

✿ سیدہ رفعیہ ابدالی، کراچی سے۔'' سب سے پہلے اداریہ پڑھا جو بہت پسند آیا۔ ناولٹ دونوں ہی بہت پسند آئے۔ فرح طاہر قریشی کی تحریر سوچنے کی بات نے ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ واقعی لڑکیوں کے بارے میں بعض عورتیں بہت سی غلط باتیں پھیلا دیتی ہیں۔ نایاب جیلانی کا ترکِ وفا بہت پُراسرار ہے۔ بدلتی رتوں میں، شاہدہ ملک نے ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائی کو بے نقاب کیا ہے۔ قرۃ العین ہاشمی کی تحریر نصیحت آموز تھی۔ بہت سی بہنوں کو شاید یہ بات معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کو جائز کیا ہے لیکن جائز کاموں میں طلاق اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ کام ہے۔ دھجیاں بھی بہت پسند آئی۔ اس ماہ کی سب سے بہترین تحریر شائستہ زریں کی تھی۔ میری طرف سے انہیں مبارک باد کے ٹوکرے بھجوا دیں۔ سیما سراج سے ملاقات بہت زبردست رہی۔ وادیٔ کاغان کی سیر بہت اچھی لگی۔ بہنوں کی محفل ہمیشہ کی طرح شاندار رہی تھی اس میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس نے مجھے حیران کر دیا۔ میری امی تو کہتی تھیں کہ جب اولاد ہو جائے تو عورت اپنے لیے نہیں جیتی ہے بلکہ وہ اپنی اولاد کے لیے جیتی ہے۔ زندگی کی ہر خوشی وہ اپنی اولاد سے حاصل کرتی ہے۔ جو بہنیں بیمار ہیں اللہ تعالیٰ انہیں شفائے کاملہ عطا کرے اور جن بہنوں کو اپنے پیاروں کی دائمی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا ہے اللہ تعالیٰ انہیں صبرِ جمیل عطا فرمائے اور جن بہنوں کو خوشیاں ملی ہیں انہیں ڈھیروں مبارک باد...... پاکیزہ ڈائری کے لیے عظمیٰ آفاق کی کاوشوں کو نہیں سراہنا ناانصافی ہوگی۔ عظمیٰ آپ بہت محنت سے اسے سجاتی ہیں۔ جلترنگ میں نجات پڑھ کر بے حد ہنسی آئی۔ میں اکثر گنگناتی ہوں میں اپنا شعر دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپی! اب میں جو بات آپ کو اور قارئین کو بتانے والی ہوں تو آپ میری طرح حیران رہ جائیں گی۔ میری امی نے اپنی بیماری سے پہلے یہ بات بتائی کہ میری امی اور خالہ بھی لکھتی تھیں۔ مجھے پتا نہیں کیوں یقین نہیں آیا۔ امی نے کہا تم اپنی خالہ جان سے تصدیق کر سکتی ہو۔ میں نے فون پر خالہ جان سے پوچھا تو انہوں نے بھی کہا کہ ہاں میری امی اور دونوں خالہ بھی لکھتی تھیں۔ میں نے امی سے کئی سوال کیے کہ وہ کیا لکھتی تھیں اور کس رسالے میں لکھتی تھیں تو انہوں نے بتایا کہ وہ عصمت، زیب النساء، تہذیبِ نسواں میں افسانے لکھا کرتی تھیں۔ امی نے بتایا تھا کہ 80 سال پہلے عورتیں اپنے نام سے نہیں لکھتی تھیں اسے بہت معیوب سمجھا جاتا تھا تو امی نے بتایا کہ بڑی خالہ اماں ''اکبر'' اور دوسری خالہ ''نور'' اور میری امی ''اصغر'' کے نام سے لکھتی تھیں۔'' (جی ہاں اب تو اپنی تصویر کتاب کے سرورق پر لگائی جاتی ہے۔ آپ کی امی بالکل ٹھیک کہتی تھیں مگر اب جن خواتین کے دماغ میں خناس بھر جاتا ہے وہ ایسی ہی باتیں کرتی ہیں)

✿ مسز فرح امجد، لاہور سے۔'' میری طرف سے میری تمام بہنوں کو پہلے اسلامی مہینے محرم الحرام کی بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو شہدائے کربلا کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کی طرح صبر، حوصلہ، عزم اور ثابت قدمی عطا فرمائے، آمین آپی مجھے خصوصی طور پر ہر دل عزیز مصنفہ فرحانہ ناز ملک کی وفات کا پڑھ کر دلی طور پر بہت دکھ ہوا یقین کریں کہ یہ افسوسناک خبر پڑھ کر میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ آپی میں خاص طور پر تعریف کروں گی نگہت سیما کے اعتبارِ وفا اور رفاقت جاوید کے رنگِ خلش کی یہ دونوں ناول موضوع کے لحاظ سے انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔ باقی تمام سلسلے خوب صورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔'' (نگہت سیما اور رفاقت جاوید شکریہ کہہ رہی ہیں)

٭ ام ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ سے۔ ''پاکیزہ سائٹل بہت اچھا لگا۔ محرم الحرام کے حوالے سے پُر اثر اداریہ دل پر اثر کر گیا۔ اختر شجاعت کے خوب صورت اور دل پذیر سلسلے کا خوب صورت اختتام ہو گیا۔ سب سے پہلے بہنوں کی محفل کی طرف دوڑ لگائی کہ پاکیزہ کا سب سے خوب صورت اور اثر انگیز سلسلہ یہی ہے۔ بہنوں کے دلچسپ خطوط کے ساتھ ساتھ آپ کے جوابات جو توجہ، محبت اور شفقت پر مبنی ہوتے ہیں اس محفل کا مزہ دوبالا کر دیتے ہیں۔ اپنے خط کی باری پر آپ نے خوشخبری سنائی کہ میرا ناولٹ قابلِ اشاعت ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی اشاعت کی خوشخبری بھی سنائیے گا۔ نگہت سیما، ماضی کے ساتھ ساتھ حال کی دلچسپیوں کو بھی ساتھ لے کر چل رہی ہیں۔ عظام کا تعلق یقیناً رواحہ کے بابا سے کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ فرح طاہر قریشی نے چھوٹے سے افسانے میں بڑی بات ظاہر کی کہ لڑکیوں کی عزت شیشے سے بھی زیادہ نازک ہوتی ہے۔ ذرا سی دراڑ آنے پر زندگی میں کئی آزمائشوں سے سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اور بات کرنے والا سوچتا تک نہیں کہ اس کی تو زبان کا چٹخارا ہو گیا اگلے کی پوری زندگی داؤ پر لگ گئی۔ نایاب جیلانی صاحبہ سے اتنا کہنا ہے کہ ذرا کہانی کے ٹیمپو کو تیز کر دیں ویسے اس قسط میں انہوں نے مون کی شخصیت کو تو کسی حد تک کھول ہی دیا ہے۔ رنگِ خلش موضوع تو منفرد ہے لیکن تھوڑا سا اس کے بھاری پن کو کم کریں رفاقت جی باقی ٹھیک ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کو بہت کم پڑھا لیکن جب بھی پڑھا اچھا لگا۔ جتنے بھی رنگ دکھائے ٹھیک ہی دکھائے۔ ناہید فاطمہ حسنین کا شروع میں ٹھیک ٹھاک افسانہ آخر میں اداس سا ہو گیا۔ ویسے اس بار مجھے تو نومبر کا شمارہ اداس لگا سوائے جلترنگ کے کھٹے میٹھے رنگوں کے۔ روشانے عبدالقیوم بھی اس بار حوا کی بیٹی کو ذلت کے گڑھے میں گرنے سے بچاتی دکھائی دیں۔ حیا بخاری کا ناول بھی ٹھیک تھا۔ مجھے لگا کہ حیا نے اس کو کچھ زیادہ ہی طویل کر دیا ہے۔ بہرحال اینڈ اچھا کیا انہوں نے روایتی انداز سے ہٹ کر..... شائستہ زریں کا بچوں اور ان کے مسائل پر مبنی مضمون بہت سی حقیقتیں مزہ دے گئی۔ پاکیزہ کا دسترخوان اچھا تھا لیکن کسی بھی سوئیٹ ڈش کی ترکیب پر اب دل سے صرف آہ نکلتی ہے شوگر کی بیماری کے بعد کیونکہ اس سے پہلے میں میٹھے کی بہت شوقین تھی اور ہر میٹھے کی ڈش ضرور کوشش کرتی تھی بنانے کی۔ اب تو دیکھ کر صرف ٹھنڈی سانس ہی بھر کے رہ جاتی ہوں۔ روحانی مشورے میں تمام دعاؤں سے مستفید ہوتے ہوئے خود سے عہد کیا کہ آخر میں دی گئی تین تسبیحات تو ضرور ہی زندگی کا معمول بنانی ہیں انشاء اللہ..... سب سے آخر میں فرحانہ ناز ملک جن کی ڈیتھ کا سن کر چار پانچ روز میں بے حد ڈسٹرب رہی حالانکہ کبھی ملاقات نہیں ہو پائی اور آپ کو بھی اسی وقت اطلاع دی جب مجھے پتا چلا۔ بہت دل کیا ان کے گھر جا کر ان کے بچوں سے ملنے کو لیکن ہمت نہیں ہوئی کہ کیسے اور کن الفاظ میں ان معصوموں کو دلاسا اور تسلی دی جائے گی۔'' (بے شک)

٭ سارہ ملک، راولپنڈی سے۔ ''اپنا افسانہ شائع ہونے کے بعد بہنوں کے تبصروں کا انتظار تھا۔ دونوں انتظار مکمل ہوئے تو قلم اٹھایا۔ سب سے پہلے تو انجم آنٹی آپ کا اور پاکیزہ کا بہت، بہت شکریہ..... میری پہلی، پہلی کاوش کو اپنے کثیر الاشاعت پرچے میں جگہ دینے کا..... میں ہر ماہ ایک آس کے ساتھ فہرست دیکھتی تھی اور پھر خود کو صبر کی تلقین کرتی تھی کہ ابھی تو ابتدا ہے، وقت لگتا ہے، یوں اکتوبر کا شمارہ بھی بے دلی سے کھولا تھا اور بغیر کسی امید کے فہرست پر محض سرسری نگاہ دوڑائی تھی کہ نگاہ اپنے نام پر جم گئی۔ لکھاری بہنیں اپنی پہلی تحریر شائع ہونے پر اپنے جو تاثرات اب تک قلم بند کرتی رہی ہیں وہ سب سمجھ میں آنے لگے تھے۔ میرے شوہر کو بھی بے انتہا خوشی ہوئی۔ (یہ تو بہت اچھی بات ہے) کیونکہ ہر ماہ پوری پابندی سے ڈائجسٹ مجھے وہی لا کر دیتے ہیں۔ میرے افسانے خط یا کوئی بھی تحریر کوریئر بھی وہی کراتے ہیں اور بخوشی کراتے ہیں۔ سو انہوں نے کہا تمہاری اور میری محنت وصول ہو گئی۔ دیگر عزیزوں کو بھی بے حد خوشی ہوئی۔ اور اب نومبر کے شمارے میں اپنے افسانے پر تبصرے پڑھ کر مزید اچھا لگا۔ مجھے تو لگا تھا کہ کافی کڑی تنقید ہوگی لیکن بڑی نوازش ہے میری قاری بہنوں کی کہ انہیں میرا افسانہ اس قدر پسند آیا۔ پہلی، پہلی کاوش پہ پہلا، پہلا تبصرہ ہے سو میں اپنی ان ساتھیوں کا دل سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے اتنی تعریف کر کے میرا ایچ بی بڑھا دیا۔ آپ تمام بہنیں انجم آنٹی کے بعد میری حوصلہ افزائی کرنے والوں میں سرِفہرست رہیں گی۔ میرا دل ہمیشہ آپ کی محبتوں کا قدر دان رہے گا۔ آپ سب کا بے حد شکریہ۔ نومبر کے شمارے میں جو افسانہ دل کو چھو گیا وہ ناہید سلطانہ اختر کا زندگی بدلتی ہے تھا۔ اس افسانے کو پڑھتے ہی گویا دل سے آواز نکلی، واہ..... رنگِ خلش میں رفاقت جاوید نے بے حد آئیڈیل ماں دکھائی ہے۔ خدا ہر ماں کو اس قدر عقل مند، معاملہ فہم

بتائے (رفاقت جاوید عملی زندگی میں خود بھی ایسی ذمے داریاں ہیں) نایاب جیلانی سے انکشافات میں تیزی لانے کی درخواست ہے۔ بلاشبہ منکشے ہی مون ہے۔ منکشے جرمن زبان میں چاند کو ہی کہتے ہوں گے اور اگر ایسا ہی ہے تو نایاب آپ ذی شاہ کو امتحان میں ڈالنے لگی ہیں۔ (یہ تو آپ کو آئندہ قسط میں ہی معلوم ہوگا کہ امتحان کس کا ہوگا) ویمن رائٹرز فورم کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔ انٹرنیٹ پر کوئی ایڈریس نہیں ہے میں ان کی ممبر بننا چاہتی ہو آپ مجھے گائڈ کر دیں۔'' (مجھے اس فورم کا ایڈریس معلوم نہیں ہے اگر کسی بہن نے بھیجا تو بتا دیا جائے گا)

✉ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ''ٹائٹل پاکیزگی کے ہالے میں لپٹا ہوا اچھوتا احساس جگا رہا تھا۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح ٹاپ پر رہا۔ سلسلے وار ناول، اعتبار وفا آہستہ آہستہ اعتبار جما رہا ہے۔ ترکِ وفا اسرار در اسرار اب لگتا ہے پنڈورا باکس کھلے گا؟ جنگل کا پھول بہت ہی زبردست ٹریک پر چل رہا ہے۔ منظر نگاری اور احساسات و محسوسات کا اظہار بہت ہی شاندار ہے۔ رنگِ خلش دوسری قسط میں عادل صاحب پیدا ہوئے اور جوان بھی ہو گئے کیا رفتار ہے۔ دیکھیں آگے، آگے کیا ہوتا ہے۔ حسنات جیسے آدمیوں سے اللہ بہو بیٹیوں کو بچائے، آمین۔ قرۃ العین ہاشمی کا دوسرا رخ بہت ہی پُر اثر اور پازیٹو رہا۔ واقعی اگر اپنی میں کو ہٹا کر دیکھیے تو ہر منظر آپ کو شفاف اور ہر روپ خلوص سے مزین نظر آئے گا۔ شمارے کی زندہ جاوید تحریر زندگی بدلتی ہے میں قلزا کی ثابت قدمی نے ششدر کر دیا۔ قلزا نے نفع نقصان سے بالاتر ہو کر مونس سے محبت کی اور نبھا کر دکھا دی نہیں تو حادثات کی ذرا سی دھوپ پڑتے ہی محبت کے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ فرحین اظفر کی ع عورت م مجبور نے لرزا کر رکھ دیا کہ یا خدایا یہ ماں تا کا کون سا روپ ہے۔ جس میں اولاد کی جان لے کر اس کی عزت رکھی جاتی ہے۔ دھجیاں، زینب کو بروقت آگاہی ہوتی اور صراط مستقیم کے راستے پر چل کر اس نے اپنی عفت کی حفاظت کی ایک سبق آموز تحریر تھی۔ کرچیاں محبت کی میں پریشے نے مہد علی کے حق میں فیصلہ کر کے اپنی نسوانیت کو تار تار ہونے سے بچا لیا ارتضیٰ اس سے بھی زیادہ ڈیزرو کرتا تھا۔ سیما سراج سے ملاقات لمحوں کو کارآمد بنا گئی۔ حیا ترمذی نے گھر بیٹھے بیٹھے ہمیں کاغان جیسے سرسبز و شاداب شہر کی سیر کروا ڈالی۔ بہت مزہ آیا۔ (شکریہ) بہنوں کی محفل کے اختتام پر یہ کیا خبر سن لی کہ ہماری پیاری مصنفہ فرحانہ ناز ملک ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو کر ہم سے بچھڑ گئیں، ان کی المناک موت نے دل کو اذیت سے پُر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے بچوں اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا کرے...... انہیں جنت کے اعلیٰ مقام پر مرحمت فرمائے اور ان کے بیٹے دانیال کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔'' (آمین)

اب آیئے درودِ ابراہیمیؒ پڑھ کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین مجھ سے میری اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا اور میرے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا کہ تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور تیری ثنا سب سے بڑی ہے اور تیری پناہ عزت والی ہے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیبُ

دعا گو

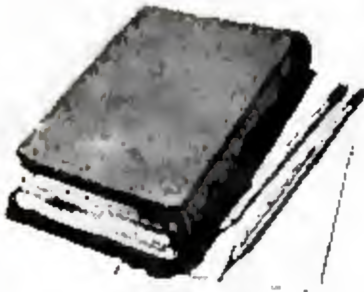
آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63-C فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35895313 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ افاق سعید

حمد باری تعالیٰ

جس کو دیکھا مجبور و بے بس دیکھا
تیرا محتاج ہر کس و ناکس دیکھا
وہ بلندی کے درجات پہ ہوا فائز
جس کو تیری یاد میں چوکس دیکھا
کہیں تازہ ہوائیں ہیں کہیں کالی گھٹا
کہیں نظروں نے بڑا جبس دیکھا
پوری حاجات سبھی کی تو کردیتا ہے
چرچا تیرا فاران و فارس دیکھا
ہو چیونٹی یا کہ ہاتھی، چڑیا ہو یا سارس
ڈوبا ہوا تیرے ذکر میں نس نس دیکھا
شکر تیرا نہ ادا کر پائے کوثر
لطفِ حمد اس نے برسا برس دیکھا

شاعرہ: کوثر خالد، جڑانوالہ

نعتِ رسول مقبول ﷺ

دل کے سناٹے میں اِک نور چمک جاتا ہے
آتشِ شوق میں شعلہ سا لپک جاتا ہے
میری قسمت مجھے لے کے کہاں آئی ہے
فلکِ زیست پہ تارہ سا چمک جاتا ہے
میں اکیلی ہوں کوئی ساتھ نہیں ہے میرے
کوئی سایہ ہے کہ ہر سانس مہک جاتا ہے
دل گرفتہ ہوں گنہگار ہوں شرمندہ ہوں
اِک احساس کہ آنسو بھی ڈھلک جاتا ہے
ایک امید پہ جیتی ہوں کہ روشن ہو حیات
روشنی دینے کو جگنو بھی چمک جاتا ہے

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
مرسلہ: عالیہ ضیا، کراچی

قرآن کریم کا پڑھنا

قرآن شریف جب پڑھو سمجھ کر پڑھو۔ جو بات سمجھ میں آئے اسے حرف بہ حرف، لفظ بہ لفظ حقیقی معنوں میں سچ سمجھو۔ اس میں استعاری، تشبیہی یا مجازی معنی ہرگز تلاش نہ کرو۔ جو بات سمجھ میں نہ آئے اسے ایسے ہی پڑھ کر آگے بڑھ جاؤ۔ قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ بار بار پڑھنے سے اس کے معنی قاری کی استعداد کے مطابق رفتہ رفتہ خود بخود منکشف ہوتے رہتے ہیں۔ بڑے ہو کر تفسیروں سے بھی ضرور استفادہ کرو لیکن خود سمجھ کر قرآن کریم کی تلاوت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہِ راست ناتا ضرور قائم رکھو۔

شہاب نامہ سے اقتباس
مرسلہ: ام ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

فوائد تلاوت

☆ اگر آپ ہمیشہ تندرست رہنا چاہتے ہیں تو سورۂ فاتحہ میں ہر بیماری کی شفا ہے۔
☆ اگر آپ کی مراد پوری نہیں ہوتی تو سورۂ یاسین کی تلاوت کو اپنا روز کا معمول بنالیں۔
☆ اگر رزق میں برکت چاہتے ہیں تو روزانہ سورہ واقعہ پڑھیں۔
☆ اگر قبر کے عذاب سے بچنا چاہتے ہیں تو روزانہ سورہ ملک کی تلاوت کریں۔

لاریب، ماہ زیب، چونیاں

حکمت کی باتیں

محتاجی اور غربت سات چیزوں سے گھر میں آتی ہے۔

1۔ جلدی، جلدی نماز پڑھنے سے۔

2۔ کھڑے ہو کر پانی پینے سے۔
3۔ آستین یا دامن سے منہ صاف کرنے سے۔
4۔ منہ سے چراغ بجھانے سے۔
5۔ عصر کے بعد گھر میں جھاڑو دینے سے۔
6۔ دانتوں سے ناخن توڑنے سے۔
7۔ فجر کی نماز کے بعد فوراً سونے سے۔

مرسلہ: شبنم کنول، حافظ آباد

اقوال امام ابو حنیفہ

1۔ جو کام کرو اطمینان اور وقار کے ساتھ کرو۔
2۔ فراخی اور تنگ دستی میں استغنا پر قائم رہو۔
3۔ گفتگو میں آواز بلند نہ ہونے دو تاکہ آپس میں محبت پیدا ہو۔
4۔ سب سے بڑی عبادت، ایمان اور سب سے بڑا گناہ کفر ہے۔
5۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل سے وہی معاملہ رکھو جو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو۔

مرسلہ: صدف نورین، لاہور کینٹ

التجا

اسے کہنا دسمبر لوٹ آیا ہے
ہوائیں سرد ہیں
اور وادیاں بھی دھند میں گم ہیں
پہاڑوں نے برف کی شال
پھر سے اوڑھ رکھی ہے
وہ سبھی رستے تمہاری یاد میں پُرنم سے لگتے ہیں
جنہیں شرفِ مسافت تھا
وہ سارے کارڈز، وہ پرفیوم
وہ چھوٹی سی ڈائری وہ ٹیرس
وہ چائے جو ہم نے ساتھ میں پی تھی
تمہاری یاد دلاتے ہیں
تمہیں واپس بلاتے ہیں
دیکھو یوں نہ ستاؤں ناں
دسمبر لوٹ آیا ہے
تم بھی لوٹ آؤ ناں

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

رُخ زیبا

بیگم کی فرمائشیں جب حد سے بڑھ کر ضد کو چھونے لگیں تو ان کے میاں جی پھولے ہوئے منہ کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے انہیں کلفٹن لے گئے۔ ساحل کی بھیگی ہوائیں بیگم کے مزاج پر اثر انداز ہوئیں۔ انہیں محبت میں آسمان سے تارے توڑ لانے والا محاورہ یاد آیا تو انہوں نے تاروں بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے مخمور لہجے میں اپنے میاں سے کہا۔

''بتائیے...... وہ کیا چیز ہے جسے آپ روز دیکھتے ہی رہتے ہیں مگر توڑ نہیں سکتے؟''

میاں جی کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے بلا توقف کہا۔

''تمہارا منہ......''

از: ارم کمال، فیصل آباد

غزل

عشق تم کو تھا نبھایا میں نے
ثواب اچھا کمایا میں نے
تم کو ساری ہی خوشی دے ڈالی
درد پلکوں پہ سجایا میں نے
پیار سمجھا ہی نہیں ہرجائی
دکھ کا خنجر تھا سو کھایا میں نے
میری ٹھوکر سے ہلا سنگِ در
عدل جابر سے دلایا میں نے
تیرے ہونٹوں کو ہنسی خود دے کر
اپنے دل کو ہی رلایا میں نے
ناخدا ہمتیں جب ہار گیا
موج سے اس کو چھڑایا میں نے
بخش خانم کی خطائیں گرچہ
ہر قدم تجھ کو بھلایا میں نے

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور

لوگ کہتے ہیں.....!

1۔ حسد، حاسد کو مرنے سے پہلے مار دیتا ہے۔

2۔ جس چیز کی ضرورت نہیں..... اس کی جستجو مت کرو۔

3۔ جو ٹھوکر لگنے سے پہلے ہوشیار ہو جائے وہ کامیاب ہوتا ہے۔

4۔ ساکھ بنانے میں بیس سال لگتے ہیں اور یہ ساکھ پانچ منٹ میں برباد ہو جاتی ہے۔

5۔ اگر تم خود ترقی نہیں کر سکتے تو دوسروں کو ترقی کرتے ہوئے دیکھ کر اپنی آنکھیں بند مت کیا کرو۔

6۔ سوتے ہوئے کتے کو سویا رہنے دو، بیدار ہو کر وہ تم پر یقیناً بھونکے گا۔

7۔ کامیابی وہ سیڑھی ہے جس پر جیبوں میں ہاتھ ڈال کر نہیں چڑھا کرتے۔

8۔ روتی ہوئی عورت اور بیمہ ایجنٹ کی باتوں پر کبھی اعتبار مت کرو۔

از: امینہ عندلیب، سلانوالی

ماہِ دسمبر

ماہِ دسمبر میں ہم دونوں، ہے ناں یار
ایک ساتھ رہتے، ہنستے، روتے، لڑتے جھگڑتے۔
کیسے کیسے ایک دوجے کو
پیار بھری باتوں سے پھر مناتے رہے.....
پھر.....
اچانک یوں ہوا
ماہِ دسمبر اثر انداز ہوا
یوں بچھڑے رُت ہی بدل گئی
نہ ملنے کی امید کی دیوی روٹھ گئی
ماہِ دسمبر کی سرد واداس شاموں میں
وہ شخص بہت اداس کرتا ہے

شاعرہ: نبیلہ نازش راؤ، ادکاڑہ

یہ زندگی

اے ابنِ آدمؑ نہ تم اپنی مدتِ حیات سے آگے جاسکتے ہو اور نہ اپنے رزق سے زیادہ حاصل کر سکتے ہو۔ یاد رکھو..... یہ زندگی دو دن کی ہے، ایک دن تمہارے حق میں ہوگی اور ایک دن تمہارے خلاف۔ جس دن تمہارے حق میں ہوگی اس دن غرور نہ کرنا اور جس دن تمہارے مخالف ہو اس دن صبر کرنا اور یہ دنیا ہمیشہ کروٹیں بدلتی رہتی ہے لہٰذا جو تمہارے حق میں ہے وہ کمزوری کے باوجود بھی تم تک آجائے گا اور جو تمہارے خلاف ہے اسے طاقت کے باوجود بھی تم حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے اللہ کے آگے عاجزی سے جھک جاؤ کہ وہ کسی کو بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔

مرسلہ: ظل شاہین، رحیم یار خان

نظم

محفل میں
ہر ایک پہ
سکتہ طاری تھا
جب اس نے پڑھ کر پھونکا سب پہ
اسمِ محبت

شاعرہ: سباس گل

مرسلہ: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

غزل

میری مسکان کے اسرار پا سکو تو چلو
ذرا چپکے سے میرے دل میں آسکو تو چلو
مجھے پسند ہیں گہرائیاں سمندر کی
تم یہ گہرائیاں آنکھوں میں لاسکو تو چلو
مجھے پسند ہے شدت سے بھرا ہر جذبہ
تم اگر اس طرح شدت دکھا سکو تو چلو
مجھے پسند ہے مٹھاس بھرا ہر لہجہ
اتنی اپنائیت سے تم بلا سکو تو چلو
مجھے پسند ہے وہ گھر جو دل میں بنتا ہے

کسی بھی موڑ پر تم اتنے بھا سکو تو چلو
مجھے پسند ہے اس زندگی میں زندہ دلی
تم برستے میرے آنسو مٹا سکو تو چلو
مجھے پسند ہے انسان گھنی چھاؤں سا
تم ایسی چھاؤں بن کے مجھ پہ چھا سکو تو چلو
مجھے پسند ہے سب تلخیاں بھلا دینا
میں کون ہوں، کہاں سے ہوں بھلا سکو تو چلو
مجھے پسند ہے بس ایک ہی گھر میں رہنا
اگر خلوص سے دل میں بسا سکو تو چلو

شاعرہ: شبینہ گل، راول پنڈی

سوئیٹ ہوم

راستے میں جاوید صاحب کو ساجد صاحب اس حالت میں ملے کہ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور چہرہ اتنا زخمی تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔

''اوہ...... تمہاری یہ کیا حالت ہو رہی ہے۔ جلدی سے تم میری بائیک پر بیٹھ جاؤ...... میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔'' جاوید صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

''رہنے دو...... میں گھر سے تو آرہا ہوں......''
ساجد صاحب رومال سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے بولے۔

از: زرین زبیر کوٹھاری، کراچی

غزل

سازِ ہستی کا بے صدا ہونا
کتنا آساں ہے بے وفا ہونا
تیرے جانے سے جان جاتی ہے
وائے حسرت تیرا جدا ہونا
میں کہ مہکوں گلاب کے مانند
میری قسمت تیرا صبا ہونا
تیرا شہر اور کرم کی تلاش
گلی گلی پھرنا کبھی گدا ہونا
تجھے پڑھنا نماز کی صورت
پھر تو ناممکن تیرا قضا ہونا

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

یہ سچ ہے

☆ بہت زیادہ کھا کر بیمار ہونے والوں کی تعداد فاقہ کشی سے بیمار ہونے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔

☆ بری عادتوں کی طاقت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب انہیں چھوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

☆ جتنی محنت سے لوگ جہنم خریدتے ہیں، اس سے آدھی محنت سے جنت ملتی ہے۔

☆ کمینے آدمی سے دوستی نہ کرو کیونکہ گرم کوئلہ ہاتھ کو جلاتا ہے اور ٹھنڈا کوئلہ ہاتھ کالے کرتا ہے۔

☆ غلطی کے بعد چہرے کو بہانے کی چادر سے نہ چھپاؤ کیونکہ ایسی چادر چہرے سے زیادہ میلی ہوتی ہے۔

☆ دوستوں کی غیر موجودگی میں ان کی کمزوریاں بیان کرنا خود آپ کے کمزور ہونے کی دلیل ہے کہ آپ کے پاس اپنی کوئی بھی بات کرنے تک کے لیے نہیں ہے۔ اس لیے لوگوں پر بہتان گھڑا کرتے ہیں۔

از: نور افشاں، شکار پور

ایسا بھی ہوتا ہے......؟

باپ، بیٹے سے ''کل رات تم میری کار لے کر چار گھنٹے تک کہاں چلے گئے تھے۔''

''بیٹا! کہیں نہیں اباجان، بس اپنے دوستوں کے ساتھ ذرا سیر کو چلا گیا تھا۔''

''باپ! ٹھیک ہے کل اپنے دوستوں سے کہنا کہ لپ اسٹک اور نیل پالش نہ لایا کریں، وہ گاڑی میں پڑی ہوئی ہیں۔''

مرسلہ: ممتاز خانم، کراچی



جلترنگ

انجم انصار

ریما کے نام خط

''پیاری ریما آپا جگ جگ جیو

آج میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے، بے وجہ لڑنے کو دل چاہ رہا ہے۔ اپنی چاروں جیٹھانیوں سے خوب زور دار جنگ کر چکی ہوں۔ بڑی والی خوامخواہ مجھے دیکھ کر ہنس رہی تھی، دوسری والی میرے انداز میں ٹھمک، ٹھمک کر چل رہی تھی، تیسری نے مجھے جلانے کے لیے زوردار چھینک ماری جبکہ اسے پتا ہے کہ چھینکوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے کہ جب میری چھینکیں شروع ہوتی ہیں تو بیس پچیس تک کی گنتی چلتی ہے اور چوتھی جیٹھانی نے میری جانب دیکھ کر برے، برے منہ بنائے۔ تب میں نے ایسی طبیعت صاف کی سب کی کہ وہ چاروں حواس باختہ سی ایک دوسرے سے یہ پوچھنے لگیں کہ ''میرا کو کیا ہو گیا ہے؟''

''دماغ خراب ہو گیا ہے میرا۔'' میں نے جل کر کہا۔

''وہ تو ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہے اگر کوئی نئی بات ہوئی ہے تو بتاؤ۔'' ان سب نے مشترکہ طور پر پوچھا۔

''بات دل کی ہے تو پھر ٹھیک ہے یوں کرو آج اپنے میکے میں سب بہن بھائیوں کے ہاں فون کرو، دل کی بھڑاس نکل جائے گی تو ذہنی کثافت میں کمی ہو گی۔''

''تم میری استانی ہو جو میں تم سے پوچھ کر کوئی کام کروں گی۔ میرا جو دل چاہے وہی کروں گی۔ تم کون ہوتی ہو مجھے مشورے دینے والی۔'' منجھلی جیٹھانی جو خاصی علامہ بنتی ہیں۔ ان کی طبیعت صاف کرتے ہوئے میں نے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے دل کی تو ہر بات ماننی چاہیے۔'' وہ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بولیں۔

طبیعت میں...... چڑچڑا پن اس قدر بڑھ رہا ہے کہ پاس پڑوس کے بچوں کی بھی خوب پٹائی کی۔ خوامخواہ ہمارے گیٹ پر کھڑے شور مچا رہے تھے۔

ہماری پڑوسن بولیں۔ ''لگتا ہے، تمہیں ڈپریشن جیسا خطرناک مرض ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ڈپریشن تو ایک عام سی بیماری ہے جو خواص تک کو ہوتی ہے'' (اگر کوئی یہ کہے کہ اسے یہ بیماری نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کوئی جن بھوت ہے مگر انسان نہیں)

آپا میری سمجھ میں تو یہ نہیں آتا کہ مجھے ڈپریشن کب ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے؟ اور کیسے ہوتا ہے؟ جب بھی بابر سے میری 'تو'، 'تو، میں، میں ہو جاتی ہے، میرے مزاج کا ٹھکانا نہیں ملتا۔ خوامخواہ پرانے گیت تک گانے لگتی ہوں جیسے آج یہ گیت ہونٹوں سے جدا ہی نہیں ہو رہا۔

الفت کی نئی منزل کو چلا

ہاں، یہ تو بتانا ہی بھول گئی، اب بابر کا ٹرانسفر خواتین کی برانچ میں ہو گیا ہے۔ برانچ کی تمام ورکرز کی یہ خواہش تھی کہ بابر اُن کے ساتھ مل کر کام کرے...... اب فنانس کا بھی بھلا کوئی کام ہوتا ہے، مجھے پورا یقین ہے فائلیں کھولے سب لڑکیوں اور عورتوں کے چہرے پڑھا کریں گے۔ رضیہ آپا کے گھر بھی جانا نہیں ہو رہا ہے، پرسوں فون آیا تھا، بیمار ہیں، دراصل اُن کی ساس ان کے گھر رہنے آئی ہوئی ہیں جب بڑی بی جائیں گی، ہماری رضو آپا فوراً بھلی چنگی ہو جائیں گی۔

آپا جانی، پتا نہیں کیا بات ہے کہ جب بھی کوئی مجھ سے کام کو کہے مجھے غصہ آنے لگتا ہے۔ ہاں اگر بابر مجھے باہر گھمانے پھرانے لے جائیں تو میں کتنی ہی تھکی ہوئی کیوں نہ ہوں، بھی غصہ نہیں آتا۔ اب کل مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تمہارے لیے بوتیک سے اچھے کپڑے لاؤں گا میں نے کہا کتنے لائیں گے وہ بولے جتنے تم کہو...... میں نے کہا، میں تو پوری دکان لوں گی۔ بابر نے کہا مجھے پتا تھا تم یہی کہوگی، میں سوچ رہا ہوں اس دکان میں سیلز مین بن جاؤں۔ تمہاری دکان ہو جائے گی پھر تو کپڑے خریدنے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ وہیں رہیں گے، تم دیکھ، دیکھ کر خوش ہوتی رہا کرنا۔ اب آپ ہی بتائیں ایسے اوچھے مذاق سن کر کسی کے لبوں پر مسکراہٹ دمک سکتی ہے۔ مذاق تو وہ ہے جسے سن کر سب ہنسیں مگر بابر کے مذاق ہمیشہ ہی ایسے ہوتے ہیں۔ آپ کی ریما تو کبھی نہیں ہنس سکتی ناں۔

پیاری آپا، آپ کو یاد ہے کہ میں سونے کی کس قدر شوقین تھی صرافہ بازار اگر انگلی کا چھلا لینے جاتی تو پورا سیٹ لے کر آتی اور سونے کا بھی یہی انداز تھا کہ دوپہر کا کھانا کھا کر جو آنکھ لگتی تو چھ سات گھنٹے سے پہلے اٹھ نہ پاتی۔

اب کل کی بات سنیے میں دوپہر کو لیٹی ہی تھی کہ دو اڑھائی گھنٹے بعد ساس صاحبہ نے اٹھا دیا کہ ''مہمان آئے ہیں تمہیں پوچھ رہے ہیں۔''

میں نے کہا، ان سے کہہ دیں کہ ''ابھی تو بستر پر لیٹی نیند کی خوشامد کر رہی تھی۔ آپ نے کچی نیند میں جگا دیا۔ میں جب اپنی نیند پوری کرلوں گی تو اٹھوں گی۔'' وہی ہوا رات کو دس بجے میں اٹھی تو بابر کا مزاج خاصا برہم تھا۔ میں نے غصے میں آکر بات ہی نہیں کی۔ اب میں اپنی عادتیں تو نہیں بدل سکتی۔ اب اگر ان کے خاندان والے چڑیا سی نیند لے لیتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور......

ہاں، بابر کی ایک کزن جو ہمارے گھر کے قریب ہی رہتی ہیں سنا ہے وہ بھی خوب سوتی ہیں۔ ایک شام میں جب ان کے گھر گئی تو دو ٹرے ان کے سامنے رکھی تھیں۔ ایک ٹرے میں پورا ناشتا تھا، دوسرے میں پورا کھانا پہلے انہوں نے ناشتے والی ٹرے ڈکاری پھر دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی کہ رات کو موووی دیکھ کر سوئی تھیں۔ دیر سے آنکھ لگی شام کو اٹھ کر پہلے ناشتا کیا پھر دوپہر کا کھانا کھایا۔ جب تک میں بیٹھی رہی۔ مذکورہ فلم کا گانا دھیرے دھیرے الگ گنگناتی رہیں۔ جورا جوری چنے کے کھیت والا...... میں نے بابر کے سامنے خوب مذاق اڑایا تو خواہ مخواہ برا ماننے لگے۔ اس سے مجھے شک بھی ہو رہا ہے۔

''بھئی میں کسی کو کچھ بھی کہوں...... تمہاری بلا سے تمہاری کون سی ایسی چہیتی ہے جو تم برا مانو۔''

''خبردار جو بھی منیرا کو کچھ کہا۔ مجھ سے تو غلطی ہوگئی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم منیرا کو کچھ کہو۔''

اب بتاؤ آپا، دماغ میں چنگاریاں بھریں گی یا نہیں۔

اب شادی کے پانچ سالوں کے بعد لوگ مجھے جسامت کی وجہ سے موسٹے والے عدنان سمیع کی رشتے دار سمجھتے ہیں... پیاری آپا، آپ وقت نکال کر میرے گھر آؤ اور بابر کو سمجھاؤ۔ کئی روز سے بات چیت بند ہے، حد تو یہ ہے کہ ان دنوں اپنی جرابیں بھی خود دھو رہا ہے مجال ہے کہ کسی کام کے لیے مجھ سے کچھ کہے۔

فقط، تمہاری لاڈلی بہن،

مکالمہ

خاتون...... ہیلو باجی...... ! کیسی ہیں آپ؟

باجی...... جی...... اللہ کا شکر ہے۔

خاتون...... آپ نے مجھے پہچانا۔

باجی..... نہیں.....

خاتون..... ایک ہمیں ہی محبت ہے آپ سے، سچی آپ کا تو خون سفید ہو گیا ہے۔

باجی..... ہاں..... آپ واقعی آپ بہت محبت کرتی ہیں۔

خاتون..... پھر بھی دماغ پر زور ڈالیے۔

باجی..... سر میں درد ہے، دماغ پر زور نہیں ڈال سکتی..... کوئی چیز قریب بھی نہیں ہے۔

خاتون..... میں شدو بول رہی ہوں..... قہقہہ اسٹارٹ..... مسلسل قہقہے.....

باجی..... کون شدو.....؟

خاتون..... بتایا تو تھا آپ کو..... میں نے آپ کو اپنی پسند کا نام جو میں نے خود رکھا تھا..... شاہدہ شدو..... (وقفے..... وقفے سے قہقہے)

باجی..... میں اب بھی نہیں پہچان سکی آپ کو..... (نادم سا لہجہ)

خاتون..... افوہ..... کیا ہو گیا ہے آپ کو میں آج چوتھی دفعہ فون کر رہی ہوں۔ (تو نکلی بھرا لہجہ)

باجی..... اچھا.....! (روہانسی لہجے میں کہا گیا)

خاتون..... پہلا فون میں نے 31 دسمبر 1999ء کو کیا تھا..... اس دن آپ شاید اپنے گھر میں بزی تھیں زیادہ لمبی بات نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا فون جنوری 2002ء میں کیا تھا..... اس دن آپ حج کے لیے جا رہی تھیں میں نے آپ کو خوب ساری مبارک باد دی تھی اور آپ نے شکریہ بھی ادا کیا تھا اور پھر 2010ء میں 12 جولائی کو کیا تھا آپ کی سالگرہ کی مبارک باد دی تھی..... اور آج آپ مجھے پہچان ہی نہیں رہی ہیں..... انہوں نے برسا برس کا حساب یوں لپیٹ دیا..... جیسے یہ چاروں فون گھنٹے..... گھنٹے بعد آئے ہوں..... اور میری بھول میری خطا بن گئی ہو۔

باجی..... ہاں..... آں..... میں واقعی پہچان گئی۔

خاتون..... شکر اللہ کا..... آج میں نے آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ آپ کو پہلے سے یاد دلا دوں پاکیزہ کے سالگرہ نمبر میں میرا نام مت بھول جایئے گا..... ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔ سمجھ گئی ناں.....!

باجی..... پلیز شدو..... ایسا نہ کرنا..... ناراضی کی دھمکی مت دینا..... زندگی رہی تو انشاء اللہ ایسا کچھ کروں گی (پہلے ہی سے پلان بنا لیا ہے) کہ کوئی اب کے یہ کہہ کر تو دکھائے..... باجی مجھے بھول

گئیں...... کیا سمجھا ہے تم لوگوں نے اپنی باجی کو!

اپنی عورت

میرا نام وجاہت مرزا ہے، دوستوں میں وجی کے نام سے جانا جاتا ہوں۔ میں شاعر ہوں۔ گلوکار بھی ہوں، برش سے چھیڑا چھاڑی بھی کرتا ہوں۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے میری کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ لوگ مجھے جانتے ہیں، پہچانتے ہیں، پسند بھی کرتے ہیں اور اکثر اوقات بس میں میرا ٹکٹ بھی لے لیتے ہیں۔

لڑکیاں تو مجھ پر اچھی خاصی عاشق ہو جاتی ہیں اور اکثر صرف وجی کہہ کر پکارتی (شریر کہیں کی) اور بعض شوخ و چنچل حسینائیں میری شاعری سن کر اپنی سڈول کلائیوں پر آٹوگراف لینے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔

ایسا واقعہ بھی خیر ہوا تھا۔ گو صرف ایک ہی مرتبہ ہوا کہ امریکا سے آئی ہوئی میری ایک فین نے مشاعرے کے بعد اپنے گالوں پر مجھ سے آٹوگراف لیا اور میری بدقسمتی کہ وہ پھر کہیں مجھے نظر نہیں آئی۔ (شاید واپس چلی گئی تھی)

میری بفضلِ خدا شکل صورت بھی اچھی ہے، لفظوں کا بہترین کھلاڑی ہوں۔ میں نے اپنی تیس سالہ زندگی میں خوب محبتیں کمائی ہیں۔ (اللہ نظرِ بد سے محفوظ رکھے)

میں چونکہ بنیادی طور پر ادیب ہوں، اس لیے خاصا مشکل پسند آدمی ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے خاصا کام کیا ہے۔ بے حد نام کمایا ہے، اس لیے اکثر اپنی پیٹھ خود ہی تھپکتا رہتا ہوں۔

بعض اوقات، مجھے خود اپنے آپ پر رشک آتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میرے یہ اوصاف عام نہیں ہیں بلکہ خاص الخاص ہیں۔

میری بیوی ایک عام سی عورت ہے ...شاید سب عورتیں عام سی ہی ہوتی ہیں یا بیوی بننے میں عمومیت آجاتی ہے۔ مجھے اپنی بیوی سے ایک شکایت ہے، وہ ظاہرداری پر بہت مرتی ہے۔

اگر میں اچھے کپڑے نہیں پہنتا، اپنا خیال نہیں رکھتا تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ (میری بیوی خواہ مخواہ مین میخ نکالتی رہتی ہے)

یہ اتنے آسان کام جو ہر شخص کر سکتا ہے، میں کیوں کروں (میں تو خاص آدمی ہوں) سوٹ پہننا، جوگرز پہننا، نیلی، پیلی شرٹس پہن کر سینے کے بٹن کھولنا، کیا کوئی مشکل کام ہیں۔

یہ کام تو ہر جاہل، لچا، لفنگا، انگوٹھا ٹیک بھی بہ آسانی کر سکتا ہے۔ میں نے تو وہ کام کیے ہیں جو عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔

پکی روشنائی سے چھپا ہوا اپنا نام کس قدر خوب صورت لگتا ہے۔ خوب صورت مجلد کتاب کتنی مسرتیں فراہم کرتی ہے۔

کتاب پر چمکتا ہوا اپنا نام کیسا روشن لگتا ہے، اپنے قلبی احساس کی عکاسی میں نہیں کر سکتا۔ اب میری بیوی کہتی ہے کہ اتنا بڑا ادیب ہونے کے باوجود میں اپنا کوئی خیال نہیں کرتا۔ کسی مہمان کو ریسیو کرنے سے پہلے، اپنے ملگجے کپڑوں کو بدلنا ضروری نہیں سمجھتا۔ تو کیا میں اتنا تن آسان ہو جاؤں کہ عام لوگوں کے کام خود کرنے لگوں۔ میرا شمار تو خواص میں ہوتا ہے، عام کیسے بن جاؤں۔ کاش یہ باتیں کوئی میری بیوی کو سمجھائے جو ہزار روپے کی ساڑی اور نقلی جیولری پہن کر ہر تقریب میں یوں اترائے پھرتی ہے جیسے اس سے زیادہ حسین کوئی نہیں ہے۔ اور جیسے میری نگاہیں صرف اسی کو دیکھ رہی ہیں اور اسی کی بلائیں لے رہی ہیں۔

پاگل کہیں کی......؟

بے وقوف عورت...... تقریبات میں اپنی عورتوں کو بھی کوئی بھلا دیکھا کرتا ہے......!

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆فردوس شاہی.....لاڑکانہ

تیری آنکھوں کے دریا کا اترنا بھی ضروری تھا
محبت بھی ضروری تھی، بچھڑنا بھی ضروری تھا

☆ماریہ سندس.....چکوال

یہ بھی ممکن ہے کسی روز نہ پہچانوں اسے
وہ جو ہر بار نیا بھیس بدل لیتا ہے
بارہا مجھ سے کہا تھا مرے یاروں نے وصی
عشق دریا ہے جو بچوں کو نگل لیتا ہے

☆سیما ممتاز عباسی.....لاڑکانہ

وہ غلط بخشیاں ہوئیں اختر
اُن کو جاں، مجھ کو خواب دے بیٹھے

☆ارم کمال.....فیصل آباد

قیامت سے بہت پہلے قیامت ہم نے دیکھی ہے
ترا مل کر بچھڑ جانا، قیامت اور کیا ہوگی

☆فصیحہ آصف خان.... ملتان

آیا ہی تھا، خیال تمہارا
اِک روشنی سی ساتھ چلنے لگی

☆شازیہ محبوب.....مقام نامعلوم

ہم نیند کے شوقین زیادہ نہیں لیکن
کچھ خواب نہ دیکھیں تو گزارہ نہیں ہوتا

☆انجم گلزار.....فیصل آباد

محبتوں کے کھلے جب گلاب آنکھوں میں
کسی کے خواب رہے بے حساب آنکھوں میں

☆اینقہ انا.....چکوال

عجیب طرح سے دونوں ہوئے ناکام محسن
وہ مجھے چاہ نہ سکا، میں اسے بھلا نہ سکا

☆پروین افضل شاہین.....بہاول نگر

یہ اشارہ ہے آفاتِ ناگہانی کا
کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا

☆مدیحہ نورین مہک.....برنالی

بات گو سچ ہے مگر دل ہی نہیں مانتا ہے
تیز بارش میں جلا کیسے آشیاں میرا

☆فرحت احمد.....گلشن حدید، کراچی

وہ مرے سامنے ہے اور مجھے
اس سے ملنے کی تمنا ہے ابھی

☆رابعہ شاہد.....دبئی

دل نے اکثر یہ تمنا کی ہے
تیری آواز کو چھو کر دیکھوں

☆کوثر خورشید.....یو کے

آدمی نے خدا تراشے ہیں
ورنہ پتھر تو صرف پتھر تھے

☆نیلوفر خان.....بہارہ کہو

ہجر کا ہر لمحہ گزرا کیسے اس کو کیا بتلاؤں
کر رہا ہے جو مرے گزرے دنوں کا احتساب

☆کوثر خالد.....جڑانوالہ

نہ تھی ہم میں کشش ایسی کہ تم کو یاد رہ جاتے
نہیں شکوہ کوئی تم سے تمہارے بھول جانے کا

☆غزالہ طارق......سرگودھا

عادت جو پڑی صبر و تحمل کی تو نجمہ
آنسو مری پلکوں پہ مچلتا ہی نہیں ہے

☆جبیں نیاز......ملتان

رشتۂ عشق سلامت ہے تو ایسا بھی تو ہو
ہم تو اس کے ہیں، کسی دن وہ ہمارا بھی تو ہو

☆ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک

میں شکارِ گردشِ روز و شب وہ طوافِ ذات میں منہمک
نہ یہاں قرار کا ذکر تھا نہ وہاں قیام کی بات تھی

☆عنبر وسیم......گوجرانوالہ

چمن میں سہمے ہوئے بیٹھے ہیں سبھی بلبل
بہارِ گل کا یہاں اہتمام مشکل ہے
تیرا نصیب تو ہے تیرے دست و بازو میں
فلک سے اترے گا تیرا طعام مشکل ہے

☆نرگس نسیم......صوابہ موہڑہ

شام سورج کو ڈھلنا سکھا دیتی ہے
شمع پروانے کو یوں جلنا سکھا دیتی ہے
گرنے والے کو تکلیف تو ہوگی مگر
ٹھوکر انسان کو چلنا سکھا دیتی ہے

☆نرگس شمیم......حیدر آباد

شکستہ آرزو بن کر تری دھڑکن میں کیا رہنا
تو اپنے دل کی بستی کو مری جاگیر بننے دے
تصور میں بھی اونچی اڑانیں بھول جائے گا
میری چاہت کو اپنے پاؤں کی زنجیر بننے دے

☆حمیرا نوشین......منڈی بہاؤالدین

نگاہِ دل کا رشتہ تو بہت مضبوط ہوتا ہے
یہ رشتہ لاکھ جھٹکے دے کے بھی توڑا نہیں جاتا
ہمارا ساتھ چھوڑا تم نے ہم سے بے وفائی کی
تمہارا ساتھ ہم چاہیں بھی تو چھوڑا نہیں جاتا

☆سیدہ رفیعہ ابدالی......کراچی

ہم رقص کرنے والے ہیں اس زندگی کے ساتھ
وہ اور تھے جو گردشِ دوراں سے ڈر گئے

☆مدیحہ احمد......کراچی

یقین تھا کہ بھول جاؤ گے
خوشی ہوئی امید پہ پورے اترے

☆ایلیا شیراز......کراچی

معرکہ گرم تو ہو لینے دو خوں ریزی کا
پہلے تلوار کے نیچے ہم ہی جا بیٹھیں گے

☆جبیں ہاشمی......بھیرہ

شکستِ فاش دشمن نے ہمیں ایسے نہیں دی ہے
تمہارا ہاتھ لگتا ہے ہماری مات کے پیچھے
سحر اس راز سے دنیا ابھی واقف نہیں شاید
نئی سازش پنپتی ہے نئے حالات کے پیچھے

☆شبنم کنول......پاپا نگری

کیوں چاہا تھا تمہیں دل سے
کیوں اپنا بنایا تمہیں دل سے
وفا تو کر نہیں سکتے تم
ہم تو نادان بن بیٹھے آپ کے دل سے

☆سیدہ رضوانہ......نارتھ ناظم آباد

ہم رقص کرنے والے ہیں اس زندگی کے ساتھ
وہ اور تھے جو گردشِ دوراں سے ڈر گئے

☆فرح مقدس......سعودی عرب

گونجی ہوئی ہے ایک کھنک بج رہے ہیں کان
گویا شکستِ دل کی صدا ہے ہمارے ساتھ

☆عروبہ ناز......کوٹلی

ان کی تصویر ہے یا ہے کوئی احسانِ عظیم
دور ہیں پھر بھی مجھے دیکھ رہے ہوں جیسے

☆☆☆

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



انڈونیشی ڈرائی بیف

اشیا: گوشت، بغیر ہڈی کا ڈیڑھ کلو۔ (دو انچ کے کیوبز کرلیں) ناریل دو سو گرام ۔ سو گرام الگ کرش کرلیں اور سو گرام نرم تازہ ناریل ہو تو اچھا ہے ملک بنانے کے لیے۔ لیمن گراس یا لیمن کے چھلکے، (باریک کاٹ لیں) دو کھانے کے چمچ۔ ہلدی کے پودے کے پتے اگر مل جائیں اور لیموں کے پودے کے بھی پتے ایک، ایک ٹیبل اسپون۔ دو ٹیبل آئل یا کوکونٹ آئل۔ دو ٹیبل اسپون۔ لال مرچ ثابت، پندرہ سے بیس عدد۔ (تازہ ہوں تو اچھا ہے) چھوٹی، چھوٹی پیاز، آٹھ عدد۔ لہسن کے جوے پانچ سے آٹھ عدد۔ ادرک، دو انچ کا ٹکڑا۔ ثابت ہلدی، ایک انچ کا ٹکڑا۔ نمک حسب ذائقہ (اصل ترکیب میں نمک نہیں ڈالا جاتا)

ترکیب: تمام مسالا جات کو آئل کے ساتھ باریک پیس لیں یا گرائنڈ کرلیں۔ سو گرام ناریل جو الگ سے تھا اس میں چار کپ پانی ڈال کر کوکونٹ ملک بنانے کے لیے بلینڈ کرلیں۔ پانی کی مقدار دو کپ مزید بڑھا سکتی ہیں۔ تمام پسے مسالا جات کو دیگچی میں ڈال کر اتنا پکائیں کہ آئل اوپر آجائے اب اس میں گوشت شامل کر کے اچھی طرح مکس کر کے ایک دن کے لیے فریج میں رکھ چھوڑیں۔ اگلے دن فریج سے نکال کر آدھے گھنٹے بعد ہلکی آنچ پر رکھیں اور گوشت گلنے، خشک ہونے اور براؤن ہونے تک پکنے دیں۔ آنچ دھیمی رکھیں۔ مزیدار (رینڈانگ) تیار ہے۔

مرسلہ: زرینہ خان، بہارہ کہو

سکندری مچھلی

مچھلی بغیر کانٹے والی، آدھا کلو۔ اجوائن 1/2 ٹی اسپون، چاٹ مسالا، حسب ذائقہ۔ ادرک لہسن پیسٹ ایک ٹیبل اسپون۔ میدہ یا بیسن، چار ٹیبل اسپون۔ لیمن جوس، دو ٹیبل اسپون۔ سرخ مرچ اور نمک حسب ذائقہ۔ ہلدی 1/2 ٹی اسپون۔ وائٹ پیپر 1/2 ٹی اسپون۔ سفید سرکہ، دو ٹیبل اسپون۔ آئل تلنے کے لیے۔

ترکیب: تمام اجزا کا پیسٹ سا بنالیں اور اس آمیزے میں مچھلی کے قتلے شامل کر کے آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک کڑاہی میں تیل تیز گرم کر کے آنچ کم کردیں اور کچھ دیر بعد ایک، ایک قتلا ڈال کر فرائی کرتی جائیں یہاں تک کہ گولڈن اور کرسپی ہوجائیں پھر براؤن پیپر پر اتارلیں۔ اوپر سے چاٹ مسالا چھڑکیں اور ہری چٹنی یا کیچپ کے ساتھ تناول فرمائیں۔

مرسلہ: رانیہ محمود، کوئٹہ

گاجر کا حلوا

اشیا: گاجر، ایک کلو۔ چینی، ایک کلو سے مٹھی دو مٹھی کم لے لیں۔ گھی، ایک پاؤ۔ بادام، اخروٹ، پستہ، حسب پسند۔ کھویا، آدھا پاؤ۔ دودھ، آدھا کلو میں دو کپ پانی اور ڈال دیں۔

ترکیب: گاجروں کو کش کر کے پانی ملے دودھ میں خوب ابال کر گھوٹ لیں۔ اب گھی میں الائچی کڑکڑا کر اس آمیزے میں شامل کرلیں۔ چینی بھی ملادیں اور پکنے دیں یہاں تک کہ خوب بھن جائے۔ تیاری پر کھویا اور میوہ ملادیں چاہیں تو کچھ ابلے ہوئے انڈوں سے بھی سجاوٹ کرسکتی ہیں۔

مرسلہ: ناہید انجم، کراچی

سندیسے

پاکیزہ بہنیں







کسی نیک ڈرائیور کے نام

ہمیں اپنے نکمے جنریٹر کے لیے ایک عدد قابل ڈرائیور کی ضرورت ہے۔ جو وقت بے وقت واپڈا والوں کی ناروا لوڈ شیڈنگ پر اس کو بوقتِ ضرورت اسٹارٹ کر سکے نہ صرف اسٹارٹ کر سکے بلکہ اس کے تیل، پٹرول کی ذمے داری بھی اٹھا سکے۔ خصوصاً آدھی رات کو اٹھ کر سب فریج، فریزر، اے سی آن آف کر سکے۔ تنخواہ واجبی ہوگی کیونکہ جاب صرف جنریٹر اسٹارٹ کرنا اور بند کرنا اور گھر کا تمام پاور ہاؤس کنٹرول کرنا ہے۔ چھٹی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بہرے افراد کو ترجیح دی جائے گی۔

تعاون کا شکریہ

از..... صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

رومان کے نام

آپ کا میری زندگی میں آنا...... زندگی کا خوب صورت دور ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھ جیسی لڑکیوں کی زندگی میں محبت کی آمد اسی وقت ہوا کرتی ہے جب ان کا اپنی زندگی کے ہم سفر سے رشتہ طے ہو جاتا ہے۔ میرا رُواں، رُواں آپ کے لیے دعا گو ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ اب آپ عمرے کی سعادت حاصل کر کے سیالکوٹ آنے والے ہو۔ اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے، آمین۔

از: ر..... مشتاق، سیالکوٹ

توقعات

خوشبوؤں کا اِک نگر آباد ہونا چاہیے
اس نظامِ زر کو اب برباد ہونا چاہیے
ان اندھیروں میں بھی منزل تک پہنچ سکتے ہیں ہم
جگنوؤں کو راستہ تو یاد ہونا چاہیے

☆☆☆

ظفر غلط ہے کہ میں اس کو پا نہیں سکتا
یہ میرے ہاتھ پہ اس کی لکیر تو دیکھو

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کیسے

ہے جن کو ہمارے لب و لہجے سے شکایت
ان سے بھی کہو ظلم سے اب ہاتھ اٹھالیں
جب عمر ہی گزری ہے تصور میں تمہارے
اب تم سے الگ اپنا جہاں کیسے بسالیں

از: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین

دل کیسے بھولے

وہ بابل کا آنگن
بچپن کا زمانہ
جب ہر سو تھیں خوشیاں
نہ تھا کہیں غم کا ٹھکانا
وہ کاغذ کی کشتی
بارش میں نہانا
وہ جگنو پکڑنا، وہ تتلیاں اڑانا
دل کیسے بھولے
وہ بیتا زمانہ
وہ گاؤں کی گلیوں میں

دوست پرانے

شاعرہ: بشریٰ باجوہ، اوکاڑہ

تیری دید

مجھے مل گیا بہانہ تیری دید کا
کیسی خوشی لے کر آیا چاند خاندان کی تقریب کا

از: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

ایشل شادیان کے نام

دوستی اگر زندگی ہے
تو پھر مجھے تم سے ملی ہے
وقت کی گردشوں میں کھو نہ جانا
کہ دوستی کی نیا ڈبو نہ جانا
دیا دوستی کا جلائے رکھنا
تعلق مجھ سے نبھائے رکھنا
تم چاہتوں میں یوں ہی رکھنا شدت
کہ دوستی سے رہے مجھے محبت
دوستی کو زندگی کا عنوان رہنے دینا
دوستی کو اپنی پہچان رہنے دینا

شاعرہ: نجل سعدی آرائیں، گولارچی

خوش باش لوگوں کے نام

یہی پہچان رہنے والے
غم کے آنسو پینے والے
پتا بہار کا دیتے ہیں
خزاں کا دکھ سہنے والے
خوشیوں کی ہوتی ہے قیمت
پاتے ہیں کچھ کھونے والے
دیتے ہیں جو غم کی دہائی
زخم وہی ہیں رِسنے والے
بڑے مقدس ہیں وہ آنسو
خاموشی سے بہنے والے
صبر توکل ہار ہے ایسا
جس کے موتی سجنے والے

سندیسے

پہلے دین اور بعد میں دنیا
کہتے ہیں سب کہنے والے
سب سے پہلے کرلو کوثر
کام ضروری کرنے والے

شاعرہ: کوثر خالد، جڑانوالہ

پیاری دوست نبیلہ کے نام

اے دوست اتنی جدائی اچھی نہیں
فرصت کے لمحات
جب بھی میسر آئے تجھے
تو سوچنا کہ
تیری جدائی نے
توڑ کر رکھ دیا مجھے
دل کو سمجھاتی ہوں
پر سمجھتا نہیں
اشک پونچھتی ہوں
آنسوؤں کا دریا تھمتا نہیں

اے دوست
تو خود کوئی بتا ایسا بھی ناتا توڑا کرتا ہے
نئی سہیلیوں میں کوئی اتنا بھی
مگن ہو جاتا ہے

از: شازیہ ہاشم، قصور

مقدر

منزل نہ مل سکی، یہ مقدر کی بات ہے
صد شکر ہم سے ذوقِ سفر تو نہیں گیا

مرسلہ: رابعہ اسلم، رحیم یار خان

بیک ورڈ اینڈ فارورڈ

میں گزشتہ پانچ سال سے ایک سرکاری اسپتال میں کام کر رہی تھی مگر تنگ آ کر میں نے اپنی جاب چھوڑ دی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسپتال کے زیادہ تر مریض بیک ورڈ تھے اور زیادہ تر ڈاکٹر، فارورڈ۔

منجانب: ایک نرس، سندھ



روحانی مشورے

ادارہ

میاں بیوی میں محبت پیدا کرنے کے وظیفے

میاں بیوی میں یا گھر میں کہیں بھی اختلاف ہو تو اس کے لیے... کچھ وظیفے لکھے جا رہے ہیں۔ اہتمام سے ان پر عمل کریں اور پھر خوب عاجزی کے ساتھ دعا مانگیں کہ اے اللہ! ہم دو میں یا ان دو میں سچی محبت پیدا فرما۔ (انشاء اللہ ضرور ہوگی)

دو مسلمانوں میں اختلاف یا جھگڑا شیطان کی سب سے بڑی کامیابی ہے، جھگڑا نیکیوں کو ایسے ہی مونڈتا ہے جیسے استرا بالوں کو مونڈتا ہے، بڑے سے بڑے سمندر اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہو جایا کرتے ہیں، اس لیے جھگڑے سے بچنے کے لیے شیطان مردود سے بچنے کی بہت فکر کی جائے، جن چیزوں سے گھروں میں شیاطین آتے ہیں ان سے بچا جائے اور جن اعمال سے شیطان سے حفاظت ہوتی ہے ان اعمال کا اہتمام کیا جائے، اس کے لیے ایک عمل یہ کرے کہ گھر میں سورۂ بقرہ کا ختم کرے، جن میاں بیوی میں جھگڑا ہو تو شوہر یا بیوی کوئی بھی گھر میں سورۂ بقرہ پڑھ کر اپنے اوپر اور پورے کمرے بلکہ پورے گھر پر دم کر دے۔

حدیث میں آتا ہے۔

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ شیطان اس گھر میں ٹھہر نہیں سکتا۔ جس میں سورۂ بقرہ تلاوت کی جائے اور اس کے ساتھ اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ گھر میں کسی جان دار کی تصویر نہ ہو، یہاں تک کہ دوا کے ڈبے یا پاؤڈر پر جو تصویریں بنی ہوئی ہوتی ہیں ان کو بھی کاٹ دیں یا اسٹیکر چپکا دیں۔

☆ گھر میں کثرت سے تلاوت کا اہتمام کریں، حدیث میں آتا ہے۔ جس گھر میں قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے اس میں خیر و برکت زیادہ ہو جاتی ہے، ملائکہ اس میں حاضر ہوتے ہیں اور شیطان نکل جاتا ہے اور جس گھر میں تلاوت نہ ہو وہ گھر لوگوں پر تنگ ہو جاتا ہے، اس میں خیر و برکت کم ہوتی ہے، شیطان اس گھر میں اپنا مسکن بنا لیتے ہیں، فرشتے وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان مرد و عورت کو چاہیے کہ گھر میں روزانہ تلاوت کا خوب اہتمام کریں۔

☆ شوہر اس بات کا اہتمام کرے کہ گھر میں جب بھی داخل ہو تو پہلے دو رکعت پڑھے، اسی طرح گھر سے باہر جانا ہو تو دو رکعت پڑھ کر باہر نکلے، اس سے بھی انشاء اللہ تعالیٰ بہت ہی فائدہ ہوگا، ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی وفات کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کیا اور فرمایا۔ تم جانتی ہو میں نے تم سے نکاح کیوں کیا؟ پھر فرمایا میں نے تم سے نکاح اس لیے کیا کہ تم مجھے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے عمل کے بارے میں بتاؤ کہ ان کے گھر میں کیا معمولات تھے تو ان کی اہلیہ نے فرمایا۔

جب وہ گھر سے نکلنے کا ارادہ کرتے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور جب گھر میں داخل ہوتے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور جب سونے کے لیے جاتے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور اس عمل پر ہمیشگی فرماتے تھے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ ''حضور اکرم ﷺ جب بھی گھر سے نکلتے ہیں تو دو رکعت پڑھ کر نکلتے

ہیں۔''

لہٰذا دو رکعت کا اہتمام ہر مرد و عورت کو کرنا چاہیے، فرضوں کے اہتمام کے ساتھ، ساتھ ان نوافل کا اہتمام خیر و برکت کا سبب ہوگا اور گھروں سے جھگڑوں کے ختم ہونے کا ذریعہ ہوگا، شوہر اور والد کو چاہیے کہ گھر میں داخل ہوتے ہی سلام کر کے پہلے دو رکعت نفل پڑھے پھر کوئی بات وغیرہ کرے، اسی طرح گھر سے نکلتے ہوئے دو رکعت نفل پڑھ کر نکلے...... انشاء اللہ تعالیٰ اس کے اہتمام سے گھروں کی بہت سی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

☆ منزل پڑھنے کا اہتمام کریں۔ اس کو پڑھیں اور گھر میں دم کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بھی بہت ہی فائدہ ہوگا۔

☆ آیت کریمہ سو مرتبہ پڑھ کر محبت کے لیے دعا مانگیں۔

☆ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۴۰ مرتبہ پڑھ کر دعا مانگیں۔

☆ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔ پانچ سو مرتبہ یا ستر مرتبہ یا سات مرتبہ پڑھ کر دعا مانگے، اے اللہ! ہم دونوں میاں بیوی میں محبت پیدا فرما۔

ان وظائف کے اہتمام سے بہت ہی فائدہ ہوگا۔ مستقل پابندی سے پڑھیں اور اہتمام سے گناہوں سے بچیں اور کوشش کریں کہ کسی طرح کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ ناراض ہو جائے، اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناراضی کے ساتھ دنیا و آخرت کی کوئی نعمت حاصل نہیں ہو سکتی اور بشری تقاضے سے اگر کبھی گناہ ہو بھی جائے تو فوراً توبہ استغفار کرے۔

اللہ تعالیٰ سے اولاد مانگنے کی تین دعائیں

جس شخص کی اولاد نہ ہو یا اولادِ نرینہ نہ ہو، وہ ذیل کی دعا کثرت سے مانگا کرے۔

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

ترجمہ: ''اے میرے پروردگار! مجھے تنہا نہ چھوڑیے اور آپ بہترین وارث ہیں۔''

اگر ہو سکے تو دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ کی نیت سے پڑھے اور پھر دعا مانگے، اس لیے کہ حدیث شریف میں آتا ہے جو شخص تنہائی میں دو رکعت نماز پڑھے، جس کو اللہ اور اس کے فرشتوں کے سوا کوئی نہ دیکھے تو اس کو جہنم کی آگ سے بری ہونے کا پروانہ مل جاتا ہے۔

اور جو شخص دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تبارک و تعالیٰ سے کوئی دعا مانگتا ہے تو حق تعالیٰ شانہٗ وہ دعا قبول فرماتا ہے، خواہ فوراً یا کسی مصلحت سے کچھ دیر کے بعد مگر قبول ضرور فرماتا ہے۔

☆ حضرت ذکریا علیہ السلام نے طلبِ اولاد کے لیے مندرجہ ذیل دعا مانگی تھی جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قبول فرما کر ان کو حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسا بیٹا عطا فرمایا۔ طلبِ اولاد کے لیے یہ دعا بھی مجرب ہے۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً اِنَّكَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ

ترجمہ: ''اے میرے پروردگار! تو عطا فرما مجھے اپنی جانب سے پاکیزہ (نیک) اولاد، بے شک تو ہی دعا کا سننے والا ہے۔''

☆ مندرجہ ذیل دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے جو انہوں نے طلبِ اولاد کے لیے کی تھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اولادِ صالح کی طلب کے لیے یہ دعا مجرب ہے۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ

ترجمہ: ''اے رب! تو مجھے نیک اولاد عطا فرما۔''

☆☆☆



شوابے ہومیو کلینک





اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

ٹانسلز اور جسمانی کمزوری

ہاجرہ علی۔ ہری پور

مجھے پرانا نزلہ تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ناک کا گوشت بڑھ گیا ہے۔ میں نے پاکیزہ میں آپ کا تجویز کردہ نسخہ پڑھا تو ادویات منگوالیں۔ اب تیسرا مہینا ہے میں ادویات لے رہی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کافی فرق ہو گیا لیکن بلغم ابھی بھی ہے۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ ٹانسلز کا ہے جو کہ بچپن ہی سے ہے۔ منہ سے بدبو بھی آتی ہے اور اگر رات کو دودھ پی لوں تو صبح پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔ لیکوریا کبھی زیادہ ہو جاتا ہے کبھی خود ہی سیٹ ہو جاتا ہے۔ بہت کمزور ہوں جیسے ہڈیوں کا ڈھانچا۔ خوراک اثر ہی نہیں کرتی مجھ پر۔ نظر کمزور، دماغ کمزور، چیزیں رکھ کر بھول جاتی ہوں۔ لوگ دیکھتے ہی کہہ دیتے ہیں کہ تم کھاتی کچھ نہیں ہو۔ برائے کرم کوئی دوائی تجویز کریں کہ میری ان ٹانسلز سے جان چھوٹے اور میری زندگی کچھ سکون میں ہو۔

جواب: بی بی آپ نے قد اور وزن نہیں لکھا۔ متوازن غذا (دودھ، انڈے، مکھن، گوشت سبزیاں اور پھل) کا استعمال کریں۔ چہل قدمی کی ورزش بھی کیا کریں۔ گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔ یاد رکھیں کہ رات کو سونے سے پہلے دودھ پینے کی عادت بالکل غلط ہے۔ یقیناً اس طرح ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ گیس کی زیادتی، تیزابیت اور موشن ہو جاتے ہیں۔ دودھ ہمیشہ صبح ناشتے

میں اور شام کو پینا چاہیے۔ رات کو برش کر کے سویا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں۔ اس کے بعد پھر تفصیل سے حال بتائیں۔ Iodium-30، Nat Mur-30، Baryta Carb-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

جسمانی ونسوانی خرابیاں

فرحت ممتاز۔ ٹیکسلا

5 سال کی تھی کہ میرے گلے میں گلٹیاں بن گئیں اور پھر بڑی ہو کر پھٹ گئیں۔ ایسا بار بار ہوتا رہا۔ 15 سال کی تھی کہ پیٹ کی آنتوں میں گلٹیاں بن گئیں جس کی وجہ سے میں کچھ کھا پی نہیں سکتی تھی کیونکہ درد بڑھ جاتا تھا۔ اب بھی میری وہی عادت ہے کہ سردیوں میں 6-6 دن میں پانی نہیں پیتی کیونکہ پیاس ہی نہیں لگتی۔ بہت عرصہ علاج کروایا، آہستہ آہستہ یہ بیماری تو ختم ہوگئی لیکن کئی اور چھوٹی، چھوٹی بیماریاں لگ گئیں۔ (1 میرے گھٹنوں میں درد بہت زیادہ ہے۔ بیٹھ جاؤں تو اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہڈیوں میں جیسے طاقت ہی نہیں رہی۔ (2 لیکوریا کا مسئلہ ہے۔ علاج کروانے سے ایک یا دو ماہ ٹھیک رہتا ہے اس کے بعد پھر شروع ہو جاتا ہے (3 مینسز بعض دفعہ ٹھیک ہوتے ہیں بعض دفعہ بہت درد کے ساتھ ہوتے ہیں (4 ہاتھ اور پاؤں کی جلد بلیک ہوگئی ہے۔ اگر مچھر بھی بیٹھ جائے تو دانہ نکل آتا ہے اور پھر داغ کیے ہوتے جاتے ہیں۔ (5 چہرے پر چھائیاں ہیں۔ بہت کریمیں استعمال کیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ (6 گرمیوں میں پسینے کی سخت بدبو سے تنگ ہوں۔ ان ہی نقائص کی وجہ سے میری شادی نہیں ہو سکی لیکن اب حالات کی مجبوری کے تحت والدین نے رشتہ طے کر دیا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ شوہر کے ساتھ میرا نباہ مشکل ہو جائے گا۔

جواب: بیماری مجبوری ہوتی ہے جبکہ وہ مستقل ہو لہٰذا ایک وضو سے ایک نماز پڑھ لیا کریں۔ اپنے آپ کو مشکل میں نہ ڈالیں۔ تازہ پھل، سبزیاں اور دودھ، دہی کا استعمال بڑھا دیں۔ صبح نہار منہ



Sulphur-200 کی ایک خوراک یعنی 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر پی لیں۔ اس کے ایک دن بعد Calc Carb-30، Chelido nium-6 اور Pulsatilla-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ 2 ماہ تک پئیں اس کے بعد دوبارہ تفصیل سے اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔ چہل قدمی کی بھی عادت ڈالیں۔ پہلے 5 منٹ کریں پھر آہستہ آہستہ بڑھاتے ہوئے ایک گھنٹے چہل قدمی کریں۔ گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔ یاد رکھیے۔ تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کرنی ہیں۔

زیادتی حیض

عاتکہ سحر۔ سیالکوٹ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے مینسز ٹھیک نہیں ہوتے۔ ذرا سی گرم تاثیر والی چیز کھالوں مثلاً انڈا، شہد، آم یا کوئی اور چیز تو وقت سے پہلے ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے میں کوئی اس طرح کی چیز نہیں کھا سکتی۔ بہت زیادہ پرہیز کرتی ہوں اور کوئی طاقت والی چیز نہیں کھاتی۔ میں نے اس مسئلے کے لیے بہت سی ایلو پیتھک دوائیں بھی کھائی ہیں جس سے وقتی فرق پڑتا ہے۔ میرا مسئلہ شروع سے ہے جس کی وجہ سے میں بہت کمزوری ہوگئی ہوں۔ سر بھی چکراتا رہتا ہے۔

جواب: آپ کو ابتدا ہی میں معالج خصوصاً ہومیو پیتھ سے رجوع کر لینا چاہیے تھا کہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو اس کا فوری علاج ہو جائے۔ آپ اپنا U/S Pelvis کرا کر رپورٹ بھیجیں، اس دوران اپنی غذا کا خیال رکھیں۔ غذا ہمیشہ متوازن ہونی چاہیے۔ ورزش بھی مفید ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل



ادویات 2 ماہ تک استعمال کریں۔ Iodium-30، Sabina-6 اور Pulsatilla-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔

اولاد کی نعمت

ب۔ع۔کراچی

شادی کو دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ کئی جگہ علاج کروا چکی ہوں۔ ڈاکٹرز کے مطابق ٹیسٹ کی تمام رپورٹس نارمل ہیں۔ جس جگہ بھی علاج کے لیے گئی، ہر کسی نے 3-3 ماہ مختلف طاقت کی دوائیوں کا کورس کروایا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی بھی 3 ماہ کی دوائیوں کا کہتا ہے تو اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ مزید یہ کہ دوائیوں کے استعمال سے کوفت اور چڑچڑاہٹ بڑھنے لگی ہے۔ بات بات پر غصہ آنے لگتا ہے۔ یہ مرض شادی سے پہلے سے ہے مگر کبھی علاج نہیں کروایا تھا۔ میری خوراک بہت کم ہے۔ صبح ناشتا نہیں کرتی اور دن میں بھی بھوک بہت کم لگتی ہے۔ اکثر اوقات ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے ہیں اور جسم کانپنے لگتا ہے۔ پیروں اور کمر میں بھی بہت درد رہتا ہے۔ بیماری سے کچھ دن پہلے چکر آنے لگتے ہیں اور متلی محسوس ہوتی ہے اور اس دوران بہت زیادہ ڈپریشن ہونے لگتا ہے۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ ذہنی دباؤ کا شکار رہتی ہوں۔ ہر وقت اسی بارے میں سوچتی رہتی ہوں اور مختلف وسوسوں کا شکار رہتی ہوں۔ بعض اوقات مایوسی ہونے لگتی ہے۔ رات میں نیند نہیں آتی۔ دماغ بے اولادی کی وجہ سے سوچوں میں گھرا رہتا ہے۔ پھر پورا دن بہت نیند آتی ہے اور سستی اور جسم میں درد رہتا ہے۔

جواب: کوئی مصیبت، تکلیف، پریشانی یا بیماری اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی۔ مایوس ہونا کفر ہے۔ فضول باتیں اور وسوسے شیطان کا حملہ ہیں۔ اعوذ باللہ پوری پڑھا کریں۔ درود شریف پڑھیں۔ استغفار پڑھا کریں۔ اللہ کی ان نعمتوں کے متعلق سوچا کریں جو آپ کے پاس ہیں اور پھر اللہ کا زبان سے زیادہ شکر کیا کریں۔ اللہ شکر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ آ کر ملیں۔ جسمانی مسائل کے علاوہ کچھ اور بھی وجوہات ہوتی ہیں جو بے اولادی کا سبب بنتی ہیں۔ ان کا تعین ملنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ فون نمبر ڈائجسٹ والوں سے لے لیں۔ فی الحال ڈاکٹر ولمار شوابے کی Bovista-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ کسی بھی وقت پئیں۔

لیکوریا

فریدہ رفیق۔گجرات

مجھے کافی عرصے سے لیکوریا کا مسئلہ ہے جو پچھلے 2 سال سے بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ ہر طرح کی ادویات استعمال کیں لیکن بالکل بھی افاقہ نہیں ہوا۔ چہرہ بے رونق اور آنکھوں کے گرد حلقے بھی ہیں۔ جب سے یہ مسئلہ زیادہ ہوا ہے چہرے پر چھائیاں بھی پڑ گئی ہیں۔ میرا وزن بھی بہت کم ہو گیا ہے۔ بیماری کے دوران اس میں تقریباً 10 کلو کی ہوئی ہے۔ بیماری کے دوران جسم میں درد اور تھکاوٹ بھی محسوس ہوتی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ برائے مہربانی کوئی ایسی دوائی تجویز کریں جس سے میرے وزن میں بھی اضافہ ہو اور مجھے اس تکلیف سے بھی نجات مل سکے۔

جواب: متوازن غذا کھائیں اور ورزش کیا کریں۔ فلمی دنیا، ڈراموں، ناولوں اور ڈائجسٹوں کی مصنوعی خوابوں کی دنیا سے دور رہیں۔ نماز کی پابندی کریں۔ ذکر و اذکار اور قرآن کی تلاوت کیا کریں۔ قرآن کے ترجمے پر بھی اور احادیث کی طرف بھی توجہ کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات

استعمال کریں۔ Borax-30،Iodium-30 اور Calc Carb-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد اپنے احوال سے آگاہی فراہم کریں۔

شوابے کی ادویات ہی کیوں؟

مسز احمد۔ فیصل آباد

(1) ڈاکٹر صاحب آپ نے جو ادویات تجویز کی ہیں وہ 30 پوٹینسی میں 3 ڈراپ والی اکٹھی بھی لی جاسکتی ہیں اور Ø والی الگ، یہ بتادیا کریں۔ یا شاید مجھے سمجھ نہیں آئی معافی چاہتی ہوں۔ ایک بات اور کہ اکثر ولمار شوابے کی میڈیسن نہیں ملتیں تو پھر میرے شوہر غصہ ہوگئے کہ اب میں کیا کروں؟ کسی اور کمپنی کی (پاکستان) کی لے آئے کہ تمہیں تو وہم ہے ورنہ میڈیسن ایک ہی ہے یہ کیمسٹ کہتا ہے۔ اب میں پاکستان والی ہی دوا use کررہی ہوں۔ بلڈ پریشر تو میرا لو ہی رہتا ہے۔ اعصابی کمزوری بہت زیادہ ہے۔ ایک دم تھکن شدید اٹیک کی طرح حملہ آور ہوتی ہے۔ میری ریڑھ کی ہڈی بالکل سیدھی ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر کہتی ہے کہ خم ختم ہوگیا ہے۔ جگہ جگہ پٹھوں میں جیسے آگ سی لگی محسوس ہوتی ہے۔ چکر بہت زیادہ آتے ہیں اور سر میں درد بڑھ جاتا ہے۔ کبھی ایک سائیڈ میں زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکتی۔ کمر میں بہت زیادہ درد ہے۔

(2) میرے بیٹے کا شیشہ پینا چھوٹ جائے، مجھے ضرور میڈیسن بتائیں۔ ویسے تو بہت اچھا ہے لیکن دوستوں کے ساتھ شیشہ پینے لگا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں۔ مجھ سے چھپاتا ہے لیکن مجھے اس کے ہاتھوں کی خوشبو سے پتا چل جاتا ہے اور پھر سچ بتا دیتا ہے کہ کلب میں شیشہ فلیور پیا ہے۔

(3 میری بیٹی کو سبق تو بالکل یاد نہیں ہوتا۔ بہت پڑھتی مگر بھول جاتی ہے اور روتی ہے۔ دو دفعہ 9th میں فیل ہوگئی۔ سامنے پڑی ہوئی چیزیں ڈھونڈتی رہتی ہے۔



جسمانی صحت بھی بہت کمزور ہے۔ اسے بھوک نہیں لگتی، روٹی تو کھاتی نہیں۔ دودھ سوڈا بس کہتی بنا دو۔ یعنی پتلی چیز جس میں کھانے میں محنت نہ کرنی پڑے۔ رنگ بھی بالکل سفید ہے۔ آنکھوں میں گہرے حلقے ہیں۔ سوتی بھی ٹھیک سے نہیں۔ کہتی ہے کہ میرا پڑھنے کو دل نہیں کرتا، آپ زبردستی کرتی ہیں اس لیے میں پڑھ لیتی ہوں۔ آج کل پڑھائی کے بنا بھی کوئی زندگی ہے۔ رنگ بالکل سفید ہے جیسے خون تو نظر ہی نہیں آتا۔ سارا دن بھوکی رہے گی اگر زبردستی بچوں کی طرح نہ کھلاؤ۔ پھر رو کر کھاتی ہے۔ صحت اچھی ہوگی تو پڑھے گی بھی۔

جواب: آپ نے خط میں چار مختلف مسائل پوچھے ہیں جن کے جواب یہ ہیں۔

(1) ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ادویات ہی استعمال کیوں کی جائیں؟ اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں: (1) دوا بنانے کے لیے جس چیز (پودے معدنیات وغیرہ) کا استعمال ہوتا ہے وہ پوری ذمے داری کے ساتھ جانچ پڑتال کے بعد ہوتا ہے۔ (2 دوا بنانے کے دوران اس کی کوالٹی کو بار بار چیک کیا جاتا ہے۔ (3 اس کی پیکنگ خودکار کمپیوٹرائزڈ مشینوں سے کی جاتی ہے جو پیکنگ کے معیار کو مسلسل چیک کرتی رہتی ہے۔ (4 ماحول آلودگی سے پاک ہوتا ہے (کارکنان سر کو ڈھانپے رکھتے ہیں، چہرے پر ماسک ہوتا ہے، ہاتھوں میں گلوز اور جسم پر گاؤن ہوتا ہے)۔ (5 فارمیسی کا ٹمپریچر اور ہوا کی نمی کو کنٹرول میں رکھا جاتا ہے۔ ہر فارمیسی اور بالخصوص مقامی کمپنیز اتنے معیارات کا خیال نہیں رکھ پاتیں جس سے دوا کی اثر پذیری پر اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا ان وجوہات کی بنا پر اعلیٰ معیار کی قابلِ بھروسا ادویات کو استعمال کرتے اور کراتے ہیں۔

(2) آپ کی باتوں سے احساس ہوا ہے کہ آپ کے ہاں ناچاقیاں بہت ہیں۔ آپ کے شوہر بھی

متاثر ہیں اور آپ بھی اور آپ کے دونوں بچے بھی۔ تمام گھر والے اللہ سے رجوع کریں۔ نماز کی پابندی کریں۔ فجر کی نماز کے بعد سورۃ یٰسین کی تلاوت کریں۔ عشا کے بعد سورۃ واقعہ پڑھا کریں۔ روزی میں خیر و برکت ہوگی۔ آپ کی بیماری کے لیے Calc Kali ،Rhustox-30 ،Carb-30 Phos-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ کسی بھی وقت ایک پانی میں لے سکتی ہیں۔ ایک ماہ تک لیں۔

(3) بیٹے کے لیے Tabacum-30 اور Staphisagria -30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کرائیں۔ اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرائیں۔ نماز کی پابندی کرائیں۔ مسجد کی طرف راغب کریں۔

(4) بیٹی کے لیے Arsenic Alb-30 اور Kali Phos-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔ اور Ferr.Phos-30 کے 5-5 قطرے صبح و شام دیں۔ ایک ماہ تک۔

ازدواجی زندگی

سجاد اعوان۔ ہری پور ہزارہ

ڈاکٹر صاحب میری شادی کو 2 ماہ ہونے والے ہیں، میں انتہائی کمزوری محسوس کرتا ہوں۔ جس کے اثرات ازدواجی زندگی پر بھی پڑ سکتے ہیں۔ پلیز ڈاکٹر صاحب مجھے اس کے لیے کوئی میڈیسن تجویز کریں جس سے میرا یہ مسئلہ ٹھیک ہو جائے، بڑی امید کے ساتھ خط لکھ رہا ہوں۔

جواب: تیز مرچ مسالے اور گوشت کے بنے ہوئے آئٹم نہ کھائیں۔ سبزیاں اور فروٹ زیادہ استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ تک استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیں۔ Staphisagria-200 کے 5 قطرے ہر ہفتہ ایک خوراک۔ اس کے ایک دن بعد Agnus Cast-30 اور Lycopodium-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

پیشاب میں جلن

سحر۔ پشاور

ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ برائے مہربانی حل کر دیں۔ مجھے 2007ء سے یہ مسئلہ ہے جو کسی بھی دوائی سے ٹھیک نہیں ہوتا۔ مجھے پیشاب کی جلن کی شکایت ہے جو گرمی میں اور خاص کر رمضان میں برداشت سے باہر ہوتی ہے۔ مجھے گردوں کی اور نہ مثانے کی بیماری ہے (الحمدللہ) بہت علاج کیا مگر ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا۔ میں بہت مایوس ہوں۔ پلیز میرا مسئلہ حل کر دیں۔

جواب: مایوسی کفر ہے۔ اللہ سے اچھی امید رکھیں۔ ہماری کوشش ناقص ہو سکتی ہے لہٰذا کوشش کو جاری رہنا چاہیے۔ پانی کا خاص خیال رکھیں۔ کم از کم 10 گلاس پانی روزانہ ضرور پئیں۔ لیکن کھانے کے ساتھ اور کھانے کے فوراً بعد نہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Merc.cor-30 اور Terebinthin-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔ 2 ماہ بعد Urine D/R کی رپورٹ کے ساتھ حال لکھیں۔